آزادی کی تلاش

مصنف

میاں اکبر شاہ

ترجمہ و ترتیب

سید وقار علی شاہ

(کاکاخیل)

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت

پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۰ —— اسلام آباد

۱۹۸۹ء

مترجم و مرتب

سید وقار علی شاہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۱ء کو زیارت کاکا صاحبؒ تحصیل نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری، پشاور یونیورسٹی سے ایم اے (۱۹۸۳) اور ایم فل (۱۹۸۶) کیا۔ آج کل قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے پی ایچ ڈی کے طالب علم ہیں۔

آپ نے ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری پشاور یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء سے قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد سے بحیثیت ریسرچ فیلو وابستہ ہیں۔

اس مختصر سے عرصے میں آپ نے سیاسیات صوبہ سرحد پر کافی کام کیا ہے۔ آپ کے کئی مقالے قومی شہرت کے حامل کتب و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

سلسلہ خود نوشت سوانح عمری : ۱

آزادی کی تلاش

CamScanner

آزادی کی تلاش

مصنف

میاں اکبر شاہ

ترجمہ و ترتیب

سید وقار علی شاہ

(کاکاخیل)

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت

اسلام آباد

۱۹۸۹ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

قیمت : ۱۵۰ روپے

طبع اوّل : ۱۹۸۹ء

ISBN 969-415-017-5

طابع

اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ پریس

اسلام آباد

ناشر

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت

پوسٹ بکس ۱۲۳۰۔ اسلام آباد

CamScanner

انتساب

جنگِ آزادی کے
گمنام شہیدوں
کے نام

آزادی کی تلاش

	صفحہ
انتساب	
دیباچہ	۱
تعارف	۳
پیش لفظ	۴۵
وطن سے روانگی۔ اسلامیہ کالج پشاور	۴۸
اتمان زئی سے روانگی	۵۰
انگریزی سرحد سے پار ہونا	۵۱
دو برجوں کا گاؤں	۵۵
مہمندوں کا وطن	۵۶
لکڑئی	۵۷
باجوڑ	۵۸
ایک ہم وطن سے ملاقات	۵۸
ناوگئی	۵۹
چمرقند اور ہندوستانی مجاہدین	۶۰
سرفراز خان کا پشیمان ہوکر واپس لوٹنا	۶۱
کونڑ کی وادی	۶۲
جلال آباد	۶۴
سپہ سالار نادر خان سے ملاقات	۶۵
دوسرے مہاجرین	۶۶
جلال آباد تا کابل	۶۹
ہم افغانی رعایا بن گئے	۶۹
مولانا کا خواب	۶۹
خاک جبار	۷۰
کابل	۷۱
قاضی عبدالولی	۷۱
مولانا عبیداللہ سندھی	۷۳
محمد شفیق	۷۴
مولانا عبدالرب	۷۵
افغانستان۔ مولانا عبدالرب سے ملاقات	۷۶

		صفحہ
کابل کا میٹھا پانی اور ٹھنڈی ہوا	۷۷ خوش آمدید مہمان ہائے ما	۱۰۲
کوہ دامان	۷۸ کوہ ہندوکش کو عبور کرنا	۱۰۴
جبل السراج	۷۹ ہمیں گالیں سننا پڑیں	۱۰۵
امین اللہ خان مہاندار	۸۰ کرنیل کے ساتھ ملاقات	۱۰۶
سرور خان کا قلعہ	۸۰ بازار گھے	۱۰۷
جبل السراج میں مہاجرین کی زندگی	۸۱ شاہی راستے میں ہم پہ ڈاکہ پڑتا ہے	۱۰۷
مہاجرین کی کمیٹی	۸۲ نارین	۱۰۸
مہاجرین کی فوجی تربیت	۸۳ ایک ساتھی کا ہم سے جدا ہونا	۱۱۰
سعید خان	۸۴ بغلان	۱۱۱
جبل السراج میں نئے مہاجرین کی آمد	۸۴ بغلان کے کوتوال کے سامنے پیشی	۱۱۲
افغانستان اور انگریز میں صلح کی خبر	ہمیں شتواریوں کی چراگاہ جلانے پر سزا ملتی ہے	۱۱۳
کا جبل السراج پہ بجلی بن کر گرنا۔	۸۶ یا چار یار	۱۱۷
حاجی معراج الدین ہماری رہنمائی کرتے ہیں	۸۷ غیبی امداد	۱۱۸
افغانستان سے باہر نکلنے کی راہداری	۹۳ غور۔ شہاب الدین غوری کا پایۂ تخت	۱۲۰
جبل السراج سے ہماری گرفتاری کے	ایبک	۱۲۰
احکامات۔	۹۶ تاش قرغان اور راہداری کی چوکی	۱۲۱
ہمارا گل بہار سے بچ نکلنا	۹۶ مہاجرین کے قافلے کی اطلاع	۱۲۲
راہ داری دیکھنے کی چوکی	۹۷ افغانی ترکستان	۱۲۳
درہ پنج شیر	۹۷ مزار شریف	۱۲۳
میرا اور صادق کا ساتھیوں سے پیچھے رہ جانا	۱۰۱ مزار شریف میں وزیر انصاف کے باڈی گارڈ کے ہاتھوں ہماری گرفتاری۔	۱۲۴

	صفحہ
نیلی آنکھوں والا مسافر	۱۲۵
سرفراز خان اور سکندر شاہ حوالات میں بند کر لئے گئے	۱۲۸
رُوسی سفارت خانہ	۱۲۹
سخی سرور صاحب کی زیارت	۱۲۹
مزار شریف اور بلخ	۱۲۹
سرفراز آفندی	۱۳۰
سیاہ گرد	۱۳۱
سوویت یونین ۔ ترمذ ۔ بخارا	
ترمذ ۔ بالشویک ہمارا شاہانہ استقبال کرتے ہیں	۱۳۳
ترمذ کا انقلابی کمشنر	۱۳۳
ہمیں فوجی سلامی دی جاتی ہے	۱۳۴
کمشنر کی انقلابی تقریر	۱۳۵
"سبحان اللہ! خلفائے راشدین کا زمانہ ہے"!	۱۳۵
مجھے بھڑنے کاٹا	۱۳۷
تفریح طبع	۱۳۸
ترمذ سے رخصت	۱۳۹
لڑائی کی بُو آنے لگی	۱۴۰
کلف (کیف)	۱۴۰
ہم ترکمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ۔	۱۴۱

	صفحہ
"اُن روسیوں کو ساتھ کیوں لائے ہو"؟	۱۴۱
"ہائیکو یا اللہ ۔ آؤ مومنو! کافروں کے خلاف جہاد میں حصّہ لو"	۱۴۳
سرائے نظام بیگ	۱۴۴
تکلیف میں انسان کو خُدا یاد آتا ہے	۱۴۵
ہمارا امتحان	۱۴۶
ہمیں سزائے موت سنائی جاتی ہے	۱۴۷
ہمیں پھر غیبی امداد پہنچتی ہے	۱۴۹
ہم بخارا کی طرف چلتے ہیں لیکن پھر جلد ہی قید ہو جاتے ہیں ۔	۱۵۱
ہم پر موت کی سختی آئی	۱۵۳
ترکمانوں کے کیمپ میں تین راتیں پاؤں سے بندھے رہے ۔	۱۵۴
کلان ترکی زمین پر زمینداری کرتے ہیں ۔	۱۵۷
عبدالرحمٰن کا قتل ہونا	۱۵۸
اخون اپنے اصلی رنگ میں آتا ہے	۱۵۹
پھر جنگ کی خبر آتی ہے اور ہم میں زندگی کی نئی رمق آتی ہے ۔	۱۶۰
اخون ہمیں چھوڑتا ہے لیکن ہم اسے نہیں چھوڑتے	۱۶۱
اخون سے فرار لیکن مجبور ہو کر پھر اس کے پاس آنا	۱۶۳

	صفحہ		صفحہ
تین دن بھوکے پیاسے چارے کے		بخارا	۱۹۳
کمرے میں بند رہے۔	۱۶۴	بخارا کا انقلاب	۱۹۳
بھوسے کے کمرے کی قید سے رہائی		بخارا کی تعلیمی حالت	۱۹۴
ملتی ہے۔	۱۶۶	انقلاب کی نشانی	۱۹۵
دریائے آمو کا کنارہ	۱۶۸	بخارا میں سفیر افغانستان سے ملاقات	۱۹۶
ہم جدیدی فوج کے پاس پہنچ گئے	۱۷۰	تاشقند	۱۹۶
ہم جدیدی فوج کے ہمراہ کرکی کے لئے		ہندوستانی انقلابی لیڈر	۱۹۷
روانہ ہوئے۔	۱۷۲	ایم این رائے	۱۹۸
کرکی چھاؤنی	۱۷۳	مولانا عبدالرب	۱۹۹
کرکی کا کمشنر	۱۷۳	مولانا فضل حق	۲۰۰
ہم ترکمانوں سے لڑتے ہیں	۱۷۴	تاشقند میں ہمارے لئے ہوائی جہازوں کا مدرسہ	۲۰۲
لطیف تاتار	۱۷۷	ہندی فوجی سکول	۲۰۴
لطیف نے پروپیگنڈہ شروع کر دیا	۱۸۰	ہماری روزمرہ کی زندگی	۲۰۵
میں بیمار ہوا	۱۸۲	ترکستان کی اقتصادی حالت	۲۰۶
جنگ اور تفریح	۱۸۲	ترکستان لینن اکیڈمی	۲۰۷
کرکی سے رخصت	۱۸۵	اکبر خان غائب ہو گیا	۲۱۰
چارجوئے	۱۸۸	جونز کی ایک یہودی لڑکی کے ساتھ محبت	۲۱۲
مہاجرین میں جدائی آتی ہے	۱۸۹	باکو۔ میرا ایشیا کے نوجوانوں کی باکو کانفرنس	
میرے سر میں بے شمار جوئیں پڑ گئیں	۱۹۱	میں شریک ہونا	۲۱۳
دریائے آمو کا کنارہ	۱۹۲	چارجوئے سے جدا ہونے والے ساتھیوں سے دوبارہ ملاقات	

	صفحہ
مصطفےٰ کمال پاشا پر بم سے حملہ	۲۱۴
باکو کانفرنس	۲۱۶
باکو شہر	۲۱۸
سوویت یونین کی ناکہ بندی کا اثر	
تاشقند میں ہندوستانی ہوائی مدرسہ بند ہوگیا	۲۱۹
ایم این رائے نے نعم البدل پیش کیا	۲۲۰
تاشقند میں فٹ بال	۲۲۱
تاشقند میں ہماری تفریح	۲۲۲
ترکستان کی آزادی کی سالانہ پریڈ	۲۲۴
روس	۲۲۵
ماسکو	۲۲۸
واستوچنے انیورسٹیٹ مشرقی یونیورسٹی	۲۲۸
ماسکو کا موسم	۲۳۰
ماسکو میں قومی خدمت کا جذبہ	۲۳۱
سوویت روس میں جسمانی ورزش کی مہم	۲۳۲
قحط	۲۳۲
سوویت کی نئی اقتصادی پالیسی	۲۳۳
ماسکو میں ہمارے آخری ایام	۲۳۴
آنیا اسایان	۲۳۶
اسایان ڈرامے میں ہیروئن کا کردار ادا کرتی ہے	۲۳۷

	صفحہ
وطن واپسی کا ارادہ: وطن کو لوٹتا ہوں	۲۴۳
ذینوی یف کے ساتھ ملاقات	۲۴۴
پیٹرگراڈ کو روانگی	۲۴۵
رات کے وقت پیانو، باجہ اور ناچ	۲۵۳
اسایان کی تصویر	۲۵۵
ماسکو سے روانگی	۲۵۶
خارکوف	۲۵۷
منزلی وادی	۲۵۸
گاڑی کے کاریڈار میں سونا	۲۶۰
طہران میں مقیم روسی سفیر کی بیوی سے ملاقات	۲۶۰
باکو پہنچنا	۲۶۱
گولایت (سیر)	۲۶۳
روٹی	۲۶۴
عورتوں کا پردے کے خلاف احتجاج	۲۶۵
باکو سے راستہ ملنا دشوار ہوگیا	۲۶۵
باکو سے تفلس	۲۶۷
نمائندگان کی گاڑی	۲۶۷
تفلس	۲۶۸
اردوان	۲۷۰
آرمنستان میں قحط	۲۷۱

	صفحہ		صفحہ
انقلابی ریل گاڑی	۲۷۲	ایرانی کرسی کے نیچے رات	۲۹۸
انجن کے ڈرائیور کو رشوت	۲۷۳	قزدین میں آغائے کلان تجار کی گرفتاری	۲۹۸
نقشبند اور جلاوطن ایرانی انقلابی کمیٹی	۲۷۴	تجارتی سفیر ہندوستانیوں کو شیطان کے نام	
واپس باکو	۲۷۵	سے یاد کرتا ہے۔	۲۹۹
شراب کا نشہ اور انقلاب ایران نندہ باد	۲۷۵	قزدین میں افلاس	۳۰۰
پھر تفلس	۲۷۷	طہران	۳۰۰
پھر باکو	۲۷۸	آغا سالار رضا خان اور سیاست ایران	۳۰۲
مجید اور اس کے ساتھی بھی واپس آگئے	۲۷۸	روسی سفیر کی طرف سے آغا سالار کو دعوت	۳۰۳
سلیمان ذکریا	۲۸۰	ایران کی تباہی کے اسباب	۳۰۳
ایران : بندر انزلی	۲۸۱	طہرانی معاشرہ : تحریک نسواں	۳۰۵
جواز	۲۸۴	خواتین کا جلوس اور اقتصادی مطالبات	۳۰۷
گیلان ۔ رشت	۲۸۶	شیخ الاسلام کا جواب	۳۱۰
مرزا کوچک خان اور سالار رضا خان	۲۸۷	متاع یا صیغہ	۳۱۱
کوہ البرز کی برف میں ہمارا پڑاؤ	۲۹۰	ایران میں شہری آزادی	۳۱۲
بین الاقوامی اجتماع	۲۹۱	سلطان محمد علی خان	۳۱۳
اپنی اپنی زبان میں گانے	۲۹۲	صوفی صاحب	۳۱۴
ناچ	۲۹۴	ایران کی فوج	۳۱۵
بیگم تمباکوف بھی ہمارے پیچھے پہنچ گئیں	۲۹۵	سالانہ فوجی پریڈ	۳۱۶
موٹریں آگے نہیں جا سکتیں	۲۹۷	ایران کی صنعتی ترقی	۳۱۷
گھوڑوں کی سواری	۲۹۷	تعلیم	۳۱۸

	صفحہ
تھیٹر اور سینما	۳۱۸
قہوہ خانہ	۳۱۹
طہران سے روانگی	۳۱۹
قُم	۳۲۲
اصفہان	۳۲۲
امپیریل بنک آف پرشیا۔ اصفہان	۳۲۴
شراب خوری	۳۲۵
اصفہان سے روانگی اور لٹیروں سے مقابلہ	۳۲۶
یزدجرد	۳۲۷
طہران سے شیراز تک کی سڑک	۳۲۸
شیراز	۳۲۹
شیراز سے بوشہر تک	۳۳۲
کازرون	۳۳۶
سالار قافلہ کے افسری خیمے میں مہمان بنا	۳۳۷
ساتواں پڑاؤ "از چشمانت معلوم مے شود کہ نجس ہستی"	۳۳۸
برازون	۳۴۱
شیخ محمدی	۳۴۲
بوشہر	۳۴۶
ایک سابق پولیس افسر کے گھر میں پناہ لی	۳۴۶
میری گرفتاری	۳۴۷
حوالات سے فرار	۳۵۰
خلیج فارس: بوشہر سے وطن	۳۵۶
جہاز میں سوار ہوتا ہوں	۳۵۸
ایران کو چھوڑنے کا افسوس ہوا	۳۵۸
جہاز کے عرشے پر	۳۵۹
درجہ دوئم کا ٹکٹ	۳۶۰
جہاز کا سیکنڈ کلاس	۳۶۰
میرے ساتھیوں کی آپس میں جنگ	۳۶۲
مسقط	۳۶۳
بحیرہ عرب، بلوچستان کا ساحل	۳۶۴
اپنا وطن، کراچی کی بندرگاہ میں کیسے بچ نکلتا ہوں	۳۶۵
افغانستان کے ایک ہزارہ نے پہچان لیا	۳۶۶
کراچی میں مولوی بننا	۳۶۶
کراچی میں افلاس	۳۶۷
کراچی سے لاہور	۳۶۸
لاہور	۳۷۱
نیڈو ہوٹل	۳۷۱
گورے کنکھیاں مارتے ہیں	۳۷۲

	صفحہ		صفحہ
سی آئی ڈی کے انسپکٹر خان بہادر		لاہور سے گاؤں کو روانگی	۳۸۳
عبدالعزیز سے ملاقات	۳۷۳	میرے گاؤں کا ہندو ہم جماعت مجھے پہچانتا ہے	۳۸۴
حاجی معراج الدین	۳۷۴	زیارت کاکا صاحبؒ میں فخر قوم میاں کے	
لاہور میں بابو سلطان محمد کا انتظار	۳۷۷	ہاں رات گزارنا	۳۸۵
مسجد وزیر خان	۳۷۸	میرے پہنچنے سے قبل گاؤں خبر	
مقبرہ جہانگیر میں آموں کی دعوت	۳۷۹	پہنچ گئی	۳۸۶
پولیس میرے تعاقب میں	۳۸۱	مجھے گرفتار کر لیا گیا	۳۸۷
بابو صاحب سے ملاقات	۳۸۲	حواشی و تعلیقات	۳۸۹

دیباچہ

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سالوں میں ہندوستان سے بے شمار لوگ ہجرت کر کے افغانستان گئے۔ ان میں سے اکثر روس۔ ترکی اور ایران تک گئے۔ کئی حضرات نے اپنے اپنے سفرنامے لکھے۔ ظفر حسن ایبک کی تین جلدوں پر مشتمل "آپ بیتی" کے علاوہ فیض محمد خان صاحب کی "ہجرت افغانستان" اور عبدالاکبر خان اکبر کا "سفر نامۂ روسی ترکستان" اسی سلسلے میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن جو معلومات ہمیں "آزادی کی تلاش" میں ملتی ہیں وہ اور کہیں ناپید ہیں۔ بڑی سادگی اور سچائی سے وہ تمام واقعات وحوادث جو میاں اکبر شاہ پر سفر روسی ترکستان و ایران میں گذرے انہوں نے "آزادی کی تلاش" میں تحریر کئے ہیں۔ میاں صاحب کی وطن واپسی پر حکومت نے ان کو گرفتار کیا۔ وہ قید کر لئے گئے۔ قید کے دوران انہوں نے کسی نہ کسی طرح سے پنسل اور کاغذ پیدا کر کے اپنی روداد سفر تفصیل کے ساتھ پشتو میں لکھی۔ ان کی یادداشت بالکل ٹھیک کام کر رہی تھی۔ جگہوں کے نام تک انہیں ٹھیک ٹھاک یاد تھے۔ اس کے علاوہ واقعات کا تسلسل بھی ابھی نہیں ٹوٹا تھا۔ "آزادی کی تلاش" مکمل ہوئی اور موقعہ ملتے ہی میاں صاحب نے چھپوا بھی دی۔

عرصہ دراز سے میری یہ خواہش تھی کہ میاں صاحب کی "آزادی کی تلاش" کا اردو میں ترجمہ کروں تاکہ پشتو بولنے اور سمجھنے والوں کے علاوہ اور لوگوں کو بھی پتہ چلے کہ پشتونوں کی سرزمین نے کیسے کیسے جان باز پیدا کئے ہیں۔ ان مجاہدین کے سامنے کوئی لالچ یا ذاتی حرص نہیں تھی۔ ایک نیک مقصد کیلئے ان کی کوششیں جاری تھیں اور یہ ان کی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ وطن آزاد ہوا۔ لیکن المیہ تو یہ ہے کہ ان مجاہدین آزادی کے ناموں تک سے بھی لوگوں کی اکثریت ناواقف ہے اور ان کی مثال

تعارف

آزادی بظاہر تو چند الفاظ کا مجموعہ ہے لیکن اپنے اندر ایک پوری دنیا بسائے ہوئے ہے۔ اس لفظ کے سنتے ہی انسان ایک ناقابل بیان خوشی محسوس کرنے لگتا ہے۔ تاہم اس کے اصل معنی سے بہت کم لوگ ہی واقف ہیں۔ نئی نسل کے لوگوں کے لئے تو اس کی اہمیت بہت کم ہے کیونکہ یہ فطرت انسانی ہے کہ جو چیز بغیر محنت و مشقت کے آسانی سے ہاتھ آئے تو اس کی قدر و منزلت انسان کی نظروں میں کم ہو جاتی ہے اور پھر ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے پیدا ہونے والے کیا جانیں کہ کتنی تکالیف سہہ کر اور کتنی بڑی قربانیاں دے کر ملک آزاد کرایا گیا ہے۔ آزادی کی راہ میں ہزاروں نوجوان بوڑھے اور عورتیں اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ انہوں نے اپنے اوپر ہر قسم کی آرام و آسائش کی زندگی حرام کی تب ہی کہیں جا کر ان کی قوموں کو چین سے رہنا اور سکون سے زندگی بسر کرنا نصیب ہوا۔ انہی لوگوں کی قربانیوں کی بدولت آج ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد وطن کی آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ پر نظر دوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں انگریزوں نے سو سال سے زیادہ حکومت کی۔ اگر اس سارے عرصے وہ کسی سے ہزیمت خوردہ اور پریشان رہے تو صرف پشتون ہی تھے۔ پشتونوں نے روز اول سے ہی انگریزوں کے ناپاک قدم اپنی پاک سرزمین پر نہ آنے دیئے۔ پشتونوں کے علاقے پر سکھوں کی یورشیں ۱۸۱۸ء سے شروع ہوئیں۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ پانچ سال بعد مروتوں کا میدانی علاقہ بھی ان کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۸۳۴ء میں پشتونوں کو نوشہرہ کے مقام پر شکست دینے کے بعد ۱۸۳۶ء میں ہری سنگھ نے پشاور کا قلعہ فتح کیا۔ ہربرٹ ایڈورڈز نے لاہور کے خالصہ دربار

کے لئے بنوں کا علاقہ فتح کیا۔ اس طرح رنجیت سنگھ پشتون علاقے کا حاکم بن گیا۔ رنجیت سنگھ کے مرنے پر اس کے جانشینوں میں تخت کے لئے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ اندرونی کش مکش اور خلفشار نے انگریزوں کو آگے آنے کا موقع فراہم کیا۔ ۱۸۴۶ء اور ۱۸۴۹ء میں اینگلو سکھ جنگیں ہوئیں۔ سکھوں کو شکست ہوئی اور انگریز سکھ ریاست پر قابض ہو گئے۔

یوں تو صوبہ سرحد پر انگریزوں کی عملداری سکھ حکومت کے خاتمے کے دن ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء سے شروع ہوئی لیکن اس سے پہلے بھی بہت سے انگریز سکھوں کے معاون کے طور پر یہاں کے بہت سے علاقوں کو دیکھ چکے تھے۔ ہربرٹ ایڈورڈز، جارج لارنس، ہوڈسن، جیمس ایبٹ، جان نکلسن وغیرہ صوبے کے مختلف مقامات پر کام کر چکے تھے۔

انگریزوں کے آنے پر ان پشتون قبائل نے جو پہلے سکھوں کے ساتھ لڑ رہے تھے اب انگریزوں کے خلاف اپنی لڑائیاں جاری رکھیں۔ انگریز دن بدن یہاں اپنی فوجوں کی تعداد بڑھاتے رہے۔ جنگوں کا ایسا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ ان کو دیکھ کر تاریخ کا ہر طالب علم آسانی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ جتنا پشتونوں نے انگریزوں کو پریشان کیا ہندوستان کیا شاید دنیا بھر کی اقوام میں اور کسی نے انہیں اتنا تنگ کیا ہو۔ ۱۸۴۹ء سے قیام صوبہ سرحد ۱۹۰۱ء تک پشتونوں نے انگریزوں کے خلاف کم و بیش ساٹھ جنگیں لڑیں۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر تک ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ دن بدن تغیرات آ رہے تھے۔ اب انگریزوں کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے مخصوص حالات کا ڈھونگ رچا کر اپنے ظلم و ستم کی پردہ پوشی کے لئے کچھ اقدامات کریں۔ لارڈ کرزن نے صوبہ علیحدہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ وہی پشتون جو پچاس سال تک پنجاب کے ساتھ برابر کی حیثیت سے انگریز کی عمل داری میں زندگی بسر کر رہے تھے اچانک خاص سلوک کے مستحق قرار پائے گئے۔ انہیں ان تمام مراعات سے محروم کرنے کی تجویز ہوئی جن سے وہ قانونی اور آئینی طور سے مستفید ہو رہے تھے۔ سرزمین سرحد کو ہر قسم کی ان اصلاحات سے جو پنجاب کو ملنے والی تھیں محروم کر دیا گیا۔ منٹو مارلے اسکیم اور مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم

میں انہیں کوئی حصہ نہیں ملا۔ یہی نہیں سرزمین سرحد پر خاص قوانین نافذ کئے گئے جن میں سرفہرست قوانین جرائم سرحد اور غازی ایکٹ (Murderous Outrages Act of 1877) جیسے سفاکانہ قوانین تھے۔ انہوں نے شہنشاہ برطانیہ کے جشن سالگرہ کے موقع پر ۹ نومبر ۱۹۰۱ء کو صوبہ سرحد کے قیام کا اعلان کیا تاہم صوبے کا باقاعدہ افتتاح ۲ اپریل ۱۹۰۲ء کو ہوا۔ ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت دن بدن بڑھنے لگی۔ وہ کوئی ایسا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے جن میں ان کو تکلیف پہنچا سکتے تھے۔ اس کے مقابلے میں شہرت کے طالب انگریز جب صوبہ سرحد کی زمین پر قدم رکھتے تو وہ شہرت اور دولت حاصل کرنے کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہ گنواتے۔ انہیں یہاں کے باشندوں سے کوئی لگاؤ تھا اور نہ ہی کوئی دلچسپی تھی۔ ان کی چاہت تو یہی تھی کہ مملکت برطانیہ بھی وسیع سے وسیع تر ہو جائے اور ان کے ذاتی خزانے بھی بھرتے جائیں۔ انگریزوں نے اپنے ان مفادات کی خاطر باشندگان سرحد کو دبانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ہندوستان کے باقی ماندہ صوبوں کی طرح صوبہ سرحد میں بھی سیاسی بیداری آہستہ آہستہ پیدا ہونے لگی۔ صوبہ سرحد کے سیاسی افق پر بیسویں صدی کے آغاز سے دو نام ابھرے جن میں ایک پنڈت امیر چند بموال اور دوسرا پنڈت رام چند کا تھا۔ امیر چند بموال صوابی کا رہنے والا پشاور میں سکونت پذیر تھا۔ سیاسی حیثیت سے اولین گرفتاری پنڈت امیر چند بموال کی ہی تھی۔ انہیں ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء کو خیرآباد میں بمعہ بشیشر ناتھ اور جے گوپال کے گرفتار کیا گیا۔ ان پر الزام عوام کو سودیشی مال خریدنے کی ترغیب دینا تھا۔ انگریزوں کی نظروں میں اس سے بڑا گناہ اور کون سا ہو سکتا تھا کیونکہ ایک طرف تو وہ ہندوستان کی دولت لوٹ کر انگلستان لے جا رہے تھے تو دوسری طرف ہندوستان کو اپنے مال کے لئے بطور منڈی بھی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ پنڈت رام چند بھی یار حسین صوابی کا رہنے والا تھا۔ سب سے پہلے اسی شخص نے صوبہ سرحد کو پنجاب سے علیحدہ کرنے پر بطور احتجاج آواز بلند کرتے ہوئے اخبارات میں مضامین لکھے اور یہ مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد کو بھی پنجاب کی طرح مساوی حقوق دیئے جائیں۔ انگریز جو کہ ہندوستان میں اپنے اوپر نکتہ چینی برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے، نے اس کی زبان بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن قبل اس سے کہ وہ انہیں گرفتار کرتے وہ صوبہ

سرحد سے دہلی نکل گیا۔ وہاں اپنی قابلیت کی بنا پر سید حیدر رضا کے اخبار "آکاش" سے منسلک ہوگیا۔ بعد میں جب پنڈت امیر چند پر بھی حکومت وقت کی بجلی گری تو پنڈت رام چند روپوش ہو کر ہندوستان چھوڑ کر امریکہ چلا گیا۔ وہاں غدر پارٹی میں شمولیت کر کے "غدر" کا ایڈیٹر بنا۔ آخر کار ۲۳ر اپریل ۱۹۱۸ء کو حکومت کی ایما پر ایک سکھ نے اسے قتل کر دیا۔

صوبہ سرحد کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات آپس میں خوشگوار تھے۔ ہندو مسلم فسادات قسم کی چیزوں سے سرزمین سرحد بچی ہوئی تھی۔ جہاں ہندو سیاسی طور پر آگے بڑھنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے وہیں مسلمان بھی ان کے شانہ بشانہ خفیہ سرگرمیوں میں بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔ آخر کار ان میں سے کچھ تعلیم یافتہ افراد کے ایک گروہ نے باہم مل کر مسلمانوں کے لئے ایک الگ جماعت کی بنیاد رکھی۔ پشاور کے مشہور انقلابی کارکن علی عباس بخاری میاں عبدالعزیز، قاضی عبدالولی، قاضی میر احمد اور حکیم محمد امین وغیرہ نے باہم مل کر ۱۹۱۲ء میں قاضی میر احمد کے بالاخانے میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ وہی بالاخانہ انہوں نے دفتر کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ میاں عبدالعزیز کو صدر منتخب کیا گیا۔ جب کہ علی عباس بخاری جنرل سیکرٹری بنے۔ انہوں نے تن دہی سے اپنا کام شروع کیا۔ ان لوگوں کے دلوں میں انگریز دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خاص کر علی عباس بخاری جو یورپ سے تازہ تازہ لوٹے تھے اور جن کو یہاں آکر شدت سے غلامی کا احساس ہو رہا تھا۔ انگریز دشمنی میں اس حد تک بڑھ گئے کہ اسلامیہ کالج پشاور کا بنانا بھی انہیں انگریزوں کی ایک چال نظر آرہی تھی۔ ان کے خیال میں انگریز اپنے لئے وفاداروں کی ٹولی اسلامیہ کالج پشاور کے ذریعے بنانا چاہتی تھی۔ علی عباس بخاری کا رابطہ اپنے انگلستان کے دوستوں کے ساتھ بھی تھا تو دوسری طرف مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ان کے اچھے مراسم تھے۔ یہاں انہیں جو کچھ ناانصافی نظر آجاتی فوراً خطوط کے ذریعے اس کی اطلاع درج بالا دوستوں کو دے دیتے۔

صدر اور جنرل سیکرٹری دونوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ آگرہ ۱۹۱۳ء میں شرکت کی۔ اور اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں بمبئی کے سالانہ اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔ انہوں نے منظم طور پر شہر میں حکومت کے خلاف کام کرنا شروع کیا۔ قدرت نے جلد ہی ان کو ایک اور موقع

جنگ بلقان کی صورت میں مہیا کر دیا تاکہ وہ زور و شور سے انگریزوں کی مخالفت کر سکیں۔ خلافت عثمانیہ اور یورپی اقوام کی کش مکش تو روز اول سے ہی جاری تھی۔ سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانے میں ترکی پر اردگرد کی یورپی افواج نے حملہ کر دیا۔ فرانس نے تیونس پر حملہ کر دیا۔ اور بہت جلد اپنے قبضے میں لے لیا۔ حکومت برطانیہ نے مصر میں اپنی فوجیں اتار لیں۔ اس پر ترکی میں "نوجوان ترکوں" (Young Turks) نے سالونیکا میں "انجمن اتحاد و ترقی" (Committee of Union and Progress) کے نام سے ایک تنظیم بنائی اور منظم طور پر تحریک چلا کر سلطان عبدالحمید کو اس پر مجبور کیا کہ وہ آئینی حکومت کا اعلان کر دے۔ جلد ہی سلطان عبدالحمید کو جلا وطن کر کے ان کے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ابھی ترکی نے اندرونی کش مکش سے سانس بھی نہیں لی تھی کہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ ابھی جنگ طرابلس ختم نہ ہو پائی تھی کہ یونان، بلغاریہ، سرویا اور مانٹینگرو نے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ترکی پر مشترکہ حملہ کر دیا۔ یہ جنگ بلقان کہلائی گئی۔

ہندوستان بھر میں ان خبروں سے سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ حالات نے جوں ہی خطرناک صورت اختیار کی مسلمانوں کی بے چینی میں اور اضافہ ہوا۔ ترکوں کی امداد کے مختلف طریقوں اور صورتوں پر غور ہونے لگا۔

اس وقت جن تجاویز پر عمل کیا گیا ان میں سے ایک ترکی کو ایک طبی وفد بھیجنے کی بھی تھی۔ طبی وفد کی سربراہی ایک قوم پرست رہنما اور ملک کے نامور طبیب ڈاکٹر مختار احمد انصاری کر رہے تھے۔ ان کے ہمراہ ہندوستان سے جانے والے حضرات کی تعداد ۲۴ تھی۔ گو اراکین کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی تاہم یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ہر صوبے سے اراکین لے کر اسے ایک کل ہند وفد بنایا جائے۔ وفد میں پانچ ڈاکٹر تھے اور بقیہ انیس میدان جنگ سے زخمیوں کو لانے اور مرہم پٹی میں امداد دینے والے تھے۔ ہندوستان کا طبی وفد ستمبر ۱۹۱۲ء میں ترکی پہنچا۔ ۸ فروری ۱۹۱۳ء کو میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا۔ ترکوں نے نہایت گرم جوشی سے وفد کے اراکین کا استقبال کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس ایثار و جذبے کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ طبی وفد نے جس دلسوزی اور جانکاہی کے

ساتھ زخمیوں کی تیمارداری کی ترکوں کے دلوں پر اس کا بہت اثر ہوا۔ وفد کی خدمات کا اعتراف عام آدمی سے لے کر حکمران تک سب نے کیا۔

اللہ بخش یوسفی نے ان دنوں کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ کس طرح سرحد کے لوگوں کے دلوں میں اپنے بھائیوں کے لئے قدر و محبت پائی جاتی تھی۔ قوم پرست رہنما مسجد مہابت خان، مسجد قاسم علی خان اور اسلامیہ کلب ہال میں جلسے کرتے۔ ایک دفعہ اسلامیہ کلب ہال میں ایک جلسے کے دوران ایک عورت نے چندہ میں اپنے گود کے بچے کو نذر کر دیا۔ علی عباس بخاری نے اس عورت کی قربانی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس بچے کو نیلام کر دیا گیا۔ کافی رقم جمع ہو گئی۔ جس شخص نے بچے کو خریدا تھا اس نے نہ صرف وہ بچہ اس کی ماں کو واپس کیا بلکہ اسے اپنا بچہ تصور کرتے ہوئے اس کی پرورش کے لئے ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔

۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد پڑی۔ عازمین حج کو لے جانے والی کمپنی منہ مانگے کرائے وصول کرتی تھی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محل لکھنؤ والے اور مولانا شوکت علی نے ان کے مقابلے میں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد رکھی۔ ان کے اغراض و مقاصد میں عازمین حج کو ہر قسم کی سہولیات فراہم کرنا تھا۔ رکنیت کے لئے ایک روپیہ سالانہ چندہ دیا جاتا۔ اس تحریک نے صوبہ سرحد میں بھی اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی۔ بڑی تعداد میں لوگ اس کے رکن بنے۔ تحریک تو جلد ہی ختم ہو گئی لیکن اتنا کر گئی کہ عازمین حج کو جہاز ران کمپنیوں والے اب سہولتیں سستے داموں فراہم کرنے لگے۔ اس اثنا میں جنگ عظیم اول کے بادل چھانے لگے۔ صوبہ سرحد میں حکومت کا عتاب۔ انجمن خدام کعبہ کے خزانچی حکیم محمد امین پر گرا۔ حکومت ان سے انجمن کے اراکین کی تعداد، جمع شدہ رقم اور اس قسم کی دوسری معلومات چاہتی تھی۔

جنگ عظیم اول میں ترکی جرمنوں کا حلیف بنا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے صورت حال نہایت تکلیف دہ ہو گئی۔ ایک طرف ان کے ہم مذہب بھائی تھے تو دوسری طرف ان پر حکومت کرنے والے انگریز۔ حکومت برطانیہ بھی صورت حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ہر حال میں ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں

کی حمایت و امداد چاہتی تھی اس لیے جنگ کے شروع ہوتے ہی انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ جنگ کا نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے حکومت ترکیہ کے خلاف کوئی کارروائی انتقامی طور پر نہیں کی جائے گی۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے مقدس مقامات کی حرمت و تقدس میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا جائے گا۔ انگریزوں کو اس وقت بڑا ڈر صوبہ سرحد کے قبائل کا تھا جن کی نظریں امیر افغانستان امیر حبیب اللہ خان کی طرف لگی ہوئی تھی لیکن انگریزوں نے اپنی عیارانہ فطرت سے امیر حبیب اللہ خان کو ایسا شیشے میں اتار رکھا تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی انگریزوں کے خلاف کھڑا ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ جرمن ترک مشن جس کے پس منظر میں انور پاشا کا ذہن کام کر رہا تھا اور جس کے خیال میں قسطنطنیہ سے شروع ہونے والا جہاد ایران عبور کر کے افغانستان پہنچ جائے گا۔ اور وہاں سے امیر افغانستان اپنی افواج سے برطانوی ہند پر بھرپور حملہ کر دے گا بھی ناکام ہوا۔ انور پاشا نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دنیا بھر سے ہندوستانی انقلابیوں کو برلن میں جمع کیا۔ ہردیال کو کیلیفورنیا سے بلوایا اور مولانا برکت اللہ بھوپالی کو جاپان سے بلوایا۔ مشن نائیدر میئر کی کمان میں تھا۔ وفد میں ترکوں، ہندوستانی انقلابیوں کے علاوہ کچھ ایرانی بھی شامل تھے۔ کل اراکین کی تعداد اسی تھی۔ اگست ۱۹۱۵ء میں مشن کابل کے لئے روانہ ہوا۔

۲۴ اگست ۱۹۱۵ء کو مشن ہرات کے راستے افغانستان میں داخل ہوا۔ ان کے افغانستان آنے سے انگریزوں کو فکر لاحق ہوئی لیکن امیر حبیب اللہ خان نے انہیں تسلی دی کہ مشن کے آنے سے افغانستان اور انگریزوں کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ امیر کے سوائے عام افغانوں نے مشن کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ سب سے زیادہ سرگرمی شہزادہ امان اللہ خان نے دکھائی اگرچہ امیر حبیب اللہ خان برطانیہ سے دوستی ختم کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا تاہم کافی ٹال مٹول کے بعد عوامی دباؤ میں آکر اس نے مشن کے اراکین کو شرف باریابی بخشا۔ ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رو سے امیر افغانستان نے دس ملین پاؤنڈ سٹرلنگ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں اسلحہ بھی مانگا تھا۔ مشن کے سربراہ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ ۲۰ ہزار سے ایک لاکھ ترکی افواج کے افغانستان آنے پر ہی امیر جنگ کا اعلان کریں گے۔ اس معاہدے پر ۲۴ جنوری ۱۹۱۶ء کو دستخط ہوئے۔ نائیدر میئر واپس چلا گیا جبکہ مولانا برکت اللہ، راجہ مہندر پرتاب اور کاظم بے کابل میں ہی رہ گئے۔ حکومت

ترکیہ کے دو نمائندے خیری بیگ اور احمد آفندی علاقہ تیراہ آئے اور یہاں کے لوگوں کو انگریزوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے پر اُکسایا۔ لیکن حکومت کے حلیف قبائل نے ترک مشن کے اراکین کو علاقہ خالی کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے راجگال نامی جگہ میں پناہ لی۔ وہاں بھی ان کو نہ بیٹھنے دیا گیا اور وہ علاقہ چھوڑ کر ننگرہار گئے۔ تاہم کچھ ان کی موجودگی اور کچھ پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بہت سے سرحدی سپاہیوں نے ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا۔ بہت سوں کا کورٹ مارشل کر دیا گیا اور کئی کو گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ انگریزوں نے اپنے سعی بہترین کوشش کی کہ بہت سے نام نہاد علمأ سے ایسے فتوے لئے جائیں جن میں یہ کہا گیا ہو کہ انگریزوں کی امداد کرنا ضروری ہے۔ اس میں انگریز کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ علاوہ ازیں انہی دنوں انگریزوں نے پشاور سے اُردو اور انگریزی میں دو اخبار "ڈیلی نیوز" کے نام سے جاری کیے۔ ان اخبارات میں جنگ کی اور خصوصاً انگریزوں کی فتوحات کی خبریں ہوتیں۔ اخبار عام طور پر مفت تقسیم ہوتے۔ اور مدارس میں معلمین کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ طلبأ کو خبریں پڑھ کر سنایا کریں۔ صوبہ سرحد میں بھی گرفتاریاں ہوئیں۔ پنڈت امیر چند بموال، بخشی لال چند اور کشور رام وغیرہ کو گرفتار کیا گیا۔ حکومت حتی الوسع مسلمانوں پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

جنگ عظیم کے اختتام تک اتحادی افواج جرمنوں پر حاوی آگئیں۔ آہستہ آہستہ انگریزوں نے بھی نظریں پھیرنی شروع کیں۔ وہ وعدے وعید جو انہوں نے مسلمانوں سے بالخصوص اور ہندوستان کے عوام سے بالعموم کئے تھے۔ بھلانے لگے۔ جنگ عظیم میں انگریزوں کی مدد کرنے کے نتیجے میں ہندوستان کو یہ صلہ ملا کہ ملک سے سیاسی بے چینی ختم کرانے کے بہانے سیاسی کارکنوں کو دبانے کے لئے جسٹس رولٹ نامی ایک انگریز کی قیادت میں ایک کمیشن قائم کیا۔ جس نے سیاسی تحریکوں کو کچلنے کے لئے اپنی سفارشات مرتب کیں جن کو رولٹ بلوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جن کی ہندوستان بھر میں مخالفت ہوئی۔ وہی حکومت جو کل تک ہندوستانیوں کے سامنے امداد و اعانت کے لئے دست سوال پھیلا رہی تھی۔ اب زبان توپ و تفنگ سے باتیں کرنے لگی۔ قومی رہنماؤں نے لوگوں کو احتجاج کے لئے تیار کیا۔ ملک بھر میں ہڑتالیں ہوئیں اور سوگ کے دن منائے گئے۔ پنجاب میں حالات کی خرابی کو دیکھتے ہوئے مارشل لأ لگا دیا گیا۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں نہتے ہجوم پر ایک انگریز جنرل اوڈائر نے گولی چلادی۔ ایک ہزار چھ سو پچاس فائر کئے گئے جس نے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تین سو اناسی جانیں لیں لیکن اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

صوبہ سرحد میں پہلی سیاسی لہر اسی رولٹ ایکٹ نے پیدا کی۔ صوبے کے طول و عرض میں یہ تحریک پھیل گئی۔ پشاور میں بھی زبردست ہڑتال ہوئی۔ سارے شہر کا کاروبار بالکل بند تھا اور لوگ بلوں کے خلاف جلوس نکالتے رہے اور جلسے کرتے رہے۔ صوبہ سرحد کی غالباً یہ پہلی ہڑتال تھی جو سیاسی مقاصد کے پیش نظر کی گئی۔ اس وقت کے چوٹی کے رہنماؤں میں سے قاضی عبدالولی، حکیم عبدالجلیل، حکیم محمد اسلم سنجری، سردار ملاپ سنگھ، عمر بخش، آیا رام، ڈاکٹر سی سی گھوش، پنڈت امیر چند بموال اور سید عبداللہ شاہ وغیرہ شامل تھے۔ ان قابل ذکر رہنماؤں نے لوگوں پر واضح کیا کہ اگر یہ بل ہم پر ٹھونسا گیا تو ہم بالکل اپاہج ہو کر رہ جائیں گے۔ ہڑتال کامیاب رہی۔ اگلے دن فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ بارہ بجے شہر کے تمام دروازے بند کر کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل۔ ڈپٹی کمشنر کین اور سٹی مجسٹریٹ چارلس مٹکاف کی طرف سے شہریوں کو ان تمام رہنماؤں کو حوالے کرنے کا نوٹس دیا گیا۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ قاضی عبدالولی، آیا رام، حکیم محمد اسلم سنجری بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے باقی سب رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد عام کارکنوں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ان کو مختلف سزائیں سنائیں گئیں جو چھ ماہ سے دو سال تک کی تھیں۔ شہروں کی خبریں جب دیہات پہنچیں تو وہاں بھی ایک اضطراب پیدا ہوگیا۔ اپریل کی دس تاریخ کو اتمان زئی میں خان عبدالغفار (جو عقیدت کی بناء پر باچا خان کہلائے جاتے ہیں) نے ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا۔ جلسے میں حاضرین کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ خوانین میں یہ پہلا شخص تھا جس نے حکومت کے خلاف ایسا دلیرانہ قدم اٹھایا تھا۔

ابھی رولٹ ایکٹ کے ہنگامے ختم بھی نہ ہو پائے تھے کہ انگریزوں اور افغانستان کے درمیان سوئم جنگ افغانستان چھڑ گئی جس کو جنگ استقلال بھی کہا جاتا ہے۔

امیر عبدالرحمان (جو کہ ۱۹ ویں صدی کے آخری عشروں میں افغانستان کا حکمران تھا) کے زمانے سے انگریزوں نے افغانستان کی خارجہ پالیسی پر قبضہ کر لیا تھا ۱۸۹۳ء میں مشہور زمانہ ڈیورنڈ لائن کا معاہدہ کیا گیا۔

جس کی رو سے افغانستان کا کافی علاقہ انگریزوں کی عملداری میں شامل ہو گیا۔ امیر عبدالرحمان کا بیٹا امیر حبیب اللہ خان بھی انگریزوں کا حلیف اور حاشیہ بردار تھا۔ والیٔ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کو اس کے دورہ ہندوستان کے دوران اتنا مرعوب کیا گیا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران جبکہ ہندوستان میں برطانوی افواج بہت ہی کم رہ گئی تھیں۔ اسے حملہ کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ خود حملہ کرنا تو ایک طرف وہ تو انگریزوں کے دشمنوں کو افغانستان کی راہ سے ہندوستان پر حملہ کرنے بھی نہیں دے رہا تھا۔ اس کو ۱۹۱۹ء میں جلال آباد کے قریب قلعہ گوش میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے مرنے پر اس کا بیٹا امیر امان اللہ خان افغانستان کا بادشاہ بنا۔ امان اللہ خان شروع سے ہی برطانوی استعمار کا مخالف تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی انگریزوں کے خلاف اپریل ۱۹۱۹ء میں کابل میں منعقدہ دربار میں اعلان جہاد کیا۔ لوگوں کی اکثریت تو پہلے ہی انگریزوں کے خلاف تھی اب ان کو نئے اولعزم امیر امان اللہ کی صورت میں ایک رہنما مل گیا سب انگریزوں کے خلاف لڑنے پر راضی ہو گئے۔ ۳ر مئی ۱۹۱۹ء کو جنگ شروع ہوئی۔ افغانستان کی طرف سے باقاعدہ طور پر ۹ر مئی کو اعلان جنگ کر دیا گیا بہت جلد جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ ٹل کے محاذ پر افغان جرنیل نادر خان نے پیش قدمی کی جب کہ جلال آباد میں افغان فوج کو نقصان پہنچایا گیا۔ ۳ر جون ۱۹۱۹ء کو فریقین جنگ بندی پر راضی ہو گئے۔ دونوں مملکتوں نے اپنے اپنے فاتح ہونے کا اعلان کیا۔ افغانستان کی طرف سے آزاد افغانستان کا ایک وفد امان اللہ خان کے برادر نسبتی علی احمد جان کی قیادت میں ہندوستان بھیجا گیا۔ ۲۴ر جولائی ۱۹۱۹ء کو وفد ہندوستانی سرحد میں داخل ہوا۔ پشاور سے وفد کے اراکین کو راولپنڈی پہنچایا گیا جہاں برطانوی وفد کے ساتھ جو کہ سر ہملٹن گرانٹ کی زیر قیادت تھا کے ساتھ افغان وفد کی بات چیت شروع ہوئی۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۱۹ء سے شروع ہونے والی گفتگو ۸ر اگست ۱۹۱۹ء تک جاری رہی۔ ۸ر اگست کو سر ہملٹن گرانٹ اور علی احمد جان نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے ڈیورنڈ لائن اینگلو افغان سرحد تسلیم کی گئی۔ افغانستان سرکاری حیثیت میں اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں آزاد ہو گیا۔

ابھی جنگ استقلال ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ایک اور مسئلہ درپیش ہوا۔ جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے برطانوی حکومت اور ان کے حلیفوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مقامات مقدسہ

کی حرمت بحال رکھیں گے اور خلافت عثمانیہ کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کریں گے۔ لیکن جنگ کے خاتمے پر انہوں نے معاہدہ سیورے کے تحت خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے شروع کئے۔ ہندوستان بھر کے مسلمان تڑپ اٹھے۔ ان کا ساتھ اہل ہنود نے بھی بھرپور دیا۔ سارے ملک میں خلافت کانفرنسیں ہوئیں اور مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان بھی گیا لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔ انگریز جو کہ فتح کے نشے میں چور تھے۔ اپنی رعایا کی بات کہاں سننے والے تھے۔ مسلمانوں کے لئے جب مخالف طاقت کے خلاف جارحانہ اقدامات کی طاقت نہ رہی تو لکھنؤ سے ایک آواز اٹھی کہ اس ملک سے اب ہجرت کر لینی چاہیئے۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اس آواز کے ساتھ اپنی آواز ملائی۔ مذہب کے نام پر ہجرت شروع ہوئی سب سے زیادہ اس کا اثر باشندگان سرحد نے لیا۔ گو اس علاقے میں کسی منظم جماعت یا علمائے کرام نے یہ فتویٰ نہیں دیا تھا پھر بھی ہندوستانی علماء کی عزت و وقعت کے پیش نظر اس حکم کو حکم شریعت اسلامیہ تسلیم کر لیا گیا۔ ساتھ ہی یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمان جائیں تو کہاں جائیں۔ جلد ہی ان کی یہ مشکل حل ہو گئی۔ برادر پڑوسی مسلمان ملک کے امیر امان اللہ خان نے یہ اعلان کیا جس میں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ پر افسوس کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان ادھر سے افغانستان آنا چاہیں تو افغانستان کی حکومت نہ صرف ان کو پناہ دے گی بلکہ ان کی ہر ممکن امداد بھی کرے گی اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ قافلے کے قافلے افغانستان جانے کے لئے پشاور میں جمع ہونا شروع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسولؐ کی خوشی کی خاطر والدین سے ان کی اولادیں بچھڑ گئیں۔ خاوندوں سے بیویاں اور بیویوں سے ان کے خاوند بچھڑ گئے۔ ایسے نوجوان بھی تھے جو اپنی منگیتروں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے سڑکوں پر ہی نکاح پڑھے۔ تحفظ اسلام کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ گھر بار لٹ گئے، فصلیں برباد ہو گئیں۔ عزیزوں اور رشتہ داروں سے اس امید پر لوگ جدا ہو رہے تھے کہ وہ بھی بہت جلد ان سے مل لیں گے۔ ہندوستان دارالحرب قرار دے دیا گیا تھا اور مسلمان دارالسلام کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ ابتدا میں چھوٹے چھوٹے قافلے تھے بعد میں ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔ افغانستان جانے کا بڑا راستہ چونکہ پشاور سے ہو کر جاتا تھا اس لئے مہاجرین کا سارا زور پشاور پر ہی تھا۔ پشاور کے لوگوں نے ایک

ہجرت کمیٹی بنائی۔ کمیٹی میں حاجی جان محمد، علی گل خان، حکیم قطب عالم اور بقیہ تمام مسلم اور غیر مسلم قومی کارکن شامل تھے۔ اس موقعہ پر پشاور کے لوگوں کی قربانی قابل ذکر ہے۔ پشتونوں کی مہمان نوازی تو ویسے بھی مشہور ہے اور اب جب کہ سب لوگ مذہب کے نام پر مال اسباب چھوڑ کر بے سروسامان جا رہے تھے۔ تو لوگ کیوں نہ ان کی استطاعت سے بڑھ کر امداد کرتے۔ مالداروں نے پیسے دیے جب کہ ہجرت کمیٹی کے رضا کاروں نے ارد گرد کے دیہاتوں کے دورے کئے اور وہاں سے مہاجرین کے لیئے اشیائے خوردنی اور مویشی لائے۔ قربانی کا جذبہ یہاں تک تھا کہ تانگے بان بھی سواریوں کو ریلوے سٹیشن سے مسافروں کو ان کے جائے قیام تک مفت پہنچاتے رہے۔

شروع شروع میں حکام نے ہجرت پر جانے والوں کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن بعد میں لوگوں کے جذبات بھانپتے ہوئے انہوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ ایک تو مملکت افغانستان کی معیشت پر بے اندازہ بوجھ ڈالا گیا اور دوسرا تمام سرگرم کارکنوں سے ان کی جان چھوٹ گئی۔ قافلے کے قافلے افغانستان کی سمت رواں دواں تھے اور اونچی اور پرجوش آوازوں سے یہ شعر گاتے تھے:

؎ برباد ہوں پرواہ نہیں
ناشاد ہوں پرواہ نہیں
اے دوستو جو کچھ بھی ہو کابل چلو کابل چلو

اور

برادران ھنود! تم کو رہے مبارک وطن کی راحت
غریب مسلم، شکستہ خاطر وطن کی الفت لٹا رہے ہیں
امیر صاحب بلا رہے ہیں! امیر صاحب بلا رہے ہیں۔

پشاور سے لے کر افغانستان کی سرحد تک خوراک اور پانی کا جا بجا انتظام کیا گیا ہے۔ مہاجرین کو تو یہ یقین تھا کہ جس طرح پشاور میں ان کی آؤ بھگت ہوئی ہے۔

ویسی ہی افغانستان میں بھی ہوگی۔ ابتدا میں کابل میں مہاجرین کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ بد انتظامی بھی پیدا ہونے لگی۔ ان کے ہمراہ حکومت برطانیہ کے چند زر خرید غلام اور جاسوس بھی ہندوستان سے گئے تھے۔ انہوں نے وہاں جاکر اپنا کام شروع کیا۔ مہاجرین کو انہوں نے حکومت افغانستان کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کو جبل السراج بھیجا گیا۔ انہوں نے اسلحہ اور بارود طلب کیا۔ نیز حکومت افغانستان سے انگریز کے خلاف جنگ میں مدد دینے کا مطالبہ کیا۔ افغانستان کچھ عرصہ قبل ہی انگریز کے ساتھ ایک جنگ لڑ چکا تھا اور اتنی جلدی دوسری جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ امیر امان اللہ خان نے اپنے وعدے کے مطابق مہاجرین کو افغانی ترکستان میں قابل کاشت زمینیں دیں۔ لیکن مہاجرین میں تو بددلی پھیلنا شروع ہو چکی تھی۔ وہ کئی گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ تو وہیں افغانستان میں رہ گئے۔ کچھ لوگ روس اور ترکی گئے۔ جبکہ اکثریت نے ہندوستان لوٹنے کا ارادہ کیا۔ واپسی کا سفر بہت المناک تھا۔ لوگ بے سروسامانی کی حالت میں ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ آج بھی کابل اور پشاور کے درمیان بہت سی قبریں ان تکالیف کی شاہد ہیں جو مہاجرین پر واپسی کے سفر کے دوران گزری ہیں۔ واپس آنے پر ان کے ساتھ اور برا برتاؤ کیا گیا ان پر کفر کے فتوے لگے۔ ان کو بزدل اور کم ہمت جانا گیا۔ قلاش تو وہ پہلے ہی ہو چکے تھے۔ اب حکومت کی نظروں میں بھی بدنام ہو گئے۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی کوششوں سے سرکاری ملازمین کو دوبارہ ملازمتوں پر بحال کیا گیا۔ اکثریت کی جائدادیں بھی ان کو واپس لوٹا دی گئیں۔ یوں ہجرت ختم ہوئی لیکن اپنے پیچھے قربانیوں اور کٹھن وقت میں مشکلات کا سامنا کرنے کی داستانیں چھوڑ گئی۔ لیکن اس ساری تحریک کے دوران بڑی عجیب بات دیکھنے میں یہ آئی کہ جن علمائے کرام نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں بیٹھ کر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا۔ ان میں سے کسی کو اس دارالحرب سے دارالسلام جانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اگر قربانیوں کی ایک نہ مٹنے والی داستان چھوڑی بھی تو وہ باشندگان سرحد نے جن کے دلوں میں عظمت اسلام پر مکمل یقین پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔

ہجرت کا خاتمہ یوں تو بے حساب تباہی و بربادی کی صورت میں ہوا لیکن ہر قربانی کے بعد

اس کا پھل بھی ملتا ہے۔ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہو گیا۔ اب ان کے لئے مذہب اور قوم کے لئے قربانی دینا کوئی بڑی بات نہ رہی۔ ہجرت پر جانے والے بہت سے قومی رہنماؤں میں باچا خان بھی تھے۔ باچا خان ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ تحصیل چارسدہ کے ایک گاؤں اتمان زئی میں بہرام خان کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد والد نے بیٹے کو فوج میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بیٹے کے مزاج کو وہ نوکری نہیں بھائی اور نوکری کو خیرباد کہا۔ پھر دیوبند چلے گئے اور قابلِ قدر و ذی عزت علمائے کرام کے ساتھ وقت گزارا۔ وطن واپس آکر انقلابی رہنماؤں کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ جن میں سرفہرست حاجی فضل واحد ترنگ زئی تھے۔ حاجی صاحب مولوی نجم الدین اخوندزادہ المعروف بہ بڈے ملا صاحب کے مرید تھے اور ساری زندگی انگریز دشمنی میں بسر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ باچا خان پہلی بار رولٹ ایکٹ کے ہنگامے میں منظرِ عام پر آئے۔ آپ نے اتمان زئی ہی میں ایک جلسے کا اہتمام کیا جس میں شامل ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس کے بعد ہجرت افغانستان کے دنوں میں ایک قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے کابل گئے۔ وہاں امیر امان اللہ خان کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی۔ امان اللہ پشتون ہونے کے باوجود پشتو زبان کو نظر انداز کر رہا تھا۔ اس پر باچا خان نے ان کو کہا کہ پشتونوں کے وطن میں پشتو کا یہ حشر دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ بادشاہ نے پشتو کو ترقی دینے کا وعدہ کیا۔ ہجرت سے واپسی پر باچا خان اصلاحی کاموں میں جت گئے۔

باچا خان نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ مل کر پشتونوں کے درمیان آپس کے جھگڑوں کو ختم کرانے کے لئے ایک اصلاحی تنظیم انجمن الاصلاح الافاغنہ کی بنیاد رکھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی قوم کو غلامی سے نفرت کا درس بھی دیا۔ حاجی صاحب ترنگ زئی کے ہمراہ آپ نے پشتونوں کی علمی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے آزاد سکولوں کی بنیاد رکھی۔ آپ کے ساتھ اس کارِ نیک میں مدد دینے والوں میں سے قاضی عطاء اللہ، میاں عبداللہ شاہ، میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان اکبر، محمد اکبر خادم، محمد عباس خان، تاج محمد خان، حاجی عبدالغفار وغیرہ بھی شامل تھے۔ بڑی محنت اور لگن سے آزاد سکول شروع کئے گئے۔ اس سلسلے میں اور قومی کارکنوں کی قربانیاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ بنوں کے امیر مختار خان نے اپنے دو فرزند

امیر ممتاز اور مقصود جان اس مقصد کے لئے وقف کر دیئے۔ مقصود جان آزاد ہائی سکول اتمان زئی کا پہلا ہیڈ ماسٹر تھا۔ قوم سے غلط رسموں کو مٹانے کے لئے اور ان میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لئے باچا خان اور ان کے رفیقوں نے صوبے بھر میں دیہاتوں کے دورے کئے۔ انہوں نے لوگوں سے تفصیلی گفتگو کی اور ان میں زندہ رہنے کی آرزو بیدار کرنے کی حتی الوسع کوششیں کیں۔ انگریز یہ کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ پہلے تو دھمکیوں سے کام چلانے کی کوشش کی لیکن جب ان سے کام نہ بنا تو پھر دولت آزمانی چاہی۔ آزاد سکولوں کے اساتذہ کو زیادہ پیسوں کا لالچ دیا۔ لیکن ان لوگوں کا تو بے لوث و لالچ جذبہ تھا اس لئے دنیا کی کوئی طاقت ان کو خرید نہیں سکتی تھی۔ جب اس سے کام نہ بنا تو باچا خان قید کئے گئے اور آزاد مدرسے خلاف قانون قرار دیئے گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب صوبے کے لوگوں میں بھی سیاسی شعور پیدا ہو رہا تھا۔ جب اپنے صوبے میں انہیں اخبار نہیں ملے تو انہوں نے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے خفیہ طور پر اخبارات و رسائل منگوانے شروع کئے۔ گروپوں کی شکل میں بیٹھ کر اخبارات پڑھے اور سنائے جاتے۔ لوگوں میں سیاسی بیداری بڑھنی شروع ہوئی۔ باچا خان پشتون قوم کی ترقی و سربلندی کے لئے ایک خالص اسلامی تحریک چلانا چاہتے تھے۔ کیونکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ پشتون زندگی کے ہر شعبہ میں باقیماندہ ہندوستان سے بہت پسماندہ تھے۔ تعلیمی ترقی پر زور دینے کا یہی مقصد تھا کہ جب تک علم کی روشنی نہیں پھیلے گی آپس کے یہ جھگڑے جاری رہیں گے۔ نوجوانوں کی ایک منظم جماعت انغان یوتھ لیگ کے نام سے بنائی گئی اور اس کے لئے باقاعدہ رضا کار بھرتی کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ ان رضا کاروں کی تنظیم کا کوئی علیحدہ نام بھی ہونا چاہیئے چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد اس تنظیم کا نام خدائی خدمت گار رکھا گیا۔

خدائی خدمت گار تنظیم کے قیام کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ پریڈ لازمی ہو گی۔ کھدر کے کپڑے بطور یونیفارم استعمال کئے جائیں گے۔ اور یہی وہ کھدر کا کپڑا تھا جس نے خدائی خدمت گاروں کو انگریزوں کی نظر میں سرخپوش بنا دیا اور جس کے ڈانڈے انہوں نے روس کے بالشویکوں کے ساتھ ملائے باچا خان اور ان کے ساتھیوں نے دیہاتوں کے دورے کئے اور لوگوں کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں رضا کاروں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی۔ سوئی ہوئی پشتون قوم کو خوابِ غفلت سے جگانا خدائی خدمت گاروں کا اولین مقصد تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو آزادی کی قدر اور اہمیت سمجھانے کی بھی کوشش کی۔ اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب ہوئے۔ نوجوان بطور خاص بڑی تعداد میں تحریک میں شامل ہونے لگے۔ پہلے تو یہ تحریک ایک خاص علاقے اور صرف مسلمانوں کے لئے محدود تھی لیکن جلد ہی رنگ و نسل و مذہب کا امتیاز کئے بغیر تمام مذاہب کے پیروکار اس میں شامل ہونے لگے۔ انگریز اس تحریک کو کہاں برداشت کر سکتے تھے؟ پہلے تو انہوں نے آزاد سکولوں کے اساتذہ کو روپے کا لالچ دیا۔ جب وہ نہ بکے تو ان کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔ باچا خان گرفتار کئے گئے۔ لیکن لوگ خوابِ غفلت سے بیدار ہونا شروع ہو گئے تھے۔

آدھر ینچے ہندوستان میں بھی آزادی کی تحریک نے ایک نیا رخ بدلا۔ پہلے تو آل انڈیا نیشنل کانگرس نوآبادیاتی طرزِ حکومت کی نمائندہ تھی لیکن قوم کے جذبات کو بھانپتے ہوئے ۲۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کی رات ساڑھے بارہ بجے دریائے راوی کے کنارے لاہور شہر میں منعقدہ اجلاس آل انڈیا نیشنل کانگرس میں جواہر لعل نہرو نے مکمل آزادی کا جھنڈا بلند کر دیا۔ انہوں نے ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دینے کا مطالبہ کیا۔ لوگوں نے انگریزوں سے نفرت کا اظہار کیا۔ کانگرس کے اس فیصلے کو ہندوستان بھر میں سراہا گیا۔ قومی تحریک نے ایک نیا رُخ لیا۔ انہی دنوں کانگرس کے سنگ سنگ ایک اور جماعت سامنے آتی ہے جس کا نام نوجوان بھارت سبھا تھا۔ اکثریت اس میں ایسے نوجوانوں کی تھی جو ہندوستان کی آزادی کا واحد حل تشدد کے ذریعے ہی سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں انگریزوں کو ختم کر کے ہی ہند کو آزاد کرایا جا سکتا تھا۔ جماعت کے اراکین میں ہندو مسلم سکھ یکساں طور سے شریک تھے۔ ان لوگوں کو کانگرس کی عدم تشدد کی پالیسی بالکل نہیں بھاتی تھی۔ تاہم ہندوستان کو غیروں سے آزاد کرانا دونوں کا مقصد اولین تھا۔ نوجوان بھارت سبھا کے اکثر اراکین کانگرس کے بھی رکن تھے۔ پشاور کہاں پیچھے رہ سکتا تھا۔ ویسے بھی سرزمین پشتون تو انقلابیوں کی آماجگاہ تھی۔ چند نوجوان انقلابیوں نے جن میں سرفہرست مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، صنوبر حسین، فضل الٰہی، عبدالرحمٰن ریا، عبدالعزیز خوشحال باش، رام سرن نگینہ

عبدالغفور آتش، اللہ بخش برقی اور بخشی فقیر چند وغیرہ تھے، نے ہندوستان کے انقلابیوں کی پیروی کرتے ہوئے یہاں "نوجوانان سرحد" کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ چند ہی دنوں میں اس کی تنظیم سینکڑوں تک جا پہنچی۔ اس کی شاخیں پشاور کے علاوہ ہزارہ اور بنوں میں بھی قائم کر دی گئیں۔ نوجوان بھارت سبھا کے اراکین نے انگریزوں کے خلاف عملی اقدام کے لئے قدم بڑھایا۔ وائسرائے ہند کی ٹرین کو بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی۔ چند بینک لوٹے گئے اور پنجاب میں تو سانڈرس نامی ایک انگریز افسر کو قتل بھی کیا گیا۔ تمام ملک میں انگریز افسروں پر قاتلانہ حملے روزانہ کا معمول بن گئے۔ انقلابیوں نے ہندوستان بھر میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ سارے ملک میں حکمرانوں کے لئے خوف و دہشت کی فضا پیدا ہو گئی سنٹرل اسمبلی ہال میں اجلاس کے دوران بم پھینکا گیا۔ پولیس نے چند انقلابیوں کو موقع پر پکڑا۔ تفتیش کی گئی تو تمام واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی گئیں۔ نوجوان بھارت سبھا کا مقبول و مشہور رہنما بھگت سنگھ معہ اپنے چند دوستوں کے پکڑا گیا۔ ان پر لاہور سازش کیس کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوا۔ لاہور سازش کیس کے علاوہ میرٹھ اور کاکوری سازش کیس بھی چلائے گئے۔ اکثر انقلابیوں کو پھانسی دی گئی۔ بھگت سنگھ کو راج گرو، سکھدیو، اور دت کے ہمراہ ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کی رات کو پھانسی دی گئی۔ پشتون خواہ قربانیوں میں ہندوستان سے کہاں پیچھے رہ سکتا تھا۔ غلہ ڈھیر ضلع مردان کے ایک نوجوان ہری کشن نے ۲۳ دسمبر ۱۹۳۰ء کو پنجاب یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر پنجاب کے گورنر سر جیفری پر قاتلانہ حملہ کیا۔ سر جیفری کی قسمت اچھی تھی گولی اس کے ہاتھ پر لگی۔ اس کے ساتھ کھڑا ایک اور پولیس افسر مارا گیا۔ ہری کشن کو موقع پر ہی گرفتار کیا گیا۔ انجام اس کا بھی اس کے دوسرے انقلابی ساتھیوں کی طرح پھانسی پانا ہی تھا۔

بات پھر لے آتا ہوں گاندھی جی کی سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کی طرف۔ گاندھی جی نے نمک کے قانون کو توڑنے کا فیصلہ کیا۔ سمندر کے کنارے ڈانڈی نامی جگہ نمک سازی کے لئے چنی گئی وہاں ان کو گرفتار کیا گیا۔ ان کی گرفتاری کے بعد روزانہ پانچ سات کارکن نمک بناتے اور حکومت انہیں گرفتار کرتی۔ سول نافرمانی کی ابتدا ہو گئی۔ باقیماندہ ہندوستان کی طرح پشاور میں بھی نمک کے قانون کو

توڑا گیا۔ پھر سے شورہ مٹی لاکر نمک بنانے کا کام شروع ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں پاؤ ڈیڑھ پاؤ نمک بنا کر اسے نیلام کیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی پڑیاں سوا ڈیڑھ سو روپے میں نیلام ہوگئیں۔ سرحد کی حکومت نے اس نافرمانی پر کانگریسی رضاکاروں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت غور و فکر کے بعد رضاکاروں نے فیصلہ کیا کہ شراب خانوں پر پکٹنگ کی جائے۔ اس مقصد کے لئے باچا خان اور ان کے ساتھیوں کو پشاور آنے کی دعوت دی گئی۔ پکٹنگ کے لئے ۲۳ اپریل کا دن چنا گیا۔ ۲۲ اور ۲۳ اپریل کی درمیانی شب کو کانگرس کے سرگرم اراکین سید لعل بادشاہ، مولوی عبدالرحیم، علی گل خان، رحیم بخش، خان میر ہلالی لالہ پیڑا خان، عبدالرحمٰن ریا، اچرج رام گھنڈی کو گرفتار کیا گیا۔ اللہ بخش برقی اور غلام ربانی سیٹھی رات کو گرفتاری سے بچ گئے تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ وہ دن کے وقت گرفتاری دیں گے۔

۲۳ اپریل کا خونی سورج بقیہ دنوں کی طرح طلوع ہوا۔ باچا خان کو میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان اکبر، سرفراز خان اور حاجی شاہنواز خان کے ہمراہ پشاور آتے ہوئے نخقئی تھانے کے قریب گرفتار کرکے واپس چارسدہ لے جایا گیا۔ کانگریس کے اراکین کی گرفتاری پر پشاور شہر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ گرفتار شدہ اراکین کو قلعہ بالاحصار میں رکھا گیا۔ اللہ بخش برقی اور غلام سیٹھی کو دن کے وقت کانگرس کے دفتر سے گرفتار کرکے تھانہ کابلی لے جایا گیا۔ اس اثنا میں کافی ہجوم جمع ہوگیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان کے محبوب رہنماؤں کی ہتھکڑیاں اتاری جائیں۔ گرفتار شدہ اراکین خود چل کر تھانے جانے کو راضی ہوگئے۔ دونوں رضاکار آگے آگے اور کم از کم بیس ہزار افراد کا ہجوم ان کے ساتھ ساتھ کابلی تھانے کی طرف رواں دواں تھا۔ دونوں رہنما تھانے کے اندر چلے گئے اور ہجوم باہر ہی کھڑا رہا۔ ہجوم میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا ہجوم رضاکاروں کے حق میں ان کی رہائی کے لئے نعرے لگا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے بے قابو ہوکر تھانے پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ پولیس نے گھبرا کر ڈپٹی کمشنر کو فون کیا کہ ان کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ حکومت کی طرف سے بھیجی گئی پہلی آرمڈ کار نہایت تیزی سے کابلی دروازے میں داخل ہوئی اور ایک نوجوان لالہ دسوندھی رام کو کچلتی ہوئی آگے بڑھی لوگوں کا غیض و غضب انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اتنے میں ایک انگریز فوجی موٹر سائیکل پر سوار آتا دکھائی دیا۔ ہجوم میں سے ایک شخص نے کلہاڑی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ ایک نوجوان نے

گاڑی کی پٹرول کی ٹنکی کو آگ لگا دی۔ حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ انگریز اپنے غلاموں کی یہ حرکت کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ لوگوں نے کچھ دیر تک تو مقابلہ کیا لیکن آرمڈ کاروں اور پیدل کا مقابلہ کہاں تک ہو سکتا تھا۔ لوگوں نے محفوظ مقامات کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ لیکن ان کو کہیں پناہ نہ ملی۔ دن کے گیارہ بجے سے تین بجے تک متواتر فائرنگ ہوتی رہی۔ ہر طرف لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اور خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ بازار قصہ خوانی کسی میدان جنگ کا سا سماں پیش کر رہا تھا۔ گولیوں سے مرنے والوں کی تعداد چار سو سے تجاوز کر گئی۔ زخمیوں کی تعداد تو ہزاروں تک جا پہنچی تھی۔ اکثر لاشیں حکومت نے غائب کروا دیں۔ کچھ لاشیں ہسپتال میں دفن کی گئیں اور تقریباً تیس کے قریب شہداء کی لاشیں اردگرد کے دیہات والے اٹھا کر لے گئے۔ مسلمانوں کی لاشیں مختلف مسجدوں اور خانقاہوں میں دفنا دی گئیں جبکہ بعض غیر مسلموں کی لاشیں جلا دی گئیں۔ مارشل لاء نافذ کر کے شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔

شہدائے اپریل ۱۹۳۰ء کا ذکر گھڑوالی فوج کے ذکر کے بغیر نامکمل ہو گا۔ گھڑوالی فوج کے جیالوں نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کیا۔ اس پر ان سب کا کورٹ مارشل کر کے انہیں مختلف سزائیں دے کر بمبئی اور پھر بمبئی سے دس سے بیس سال تک کی قید کی سزا دے کر مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔

اس واقعہ پر لوگوں کے دل رنج و غم سے بھر گئے۔ شاعروں نے اس پر اپنے اپنے انداز میں شعر کہے۔ مولانا ظفر علی خان جو اس زمانے میں گجرات جیل میں محبوس تھے، نے قصہ خوانی کے حادثہ فاجعہ کو اس انداز میں بیان کیا ہے:

ملک الموت کو خاطر میں نہ لانے والے
گولیاں تانے ہوئے سینوں میں کھانے والے

قبر تک صبر کو سہتے ہوئے جانے والے
صبر کا معجزہ دنیا کو دکھانے والے

رنگ اسلام کا محفل میں جمانے والے
اپنے ہی خون شہادت میں نہانے والے

اپنے اقبال کا نقارہ بجانے والے
ناچ طاغوت کو تگنی کا نچانے والے

دل کی بستی کو محبت سے بسانے والے
شان ایثار زمانے کو دکھانے والے

کشور ہند کو آزاد کرانے والے
نام مشرق سے غلامی کا مٹانے والے

جانتے بھی ہو کہ کس خاک سے اٹھی ہے یہ قوم
جس کے گن گاتے ہیں اور گائیں گے گانے والے

فخر ہے صوبۂ سرحد کو کہ اس کے ذرّے
ہیں خمیر اس کی شجاعت کا اٹھانے والے

دنگ ہیں دیکھ کے اس قوم کے یہ رنگ یہ ڈھنگ
نارمن بولٹن[1] اور اس کے گھرانے والے

اس کے فوراً بعد انگریزی استعمار نے ٹکر (مردان) اور ہاتھی خیل (بنوں) میں بھی گولی چلا دی۔ بے شمار قومی کارکن اور خدائی خدمت گار شہید اور زخمی ہوئے۔

انگریز کے ان مظالم نے صوبہ بھر میں ایک آگ لگا دی۔ خدائی خدمت گار اور کانگرسی رضا کار پورے صوبے میں پھیل گئے۔ انہوں نے انگریزوں کے مظالم کو اس انداز میں پیش کرنا شروع کیا کہ لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوگئیں۔ لوگ ان پر کئے گئے مظالم سُن سُن کر روتے۔ انہی دنوں فخر قوم میاں صاحب حمید گل کی کوششوں سے زیارت کاکا صاحبؒ میں ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ اور لوگوں کے علاوہ جلسے میں علاقہ غیر سے آئی ہوئی آفریدی قوم نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ بھگت

[1] نارمن بولٹن اس وقت صوبہ سرحد کا چیف کمشنر تھا۔

رام تلوار کے مطابق اس جلسے میں آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں فیصلہ کیا گیا۔ آفریدیوں نے مہمندوں کے ساتھ مل کر یہ طے کیا کہ وہ پشاور پر حملہ کر دیں گے اور مہمند شبقدر کے راستے پشاور پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ ان کی یہ متحدہ قوت انگریزوں کو اٹک کے اس پار بھگا دے گی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح انگریز کے نمک خواروں نے یہ خبر حکومت تک پہنچا دی۔ مہمندوں کے شبقدر پر حملے کے وقت انگریز کے یہ وفادار انگریز دوستی میں اس حد تک بڑھ گئے کہ ان حملہ آور مہمندوں کو دھمکی دے دی گئی کہ اگر وہ شبقدر کے راستے آئے تو شبقدر کے لوگ ان کا مقابلہ کریں گے۔ مہمندوں نے جب یہ حال دیکھا تو واپس لوٹنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی کیونکہ جن لوگوں کے لئے وہ جہاد کرنا چاہتے تھے وہ لوگ خود ہی اس کی مخالفت کر رہے تھے تو پھر اُن کے آنے کا فائدہ ہی کیا۔ آفریدیوں نے پروگرام کے مطابق وزیر باغ کی سمت سے پشاور پر حملہ کیا۔ انہوں نے شہر کا محاصرہ کیا جو زیادہ دن تک نہیں رہ سکا۔ لڑائی میں کافی آفریدی شہید ہوئے لیکن آخر کار پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے بعد تو خدائی خدمت گاروں پر ظلم و ستم کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس نے لوگوں کو منگولوں اور مغلوں کے مظالم کی یاد بھلا دی۔ ان کی کھڑی فصلیں جلا دی گئیں۔ ان کی بے عزتیاں کی گئیں۔ انہیں ننگا کر کے مارا پیٹا گیا۔ ان کے سامنے ان کی باپردہ مستورات کو ننگا کر کے پھرایا گیا جو کہ ان کے لئے موت سے بھی بدتر سزا تھی۔ ان سب مظالم کا نتیجہ کیا نکلا؟ کیا وہ لوگ ہمت ہار بیٹھے یا انہوں نے تحریک چھوڑ دی؟ نہیں بالکل نہیں۔ حکومت جتنی ان پر سختی کرتی گئی اتنی ہی ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ وہی خدائی خدمت گار جن کی تعداد ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء سے پہلے سینکڑوں میں تھی چند دنوں کے اندر ہی ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔ ان کے تمام قابل ذکر رہنما جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ باچا خان کو گجرات جیل بھیجا گیا جہاں اس وقت کے تمام اہم قوم پرست اور کانگریسی رہنما بند تھے۔ ان میں قابل ذکر مولانا کفایت اللہ صاحب، ڈاکٹر انصاری، مولانا احمد سعید، مولانا ظفر علی خان، عطاء اللہ شاہ بخاری، شنکر لال اور سنت رام جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ یہیں آپ کی زندگی میں وہ عظیم انقلاب آیا جس نے آگے چل کر آپ کو مہاتما گاندھی کا پیروکار بنا دیا اور پیروکار بھی پھر ایسا جس نے آگے چل کر فلسفہ

عدم تشدد پر اس حد تک عمل کیا کہ اپنے لئے گاندھی کے نام کی مناسبت سے سرحدی گاندھی کا لقب پایا۔
باچا خان گجرات جیل میں تھے اور ان کے صوبے میں ظلم و تشدد کا دور دورہ تھا۔ انگریز تحریک کو کچلنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی اور وائسرائے ہند لارڈ اروِن میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ لیکن باچا خان اور خدائی خدمت گار بدستور جیلوں میں پڑے ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے جب ان کی رہائی کا مطالبہ کیا تو وائسرائے نے کہا کہ ان لوگوں کا تو کانگرس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ان کی رہائی معاہدے کی رو سے ناقابلِ عمل ہے۔ دراصل انگریز خدائی خدمت گاروں کو روس کے بالشویکوں کے ایجنٹ کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ جب نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے فوراً باچا خان کو پیغام بھیجا کہ جیسے بھی ہو اپنا تعلق ہندوستان کی بڑی سیاسی پارٹیوں میں سے کسی کے ساتھ جوڑو ورنہ انگریز تمہیں ختم کرنے کے درپے ہے۔ میاں جعفر شاہ اور میاں عبداللہ شاہ جواب تک گرفتاری سے بچے ہوئے تھے، نے گجرات جیل میں باچا خان کو صاحبزادہ صاحب کا یہ پیغام دیا۔ صلاح مشورے کے بعد یہ طے پایا گیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہیئے۔ ان کو پیغام بھیجا گیا لیکن جواب نفی میں ملا کیونکہ مسلم لیگ کی نظر میں انگریزوں سے زیادہ ان کے دشمن ہندو تھے۔ جبکہ باچا خان اور ان کی جماعت انگریزوں کے خلاف تھی۔ اس لئے مسلم لیگیوں کا خدائی خدمت گاروں کے ساتھ اتحاد کرنا گوارہ لوگ، ان کو اپنے پاس رکھنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے مسلم لیگ سے مایوس ہو کر آل انڈیا نیشنل کانگرس کو اپنے نمائندے بھیجے گئے۔ ان کا مقصد بھی انگریزوں کے چنگل سے ہند کو آزاد کرانا تھا اور خدائی خدمت گار بھی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے لہٰذا کانگرس نے انہیں گلے لگایا۔ گاندھی جی کو جیسے ہی خدائی خدمت گاروں کے کانگرس سے الحاق کی خبریں ملیں وہ فوراً جا کر وائسرائے سے ملے اور انہیں کہا کہ اب یہ لوگ کانگرس میں شامل ہو گئے ہیں لہٰذا انہیں بھی رہا کرایا جائے۔ ۱۰ مارچ کو خدائی خدمت گاروں کو رہائی ملی۔

لندن میں ہندوستانی رہنماؤں کی حکمرانوں کے ساتھ گول میز کانفرنسیں ہوئیں۔ سرحد کی نمائندگی صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے کی۔ واپسی میں ۱۹۳۲ء میں وہ اپنے عوام کے لئے جہاں ایک طرف اصلاحات کا تحفہ لے کر آئے

وہیں ان کو یہ نوید مسرت دی کہ ہندوستان کے بقیہ صوبوں کی طرح اب صوبہ سرحد بھی چیف کمشنر کے بجائے گورنر کا صوبہ بن گیا۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن پشاور آئے اور سر رالف گرفتہ کو گورنر بنانے کا اعلان کیا۔ وہی اصلاحات جو ہندوستان کے اور صوبوں کو برسوں پہلے ملی تھیں۔ اب صوبہ سرحد کو بھی دے دی گئیں۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات بھی دے دی گئیں۔ لیجسلیٹو کونسل کے لئے پہلی دفعہ انتخابات کئے گئے جن کا خدائی خدمت گاروں نے مکمل بائیکاٹ کیا۔ کل منتخب ممبران کی تعداد ۳۶ ہونا تھی جن میں سے زیادہ تعداد نامزد ممبران کی تھی۔ صاحبزادہ صاحب وزارت کے لئے واحد امیدوار تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں پہلی دفعہ سرحد سے ایک رکن سنٹرل اسمبلی (مرکزی اسمبلی) کے لئے لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ کانگرس اور خدائی خدمت گاروں کے متفقہ امیدوار باچا خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب تھے۔ ہندو مہاسبھا کی طرف سے رام داس لگائی تھا جبکہ حکومت کے حلیف اور وفادار خزانین کا امیدوار راجہ حیدر زمان تھا۔ نتیجہ ڈاکٹر خان صاحب کی کامیابی کی شکل میں نکلا۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی ہندوستان بھر میں نئی اصلاحات کی رو سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت عام انتخابات ہوئے۔ صوبائی کانگرس نے صوبہ میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کے جماعتی فیصلے کے مطابق انتخابات میں حصہ لیا۔ حکومت نے دھاندلی کے بہت طور طریقے اپنائے لیکن پھر بھی پچاس ارکان اسمبلی میں سے انیس کانگرسی تھے۔ سولہ ارکان نواب صاحب سر صاحبزادہ عبدالقیوم کی مسلم نیشنلسٹ پارٹی سے کامیاب ہوئے جبکہ آٹھ ممبران ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی کے تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے چار اراکین کامیاب ہوئے اور تین ارکان آزاد امیدوار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ کانگرسی ہائی کمان کے فیصلے کے مطابق اکثریت میں ہونے کے باوجود انہوں نے وزارت نہیں بنائی۔ گورنر سرحد سر جارج کنگھم نے نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو وزارت بنی۔ صاحبزادہ کے علاوہ وزارت کے اراکین میں رائے بہادر مہر چند کھنہ اور سر سعد اللہ خان بھی شامل تھے لیکن ستمبر ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے صاحبزادہ صاحب کی وزارت پر عدم اعتماد کا ووٹ پاس کیا۔ کانگرسی ہائی کمان نے وزارتیں بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ ان کی وزارت میں ان

کے ساتھ قاضی عطاء اللہ، محمد عباس خان اور بھنجر رام گاندھی شامل تھے۔ وزارت نے دو سال اور تین مہینے کی مختصر مدت میں عوام میں کافی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ بہت سے ناجائز ٹیکسوں کا خاتمہ کیا گیا اور لوگوں کو زندہ رہنے کا طریقہ سکھایا گیا۔ لوگوں کی اصلاح کے لئے کافی انقلابی قسم کے اقدامات کئے گئے۔ لیکن عوام میں مقبولیت حاصل کرنے والی اسی وزارت نے اپنے ہی لوگوں پر ظلم و ستم کر کے تاریخ میں ایک نیا نام پیدا کیا۔ غلہ ڈھیر میں کسان تحریک اس بات کی شاہد ہے کہ اپنے لوگوں پر ہی ظلم کرنا کہاں کا انصاف تھا۔ نواب طورو کو خوش کرنے کے لئے غلہ ڈھیر کے کسانوں کی بید خلیاں کی گئیں۔ ان کے رہنماؤں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ غریب کارکن یہی کہتے رہے کہ ہم نے قربانیاں کیا اس لئے دی تھیں کہ ہمیں تو پیٹ بھر کر کھانا، تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا اور سر چھپانے کو مکان بھی نہ ملے جبکہ نوابوں اور خانوں کے خزانے اسی طرح بھرتے رہیں۔ آخر کار ہائی کمان کی مداخلت سے فریقین کے درمیان صلح کرائی گئی۔

انہی دنوں ہندوستان کی آزادی کے لئے تشدد اور عدم تشدد اختیار کرنے کا جھگڑا ایک بار پھر شروع ہوا۔ گاندھی جی ہمیشہ کی طرح عدم تشدد ہی کی وکالت کر رہے تھے جبکہ انقلابی کانگرسی نوجوان ہندوستان کی آزادی چاہتے تھے۔ چاہے وہ کسی بھی قیمت پر کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں کا رہنما سبھاش بابو اور ان کے ساتھی کانگرس کے اندر ہی رہ کر انقلابی اقدام کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کانگرس کے اندر ہی رہ کر اپنے لئے فارورڈ بلاک بنائی۔ کانگرس کے صدارتی انتخاب میں سبھاش بابو گاندھی جی کے امیدوار سیتا رامیہ پٹیا بھائی کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔ ان کو بھاری اکثریت ملی تھی لیکن بعد میں حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اور پارٹی کو انتشار سے بچانے کے لئے انہوں نے صدارت سے استعفیٰ دیا۔ صوبہ سرحد میں بھی ہندوستان کے بقیہ صوبوں کی طرح فارورڈ بلاک بنا۔ ان کے اور باچا خان کے درمیان معمولی نوعیت کے اختلافات بھی پیدا ہوئے لیکن باچا خان کی ہر دلعزیز اور متاثر کن شخصیت کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں یورپ میں جنگ عظیم دوئم شروع ہوئی۔ ہندوستان کو بھی اس کی مرضی جانے بغیر اس آگ میں جھونک دیا گیا۔ انگریزوں نے ملک کے منتخب نمائندوں کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے کوئی مشورہ کیا جاتا۔ کانگرس ہائی کمان کے فیصلے کے مطابق تمام کانگرس وزارتیں بطور احتجاج مستعفی ہو گئیں۔ صوبے میں

ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ واقعہ ۷ نومبر ۱۹۳۹ء کا ہے اور ۱۱ نومبر ۱۹۳۹ء کو سر جارج کنگھم نے دفعہ ۹۳ کے تحت تمام اختیارات خود سنبھال لئے۔ اس پر قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگی رہنما سردار اورنگ زیب کو کہا کہ جس نیت پر بھی ہو صوبے میں لیگ کی وزارت بناؤ۔ یہاں صوبہ سرحد کے حوالے سے قائدِ اعظم محمد علی جناح کا تھوڑا سا ذکر بھی ضروری ہے۔ انہوں نے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں پشاور کا دورہ کیا۔ اس دورے میں انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت صوبے بھر میں صاحبزادہ عبدالقیوم خان کا طوطی بولتا تھا۔ انہوں نے حتی الوسع قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قدر و عزت کی لیکن لیگ میں شامل نہیں ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب اپنے اوپر عدم اعتماد کا ووٹ پاس ہونے کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہے۔ اور ۱۹۳۷ء کے آخری دنوں میں فوت ہوئے۔ ان کے مرنے پر ان کی پارٹی تتر بتر ہو گئی۔ پارٹی کے روح رواں سردار اورنگ زیب خان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اکثر عہدیداروں نے جن میں بڑی تعداد خوانین کی تھی نے بھی لیگ میں شامل ہونے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ کیونکہ ان کے مفادات کا دفاع مسلم لیگ ہی کر سکتی تھی۔ صوبہ سرحد کی اس زمانے کی مسلم لیگ بالکل عوامی جماعت نہیں تھی اگرچہ ۱۹۳۷ء ہی میں ایبٹ آباد میں قاضی عبدالحکیم اور مولانا محمد شعیب نے اس کو از سر نو فعال بنانے کی کوشش کی تھی۔ خان بہادر سعداللہ خان معہ دیگر خوانین کے لیگ میں شامل ہو گئے۔ ان دنوں کی صوبائی لیگ "موٹر لیگ" کہلاتی تھی جس کا کام بقول کسی کے صرف نوابوں اور خوانین کے ڈرائنگ روموں میں جانا اور چائے وغیرہ کی دعوتیں اڑانا ہی تھا۔ ایسے حالات میں قائدِ اعظم کی ایما پر سردار اورنگ زیب خان نے لیگی وزارت بنانے کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔

جنگ میں شدت آ گئی۔ جرمنوں کی طرف سے جاپان بھی جنگ میں کود پڑا۔ جاپان کی شمولیت سے چین اور امریکہ کو بہت تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے اپنی کوششیں اس بات پر صرف کر دیں کہ جیسے بھی ہو ہندوستان کی حمایت حاصل کی جائے۔ فروری ۱۹۴۲ء میں چین کے چیانگ کائی شیک نے اپنی بیگم کے ہمراہ ہندوستان کا دورہ کیا۔ یہاں آ کر وہ وائسرائے ہند کے علاوہ ہندوستانی لیڈروں سے بھی ملا۔ ۷ مارچ ۱۹۴۲ء کو رنگون استحادیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب تو امریکی صدر روزویلٹ کی پریشانی اور بھی بڑھنے لگی۔ اس نے اپنا ذاتی نمائندہ کرنل جانسن ہندوستان بھیجا۔ آخر کار ہر طرف سے مجبور ہو کر برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے سر سٹیفورڈ

کرپس کو کچھ تجاویز کے ہمراہ ہندوستان بھیجا۔ سر کرپس نے اپنے منصوبے میں ایک آزاد وفاق کی وکالت کی۔ لیکن ساتھ ہی منصوبے کے تحت صوبوں کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر وہ وفاق ہند سے نکلنا چاہیں تو انہیں اس کی اجازت ہوگی۔ ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں آل انڈیا نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اپنے طور پر کرپس منصوبہ رد کر دیا۔ مشن ناکام ہو کر ۱۱ اپریل ۱۹۴۲ء کو انگلستان واپس چلا گیا۔

ہندوستان بھر میں مکمل آزادی کے مطالبے میں زور ڈالنے کے لئے اکتوبر ۱۹۴۰ء سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ گاندھی جی کو تحریک کی باگ ڈور سونپی گئی۔ انہوں نے شروع میں انفرادی ستیہ گرہ کے طریقے کو پسند کیا۔ ونوبا بھاوے پہلے شخص تھے جنہوں نے اس سلسلے میں قربانی دی اور گرفتار کر لئے گئے۔ جلد ہی تحریک پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ صوبہ سرحد اس معاملے میں کہاں پیچھے رہ سکتا تھا۔ صوبائی رضاکاروں نے بھی گرفتاریاں پیش کرنا شروع کر دیں۔ پہلے جتھے میں گرفتار ہونے والوں میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، رام سرن نگینہ، ارباب عبدالغفور خان، ولی محمد خان طوفان وغیرہ شامل تھے۔ اس کے بعد گرفتاریوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ سول نافرمانی کی اس تحریک کے سنگ سنگ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو باقی کمان نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک بھی شروع کر دی۔ صوبہ سرحد میں دس کانگرسی ایم ایل اے گرفتار کئے گئے۔ خدائی خدمت گاروں پر پہلے کی طرح پھر سے حکومت نے ظلم کی انتہا کر دی۔ نہتے اور پُرامن رضاکاروں پر لاٹھی چارج تو روزانہ کا معمول تھا۔ کارکنوں پر بھاری جرمانے عائد کئے گئے۔ ان کے سامان نیلام کئے گئے۔ سرعام ننگا کر کے پٹوایا گیا۔ ان کے رشتہ داروں کو نوکریوں سے نکالا گیا۔ ان پر تشدد کے نت نئے طریقے آزمائے گئے۔ سردیوں میں رضاکاروں کو ٹھنڈے پانی میں غوطے دیئے گئے اور گرمی میں ان کو ننگا کر کے گرم ریت پر لٹایا جاتا۔ تشدد اتنا بڑھا کہ باچا خان خود بھی اس کے نشانہ سے نہ بچ سکے۔ ان کو اتنا مارا گیا کہ ان کی دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ پولیس اور انتظامیہ کو حکم تھا کہ من مانے تشدد کے طریقے ان لوگوں پر آزمائے جائیں تاکہ اور لوگوں کو عبرت ہو۔ لیکن ان سب کا نتیجہ کیا نکلا۔ باچا خان کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ ہی تھا کہ جتنا ان کو دبایا گیا اتنا ہی ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ جتنی ان پر سختیاں کی گئیں ان کے ارادوں میں پختگی آتی گئی۔ یہ سیلاب، یہ طوفان کون روک سکتا تھا کیونکہ ؎

بیٹھ کر باؤں کے چھالوں کو نہیں گنتے ہیں
راہ پر خار محبت میں گزرنے والے

کانگرسی اراکین اسمبلی کے جیل جانے پر مسلم لیگ کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ انگریزی حکومت کی بھی یہی پالیسی تھی کہ جتنا بھی ممکن ہو سکے غیر کانگرسی وزارتیں صوبوں میں بنالیں تاکہ دنیا کو دکھا سکیں کہ سوائے کانگرس کے ملک میں اور قوتیں انگریزوں کا ساتھ دے رہی ہیں۔ سردار اورنگ زیب خان نے پوری تندہی سے لیگ، وزارت کے لئے کوششیں شروع کر دیں اور آخر کار اکالی پارٹی کے سردار اجیت سنگھ کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ سردار اجیت سنگھ کے علاوہ انہوں نے آزاد رکن سردار عبدالرب نشتر اور ایک کانگرسی ممبر ثمین جان خان کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اکالی مسلم لیگ کی مخلوط حکومت کا قیام ۲۵ مئی ۱۹۴۳ء کو عمل میں آیا۔ سردار اورنگ زیب خان وزیر اعلیٰ بنے۔ ثمین جان خان کو وزیر تعلیم بنایا گیا۔ سردار عبدالرب نشتر وزیر خزانہ، راجہ عبدالرحمٰن خان وزیر اطلاعات اور سردار اجیت سنگھ وزیر صحت بنائے گئے۔ کچھ جوہات کی بنا پر مسلم لیگ کی یہ حکومت ناکام رہی۔ تقریباً ڈھائی سال کے عرصے میں انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ نتیجتاً کانگرسی ممبران کے جیل سے باہر آنے کے فوراً بعد مارچ ۱۹۴۵ء میں سردار اورنگزیب پر عدم اعتماد کا ووٹ پاس ہوا اور وزارت دوبارہ ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں کانگرس کی بن گئی۔

جون ۱۹۴۵ء میں یورپ میں جنگ کے حالات میں کچھ بہتری پیدا ہوئی۔ امریکی رائے عامہ نے انگریزوں پر ہندوستان کی آزادی کے لئے نئے سرے سے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول ہندوستان سے لندن گیا تاکہ وہاں ہندوستان کے مسئلے کے حل کے لئے کوئی راہ نکالے۔ وہاں طے پایا کہ ہندوستان کے نمائندہ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی ایک گول میز کانفرنس بلوائی جائے۔ ہندوستان واپسی پر وائسرائے نے تمام گرفتار شدہ کانگرسی اراکین ورکنگ کمیٹی کو رہا کر دیا جو کہ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے دنوں سے نظر بند اور گرفتار تھے۔ شملہ کانفرنس ۲۵ جون ۱۹۴۵ء سے شروع ہوئی۔ اور باتوں کے علاوہ وائسرائے نے ایک تجویز پیش کی کہ مرکز میں ایک نمائندہ حکومت بنائی جائے جس میں پانچ ہندو، پانچ مسلمان، ایک سکھ، ایک پارسی اور ایک اچھوت نمائندہ شامل ہو۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم نے تجویز مانتے ہوئے مطالبہ

کیا کہ مسلمان اراکین تمام مسلم لیگی ہوں گے۔ کانگرس نے مطالبہ کیا کہ پانچ مسلم اراکین میں سے چار لیگی ہوں اور ایک کانگرسی مسلمان ہو۔ قائداعظم نہ مانے۔ کانگرس کے اس وقت کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے ہر چند قائداعظم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی جماعت نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ سب سے بڑا ثبوت اس کا یہ ہے کہ وہ خود مسلمان ہو کر بھی اس کے صدر ہیں لہذا کانگرس کو قومی جماعت کی حیثیت سے مانا جائے بجائے اس کے کہ اس کو ہندوؤں کی جماعت کا نام دیا جائے لیکن قائداعظم نہ مانے اور اپنی بات پر اڑے رہے۔ نتیجہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کی صورت میں نکلا۔ اس کے فوراً بعد ملک میں عام انتخابات کرائے گئے۔ انتخابات کا نتیجہ ۱۸ فروری ۱۹۴۶ء کو منظر عام پر لایا گیا۔ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں پچاس نشستوں میں سے تیس نشستیں حاصل کر کے کانگرس نے مکمل کامیابی حاصل کی۔ مسلم لیگ کو سترہ نشستیں ملیں۔ ہندوستان کے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں یعنی اڑیسہ، مدراس، سی پی، یوپی، بہار شمال مغربی سرحدی صوبہ، آسام اور بمبئی میں کانگرس نے اکثریت حاصل کی جبکہ بنگال، سندھ اور پنجاب میں مسلم لیگ اکثریتی جماعت بن کے نکلی۔

انگلستان میں بھی لیبر پارٹی برسر اقتدار آئی۔ انہوں نے ہندوستان کے مسئلے کے حل کے لئے کابینہ کے تین وزیروں پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ وفد کے اراکین میں لارڈ پیتھک لارنس، سر سٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزنڈر شامل تھے۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں وفد ہندوستان پہنچا آتے ہی وفد کے اراکین کی مختلف سیاسی پارٹیوں سے بات چیت ہوئی۔ کانگرسی اراکین جو وفد سے ملے ان میں پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، باچا خان اور ولبھ بھائی پٹیل شامل تھے۔ جبکہ مسلم لیگ کے وفد میں قائداعظم جناح، سردار عبدالرب نشتر، نواب اسمٰعیل خان اور لیاقت علی شامل تھے۔ ۵ سے ۱۲ مئی تک شملہ میں پھر ایک کانفرنس بلائی گئی۔ وہاں وفد کے اراکین کو اندازہ ہو گیا کہ کانگرس اور لیگ کے درمیان کی خلیج اتنی بڑھ چکی ہے کہ بآسانی اسے پاٹنا مشکل ہے۔ آخر کار ہر طرف سے ناکام ہو کر وزارتی مشن کے اراکین نے اپنی کچھ تجاویز اس طرح پیش کیں کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے ہر حصے میں ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے۔ لیکن تمام حکومتیں مرکز کے ماتحت ہونی چاہئیں۔ تقسیم اس طرح تھی:

گروپ ا: مدراس، بمبئی، سی پی، یوپی، اڑیسہ اور بہار۔

گروپ ب : پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ۔

گروپ ج : بنگال اور آسام۔

آل انڈیا نیشنل کانگرس نے ان تجاویز کو اس لئے مسترد کر دیا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کے لئے پیش کی جانے والی ہر تجویز کے مخالف تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے پہلے تو سکیم کو منظور کر لیا تھا کیونکہ اس میں پاکستان کے لئے مبہم سے اشارے موجود تھے لیکن بعد میں اس بنا پر مسترد کر دیا کہ مشن کے اراکین نے باقاعدہ طور پر تقسیم کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کے علاوہ کانگرس ویسے بھی صوبوں کے آپس میں اتحاد کو رضاکارانہ چاہتی تھی جبکہ مسلم لیگ لازمی گروپ بندی کی حمایت کر رہی تھی۔

حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ برطانوی حکومت بھی اب جلد از جلد ہندوستان کے مسائل سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ ادھر ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے رہنما کسی متفقہ فیصلے پر نہیں پہنچ رہے تھے۔ اگست ۱۹۴۶ء میں وائسرائے ہند کی دعوت پر سیاسی رہنماؤں کو عبوری دور کے لئے ایک عارضی حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کو نائب صدر بنایا گیا جبکہ مسلم لیگ نے قائداعظم کی رہنمائی میں عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ملک کے طول و عرض میں فسادات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو بہت سی جانوں کا نذرانہ لے کر ہی ٹلا۔ کچھ عرصہ بعد مسلم لیگ عبوری حکومت میں شمولیت پر راضی ہوئی۔ اس کے بعد ہندوستان کے قابل ذکر رہنماؤں کو انگلستان بلوایا گیا لیکن وہاں بھی نتیجہ صفر کا صفر ہی رہا۔ اس اثنا میں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے نئے وائسرائے کی حیثیت سے دہلی پہنچا۔ اس نے آتے ہی لیگ اور کانگرس میں سمجھوتہ کرانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔

انہی دنوں صوبہ سرحد کی کانگرسی حکومت کے خلاف مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ تحریک چلانے والے اور مطالبات کے علاوہ ڈاکٹر خان صاحب کے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حالات دن بدن خراب ہوتے گئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے حالات کا بذات خود جائزہ لینے کے لئے ۲۸ اور ۲۹ اپریل کو پشاور کا دورہ کیا۔ اس موقع پر ہزاروں لیگی صوبے کے طول و عرض سے پشاور کے

مشہور پارک کننگھم پارک (موجودہ جناح پارک) میں جمع ہو گئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ اب پرانی خان بہادروں اور نوابوں والی مسلم لیگ نہیں رہی تھی بلکہ اب ایک حد تک عوامی جماعت بن چکی تھی۔ مسلم لیگ کے بدن میں نئی روح پھونکنے والوں میں امیر الملت پیر مانکی صاحب کا نام سرفہرست ہے

۳ جون ۱۹۴۷ء کو برصغیر پاک و ہند کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی صوبہ سرحد میں ریفرنڈم (استصواب رائے) کرانے کا بھی اعلان کیا گیا۔ ریفرنڈم اس بات پر ہونا تھا کہ یہاں کے باشندے ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں رہنا پسند کریں گے۔ کانگرس ہائی کمان نے انگریزوں کے اس فیصلے کو مان لیا۔ جبکہ صوبائی کانگرس نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ہندوستان کے بقیہ صوبوں کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ ان کے منتخب نمائندے ہی ان کی قسمت کا فیصلہ کریں جبکہ صوبہ سرحد کے ساتھ ایک سوتیلے بیٹے کی طرح کا سلوک ہو رہا تھا۔ باچا خان اور ان کے ساتھیوں نے مطالبہ کیا کہ اگر ریفرنڈم کرانا ہی ہے تو پھر ہندوستان کا نام درمیان میں سے نکال دو کیونکہ ہم ان کے ساتھ ملنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی جگہ پاکستان اور آزاد پشتونستان کا نام شامل کرو۔ باچا خان نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں اپنی آخری تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پشتونوں نے تو آپ کے سنگ سنگ ہندوستان کی جنگ آزادی لڑی ہے۔ انگریزوں نے اس سلسلے میں کون سا ظلم اور تشدد کا حربہ ہم پر نہیں آزمایا انہوں نے ہمیں لالچ بھی دیئے اور خریدنے کی کوشش کی۔ لیکن ہم آزمائش کی اس گھڑی میں آپ کے ساتھ رہے اب جبکہ آزادی کا پھل ملنے والا ہے اور انگریز نے برصغیر کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو آپ لوگوں نے اس کٹھن وقت میں ہمیں اکیلا چھوڑ دیا۔ اس سے بڑی ناانصافی اور کون سی ہو گی۔ کہاں گئیں ہماری وہ ساری قربانیاں اور کہاں گئے آپ کے عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے۔ کہاں گئی آپ کی وہ دوستی۔ آپ لوگوں نے ہمیں بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا ہے۔ لیکن کانگرس نے تو تقسیم ہند کا فیصلہ اصولی طور پر مان لیا تھا اس لئے خدائی خدمت گاروں اور باچا خان کے ان گلوں شکووں پر کوئی کان نہیں دھرا۔ اس پر خدائی خدمتگاروں نے ریفرنڈم کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کی کسی بھی شق میں ریفرنڈم وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک سال پہلے صوبہ سرحد میں صوبائی کانگرس نے انتخابات

میں مسلم لیگ کو واضح شکست دی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مذہبی اور جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کے ساتھ ملنا ناممکنات میں شامل تھا۔ تو پھر پاکستان یا ہندوستان کے سوال پر ریفرنڈم کرانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خدائی خدمت گاروں کے بائیکاٹ کے باوجود ریفرنڈم کرایا گیا۔ ۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو پولنگ شروع ہوئی ۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو عوام کو نتائج سے آگاہ کیا گیا۔ جیت لازماً پاکستان کی ہی ہوئی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے نام سے مسلمانوں کا ایک نیا ملک معرض وجود میں آگیا۔

۲

پشاور جاتے ہوئے اٹک پار کر کے بائیں ہاتھ پہاڑیوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ان پہاڑیوں میں سبزہ بہت کم پیدا ہوتا ہے اور یہ بنجر اور سنگلاخ ہیں لیکن ان کا اصل سرمایہ تو وہ زرخیزی اور شادابی ہے جو صدیوں سے برصغیر ہندو پاک کو جلا بخشتے ہوئے ہے۔ یہ پہاڑیاں اگر ایک طرف مسکن ہیں ان اولیاء اللہ کا جن کی کوشش سے اسلام کی روشنی ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچی تو دوسری طرف ایسے ایسے نامور فرزند پیدا کئے جن کی رزمیہ داستانیں آج بھی شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔

تحصیل نوشہرہ کے ایک گاؤں بدرشی جو زیارت کاکا صاحبؒ جاتے ہی راستے میں آتا ہے، میں میاں بازگل کے گھر ۱۸ جنوری ۱۸۹۹ء کو ایک فرزند پیدا ہوا۔ عام دستور کے مطابق اولاد نرینہ پر جو خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے روایتی طور پر اس بچے کی پیدائش پر بھی اسی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ بچے کا نام اکبر شاہ رکھا گیا۔ کسی کو کیا پتہ تھا کہ آگے چل کر یہ بچہ نہ صرف اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں اپنے لئے ایک عزت کا مقام بنا کر رہے گا۔ ابتدائی تعلیم نوشہرہ میں حاصل کرنے کے بعد اکبر شاہ کو اسلامیہ کالج پشاور بھیج دیا گیا۔ اس وقت ہندوستان بھر میں سیاسی بیداری کی ایک لہر سی پیدا ہو گئی تھی۔ جنگ عظیم اوّل ختم ہو چکی تھی اور ہندوستانی عوام انگلستان کے لئے جنگ میں مدد دینے کے صلے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن جنگ میں برطانیہ کی مدد کرنے کا پھل انہیں رولٹ ایکٹ کی شکل میں ملا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ایک انگریز فوجی جنرل ڈائر نے نہتے عوام پر گولی چلوا دی۔ ہندوستان کی ان خبروں نے

اسلامیہ کالج پشاور کے طالب علموں کو ایک عجیب سی صورت حال سے دوچار کیا۔ سارے صوبے میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ طالب علم جو ویسے بھی معاشرے کے اور افراد کی بہ نسبت زیادہ حساس واقع ہوتے ہیں حالات کی نزاکت کو دیکھ رہے تھے۔ قومی رہنماؤں پر ظلم و تشدد انہیں بالکل نہیں بھایا۔ طالب علموں نے اپنے طور پر اپنے لئے لائحہ عمل تیار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ خفیہ اجلاس ہوئے کہ کسی طرح انگریز حکمرانوں کو تنگ کیا جائے۔ ان جذباتی نوجوانوں کے ایک گروہ نے فیصلہ کیا کہ قوم و ملک کی آزادی کی خاطر ہمسایہ ملک افغانستان چلنا چاہیئے۔ اور وہاں سے انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رکھنا چاہیئے۔ ان لوگوں کے سامنے حاجی صاحب ترنگ زئی کی مثال تھی۔ حاجی صاحب کا اصلی نام فضل واحد تھا اور ترنگزئی کے رہنے والے تھے۔ آپ نے انگریزوں کو ستانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس سے پہلے کہ انگریز آپ کو گرفتار کرتے آپ باجوڑ کے علاقہ غیر جا کر رہائش پذیر ہو گئے۔ اور وہاں سے جہاد جاری رکھا۔ انقلابیوں اور نوجوانوں کے لئے حاجی صاحب اور ان کے رفیقوں کی زندگیاں مشعل راہ تھیں۔ اسلامیہ کالج کے طالب علموں کے اس گروہ نے آخر کار اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا ہی دیا۔ اکبر شاہ معہ اپنے چند ساتھیوں کے کالج چھوڑ کر روانہ ہوئے اور چارسدہ میں عبدالغفار خان (باچا خان) سے ملے۔ باچا خان نے ان لوگوں کے افغانستان جانے کے پروگرام کو حتمی شکل دی۔ سرحد پار کر کے بہ خیر و عافیت یہ کابل پہنچے اور پھر وہاں سے جبل السراج پہنچائے گئے۔ اس اثنا میں ہندوستان میں عام ہجرت شروع ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے عموماً اور صوبہ سرحد کے خصوصاً مسلمان اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے سب کچھ چھوڑ کر پڑوسی مسلمان ملک افغانستان کوچ کر رہے تھے۔ علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ اس قسم کے فتوے دیئے گئے کہ جو لوگ دارالحرب میں رہیں گے۔ ان پر ان کی بیویاں طلاق ہیں۔ مہاجرین کے قیام و طعام کا بندوبست پشاور میں کیا گیا۔ کیونکہ نسبتاً پشاور ہی افغانستان کی سرحد کے قریب ترین بڑا شہر ہے۔ پشتونوں کی روایتی مہمان نوازی ویسے بھی ضرب المثل ہے اب جبکہ لوگ مذہب اور اللہ کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر جا رہے تھے تو ان کی خدمت اہلیان پشاور پر فرض تھی۔ ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر آنے والے مہمانوں کی خدمت کی۔ پشاور میں ہجرت کمیٹیاں بنائی گئیں جن کا کام مہاجرین کے قیام و طعام کے

بندوبست کو بہتر بنانا تھا۔ تمام قومی رضاکاروں نے بڑھ چڑھ کر اصلاحی کاموں میں حصہ لیا۔ اردگرد کے دیہات کے دورے بھی کئے گئے اور مہاجرین کے لئے مویشی اور خورد و نوش کا سامان اکٹھا گیا۔ غرض ایک جوش اور جذبے کے تحت اہلیان پشاور مہاجر بھائیوں کی امداد کر رہے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں سندھ سے بیرسٹر جان محمد جونیجو کی کمان میں مہاجرین کا ایک قافلہ بذریعہ ریل گاڑی پشاور پہنچا۔ اب تو لوگوں کا جوش و خروش انتہا کو پہنچ چکا تھا لیکن ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ ہندوستان کو جن لوگوں نے دارالحرب قرار دیا تھا ان میں سے کسی کو دارالسلام جانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ پشاور سے قافلے کے قافلے افغانستان کی طرف رواں دواں تھے۔

ان قافلوں کی افغانستان میں بہت آؤ بھگت کی گئی۔ ان کو سرکاری خزانے سے راشن اور پیسے دیئے گئے۔ امان اللہ خان کی خواہش تھی کہ تعلیم یافتہ افراد کو ملازمتیں دیں اور بقیہ مہاجرین کو افغانستان کے طول و عرض میں کھیتی باڑی کے لئے زرعی زمینیں دیں۔ لیکن مہاجرین کے ہمراہ ایک بڑی تعداد انگریزوں کے جاسوسوں کی تھی۔ انہوں نے اب اپنا کام دکھانا شروع کیا۔ ہر طرف حکومت افغانستان پر اعتراضات ہونے لگے۔ ہر کوئی یہ باتیں کرنے لگا کہ یہاں ہم عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے تو نہیں آئے بلکہ ہم تو انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے آئے ہیں۔ شاہ افغانستان کو انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دینا چاہیئے۔ لیکن افغانستان تھوڑا عرصہ قبل ہی انگریزوں سے جنگ لڑ چکا تھا۔ اور اب اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ دوبارہ انگریزوں سے لڑائی لڑتا۔ جبل السراج کیمپ کے مکین پہلے تو عیش و عشرت میں پڑے ہوئے زندگی کے مزے لے رہے تھے لیکن جلد ہی ان کو بھی احساس ہو گیا کہ یہاں ہم زندگی کے مزے لینے تو نہیں آئے۔ وہ بھی زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکے۔ ان میں بھی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ اتنے میں انگریزوں اور افغانستان کے درمیان صلح ہو گئی۔ یہ خبر جبل السراج کے مہاجرین پر بجلی بن کے گری۔ ان کے لئے بقول ان کے اب ہندوستان اور افغانستان میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ آئندہ لائحہ عمل کے لئے صلاح مشورے ہونے لگے۔ کچھ مہاجرین کی یہ رائے تھی کہ علاقہ غیر جا کر وہاں سے مجاہدین چمرکنڈ کی طرح انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھنا چاہیئے کچھ لوگوں نے رائے دی کہ افغانستان سے ہجرت کر کے ترکی چلنا چاہیئے کیونکہ وہاں ترکوں کو اس وقت

مدد کی ضرورت ہے اور ویسے بھی یہ لوگ گھروں سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا کے لئے نکلے ہیں ہندوستان واپس جاکر لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار نہیں ہونا چاہیئے۔

اکبر شاہ معہ اپنے ساتھیوں کے چار و ناچار افغانستان سے نکل پڑا۔ افغانستان کے اندر اور افغانستان سے باہر ان پر جو تکالیف بیتی ہیں ان کی تفصیلات تو کتاب کا موضوع ہے اور یہاں بیان کرنا مناسب نہیں۔ راستے میں ترکمانوں کے چنگل میں پھنس گئے۔ موت کی سختیاں مہاجرین نے ترکمانوں کی قید میں جھیلیں۔ ان سے رہائی پاکر وہ روس کی بالشویکی حکومت کے مہمان بنے۔ ان کی قدر و منزلت کی گئی۔ آگے چل کر اس مسئلے پر کہ ان کو بالشویکوں کی ترکمانوں کے خلاف امداد کرنی چاہیئے یا نہیں ان میں اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ آدھے تو اناطولیہ کی طرف کوچ کر جاتے ہیں اور بقیہ آدھے جن میں اکبر شاہ بھی شامل ہیں وہیں روس میں ٹھہر جاتے ہیں۔ تاشقند کے ہوائی مدرسے میں ان کو داخلہ دے دیا جاتا ہے کیونکہ ایم این رائے (مہندرا ناتھ رائے) کے مطابق ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کو بہت اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ ابھی ان کی تربیت پوری نہ ہو پائی تھی کہ بدقسمتی ان کا پیچھا کرتی وہاں بھی آپہنچی۔ انگریز اور روس کے درمیان صلح ہوگئی۔ تاشقند کا ہوائی مدرسہ بند کر دیا گیا۔ وہاں سے ان کو ماسکو لایا گیا۔ وہاں کچھ عرصہ رہ کر ان کو واپس وطن بھیجا جاتا ہے۔ میاں صاحب کا واپسی کا سفر واقعات و حوادث سے بھرپور ہے۔ اکبر شاہ میاں صاحب نے جس تفصیل کے ساتھ اور مزے لے لے کر وہ تکالیف جو ان پر بیتیں بیان کی ہیں تو عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے ان قربانیوں کو دیکھ کر جو آزادی کے ان پروانوں نے آزادی کے لئے دیں۔ واپسی کا سفر اکبر شاہ ایران کے راستے کرتے ہیں۔ اس وقت کے ایران کے متعلق تفصیلی ذکر میاں صاحب نے بہت دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ایران میں اس وقت کے تغیرات اور تبدیلیاں جو آنے والی تھیں ان کے متعلق بھی میاں صاحب نے بہترین تجزیہ کیا ہے۔ ایران سے کراچی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں سے لاہور آتے ہیں۔ لاہور میں انہوں نے چند روز قیام کیا۔ لاہور ٹھہرنے کا مقصد یہی تھا کہ گاؤں اور علاقے کے واقعات سے آشنا ہو سکیں۔ بابو سلطان محمد اس وقت کے ایک انقلابی ان سے ملاقات کے لئے لاہور آتے ہیں اور ان سے سیاسی تفصیلات

طے ہو جاتی ہیں۔ اپنے تئیں ان کی کوشش یہی رہی کہ سیدھے گھر نہ جائیں اس لئے زیارت کاکا صاحبؒ جا کر وہاں ایک مشہور انقلابی جن کے سر کانگرس کو سرحد کے دیہات میں متعارف کرانے کا سہرا ہے اور اصلی نام تو حمید گل تھا لیکن اپنی قربانیوں کے پیش نظر قوم سے "فخر قوم" کا خطاب پایا تھا کے ہاں ٹھہرے وہاں سے گاؤں خبر بھیجی گئی اور خبر لے جانے والے سے رازداری برتنے کو کہا گیا۔ لیکن بجائے رازداری سے خبر پہنچنے کے میاں اکبر شاہ کی وطن واپسی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق میاں باز گل کو بیٹے کے زندہ سلامت واپس لوٹنے پر مبارکباد دینے کے لئے آرہے تھے۔ انہی آنے والوں میں ایک ایسا شخص بھی شامل تھا جو میاں صاحب کو پشاور لانے کی نوید لے کر آیا تھا۔ پشاور پہنچنے پر اکبر شاہ اور اس کے آٹھ ساتھیوں کو حکومت ہند (برطانیہ) کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ان سب پر پشاور سازش کیس Peshawar Conspiracy Case کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ ان سب کو مختلف قسم کی سزائیں سنا دی گئیں۔ انگریز حکمران دراصل ان سب اشخاص کو جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح بالشویک روس سے رہا تھا ہندوستان میں آزاد نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ ان کو اپنے لئے خطرہ جانتے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ قید کے دوران ہی میاں صاحب کو موقع مل جائے گا کہ وہ اپنی داستان یا دوسرے الفاظ میں سفرنامہ مکمل کریں گے۔ کسی نہ کسی طرح جیل کے اندر انہوں نے کاغذ پنسل پیدا کر لیا۔ الفاظ کو لکھنے میں میاں صاحب کو کمال حاصل تھا اور بڑی بات یہ بھی تھی کہ میاں صاحب کا حافظہ بالکل ٹھیک کام دے رہا تھا۔ واقعات کی کڑیاں ملاتے گئے۔ جگہوں اور لوگوں کے نام بالکل یاد تھے۔ اس لئے لکھنے میں اور آسانی پیدا ہو گئی۔ رہائی ملنے پر انہوں نے وہی مسودہ صاف اور واضح الفاظ میں لکھا۔ جو کچھ عرصہ بعد انہوں نے پشتو ہی میں چھپوایا۔

جیل سے رہا ہونے پر میاں صاحب نے پھر پڑھائی شروع کی۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں وکالت کا امتحان علی گڑھ سے پاس کیا۔ وطن آنے پر پشاور کے نامور وکیل سردار اورنگ زیب (جو بعد میں مسلم لیگ کی طرف سے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے) کے ساتھ وکالت شروع کی۔ میاں صاحب جیسا سیاسی شعور رکھنے والا آدمی کہاں گمنامی کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ انہوں نے صوبے کے سیاسی افق پر اپنا کردار ادا

کرنا شروع کیا۔ اردگرد نظر دوڑانے پر باچا خان کی زیر قیادت شروع ہونے والی قومی تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور قابلیت کی بنا پر صوبائی ورکنگ کمیٹی (مجلسِ عاملہ) کے رکن بن گئے۔ انہی دنوں ہندوستان کے کانگریسی رہنماؤں میں دو دھڑے بن گئے۔ دایاں اور بایاں بازو کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ مہاتما گاندھی دائیں بازو کے سرکردہ رہنما تھے جبکہ بایاں بازو سبھاش چندر بوس کی زیر قیادت کام کر رہا تھا۔ کانگرس کے ہر ایک اجلاس میں اختلافات پیدا ہوتے گئے اور یہ اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ سبھاش بابو نے کانگرس کے اندر رہتے ہوئے اپنے ہم خیال کارکنوں کو ساتھ ملا کر آل انڈیا فارورڈ بلاک کی بنیاد رکھی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فارورڈ بلاک کوئی علیحدہ جماعت نہیں تھی بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو فارورڈ بلاک آف دی آل انڈیا نیشنل کانگرس ہی کہلاتی رہی۔ سبھاش بابو نے اس سلسلے میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ وہ پشاور بھی تشریف لائے اور یہاں فارورڈ بلاک کی تنظیم کی۔ میاں اکبر شاہ جو خدائی خدمت گار تحریک میں رہتے ہوئے ہمیشہ کھری بات کہنے والے اور غریب کا ساتھ دینے والے تھے جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ ان کے علاوہ اور قابلِ ذکر ممبران میں غلام محمد خان لوند خوڑ، عبدالرؤف خان اور اجون خان شامل تھے۔ میاں اکبر شاہ کو ساتھ ہی آل انڈیا فارورڈ بلاک کی مرکزی کمیٹی کا ممبر بھی چنا گیا۔ آپ فارورڈ بلاک کے تقریباً تمام اہم اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ اس طرح آپ کا رابطہ ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں کے ساتھ قائم ہو گیا۔

جلد ہی ایبٹ آباد میں منعقدہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے دوران باچا خان اور فارورڈ بلاکیوں کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آئے۔ باچا خان نے ان کو کہا کہ وطن کو آزاد کرانا دونوں کا مقصد ہے لیکن پارٹی پروگرام میں آپ کے اور ہمارے درمیان فرق ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ اور ہم علیحدہ ہو جائیں۔ ہم آپ کو دعائیں دیں گے۔ آپ ہمیں دعائیں دیجئے۔ باچا خان کی متاثر کن شخصیت کے آگے کچھ بولنا ناممکن تھا۔ ہر چند اکبر شاہ نے دلائل دینا چاہے لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر کار رائے اس پر ٹھہری کہ گاندھی جی جو اس وقت صوبے کے دورے پر آئے ہوئے تھے اور ایبٹ آباد میں ہی مقیم تھے کے پاس جا کر فیصلہ کرانا چاہیئے۔ اراکین ورکنگ کمیٹی تمام کے تمام گاندھی جی کے پاس گئے اور ان کو تفصیلاً اپنا مسئلہ سمجھایا۔ گاندھی جی نے جواب میں اسلام کی

مثال دی اور کہا کہ اسلام ایک مذہب ہے لیکن اس میں سنی شیعہ سب کا الگ الگ فرقہ ہے۔ اسی طرح ہم سب کا نصب العین بھی ہندوستان کو آزاد کرانا ہے۔ چاہے کوئی کسی مذہب، فرقہ، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو لیکن ہمارے ساتھ ہمارے نصب العین میں شامل ہونے کے لئے کانگرس کا ترنگا اپناتا ہے تو وہ کانگرسی ہے اس طرح صوبائی فارورڈ بلاک والے کانگرس میں ہی رہ گئے۔

میاں صاحب نے باچا خان کے ساتھ مل کر صوبے کے دور دراز علاقوں کا دورہ کیا۔ پشتونخوا کے دشوار گزار راستوں میں سنگلاخ چٹانوں پر راستہ بناتے ہوئے یہ لوگ پشتون قوم کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے چلتے رہے۔ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا اور ان کے آپس کے جھگڑوں کو مٹانا ان کا مقصد اولین تھا۔ جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔ میاں صاحب کا کہنا ہے کہ صوبے کا کوئی کونہ ایسا نہیں تھا جہاں باچا خان نہ گئے ہوں۔ تاریخ میں ایسی مثال دوسری نہیں ملتی جیسے کہ باچا خان کی ہے اور انہوں نے جو خدمات اپنی پشتون قوم کے لئے سرانجام دیں ان سے روگردانی کوئی قوم اور ملت فروش ہی کر سکے گا۔ اپنے چند اختلافات کے باوجود میاں صاحب نے ساری زندگی قومی خدمات باچا خان کی زیر قیادت سرانجام دی ہیں اور انہیں باچا خان کے ساتھ طویل سیاسی زندگی گزارنے میں بھی جو خوشی اور مسرت ملی ہے وہ اور کسی طریقے سے نہیں مل سکتی تھی۔ انہیں اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے باچا خان کی رفاقت میں قومی کام تن دہی سے انجام دیا۔ کانگرس وزارت کے دوران میاں صاحب کو پشاور کا ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا۔ انہوں نے حتی الوسع لوگوں کی خدمت کی۔ ۱۹۳۸ء میں دو ایسی تحریکیں کانگرس حکومت کے خلاف چلیں کہ صوبائی حکومت سارے ہندوستان میں بدنام ہو گئی۔ یہ تحریکیں مفتی آباد، چارسدہ اور غلہ ڈھیر مردان کی کسان تحریکیں تھیں۔ مفتی آباد تحصیل چارسدہ کے ایک گاؤں میں کاشتکاروں اور مالکان اراضی کے درمیان کچھ جھگڑا کھڑا ہوا۔ مالکان نے ان کے خلاف بے دخلی کا مقدمہ دائر کیا جو کہ انہوں نے جیت لیا۔ کاشت کاروں نے قبضہ دینے سے انکار کر دیا۔ مالکان نے حکومت سے مدد کی درخواست کی۔ پولیس نے بے دخلیاں شروع کیں۔ ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ سرحد کے بیٹے عبیداللہ خان نے کاشتکاروں کا ساتھ دیا۔ ڈاکٹر خان صاحب کے کہنے پر پولیس نے انہیں بھی گرفتار کیا۔

ساتھ میں اور بھی بے شمار لوگ گرفتار کئے گئے جن میں اکثریت ہمدرد زمینداروں کی تھی۔ اس تحریک کی دیکھا دیکھی ضلع مردان کے غلہ ڈھیر نامی گاؤں میں بھی مالکان اراضی اور کاشت کاروں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہوا۔ بنیادی وجہ وہی مزارع اور مالک کی پرانی ان بن تھی۔ طور و کے نوابوں نے جو زمینوں کے مالک تھے نے بے دخلیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ جس کی سخت مزاحمت کی گئی۔ ان کاشت کاروں کو منظم کرنے میں میاں اکبر شاہ ، بھگت رام، وارث خان اور میاں محمد شاہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے ان کو ان کا حق لینے کا طریقہ سکھایا اور ان میں ہمت پیدا کی کہ کیسے خوانین اور نوابوں کے مقابلے میں کھڑا ہونا چاہیئے۔ کانگرسی حکومت نے ان سب کو گرفتار کیا۔ اس پر تمام ہندوستان میں بہت شور برپا ہو گیا۔ وہی کانگریسی حکومت جن کی کامیابی کے لئے ان لوگوں نے اپنے اوپر دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اپنے لوگوں پر ہی چند نوابوں کی خاطر ظلم و تشدد کر رہی تھی۔ یہ معاملہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں بھی پیش ہوا۔ مرکز سے چند مشہور سوشلسٹ رہنماؤں پر مشتمل ایک وفد معاملات کی چھان بین کے لئے صوبے بھیجا گیا۔ وفد نے کانگرسی حکومت اور غلہ ڈھیر تحریک کے متاثرین کے درمیان صلح کروائی۔ میاں صاحب اور ان کے رفقاء کو بھی جیل سے رہائی ملی۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں یورپ میں جنگ عظیم دوئم شروع ہو گئی۔ ہندوستان کی مرضی پوچھے بغیر مملکت برطانیہ نے اس کو بھی جنگ میں دھکیل دیا۔ اس پر بطور احتجاج کانگرسی وزارتوں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا اور خان صاحب کی وزارت بھی مستعفی ہو گئی۔ کانگرس ہائی کمان میں وہی پرانا جھگڑا ایک بار پھر کھڑا ہوا۔ ۱۹۳۹ء کے بانویں اجلاس کی صدارت کے لئے تین نام چنے گئے۔ ان میں سبھاش بوس، ڈاکٹر پٹابی ستیارامیہ اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا آزاد نے بیماری کے باعث انکار کیا۔ ہائی کمان نے ستیارامیہ کی حمایت کر دی۔ لیکن سوشلسٹ ارکان کی حمایت سے سبھاش بابو نے دستبردار ہونے سے انکار کیا۔ کانگرس کے دائیں بازو کے نامور اراکین نے گاندھی جی کو سبھاش بابو کے خلاف لا کھڑا کیا۔ گاندھی جی کے خیالات کو دیکھتے ہوئے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے چھ اراکین سردار پٹیل، آچاریہ کرپلانی، بھولا بھائی ڈیسائی، شنکر راؤ دیو بابو راجندر پرشاد اور مسٹر جے رام داس دولت رام نے بھی ڈاکٹر ستیارامیہ پٹابی کی حمایت کی اور سبھاش

بوس سے مقابلے سے دست بردار ہونے کی اپیل کی۔ لیکن سبھاش بابو اصولی موقف پر کھڑے رہے۔ انتخاب ہوا نتیجہ سبھاش بابو کی کامیابی کی صورت میں نکلا۔ گاندھی جی نے اس شکست کو اپنی شکست تصور کیا۔ اس کے بعد کانگرس ورکنگ کمیٹی کے بارہ اراکین نے مشترکہ طور پر ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے استعفیٰ دیا۔ سبھاش بابو نے کانگرس کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے صدارت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔

ایک طرف تو سبھاش بابو داخلی امور میں پھنسے ہوئے تھے دوسری طرف جنگ عظیم کے دنوں کو ہندوستان کے لئے ایک غیر مترقبہ نعمت جانتے ہوئے انہوں نے انگریزوں کے ناپاک قدم ہندوستان سے نکالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان کے خیال میں ایسا موقعہ پھر ہندوستان کو نہیں ملنے والا تھا۔ اس لئے ان کے بقول سول نافرمانی کی تحریک کو پورے زور و شور سے شروع کر دینا چاہیئے تھا لیکن گاندھی جی جو تشدد کے ساری عمر خلاف رہے نے اس موقعہ پر بھی سبھاش بوس کا ساتھ نہیں دیا۔ کانگرس ہائی کمان کی طرف سے نا امید ہو کر سبھاش بوس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے طور سے کوششوں میں مصروف رہے کیونکہ ان کے خیال میں ایسا نادر موقعہ پھر ہاتھ نہ آتا۔ وہ اس جنگ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ قریبی ساتھیوں سے صلاح مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ جس قیمت پر بھی ہو ہندوستان سے نکل جانا چاہیے اور اس افراتفری کی حالت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ان کی نظر میاں اکبر شاہ پر پڑی۔ انہوں نے میاں صاحب کو مشورے کے لئے کلکتہ طلب کیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں میاں صاحب کلکتے گئے۔ وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ میاں صاحب کسی نہ کسی طریقے سے سبھاش بابو کو کابل پہنچائیں جہاں سے پھر وہ روسی سفارت خانے کی مدد سے روس جائیں گے اور وہاں سے انگریزوں سے رہائی پانے کے طریقوں پر عمل کیا جائے گا۔ میاں اکبر شاہ پشاور واپس آئے اور اپنے رفقاء خاص میاں محمد شاہ اور بھگت رام کے ساتھ طویل صلاح مشورے کئے۔ آخر کار یہ طے پایا گیا کہ بھگت رام سبھاش بابو کو کابل پہنچائے گا۔ پیر پیائی کے عباد خان نے سبھاش بابو کو ٹرک میں سرحد پار کرانے کی حامی بھری۔ ان سب کو معاملے کی سنگینی کا پورا پورا احساس تھا۔ کیونکہ ایسے حساس وقت میں سبھاش بابو کو ہندوستان سے لے جانا جان جوکھوں کا کام تھا لیکن یہ انقلابی تھے اور انقلابیوں کی ساری زندگی ہی اسی طرح گزرتی ہے۔ سبھاش بابو کا بھیس بدل کر پشاور آنا بھی ایک دلچسپ داستان ہے جو ان کے بھتیجے سسر کمار بوس نے "دی گریٹ اسکیپ The Great Escape

نامی کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ سبھاش بابو نے داڑھی بڑھالی تھی اور ایک مسلمان کا بھیس بدلا تھا۔ شیروانی پہنے ہوئے سر پر فیض (ٹوپی) رکھے ہوئے جب وہ پشاور کینٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے تو یقیناً کسی برگزیدہ پیر سے کم کسی طرح بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میاں صاحب ان کو لے کر ڈینز ہوٹل گئے لیکن راستے میں تانگے بان نے کہا کہ مسلمان ہو کر پیر صاحب کو کیوں کافروں کے ہوٹل لے جاتے ہو۔ تانگہ بان ان کو لے کر تاج محل ہوٹل آ گیا۔ تاج محل ہوٹل سے یہ لوگ عباد خان کے گھر آ گئے۔ عباد خان کے گھر سے سبھاش بابو کو کھبوری کے راستے جلال آباد اور پھر کابل لے جایا گیا۔ کابل میں ان لوگوں پر کیا بیتی اور کیسے مشکل حالات میں انہوں نے دن گزارے اور پھر ایمبیسیوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان تفاصیل کے جاننے کے لئے بھگت رام تلوار کی لکھی ہوئی کتاب

The Talwars of Pathan Land and

subhas Chandra's Great Escape

ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ اس کے بعد سبھاش بابو کابل سے برلن جا پہنچتے ہیں اور وہاں سے پھر آزاد ہند فوج کے قیام کا اعلان کرتے ہیں۔ یہاں وہ تفصیلات بیان کرنے کا موقعہ نہیں لیکن یہ کافی ہے کہ ان سب کامیابیوں کا سہرا میاں اکبر شاہ کے اور ان کے خاص رفقاء کے سر ہے۔ ان لوگوں پر بھروسہ اور اعتماد کر کے ہی سبھاش بوس ہندوستان سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ اگر سبھاش بابو اپنی تحریک میں کامیاب ہو جاتے تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور اس میں یقیناً میاں صاحب اور بھگت رام کے نام سنہرے حروف سے لکھے جاتے۔ ہندوستان تو بعد میں آزاد ہوا لیکن سبھاش بابو اس سے پہلے ہی دیارِ غیر میں وطن عزیز کی آزادی کے لئے قربان ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ ہی ان کے رفقاء کی قربانیوں کے متعلق تفصیلات بھی ایسی منظرِ عام پر نہیں آئیں جس طرح کہ ان کا حق بنتا ہے۔

سبھاش بابو کے ہندوستان سے نکلنے پر سارا نزلہ حکومت کا میاں صاحب پر گرا۔ ان کو معہ انکے ساتھیوں کے گرفتار کر کے دیولی کیمپ بھیجا گیا جو کہ راجپوتانے میں واقعہ تھا۔ دُور دُور تک کیکروں کا جنگل پھیلا ہوا تھا اور ملاقاتیوں کو بھی ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ آخر کار گاندھی جی نے دیولی کیمپ کے

قیدیوں کے حق میں بھوک ہڑتال کردی اور ان لوگوں کو دیولی کیمپ سے دوسری جیلوں میں منتقل کردیا گیا۔ میاں صاحب کو پشاور جیل بھیج دیا گیا۔ پشاور جیل آنے پر میاں صاحب کی ملاقات اپنے پرانے رفیقوں خدائی خدمتگاروں سے ہوئی۔ جن کو سول نافرمانی کے جرم میں قید کیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد کے اس وقت کے وزیراعلیٰ سردار اورنگ زیب خان تھے جن کے ساتھ میاں صاحب نے کافی عرصہ وکالت کی تھی ان کو جب پتہ چلا کہ میاں صاحب اتنے لمبے عرصے سے جیل میں ہیں تو انہوں نے اپنا ذاتی اثر ورسوخ استعمال کرکے میاں صاحب کو رہائی دلوائی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بنا اور میاں صاحب کے بقول آزادی کی تلاش ختم ہوئی۔

پاکستان بننے کے بعد میاں جعفر شاہ جو کہ میاں اکبر شاہ کے دیرینہ رفیق تھے کے کہنے پر اکبر شاہ میاں نے قیوم خان کا ساتھ دیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ اسمبلی کے ممبر رہے۔

کانگرس چونکہ پاکستان میں غیر قانونی جماعت قرار پائی جاچکی تھی۔ اس لئے اکبر شاہ کے دیرینہ رفقاء کی یہی خواہش تھی کہ میاں صاحب تحصیل نوشہرہ سے نوشہرہ ہی کے ایک تاج محمد خان نامی شخص کے خلاف الیکشن لڑیں۔ انہیں قیوم خان کی طرف سے کھڑا کیا گیا۔ مزید برآں ان کے حلقہ انتخاب میں اکثریت ان دیہات کی تھی جو دو سو سال سے زیادہ عرصہ سے وہاں رہ رہے تھے لیکن اراضی وہ کے مالک نہیں تھے۔ قیوم خان کا خیال تھا کہ ایسے علاقوں میں زمینوں کی ملکیت تبدیل کی جائے۔ اس لئے یہاں اکبر شاہ کو کھڑا کیا گیا اور میاں صاحب بھاری اکثریت سے کامیاب ہوکر اسمبلی کے ممبر بنے۔ انہوں نے وکالت جاری رکھی اور ۱۹۷۸ء تک اس پیشے سے منسلک رہے۔ آج کل صحت اجازت نہیں دیتی کیونکہ کانوں سے ذرا اونچا سننے لگے ہیں ورنہ حوصلہ اور امنگیں اب بھی اسی طرح جوان ہیں اور علاقے اور قوم کی خاطر سیاست کے میدان میں آنے کے لئے اب بھی بیتاب ہیں۔

جہاں تک ذاتی زندگی کا تعلق ہے ایک بڑا بھائی میاں جناح الدین تھا۔ بہن کوئی نہیں تھی۔ ۱۹۳۴ء میں شادی کی جس سے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں بڑا لڑکا جعفر شاہ انگلستان میں ڈاکٹری کررہا ہے جبکہ چھوٹا لڑکا مصطفیٰ کمال گاؤں ہی میں میاں صاحب کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔

قیدیوں کے حق میں بھوک ہڑتال کر دی اور ان لوگوں کو دیولی کیمپ سے دوسری جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ میاں صاحب کو پشاور جیل بھیج دیا گیا۔ پشاور جیل آنے پر میاں صاحب کی ملاقات اپنے پرانے رفیقوں خدائی خدمتگاروں سے ہوئی۔ جن کو سول نافرمانی کے جرم میں قید کیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سردار اورنگ زیب خان تھے جن کے ساتھ میاں صاحب نے کافی عرصہ وکالت کی تھی ان کو جب پتہ چلا کہ میاں صاحب اتنے لمبے عرصے سے جیل میں ہیں تو انہوں نے اپنا ذاتی اثر ورسوخ استعمال کر کے میاں صاحب کو رہائی دلوائی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بنا اور میاں صاحب کے بقول آزادی کی تلاش ختم ہوئی۔

پاکستان بننے کے بعد میاں جعفر شاہ جو کہ میاں اکبر شاہ کے دیرینہ رفیق تھے کے کہنے پر اکبر شاہ میاں نے قیوم خان کا ساتھ دیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ اسمبلی کے ممبر رہے۔

کانگرس چونکہ پاکستان میں غیر قانونی جماعت قرار پائی جا چکی تھی۔ اس لئے اکبر شاہ کے دیرینہ رفقاء کی یہی خواہش تھی کہ میاں صاحب تحصیل نوشہرہ سے نوشہرہ ہی کے ایک تاج محمد خان نامی شخص کے خلاف الیکشن لڑیں۔ انہیں قیوم خان کی طرف سے کھڑا کیا گیا۔ مزید برآں ان کے حلقہ انتخاب میں اکثریت ان دیہات کی تھی جو دو سو سال سے زیادہ عرصہ سے وہاں رہ رہے تھے لیکن اراضی وہ کے مالک نہیں تھے۔ قیوم خان کا خیال تھا کہ ایسے علاقوں میں زمینوں کی ملکیت تبدیل کی جائے۔ اس لئے یہاں اکبر شاہ کو کھڑا کیا گیا اور میاں صاحب بھاری اکثریت سے کامیاب ہو کر اسمبلی کے ممبر بنے۔ انہوں نے وکالت جاری رکھی اور ۱۹۷۸ء تک اس پیشے سے منسلک رہے۔ آج کل صحت اجازت نہیں دیتی کیونکہ کانوں سے ذرا اونچا سننے لگے ہیں ورنہ حوصلہ اور امنگیں اب بھی اسی طرح جوان ہیں اور علاقے اور قوم کی خاطر سیاست کے میدان میں آنے کے لئے اب بھی بیتاب ہیں۔

جہاں تک ذاتی زندگی کا تعلق ہے ایک بڑا بھائی میاں جناح الدین تھا۔ بہن کوئی نہیں تھی۔ ۱۹۳۴ء میں شادی کی جس سے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں بڑا لڑکا جعفر شاہ انگلستان میں ڈاکٹری کر رہا ہے جبکہ چھوٹا لڑکا مصطفیٰ کمال گاؤں ہی میں میاں صاحب کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔

۳

عام طور سے یہی دستور ہے کہ کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنے والا مصنف کی کتاب سے چند اقتباسات و واقعات منتخب کر کے پھر اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن بہت دفعہ کتاب پڑھنے کے بعد بھی میں چند پیرائے منتخب کرنے میں ناکام رہا۔ کیونکہ میاں صاحب کا اندازِ بیان اتنا دلکش اور معلومات سے بھرپور ہے کہ ان میں سے چند صفحے یا اقتباسات لینا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ اس لئے عام روش سے ذرا ہٹ کر پڑھنے والوں کو یہ حق دیتا ہوں کہ وہ کتاب پڑھ کر اپنی اپنی رائے کا خود ہی اظہار کریں۔

سید وقار علی شاہ (کاکاخیل)

اسلام آباد

۵ مئی ۱۹۸۸ء

مصنف کا راستہ
تاشقند
ترکمانستان
ازبکستان
بخارا
مرو
مشہد
ہرات
قندھار
کابل
پشاور
ایران
اصفہان
شیراز
بوشہر
خلیج فارس
مسقط
عراق
بغداد
بصرہ
کویت
نجف
کربلا
حلہ
بابل
سرخس
مرو
چشمہ اسود
الفتہ
الشنول
وادی
ہرات
فراہ
قندھار
کوئٹہ
لیکن کراچی
پاکستان
ہندوستان

پیش لفظ

۱۹۱۹ء میں میں نے دسویں پاس کر کے اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ لیا۔ اس وقت برصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ انگریز کی سلطنت ساری دنیا میں مشہور تھی اور یہ ایک عام کہاوت تھی کہ "سلطنت انگلشیہ میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا"۔ دنیا کے ہر ایک براعظم کا کچھ نہ کچھ حصہ اس کے زیر سلطنت تھا۔ ایشیا میں تو برصغیر پاک و ہند پر ایسی حکومت کر رہے تھے کہ اسسٹنٹ کمشنر کے اوپر تمام افسران یا تو انگریز تھے اور یا ان کے پسندیدہ آدمی ہوتے۔

پہلی جنگ عظیم کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ برصغیر کے لوگ بھی بیدار ہوئے۔ جگہ جگہ جلسے شروع ہوئے۔ لوگوں نے آزادی کی خواہش ظاہر کی۔

۱۹۱۹ء ہی میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہونا قرار پایا۔ گورا فوج نے جنرل ڈائر کی زیر کمان بندوقوں اور مشین گنوں سے ہزار سے زیادہ افراد کو چھلنی کر دیا۔

انگریز کے اس ظالمانہ عمل کا اثر پورے برصغیر پر پڑا۔ لوگ بیدار ہوئے۔ ہر کالج میں طالب علموں نے مظاہرے کیے۔ اسلامیہ کالج پشاور کے طلبا، کیسے بے اثر رہ سکتے تھے۔ پشتون نے تو ہمیشہ جارح اور غاصب کا مقابلہ کیا ہے۔ جس دن سے انگریز نے پشتون کی سرزمین پر قدم رکھا، اس دن سے انگریزوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ان کی مخالفت میں جہاد کر رہے ہیں۔

انہی دنوں افغانستان انگریز کے خلاف اپنی جنگ استقلال میں مشغول تھا۔ ہمارے کالج میں انگریز کے رویے کے خلاف متواتر جلسے ہوتے رہے۔ ہم نے موقعہ غنیمت جانا اور آپس میں مشورہ کیا کہ وطن کو آزاد کرانے کا بہترین موقعہ میسر آیا ہے۔ ہم چار ساتھی وطن کی آزادی کی تلاش میں نکلے۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ افغانستان کی حملہ آور فوج کی مدد سے ہم لوگ جنگ آزادی میں حصہ لیں گے۔ لیکن ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ ہماری آزادی کی تلاش افغانستان تک ہی محدود نہ ہوگی۔ اور میں کابل، بلخ، بخارا، سمرقند، تاشقند، ماسکو۔ باکو۔ قفقاز اور ایران میں تکلیفیں برداشت کرنے کے

بعد وطن عزیز کو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لوٹوں گا۔

اگرچہ "آزادی کی تلاش" میں نے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں لکھ لی تھی لیکن چالیس سال تک اسے چھاپ نہیں سکا۔ سفر سے میری اپنے گاؤں بدرشی کو واپسی ۱۹۲۲ء میں ہوئی تھی۔ تین چار دن کے اندر ہی مجھے سی آئی ڈی انسپکٹر شیخ عبدالعزیز نے گرفتار کیا اور ساتھ پشاور لے گیا۔ میں اور میرے دیگر ساتھی گوہر رحمٰن خان درویش کے (درویش ہری پور ہزارہ میں واقع ہے)، سلطان محمد خان ریحانہ کے (ہری پور، ضلع ہزارہ) ایم۔ اے مجید لاہور کے، فیروز الدین منصور شیخوپورہ کے، رفیق بھوپال کے اور سید حبیب شاہ پور کے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ الف کے تحت چالان ہوتے اور انگریز سیشن جج فریزر نے دو دو سال قید کی سزا دی۔

پشاور جیل میں پہلے چند مہینے ہم ۲۵ سیر اناج روزانہ پیستے اور ردی کاغذوں میں جگائی کرتے۔ لیکن چار مہینے کی قید سخت اور مشقت کے بعد مجھے جیل کے ہسپتال میں منشی مقرر کیا گیا۔ ہسپتال میں جب بھی موقع ملتا تو اپنے سفر کے حالات کو تحریر کرتا۔ قلم، دوات، کاغذ رکھنا سخت جرم تھا۔ لیکن اللہ بھلا کرے کمپوڈر کا جو بازار سے کاغذ منگوا کر دیتا اور پھر صاف اور لکھے ہوئے تمام کاغذوں کو اپنی تحویل میں رکھتا۔ اپنی قید کی مدت پوری ہونے سے قبل ہی میں نے یہ مسودہ تیار کر لیا تھا اور رہائی سے پہلے ہی اسے اپنے گھر بھجوا دیا تھا۔

۱۹۳۸ء میں صوبہ سرحد میں کانگریس کی حکومت تھی۔ ہم نوشہرہ تحصیل کے کافی سیاسی اراکین غلہ ڈھیر کسان تحریک میں گرفتار کئے گئے اور قید میں ڈال دیئے گئے۔ پھر پشاور جیل ملی۔ ڈاکٹر خان صاحب اس وقت وزیر اعلیٰ تھے۔ جس طرح انہوں نے باہر کی زندگی بدلی اسی طرح جیل کی دوزخی زندگی میں بھی اصلاحات کیں۔ اچھا موقع ہاتھ تو آیا تھا میں نے اس سے فائدہ لیا۔ پنسل والا مسودہ صاف کاغذ پر لکھا۔ انگریزی حکومت ظالم اور جابر تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ میری کتاب ضبط ہو جائے گی اس وجہ سے میں نے شائع کرنے کی کوشش نہیں کی۔

۱۹۴۰ء میں میں نے اور میرے ساتھیوں میاں محمد شاہ جو پبی (تحصیل نوشہرہ) کے رہنے والے تھے اور ماسٹر حاجی محمد جو اکوڑہ خٹک (تحصیل نوشہرہ) کے تھے نے ایک خلاف قانون اخبار "د جنگ بگل" (جنگ کا بگل) شائع کیا۔ سی آئی ڈی نے اخبار اور سائیکلو سٹائل مشین کے لئے میرے اور میرے دوستوں کے گھروں کی تلاشیاں لیں۔ اس کتاب کا وہ صاف ستھرا مسودہ بھی میرے ماموں کے گھر سے لے گئے۔ چند ہی مہینے بعد مجھے، میاں محمد شاہ اور ہمارے

اور ساتھیوں کو ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نظر بند کر لیا گیا۔ ایک دفعہ پھر مجھے موقعہ ملا کہ اس پنسلی مسودے سے نقل کر سکوں۔

فرنگی ۱۹۴۷ء میں دفع ہوئے۔ ہم آزاد ہوئے۔ لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جن لوگوں نے آزادی کی خاطر قربانیاں دی ہیں ان کی خیر نہیں اور نہ ہی کتاب کے لئے فضا ٹھیک تھی۔ لیکن آخر زمانہ بدل گیا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کچھ بہتر ہوئی۔ امریکی لٹریچر کے ساتھ ساتھ روسی لٹریچر کے ساتھ بھی یکساں سلوک ہونے لگا اور اس طرح عرصہ انتظار کے بعد پاکستان کی آزاد خارجہ پالیسی کی بدولت "آزادی کی تلاش" کے لیئے موزوں اور مناسب فضا بنی اور آج وہ آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

میاں اکبر شاہ

بدرشی۔

وطن سے روانگی

۱۔ اسلامیہ کالج پشاور[1]

مہینہ بھر محمد اکبر خان کے انتظار نے میری ایسی حالت بنا دی تھی کہ نہ تو ہاسٹل میں جی لگتا تھا اور نہ کلاس روم میں۔ میری حرکتیں کچھ ایسی صورت اختیار کر چکی تھیں کہ پروفیسر مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ خصوصاً لالہ عبدالرحیم جانتے تھے کہ مجھے کسی پہلو قرار نہیں۔ محمد اکبر خان کے آنے سے نا اُمید ہو کر میں نے کالج کی فیس جو کہ دو سو روپے بنتی تھی اور میں نے جو سفر کے خرچ کے لئے سنبھال کر رکھے تھے اکاؤنٹنٹ کے حوالے کر دیے۔ اب میرے پاس صرف انتیس روپے رہ گئے تھے۔ میں سفر اور ہم سفر دونوں سے مایوس ہو کر دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ کلاس میں سب سے پیچھے بیٹھنا میرا معمول بن چکا تھا۔ پروفیسروں کے لیکچروں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی بس یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کونسی سمت سر اٹھا کر چل پڑوں۔ ایسے ہی فکرمند اور بے قرار شب و روز میں ایک دن ہزارہ کے سید سرور شاہ نے کلاس روم میں داخل ہو کر باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں کتاب ڈیسک پر رکھ کر باہر آیا۔ باہر کالج کی سیڑھیوں کے پاس ایک خوبصورت نوجوان نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ ہم بغیر تعارف کے ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ ہم دونوں میرے کمرے میں جو چیسفورڈ ہاسٹل میں تھا آئے۔ میں خوش تھا کہ میرے سفر کی دیرینہ خواہش کے بر آنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ میں دو جوڑے سفید کپڑوں۔ ایک جوڑا ایلشیا، ایک جوڑا چپلی اور انتیس روپوں کے ہمراہ ایک نامعلوم منزل کی سمت روانہ ہوا۔ لمحے بھر کے لئے بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ ایک نامعلوم مہم کے لئے یہ سامان ناکافی ہو گا۔

ہم کالج سے باہر بڑی سڑک پر نکل آئے۔ یہ شاہراہ پشاور سے سیدھی کابل کو جاتی ہے لیکن آمد و رفت اس پر برائے نام ہی ہوا کرتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کالج کے دولت مند طلبا پشاور سے ڈیڑھ روپیہ ادا کر کے سپیشل تانگوں میں اپنی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ یہ غریب کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہم نے پشاور کی جانب اپنا سفر اختیار

کیا۔ مجھے اُمید تھی کہ کوئی دولت مند طالب علم ضرور تانگہ ساتھ لایا ہوگا جو ہمیں معمولی کرایے پر پشاور پہنچا دے گا کیونکہ خالی تانگہ واپس لے جانے سے تانگہ بان تھوڑے پیسے بھی غنیمت سمجھا کرتے تھے۔ لیکن ایسا کوئی تانگہ نہ مل سکا۔

مجھے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ میرے ساتھی کا نام سرفراز خان ہے۔ ہم باتوں باتوں میں پیدل پشاور پہنچ گئے۔ جہاں بالا حصار کے قریب ایک خالی میدان میں چارسدہ کے لئے تانگوں کا اڈہ تھا۔ تانگے بان چارسدہ جانے کے لئے آوازیں لگا رہے تھے۔ ہم دونوں ایک خالی تانگہ میں چھ آنے فی سواری کے حساب سے سوار ہو گئے۔ تانگے میں سرفراز خان نے مجھ سے دریافت کیا کہ "محمد اکبر کو تو آپ جانتے ہوں گے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر دوسرے ساتھیوں کا تعارف اس نے کچھ اس انداز سے کیا کہ گوہر بہت بہادر جوان ہے۔ میں اور وہ اکٹھے فوجی رسالے میں ملازم تھے۔ تقریباً دو سال ہم نے ایک ساتھ ٹریننگ حاصل کی ہے۔ ہمیں اپنی شاہسواری پہ ناز ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرفراز نے اپنا سینہ پھیلاتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جیسے کہ وہ گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ اٹھائے اپنی شاہ سواری کے جوہر دکھا رہا ہو۔ پھر کہنے لگا کہ "دیکھیے میرے اور گوہر کے لئے تو افغانی فوجی رسالہ میں داخل ہونا اس لئے مشکل نہیں کہ ہم انگریزی فوجی رسالہ کے تربیت یافتہ نوجوان ہیں۔ بس نیزہ ہاتھ میں اور بندوق کو زین سے لٹکائے گھوڑوں کو ایڑ لگانے کی ضرورت ہوگی اور پھر دیکھیے کہ انگریز کو نیزے کی نوک پر اٹھا کر ہوا میں لہراتے دکھائی دیں گے۔ البتہ آپ کو ابھی بڑی مشکلوں سے گذرنا پڑے گا۔" سرفراز خان کی باتیں مجھے ایسی لگ رہی تھیں جیسے کہ حقیقت ہو۔ پھر وہ کہنے لگا کہ "ہمارے ایک اور ساتھی سلطان محمد خان ہیں۔ جو ہیں تو خانزادہ لیکن ذرا بے پرواہ ہیں۔" سرفراز خان نے اور تفصیلات نہیں بتائیں۔ "ایک اور میرا ملازم بھی ہے" وہ بولا "جو ہے تو شرابی لیکن وفاداری اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔"

جب ہم ناگمان کے مقام پہ پہنچے تو سامنے سے محمد اکبر ایک دوسرے تانگے پہ آتے دکھائی دیے۔ فوراً اتر کر ہمارے ساتھ تانگہ میں سوار ہو گئے۔ تانگے بان نے آواز لگائی "بھائی تمہارا بھی چھ آنے لگے گا۔" میں نے اسے جواب دیا "فکر نہ کریں۔" تانگہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ ہم لوگ آپس میں مصروف گفتگو ہو گئے۔ البتہ محمد اکبر کے شامل ہونے کے بعد سرفراز خان بحث میں بہت کم حصہ لے رہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سرفراز خان احتراماً خاموش رہنا پسند کرتے ہیں۔ چارسدہ سے ہم دوسرے تانگے میں بیٹھے۔ محمد اکبر خان نے مجھ سے دریافت کیا "اکبر شاہ آپ عبدالغفار خان کو پہچانتے ہیں؟" میں نے کہاں "ہاں کیوں نہیں۔" سلطان محمد[۲] بابو صاحب جب بھی نوشہرہ ہائی سکول میں تعلیم القرآن

کا سالانہ جلسہ منعقد کرتے تو عبدالغفار خان کی اس میں تقریر ضرور ہوا کرتی تھی جس سے متاثر ہو کر نوشہرہ کے عوام جی بھر کر چندہ دیتے تھے۔ "سلطان محمد بابو صاحب کون ہیں ؟" محمد اکبر نے پھر دریافت کیا۔

"آپ سلطان محمد بابو صاحب کو نہیں جانتے "، میں نے حیران ہو کر ان سے پوچھا۔

"نہیں میں انہیں نہیں جانتا"۔ انہوں نے جواب دیا۔ میں نے انہیں سلطان محمد بابو صاحب کے متعلق بتایا کہ وہ نوشہرہ چھاؤنی کے باشندے ہیں انگریزوں کے کلب میں اسی روپے ماہوار پر ملازم ہیں۔ بہت ہر دلعزیز شخص ہیں۔ اتوار کی چھٹی کے روز مقامی باشندے ان کے اردگرد جمع رہتے ہیں۔ بابو صاحب مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لئے دن رات کوشاں رہتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ بڑے بڑے جلسے منعقد کراتے رہتے ہیں اور اہل ثروت اشخاص کی توجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی طرف مبذول کراتے ہوئے دامے درمے۔ قدمے اور سخنے امداد کے لئے انہیں آمادہ کرتے ہیں۔ ان کے جلسوں میں مردان چارسدہ اور پشاور کی اہم شخصیتیں شامل ہوتی ہیں اور دل کھول کر چندے دیا کرتی ہیں۔ بابو صاحب نوشہرہ چھاؤنی میں مسلم ہائی سکول اور نوشہرہ کلاں میں ایک ٹیکنیکل سکول قومی فنڈ سے چلا رہے ہیں۔ محمد اکبر نے مجھے جواب میں بتایا کہ" عبدالغفار خان بھی تعلیم کے دلدادہ ہیں۔ ہشت نگر[۳] کے علاقے میں انہوں نے اور حاجی صاحب ترنگ زئی نے مدرسوں کا جال بچھایا ہے۔ اب ہمیں افغانستان تک پہنچانے کا انتظام بھی انہی کے ہاتھ میں ہے"۔ محمد اکبر نے میری خوشی اور تسلی کے لئے عبدالغفار خان کی تعریف میں نہایت فراخدلی سے کام لیا۔

اس طرح ہم لوگ تھوڑی دیر میں اتمانزئی پہنچ گئے۔ وہ مجھے ایک دوسرے خان کی جگہ پر لے گئے جس کا نام بھی حسن اتفاق سے عبدالغفار خان ہی تھا۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ اتمانزئی میں ہمارا قیام تین روز تک رہا۔ اکثر اوقات ہم لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ ہمیں خوشی بھی تھی اور توقع بھی کہ افغانستان کے عوام انگریزوں سے جنگ آزادی لڑنے میں ہماری بھرپور امداد کریں گے۔

اتمانزئی سے روانگی

۱۶ مئی ۱۹۲۰ء کو ہم اتمانزئی سے پیادہ مغرب کی جانب روانہ ہوئے۔ دوپہر کو عمرزئی سے مغرب کی

میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ہم لوگ رہبر کی رہنمائی میں پھاٹک تک پہنچ گئے۔ اتنے میں آسمان پر بجلی جو کوندی تو اس کی روشنی میں دو بلند مینار نظر آئے جو پھاٹک کی دوسری طرف بالمقابل کھڑے تھے۔ طاؤس خان (نیا رہبر) نے ہدایت دی کہ آہستہ چلیے اور بات نہ کیجیے کیونکہ مینار نما موچوں میں پہریدار ہوں گے۔ ہم لوگ چیونٹی کی چال سے پھاٹک عبور کر گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ برجوں میں کوئی نہ تھا۔ پھاٹک سے آگے پہاڑوں کا ایک عظیم سلسلہ تھا۔ پہاڑوں کے دامن کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے خاردار تار بچھایا تھا۔ جگہ جگہ برجیاں تعمیر کی گئیں تھیں لیکن اتنے انتظامات کے باوجود طاؤس خان جیسے سولہ سالہ نوجوان اور ساٹھ ساٹھ سالہ بوڑھوں کا آدھی رات کو ان حفاظتی دشواریوں کو پھلانگ کر انگریزی پلٹنوں پر حملہ کرنا ان قبائل کے جذبہ آزادی کا بے مثال ثبوت تھا۔

ہم لوگ پھاٹک سے تھوڑا آگے چل کر کھڑے ہوئے اور ایک بار پلٹ کر اپنے غلام وطن پر نظر دوڑائی وطن سے جدا ہونے کے باوجود ہمیں غم سے زیادہ خوشی ہوئی اور اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ انگریز کی غلامی کے جال سے ہم لوگ بہ خیریت گذر آئے تھے۔ دو گھنٹے تک مزید مسافت طے کی۔ اندھیرے کے باعث ہمیں راستہ نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن طاؤس خان جیسے کمسن رہبر کے پیچھے اس اعتماد سے ہمارا سفر جاری تھا کہ راہ بھٹکنے کا خدشہ تک محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ حالات نے طاؤس خان کو فولادی انسان بنا دیا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات نے ایسا کوئی موقعہ پیدا نہیں ہونے دیا جس سے اس کی رہبری پر شک و شبہ پیدا ہو سکتا۔ رات کے تقریباً دس بجے طاؤس خان نے میرے کان میں آہستہ سے کہا کہ آگے چوروں کا خطرہ ہے۔ چور کبھی کبھی رات کے پہلے پہر اس راستے پر اپنا شکار تلاش کرتے ہیں اس لئے ہمیں نزدیکی چشمے پر آرام کرنا چاہیئے۔ جب رات گہری ہو جائے تب ہم اپنا آگے کا سفر جاری رکھیں گے۔ ہم نے راہبر کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے چشمے کے کنارے ڈیرے ڈال دیے۔ طاؤس خان نے روٹیوں کی گٹھڑی کھول دی۔ ہم سب نے مل کر گندم کی نرم روٹی کھانی شروع کر دی۔ دنیا کی کوئی نعمت بھی ایسی نظر نہیں آتی جیسی اس وقت وہ روکھی روٹی لگی۔ طاؤس خان کو بھی ہم نے کھانے پر ساتھ بٹھا دیا۔ طاؤس خان نے کہا کہ میرے پاس اپنے حصہ کی روٹی محفوظ ہے۔ جو مکئی کی سوکھی روٹی کے چند ٹکڑوں پر مشتمل تھی۔ ہم نے وہ

جانب چند مکان تھے، ان کی سمت پانی پینے کے لئے گئے۔ وہاں ایک مسجد تھی جس میں پانی کا کنواں تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ہمارے گاؤں کا نرے نامی ایک شخص کھڑا پانی نکال رہا تھا۔ گاؤں میں یہ شخص ہمارا پڑوسی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حیرانگی سے چلاّنے لگا کہ تم کابل جا رہے ہو۔ ٹھہریے میں ابھی آپ کے والد بزرگوار کو اطلاع کئے دیتا ہوں۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ نہیں میں کابل نہیں جا رہا بلکہ ہم لوگ کالج سے تفریح کے لئے یہاں آئے ہیں۔ نرے نے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ہرگز نہیں میں انہیں اطلاع دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ اکبر شاہ کو کابل جاتے ہوئے میں نے دیکھا تھا اور اسے روکا بھی نہیں اور نہ ہی انہیں اطلاع دی تو وہ ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جائیں گے اور میں ان کی خفگی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے آہستہ آہستہ نرے کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ میں کالج جا رہا ہوں اور ویسے بھی اگر نرے خود میرے والد صاحب کو اطلاع نہ دیں تو انہیں کیسے خبر ہوگی کہ میں نرے سے ملا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد نرے راضی ہو چکا تھا کہ میرے والد صاحب کو میرے متعلق نہ بتائے۔ ہم لوگوں نے کھیتوں کے بیچوں بیچ اپنا سفر جاری رکھا۔ شام ڈھلے کتوزئی پہنچے اور اندھیرے میں صدر گڑھی میں داخل ہوئے۔ ہمارا رہبر ہمیں ایک حجرے میں لے گیا۔ حجرے میں اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ ہم لوگ تھکان سے چُور چُور تھے۔ علی الصبح اتمان زئی سے روانہ ہوئے تھے اور شام ڈھلے یہاں پہنچے تھے۔ حجرے میں خالی چارپائیاں پڑی تھیں اُن پر دراز ہو گئے۔

انگریزی سرحد سے پار ہونا

ابھی ہم لوگ کمر سیدھی نہ کر پائے تھے کہ ایک مہمند لڑکا تندور کی گرم گرم روٹیاں کندھے پر رکھے اندر داخل ہوا اور کہنے لگا کہ اٹھو کہ چلیں۔ ہم لوگ جلد اُٹھ گئے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ اب ہمارا رہبر بدل گیا ہے۔ چونکہ آگے علاقہ اب مہمند قبیلے کا تھا اس لئے ہماری رہبری اب اس مہمند لڑکے نے ہی کرنی تھی۔ صدر گڑھی سے آگے لیکنڈی پہاڑ کے دامن میں انگریزوں اور مہمندوں کی سرحد پر جہاں خاردار تار کی باڑ لگی ہوئی تھی تھوڑی دیر میں پہنچ گئے۔ عشاء کا وقت تھا اور آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے

سوکھے ٹکڑے اس کی نظر سے بچا کر الگ رکھ دیے اور اسے کہا کہ اس وقت آپ ہمارے ساتھ یہ نرم روٹی کھالیں۔ یہ سوکھی روٹی اور کسی وقت کھالیں گے۔ طاؤس خان نے اپنی سوکھی روٹی کھانے کے لئے بہت اصرار کیا لیکن ہم نے اسے ہاتھ لگانے نہیں دیا کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ طاؤس خان کی روٹی بغیر پانی کے گھونٹ کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی۔ بہرکیف طاؤس خان کے مشورے پر کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ایک چھوٹی سی گھاٹی (خرخوڑئی) میں لیٹ گئے۔ طاؤس خان چند بڑے بڑے پتھر اٹھا لایا۔ اور یہ کہتے ہوئے پتھر ہمارے حوالے کئے کہ آپ لوگ تو تکیوں کے عادی ہوں گے آج سر اونچا رکھنے کے لئے ان پتھروں کا سہارا لیجیے۔ ہم ہنس پڑے کہ بھلا تکیوں کا لطف پتھر سے کیونکر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن طاؤس خان کے بہتر سلوک اور پرخلوص میزبانی سے ہم اس قدر متاثر ہوئے کہ پتھروں کے تکیے ہمیں ریشمی تکیوں کا لطف دینے لگے۔ گوہر رحمان نے سگریٹ سلگائی لیکن طاؤس خان کی تنبیہ پر بجھادی گئی کیونکہ رات کے وقت سگریٹ جلنے کی روشنی دور تک دکھائی دیتی ہے جو ہم جیسے کوہ نوروں کے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ طاؤس خان نے احتیاط کے لئے ہمیں کانا پھوسی سے بھی منع کر دیا تھا۔

اسی طرح رات کے بارہ بجے دوبارہ ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ آگے پہاڑی سلسلہ اس قدر مشکل ترین تھا کہ انگریزوں نے بھی اس راستے مہمندوں پر حملہ کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن طاؤس خان ہرن کی طرح پہاڑوں کو پھلانگ رہا تھا۔ میری یہی خواہش تھی کہ پیچھے نہ رہ جاؤں کیونکہ اور ساتھی پیچھے رہتے جا رہے تھے۔ طاؤس خان ہر موڑ پر ہمارے لئے رک جایا کرتا تھا۔ ایک جگہ تو مجھے اور طاؤس خان دونوں کو ساتھیوں کے انتظار میں رکنا پڑا۔ یہاں طاؤس خان نے مجھ سے دریافت کیا کہ بھائی کیا آپ آفریدی ہیں۔ میں نے جواب دیا نہیں میں خٹک ہوں۔ طاؤس خان نے پھر کہا تو آپ سب ایک گاؤں کے نہیں۔ اسی لئے آپ کے ساتھی پشتو نہیں بولتے۔ میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم الگ الگ گاؤں کے باسی ہیں لیکن بھائیوں جیسے رشتہ میں منسلک ہیں۔ رات نہایت اندھیری تھی لیکن ہم ساری رات چلتے رہے۔ طاؤس خان چند قدم چل کر رک جاتا تھا تاکہ بھٹکنے کی نوبت نہ آئے۔ راستہ اس قدر تنگ

تھا کہ دو آدمی ایک ساتھ چلنے کے بجائے ایک دوسرے کے پیچھے چل کر ہی راستہ طے کر سکتے تھے۔

پہاڑی میں ہمارا سفر ابھی جاری تھا کہ صبح کا اجالا پھیل گیا۔ آہستہ آہستہ سورج نکل آیا۔ طاؤس خان نے پہاڑ کی چوٹی سے ہمیں اپنا گھر اور گاؤں دکھایا جو ایک چھوٹے سے قلعے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں ایک بچاؤ برج کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ تقریباً آٹھ نو بجے کے درمیان ہم لوگ طاؤس خان کے مکان پر پہنچے۔ دروازے کے باہر اس کے والد بزرگوار کھڑے تھے جو پینتالیس کے پیٹے میں لگ رہے تھے۔ خشخشی داڑھی اور پروقار حلیہ کے شخص تھے۔ ہم نے نہایت محبت سے پیش آئے۔ دروازے کے باہر سامنے چارپائیاں ڈال دی گئیں جس پر ہمیں بٹھا کر طاؤس خان گھر میں داخل ہو گیا۔ تھوڑا وقفہ گذرنے نہ پایا تھا کہ گھر سے طاؤس خان بمعہ اپنے والد صاحب تندور کی گرم روٹیاں اور ایک بڑے برتن میں (جو پشتو میں کارخانے تباخ کے طور پر شہرت رکھتا ہے) گرم دودھ جس پر خالص گھی پڑا ہوا تھا لے آئے۔ طاؤس خان کے دادا نے بغیر پوچھے روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس میں ڈال دیے۔ جب روٹی دودھ اور گھی میں نرم ہو گئی تو اس نے ہمیں کھانا شروع کرنے کی ہدایت کی۔ طاؤس خان کے دادا ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے اور وہ خود ہمارے بار بار کہنے کے باوجود بھی کھانے میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوا۔ دادا نے ہنستے ہوئے ہمیں بتایا کہ وہ گھر میں دادی کے ساتھ کھانا کھائے گا۔ طاؤس خان چودہ پندرہ سالہ نوخیز لڑکا تھا جس کی مسیں بھی ابھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں لیکن جس بلند اخلاقی، حسن سلوک اور سنجیدہ کاری سے اس نے گذشتہ رات ہماری رہنمائی کی تھی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

طاؤس خان کے سترسالہ سفید ریش چھریرے بدن کے دادا جو چاک و چوبند شخص تھے، نے ہمیں بتایا کہ طاؤس خان کی خواہش تھی کہ وہ آپ لوگوں کو حاجی صاحب[۸] (ترنگ زئی) تک پہنچائے لیکن میرا خیال ہے اب اس کا کام ختم ہو گیا ہے اب آپ لوگ میرے مہمان ہیں اور حاجی صاحب تک آپ کو پہنچانا میرا فرض ہے۔

تھوڑے وقفے کے بعد جب ہم نے آگے بڑھنے کی خواہش کی اور میزبان یہ جان کر کہ مزید ٹھہرنے

کے لئے ہم لوگ تیار نہیں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چلتے چلتے اپنی گٹھڑی کھولی اور کپڑوں کا ایک نیا جوڑا جو کہ ملیشیا کا تھا طاؤس خان کو بطور تحفہ پیش کیا ۔ جسے اس نے لینے سے انکار کیا۔ محمد اکبر نے فوراً طاؤس خان کو پکڑتے ہوئے اسے تحفہ قبول کرنے پر اصرار کیا تو اس کے دادا نے بھی اس کو کہا کہ بیٹا لے مہمانوں کی دل شکنی اچھی نہیں ۔ اس پر طاؤس خان نے کپڑوں کا جوڑا اپنے پاس رکھ لیا۔

اس طرح بوڑھا آگے آگے اور ہم اس کے پیچھے نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔ چار پانچ میل کا فاصلہ جب طے کیا تو ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچے ۔ گاؤں سے باہر چشمے کے کنارے شہتوتوں کی گھنی چھاؤں میں چند آدمی چارپائیوں پر اپنی بندوقوں کے ہمراہ بیٹھے ہوئے تھے ۔ ہمارے سلام کرنے پر یکدم اُٹھے اور علیک سلیک کے بعد ہمیں اپنی چارپائیوں پر بٹھایا۔ ان میں سے ایک شخص اٹھ کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا تو طاؤس خان کے دادا نے اسے آواز دے کر روک لیا کہ گھر مت جایئے ہم ٹھہرنے والے نہیں ۔ اس پر جانے والے نے کہا کہ ہرگز نہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ کھانا کھائے بغیر یہاں سے جائیں ۔ اور پھر آپ کے ساتھ مہمان بھی ہیں ۔ میں نے ان کی بات درمیان میں کاٹ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے ابھی روٹی بابا کے ہاں کھائی ہے۔

ہمارے ٹھہرنے میں کوئی خاص وقت نہیں گذرا تھا کہ ایک مسافر دوڑتا ہوا آکر کہنے لگا کہ درّہ میں مجھ سے میرا کمبل کسی نے چھین لیا ہے ۔ بات پوری ہونے سے پہلے سبھی افراد جائے وقوعہ کی طرف پلک جھپکتے ہی دوڑ پڑے ۔ تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ وہ لوگ مسکراتے ہوئے واپس لوٹتے دکھائی دیے اور آتے ہی کہنے لگے کہ چند شرارتی لڑکوں کا کام تھا جو تھپڑ دو تھپڑ میں ہی تائب ہو گئے۔ دراصل مہمند اپنے علاقے میں جرائم برداشت نہیں کر سکتے ۔ بلکہ کسی جرم کے ارتکاب کو اپنے قبیلہ و خاندان کی بے عزتی تصور کرتے ہیں ۔

دو برجوں کا گاؤں

دو بجے دوپہر ہم کنڈاؤ سے گزرے ۔ ہمارے آگے ڈھلوان پر مہمند قبیلے کی کاشت کا ایک وسیع

میدان تھا۔ پانچ بجے شام ہم لوگ دو برجوں والے گاؤں میں داخل ہوئے ۔ رات یہاں ایک مسجد میں بسر کی۔ کھٹملوں نے ساری رات آنکھ جھپکنے بھی نہیں دی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس گاؤں کا رہنے والا کوئی شخص اپنی موت نہیں مرتا دشمن کی گولی سے مرتا ہے جب تک آپس میں معاہدہ نہ کرلیں تو صرف عورتیں ہی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں کیونکہ مردوں کے نمودار ہونے پر گولی چلا دینا ضروری امر ہے۔ تاہم قبائل اپنے اندرونی علاقے میں بدامنی برداشت نہیں کرتے ۔ اسی لئے کبھی اگر دونوں برجوں کے درمیان جنگ شروع ہو جائے اور گردونواح کے لوگ یہ جنگ بند کرانے میں ناکام ہو جائیں تو پھر اپنے ہی قبیلہ کے عمر رسیدہ سفید ریش بزرگ بیچ بچاؤ کے لئے آگے بڑھ کر فیصلہ کرا دیتے ہیں۔ ان دونوں برجوں کے درمیان ایک معاہدہ (پشتو میں جوتیگہ[10] کہلاتا ہے) حاجی صاحب ترنگ زئی نے طے کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایک برج والے عہد شکنی کے مرتکب ہوئے جس پر حاجی صاحب نے انہیں تنبیہ کی لیکن جارح نہیں مانے۔ لہٰذا قاعدے کی رو سے گردونواح کے اسی سے (۱۰۰ - ۸۰) افراد کے ہمراہ حاجی صاحب جارح کے ہاں آکر ٹھہر گئے۔ اور اس وقت تک وہاں مقیم رہے جب تک انہوں نے مقررہ جرمانہ ادا نہیں کیا۔ معاہدہ ایک بار پھر طے کرانے کے بعد حاجی صاحب معہ دیگر مہمانوں کے یہاں سے رخصت ہوئے۔

مہمندوں کا وطن

مہمند قبیلے کا علاقہ ناوگئی باجوڑ سے دریائے کابل تک پچیس میل لمبے اور تقریباً اتنے ہی چوڑے رقبے پر مشتمل تھا۔ پہاڑوں پر سبزہ بالکل نہیں ہے اور خشک ہیں۔ لیکن درمیان والا علاقہ زرخیز ہے۔ سال میں صرف ایک گندم کی فصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر بارش نہ ہو تو پھر قحط سالی ہی رہتی ہے۔ یہاں کے باسی جوہڑوں کا پانی پینے کے لیئے استعمال کرتے ہیں۔

ہم لوگ صبح سویرے دو برجوں والے گاؤں سے روانہ ہوئے چڑھتی دوپہر تک چلنے کے بعد ایک ایسے ہی جوہڑ پہ پانی پینے کے لئے آئے ۔ وہاں پر چند آدمی جو فصلوں کی کٹائی والے[11] (لوگری) درانتیاں ہاتھوں میں لئے ستا رہے تھے۔ بابا نے ان سے علیک سلیک کی اور وہ سب ہاتھ ملانے کے لئے اُٹھ

کھڑے ہوئے۔ پانی پینے کے بعد جب ہم نے چلنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ہمیں روکتے ہوئے کہا کہ "بیٹھئے کھانا آرہا ہے کھا کر جائیے اور" جو کچھ روکھا سوکھا تیار ہے وہی دوست کے لیئے حاضر ہے"۔ ہم نے دیکھا کہ چند عورتیں کھانا سروں پر اٹھائے ان کی طرف آرہی تھیں۔ بابا نے ان کو کہا کہ ہمیں ابھی اور آگے بھی جانا ہے ہمیں سفر کرنے کی اجازت دیجئے۔ ہم آگے کہیں کھالیں گے کیونکہ کھانا تو صرف آپ کے لیئے ہی آرہا ہے۔ لیکن وہ نہ مانے۔ ہمارا مسلسل انکار کارگر ثابت نہ ہوا اور ان لوگوں نے اصرار کرکے ہمیں روک لیا۔ انہوں نے ہمارے ہاتھ دھلوائے اور ہمیں کھانے پر بٹھایا۔ میزبانوں سے صرف ایک آدمی ہمارے ساتھ کھانے پر بیٹھا لیکن وہ بھی کھانا کم اور دکھانا زیادہ والے اصول پر عمل پیرا تھا۔ اس کی کوشش بھی یہی تھی کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ کھلائے تاکہ ان کی مہمان نوازی کی روایت زندہ رہ سکے۔ ہم لوگ مسافت اور تھکان کے باعث کچھ زیادہ ہی بھوکے تھے۔ اس گندم کی تازہ تازہ نرم وگرم روٹی نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ اس کھانے میں جو لطف ہمیں آیا وہ کبھی گھر پر میسّر نہیں تھا۔

لکڑئی

میزبانوں سے رخصت ہوکر ہم لوگ شام ڈھلے حاجی صاحب ترنگزئی کے مسکن لکڑئی پہنچے۔ گاؤں نزدیک سے بھی نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ حاجی صاحب کی ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ ساتھ ہی بڑی مسجد کے علاوہ ان کے متعلقین کے گھر آباد تھے۔ حاجی صاحب کے ایک نائب نے ہمیں مسجد سے اٹھاکر حجرے میں لے گئے۔ اتمانزئی کے خان عبدالغفار خان کا خط ہم نے اس کو دیا۔ اس کو پڑھ کر اس نے ہماری خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اگلے روز ہماری ملاقات حاجی صاحب سے ہوگئی۔ انہوں نے ہمیں دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ "جوانو! تمہارے حوصلے بلند اور ارادے نیک ہیں۔ خداوند کریم تمہارے ہمت اور استقلال کو دوام بخشے تاکہ اپنے غلام وطن کی آزادی کے لیئے ٹھوس کام کرسکو۔ انگریز کی غلامی[۱۲] سے وطن کو نجات دلانے کے لئے تم جیسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ تم لوگ ایسے وقت پر افغانستان کو جارہے ہو۔ جب کہ وہاں آزادی اور جہاد کا علم بلند ہوچکا ہے۔[۱۳]

خداوند کریم انگریز کی غلامی سے مسلمانوں کو نجات دلائے۔"

باجوڑ

چھ روز تک ہمارا قیام حاجی صاحب کے ساتھ رہا۔ ہمارے ٹھہرنے کے تین چار روز بعد باجوڑ کے مازون صاحب کے انتقال کی خبر یہاں موصول ہوئی۔ میں نے بھی حاجی صاحب کے ہمراہ جنازے میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ مازون صاحب کا گاؤں یہاں سے دس بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ میرے لئے ایک الگ گھوڑے کا انتظام کیا گیا۔ وہاں پہنچنے پر مجھے حاجی صاحب کی طاقت اور اثر و رسوخ کا صحیح اندازہ ہوا۔ ایک گھڑسوار سرپٹ دوڑ لگاتے ہوئے حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور آکر کہنے لگا کہ جناب والا اگر آپ اجازت دیں تو جار خان معہ تیس افراد کے مازون صاحب کے جنازے میں شرکت کرے۔ حاجی صاحب نے اجازت دے دی۔ تھوڑی ہی دیر میں جار خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جنازے میں شرکت کے لئے آگیا۔ جار خان ایک عمدہ نسل کے گھوڑے پر سوار تھا۔ یہ باجوڑ کے علاقے کا سب سے بڑا خان تھا۔ کچھ عرصہ قبل اس میں اور حاجی صاحب کے درمیان ایک خونریز جھڑپ ہوئی اور صلح اس بات پر ہوئی تھی کہ جار خان آئندہ انگریزوں سے نہ تو کوئی سالانہ ماجب لے گا اور نہ ہی کوئی دوسرا فائدہ حاصل کرے گا۔

ایک ہم وطن سے ملاقات

نماز جنازہ سے کچھ دیر قبل ایک جگہ پر کھڑا میں باجوڑ کے میدان کا جائزہ لے رہا تھا کہ اتنے میں ایک آدمی پر نظر پڑی۔ یہ شخص اس علاقے کا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حلیے سے پشاور یا مردان کا باشندہ لگ رہا تھا۔ اس نے میرے نزدیک آکر میرے ساتھ علیک سلیک کی اور باتوں ہی باتوں میں مجھ سے دریافت کیا کہ بھائی تو کون ہے اور کہاں جا رہا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ موضع بدرشی علاقہ خٹک کا رہنے والا ہوں اور میں اور میرے ساتھی افغانستان کی مدد سے اپنا وطن انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کا مقصد رکھتے ہیں۔

جس پر اس نے کہا کہ صرف نام کی اسلامی حکومت قائم کرنے سے آپ آسودہ نہ ہو سکیں گے۔ حکومت عوام کی بنانی چاہیئے تاکہ عوام کو مشکلات سے چھٹکارا ملے۔ اس شخص کی باتیں میرے لئے عجیب اور نئے انداز کی تھیں۔ یہ حیران کن گفتگو ابھی جاری تھی کہ حاجی صاحب کی واپسی کا اعلان سُنا۔ جب میں اپنی جگہ واپس لوٹا تو حاجی صاحب جا چکے تھے اور ساتھ ہی میرا خالی گھوڑا بھی کوئی لے گیا تھا۔ ایک شخص جو لکڑی سے حاجی صاحب کے ہمراہ آیا تھا اس کے ہمراہ میں واپس پیدل چل پڑا۔

ناوگئی

تھوڑی دیر بعد ہم ناوگئی پہنچ گئے۔ یہ جگہ پشتونوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ پشاور کی جانب سے انگریزی فوج مہمند علاقے کے پہاڑوں کے دامن تک آسکتی تھی اور یہی وہ پہاڑ ہیں جہاں جیالے مہمندوں نے انگریزوں کو ہمیشہ شکست دی ہے۔ اسی طرح دوسرا راستہ ان کے لئے مالاکنڈ کے درّے پر تھا۔ ایک مرتبہ انگریز مالاکنڈ سے تیمرگرہ والے راستے پر باجوڑ تک پہنچے تھے اور پھر باجوڑ سے ناوگئی کے راستے مہمندوں پر حملہ کیا تھا لیکن انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ انگریزی فوج نے پسپا ہوتے ہوئے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ ناوگئی۔ باجوڑ۔ تیمرگرہ اور مالاکنڈ سے ہوتے ہوئے پشاور پہنچا تھا۔

سکندر اعظم بھی ناوگئی کے راستے سے باجوڑ اور پھر باجوڑ سے تیمرگرہ۔ مالاکنڈ شہباز گڑھی اور ہنڈ نامی مقام سے دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ اسی طرح بابر مغل نے بھی یوسف زئی پشتونوں سے خونریز جنگ کے بعد ناوگئی کے راستے ہی باجوڑ میں داخل ہونے کے بعد تیمرہ گرہ۔ مالاکنڈ۔ شہباز گڑھی اور ہنڈ نامی مقام سے دریائے سندھ عبور کیا تھا۔ اب یہاں ایک بوسیدہ قلعہ اور چند کھنڈرات ناوگئی کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ناوگئی انگریزوں کی آمد سے پہلے ایک قابل دید مقام تھا اور اس وقت بھی اپنے تاریخی پس منظر کی روشنی میں بہت اہمیت کا حامل ہے اور جب وطن عزیز غیروں کی غلامی سے نجات حاصل کرے گا تو ناوگئی کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہو گی کہ یہ دنیا کی عظیم ترین شاہراہوں کا سنگم رہا ہے۔ یہاں زمانہ قدیم میں جلال آباد سے ناوگئی۔ باجوڑ۔ تیمرگرہ۔ مالاکنڈ درّے سے شہباز گڑھی اور ہنڈ سے دریائے سندھ

کو عبور کر کے ٹیکسلا کے راستے ہندوستان سے ملانے والی ایک بڑی شاہراہ قائم تھی۔ ناوگئی اس عظیم شاہراہ پر ایک بڑا شہر آباد تھا۔ اس شہر کا نام ناوگئی تجویز کرنے والے نے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ دراصل پرنالے کو پشتو میں نادہ کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جبکہ باجوڑ ایک اونچے مقام کا حامل ملک ہے اور یہاں سے بارش کا پانی مذکورہ نالے میں بہتا ہوا مازون صاحب کے گاؤں سے ڈھلوان کی جانب مہمندوں کے علاقے کو سیراب کرتا ہے۔ ناوگئی کے نزدیک مہمندوں کے پہاڑ دیواروں کے مانند ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک واقع ہیں کہ صرف تقریباً سو قدم کا فاصلہ علاقہ مہمند اور باجوڑ کو الگ کیئے ہوئے ہے۔ ہمارا سفر جاری تھا اور میں ہم سفر سے اردگرد کے علاقوں کے حالات معلوم کرتا جا رہا تھا۔ راستے میں مرد عورتیں میرے متعلق میرے ہمسفر سے استفسار کر کے پوچھتے کہ یہ پشاوری کس کا مہمان ہے؟ انہیں جواب ملتا کہ حاجی صاحب ہم لوگ شام ڈھلے لکڑئی پہنچے۔

چمرقند[14] اور ہندوستانی مجاہدین

ہمارا ساتھی محمد اکبر خان بیمار پڑ گیا۔ دوسرے ساتھی سلطان محمد خان نے کہا کہ ہمیں ان کے تندرست ہونے تک ایک دن مزید حاجی صاحب کے ہاں ٹھہرنا چاہیئے۔ لیکن محمد اکبر خان نے پروگرام تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ چھ روز حاجی کے ساتھ بسر کرنے کے بعد ہم اگلی منزل پر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ہمیں ایک خط دیا جو یاغستان اور افغانستان کے لئے ایک پاسپورٹ سے کم نہیں تھا بلکہ اس نے راستے بھر بہت کام دیا۔ خط دکھانے کے بعد ہمیں نہ صرف کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ہر جگہ لوگوں نے ہماری پذیرائی میں بھرپور حصہ لیا۔

بیمار محمد اکبر کے لئے ایک خچر کرایہ پر حاصل کیا گیا جس کا مالک ایک سکھ تھا۔ اس نے تھری ناٹ تھری بندوق کندھے پر لٹکائے ہمارا ساتھ دیا۔ ہم دوپہر تک چمرقند پہنچ گئے۔ چمرقند افغانستان اور مہمند قبیلہ کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں ستر کے قریب ہندوستانی مجاہدین رہتے ہیں۔ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ہر غزا میں پشتون غازیوں کی مدد کی[15]۔ دراصل چمرقند مجاہد اعظم ہڈے صاحب[16] کا انگریز دل کے

خلاف ایک بڑا مرکز تھا اور یہ مجاہدین غالباً اس صدی کے شروع میں سمتے بونیر سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے اور ہندوستان کے رہنے والے ہیں اب بھی ہندوستان سے ان کو اتنا روپیہ موصول ہو رہا ہے جس سے وہ اپنے لئے اسلحہ اور خورد و نوش کا انتظام بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں افغانستان بھی اپنی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا ہے۔ یہ مجاہدین انیسویں صدی کے درمیان سے پہلے سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کے بچنے والے سپاہیوں کا گروہ تھا جو ہزارہ اور بالاکوٹ کی لڑائی کے بعد بند سمتے میں ٹھہر گیا تھا۔ اسی گروہ نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جذبہ آزادی کی شمع جلائی رکھی اور انیسویں صدی کے آخر میں اسی سو (۸۰-۱۰۰) افراد پر مشتمل یہ مجاہدین وہاں سے چمرقند اُٹھ آئے اور ہڈے صاحب کے اس مرکزی مقام پر آباد ہو گئے۔ اب تک ہڈے صاحب کی مسجد ان کی رہائش اور نماز کی جگہ ہے۔ کچھ کچے مکانات بھی رہائش کے لئے بنائے گئے ہیں۔ مسجد نہایت مضبوط تیار کی گئی ہے۔ اس میں لگے ہوئے شہتیر ناتراشیدہ گیلیاں ہیں۔ مسجد کچھ اس طرح تعمیر کی گئی ہے کہ کچھ ہی فاصلے سے بھی دکھائی نہیں دیتی۔

چمرقند سطح سمندر سے چار پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ مئی کی آخری تاریخ تھی لیکن ہم نے کمرے کے اندر رات بسر کی ساری رات آگ کمرے کے اندر جل رہی تھی اور پھر بھی ہم لحافوں میں پڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ چمرقند پہاڑ کی چوٹی سے نیچے واقع ہے۔ مجاہدین کا کہنا تھا کہ پہاڑ کی چوٹی ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ یہاں دیودار کے درخت کھڑے تھے اور جنگلی ریچھ بھی کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی سے برف کا پانی مسجد کے بازو میں ہمیشہ بہتا رہتا ہے۔ نیچے مجاہدین کچھ کھیتی باڑی کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے تھے لیکن اس کی طرف ان کا کچھ زیادہ رجحان نہیں تھا۔

سرفراز خان کا پیشمان ہو کر واپس لوٹنا

ہم لوگ آگے بڑھنے کی تیاری میں مشغول تھے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ جس کو دیکھ کر محمد اکبر سخت پریشان ہو گیا۔ اس شخص نے آتے ہی ایک لفافہ محمد اکبر کے حوالے کیا۔ محمد اکبر نے خط پڑھنے کے بعد سلطان محمد اور گوہر کو الگ کیا۔ پانچ منٹ بعد وہ ہمارے ساتھ آکر بیٹھ گئے۔ محمد اکبر نے جلدی

سے ایک خط اپنے والد صاحب کو لکھا۔

بزرگوارم !

میں وطن کو غیروں کی غلامی سے آزادی دلانے کا نیک مقصد لے کر گھر سے نکلا ہوں۔ میرے واپس لوٹ کر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ میرے لئے صرف دعا کریں۔

آپ کا محمد اکبر

یہاں قاصد کو دیکھ کر سرفراز خان کی حالت دگرگوں ہو چکی تھی۔ جسے سلطان محمد خان اور گوہر رحمان بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے سرفراز خان کو کہا کہ اگر آپ واپس جانا چاہتے ہیں تو اس سے بہترین کوئی دوسرا موقعہ آپ کو میسر نہ آئے گا۔ سرفراز خان نے لجاحت آمیز لہجے میں کہا کہ میرا ملازم حاجی صاحب کے رہنے کی جگہ سے فرار ہو چکا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں واپس وطن کو لوٹ جاؤں۔ ہم نے اسے بخوشی قاصد کے ہمراہ رخصت کیا۔

کونڑ کی وادی

ہم نے امیر مجاہدین عبدالکریم اور دوسرے مجاہدین سے رخصت لی۔ انہوں نے ایک مجاہد کو ہمارے ساتھ کر دیا۔ تاکہ وہ ہمیں سرکانئی کے کرنیل صاحب تک پہنچا دے۔ جون کی پہلی تاریخ کو ہم چمرقند کنڈاؤ کے راستے افغانستان کی حدود میں داخل ہو گئے۔ کنڈاؤ کی چوٹی سے ہم تین گھنٹوں میں نیچے سرکانئی اترے۔ چمرقند سے ہمراہ آنے والے مجاہد نے سرکانئی جو کہ افغانستان کی چھاؤنی ہے کے کرنیل صاحب کی جگہ تک ہمارا ساتھ دیا۔

وادی کونڑ وادی چترال کے جنوب میں واقع ہے۔ دریائے چترال وادی کونڑ میں دریائے کونڑ کے نام سے موسوم ہے۔ دریا سے مشرق کی جانب چمرقند کا بے آب و گیاہ سلسلہ کوہ ہے اور مغرب کی جانب آٹھ دس ہزار فٹ کے بلند و بالا پہاڑ واقع ہیں جس پہ دیودار کے گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ وادی سرکانئی کے سامنے کشادہ اور عقب میں

تنگ ہے۔

کرنیل صاحب ایک عالم اور قابل شخص تھے۔ ان کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے بغیر انہیں کھانے کا لطف نہیں آتا تھا۔ روزانہ اخبار کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد اسے سلیقے سے ریک میں رکھنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ جب بھی میں نے اخبار پڑھ کر لاپرواہی سے ایک جانب پھینکا انہوں نے فوراً اٹھ کر خود اسے سلیقے سے اٹھا کر رکھ لیا۔ ایک بار دوران گفتگو ہمارے کسی ساتھی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر کے نام سے موسوم کیا تو انہوں نے فوراً اس کی اصلاح کرتے ہوئے کہا "نوجوان یہ لڑائی ہندوستان کی جنگ آزادی تھی۔ اسے غدر کہنا درست نہیں۔"

دوسرے دن کرنیل صاحب کے جوان بیٹے نے دریا کی سیر میں میرا ساتھ دیا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں نقشے کو سمجھ سکتا ہوں؟ "ہاں لیکن مکمل طور پر نہیں۔ کیونکہ سکول میں ہمیں یہ مضمون لازمی طور سے نہیں پڑھایا گیا۔" میں نے جواب دیا۔

اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا کہ کرنیل صاحب کے لڑکے کا نقشے کے علم کے متعلق استفسار کیوں ہے لیکن افغانستان میں میرے قیام کے دوران مجھے جن مرحلوں سے گذرنا پڑا اس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ افغانستان یہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھی غیر شخص جو نقشوں کی سوجھ بوجھ رکھتا ہو افغانستان کی سرزمین کا تفصیلی جائزہ لے اور یہاں سے متعلق معلومات دشمن کو مہیا کر سکے۔

تیسرے روز صبح سویرے ہم چار آدمی جالہ (دریا کو عبور کرنے کے لئے بڑی بڑی لکڑیاں آپس میں باندھ دی جاتی ہیں اور ان سے پھر کشتی کا کام لیا جاتا ہے) میں سوار ہو کر دریائے کونڑ کے بہاؤ پر روانہ ہو گئے۔ دریائے کونڑ نہایت تیز رفتار دریا ہے جس سے ہماری رفتار کسی موٹر کی رفتار سے ہرگز کم نہیں تھی۔ وادی کونڑ نہایت سرسبز و شاداب اور حسین وادی ہے۔ قدرت نے کائنات کا تمام تر حسن اس وادی کو عطا کیا ہے۔ پہاڑ سرسبز تھے اور دریا کے دونوں کنارے بھی سرسبزی میں بے نظیر تھے۔ دریا کے دونوں کناروں پر شہتوت کے درختوں کی بہتات تھی۔ ایک جگہ وادی اس قدر تنگ تھی کہ ہم جالہ میں سوار دریا کے کنارے کام کرنے والوں سے مزے لے لے

کر باتیں کرتے جا رہے تھے۔

جلال آباد

ہم لوگ عصر کے قریب جلال آباد پہنچ گئے۔ کونڑ کی تنگ وادی ختم ہو چکی تھی۔ اب ہمارے سامنے جلال آباد کا وسیع میدان تھا۔ جالہ بان نے ہمیں بے سود نامی گاؤں کے قریب اتار دیا۔ ہم لوگ رات بسر کرنے کے لئے اس گاؤں کی مسجد میں داخل ہوئے۔ شام کی نماز وہیں ادا کی۔ نمازی نماز پڑھنے کے بعد یکے بعد دیگرے مسجد خالی کر کے چلے گئے۔ مسجد میں صرف ہم اور امام مسجد رہ گئے۔ امام صاحب کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ دو چار لقمے ہی لئے تھے کہ ان کا خیال ہماری جانب ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے کھانا کھایا ہے؟

میری اس وقت کچھ عجیب سی حالت تھی۔ میرے دوستوں کو پشتو نہیں آتی تھی ہر جگہ ان کی ترجمانی میں نے کی لیکن اس وقت میں کچھ عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ نہ "ہاں" کہہ سکتا ہوں اور نہ "نہ" کہہ سکتا ہوں۔ پہلے جواب کی بھوک کے مارے ہمت نہیں پڑتی تھی اور نہ کہہ کر دوستوں اور پیٹ کی دشمنی مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اسے واضح جواب کوئی نہیں دیا بلکہ "اوں آں" کہہ کر اسے سمجھنے کا موقعہ دیا کہ ہم لوگ بھوکے ہیں۔ امام صاحب سمجھ گئے اور اپنے آگے پڑی ہوئی روٹی بغیر توقف کے ساگ کے ہمراہ جو وہ کھا رہے تھے ہمارے آگے کر دی۔ اسے ہم لوگوں نے نہایت شوق سے کھایا۔

نیچے مسجد کے صحن میں پسّو اور گرمی تھی۔ امام صاحب کے مشورے پر مسجد کی چھت پر سونے کے لئے لیٹ گئے۔ چار آدمیوں کے ساتھ دو کوہاٹی چادریں تھیں جنہیں ہم نے بچھونا بنا دیا۔ نصف شب کے بعد جب سردی لگی تو چادریں نیچے سے نکال کر اوڑھ لیں۔ لیکن سردی کا یہ عالم تھا کہ چادریں نیچے اوپر کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ حالانکہ یہ علاقہ افغانستان کا گرم ترین علاقہ تھا۔ اور جون کے پہلے ہفتے میں یہ عالم تھا کہ سردی کے مارے ساری رات نیند نہیں آئی۔

بے سود اور جلال آباد کے درمیان ایک گہرا نالہ بہہ رہا تھا اسے پھر جالہ کے ذریعہ عبور کیا جالہ بان سمجھ گیا کہ مسافر ہیں تو اس نے ایک قیران فی کس کے حساب سے نالہ عبور کروایا۔ جلال آباد کی ایک سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا اور اپنا مال و اسباب اس میں رکھا۔ سامان رکھنے کے بعد اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ میں نے وطن میں ایک سال سے داڑھی بڑھائی تھی۔ وہاں اسے صاف کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس خیال سے صاف نہیں کی کہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ مسلمان حجام سے حجامت بنواؤں گا۔ لہذا سرائے کے ایک حجام سے داڑھی صاف کرائی۔ صاف ستھرے کپڑے زیب تن کئے۔ اور حکومت کے کسی ذمہ دار افسر سے ملاقات کی غرض سے باہر نکلے تاکہ اسے اپنے آنے کی غرض و غایت سے آگاہ کریں تاکہ وہ ہماری مدد اور رہنمائی کر سکے۔

سپہ سالار نادر خان[18] سے ملاقات

اگلے روز دوپہر کے بارہ بجے سپہ سالار سے ہماری ملاقات کا وقت چمرقند کے نائب وکیل جو کہ جلال آباد میں مقیم تھے کی وساطت سے طے پایا۔ سپہ سالار صاحب مجاہدین سے 1919ء کی لڑائی میں ان کی اعلیٰ کارکردگی سے خوش تھے۔ وقت مقررہ پر ہم جب سپہ سالار صاحب سے ملاقات کے لئے پہنچے تو وہ ایک سادہ کمرے میں سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے۔ وہ کرسی پر فروکش تھے اور سفید ململ کا عمامہ اور سفید ہلکی کابلی فیشن کی شلوار زیب تن کئے ہوئے تھے۔ کمرے میں چاروں طرف کتابوں کی بھری ہوئی الماریاں دیوار کے ساتھ ایستادہ تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی کرسی سے اٹھے اور پرتپاک انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہمارے ساتھیوں کو خوشی تھی کہ سپہ سالار صاحب صاف اور سلیس اردو بولنے پر قادر تھے۔ بات چیت کے دوران انہوں نے ہندوستان کے شمال مغربی صوبہ سرحد میں بڑی دلچسپی لی۔ انہوں نے محمد اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ضلع ہزارہ کے لوگ پشتون ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ پشتو زبان کی طرف زیادہ توجہ دیں۔

سپہ سالار صاحب نے افغانستان کی نئی کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ درست ہے کہ ہم دشمن سے نئی زمین حاصل نہیں کر سکے لیکن ہم نے جو مکمل آزادی حاصل کر لی ہے ہم اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں

ہم نے سپہ سالار صاحب کو اپنی آمد کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم یاغستان کے قبائل کے ہمراہ حکومتِ افغانستان کی مدد سے اپنے وطن کی آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں اور بوقت ضرورت جلال آباد میں حاضری دیتے رہیں گے۔ سپہ سالار صاحب نے کہا کہ افسوس ہے کہ اعلیٰ حضرت افغانستان امان اللہ خان کا فرمان ہے کہ مہاجرین کابل میں ٹھہرائے جائیں گے۔ ہاں آپ لوگ تسلی رکھیں۔ افغانستان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ سپہ سالار صاحب نے ہمارے لئے کابل ٹیلیفون کیا اور ان کو اطلاع دی کہ اسلامیہ کالج پشاور کے چار نوجوان طلباء جلال آباد پہنچے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ وہ یہیں ٹھہر جائیں۔ لیکن وزارت خارجہ نے یہ جواب دیا کہ اعلیٰ حضرت کے حکم کے مطابق ان کو کابل بھیج دیا جائے۔

کابل میں ہمیں معلوم ہوا کہ سپہ سالار صاحب کے ٹیلیفون نے ہمارے لئے اچھی رائے قائم کروائی ہے۔ مجاہدین کے نمائندے مولوی بشیر صاحب[19] کی خواہش یہ تھی کہ ہم جلال آباد میں ہی ٹھہر جائیں اس کے لئے انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ طلباء مجاہدین ہیں۔ لیکن پشاور کے ایک انقلابی رہنما قاضی عبدالولی خانصاحب وزارت خارجہ سے متفق تھے کہ ہمیں کابل چلا جانا چاہیے۔

دوسرے مہاجرین

ملاقات کے بعد ہمیں مہمان خانہ بھیج دیا گیا۔ جہاں دس بارہ اور مہاجرین پشاور سے براستہ خیبر تین روز کی مسافت طے کر کے ہم سے ایک دن پہلے یہاں پہنچ چکے تھے۔ جن دنوں ہم وطن سے روانہ ہو رہے تھے وہاں عوام میں ہجرت کا موضوع زیرِ بحث تھا۔ اب ان مہاجرین سے معلوم ہوا کہ ہجرت اب منظم طریقے سے عملی طور پر شروع ہونے والی ہے۔ نئے مہاجرین میں نصف تہکال (پشاور) کے رہنے والے تھے اور نصف لاہور کے رہنے والے تھے۔ تیسرے دن بریگیڈیئر غلام نبی خان نے تمام مہاجرین کو کھانے

پر بلوایا۔ دعوت پر کچھ فوجی افسران اور ہندوستان کے انقلابی شامل ہوئے۔ دوران گفتگو بریگیڈیئر صاحب نے انکشاف کیا کہ ہندوستان کی آزادی ایشیا بھر کی آزادی کی ضمانت ہے اور ہندوستان کی غلامی ایشیا بھر کی غلامی ہے۔ جب ہمیں اپنے اس اقدام کی اہمیت کا پتہ چلا تو آزادی وطن کا جذبہ ہمارے سینوں میں اور بھی شدت سے موجزن ہوا۔

جلال آباد افغانستان کا ایک اہم مقام ہے۔ اسے دفاعی طور پر مضبوط بنانے کے لئے حکومت افغانستان نے یہاں ایک منظم اور اعلیٰ فوج رکھی ہے۔ علاوہ ازیں آزاد قبائل کو اہمیت اور امداد دینے کا بھرپور طریقہ بھی اپنا رکھا تھا تاکہ انگریزی استعمار کی حریصانہ پالیسی کا موثر انداز میں مقابلہ کر سکے۔

جلال آباد کے جنوب مشرق میں مہمند قبائل آباد ہیں۔ داخلی افغانستان میں بھی بہادر قبائل آباد ہیں جو ہمیشہ انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔ لیکن آفریدی۔ مہمند اور شنواری قبائل جلال آباد کے لئے ڈھال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انگریزوں سے لڑائی کے دوران ہمیشہ افغانستان اور یاغستان کے تمام قبیلے یک جان ہو کر لڑتے رہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ پشتون کبھی غلامی قبول نہیں کرتا۔

افغانستان سے انگریزوں نے بے شمار جنگیں لڑی ہیں اور آزاد قبائل نے ہمیشہ افغانستان کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگائی۔ خاص طور پر خیبر کی ناکہ بندی سے اکثر انگریزی فوج کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح وزیرستان کے قبائل نے ۱۹۱۹ء سے انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کی ہے اور ابھی تک لڑ رہے ہیں۔

پہلے پہل تو یہ دیکھ کر ہمیں بہت صدمہ پہنچا کہ افغانستان کی فوج اچھے اسلحہ سے محروم ہے لیکن جلد ہی یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ اس افغان حکومت میں ہر ایک آدمی بحیثیت پشتون اپنی ایک اچھی بندوق کا مالک ہے۔ جنگ کے دوران عام آدمی بھی انگریزوں کے خلاف فوج کے شانہ بشانہ لڑتے ہیں نیز داخلی مسائل سے حکومت بالکل مطمئن تھی کیونکہ تمام تر مسائل حکومت عوام کی مرضی سے حل کرتی تھی۔ عوام پر ٹیکس نہیں لگا کرتے جبکہ اس کے مقابلے میں ہندوستان کے عوام کو انگریزوں نے نہ صرف غیر مسلح رکھا بلکہ ان پر

بت سے ٹیکس لگا کے اور اسی ٹیکس سے وصول کردہ آمدن سے ان کی بلائی کی تنخواہیں مزید مضبوط کیں۔ افغانستان کے عوام نے کبھی بھی انگریزی استعمار کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

جلال آباد ایک سرسبز اور وسیع میدان میں آباد ہے۔ کابل سے سطح مرتفع آہستہ آہستہ کم ہوتی ہوئی جلال آباد پر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کونڑ کی وادی بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی ہوئی جلال آباد کے میدان میں بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ کوہ سفید جلال آباد کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اس کی چوٹی پر سال بھر برف جمی رہتی ہے اسی نسبت سے اس کا نام کوہ سفید پڑا ہے۔

کوہ سفید سے وادی کونڑ کے پہاڑوں اور تورغم سے لے کر کابل تک ایک وسیع میدان واقع ہے جو باوجود اپنی ہموار کے پانی کی وافر مقدار میں موجودگی کے باعث زراعت کے قابل ہے اور یقیناً وہ وقت دور نہیں جب یہ مقام میوے کی صنعت کے لئے ایسا کارآمد ثابت ہوگا کہ افغانستان کی غربت کا خاتمہ کر دے گا۔

جلال آباد اس تمام وادی کے نچلے حصے پر درہ خیبر کے سامنے اس شاہراہ پر واقع ہے جو قرون وسطیٰ میں پشاور سے کابل اور بلخ کو آپس میں ملاتا تھا۔ شاہراہ قراقرم کے ساتھ یہ شاہراہ بلخ کے مقام پر ملتی تھی۔ اور شاہراہ قراقرم (شاہراہ ریشم) کے ذریعے یورپ سے ترکی ایران اور ترکستان کے راستہ چین کو تجارتی کاروان چلتے تھے۔ ان شہروں میں دولت کے انبار پڑے ہوئے تھے لیکن انگریزوں نے یہ راستہ تباہ کر دیا۔ اور یورپ کو سمندر کے لمبے اور طویل راستے ہندوستان کو ملایا۔ لیکن ہندوستان کی آزادی پر ایک بار پھر یہ راستہ تاجروں کی کشش کا باعث ہوگا اور جلال آباد ایک بار پھر ایک قابلِ دید مقام بن جائے گا۔

جلال آباد تا کابل

چوتھے روز ہم تہکال کے ساتھیوں کے ہمراہ تانگوں میں بیٹھ کر کابل کی سمت روانہ ہوئے۔ تانگہ بان سے بیس کابلی روپے فی کس کرایہ طے ہوا تھا۔ پہلے دن کا سفر کم تھا رات ہم فتح آباد پہنچ گئے۔

ہم افغانی رعایا بن گئے

رات فتح آباد میں بسر کی دوسرے روز کی شام کو نیلا پہنچے۔ یہ تمام سفر ہمارا سرکاری مہمان کی حیثیت سے جاری تھا۔ ہر پڑاؤ پر سرکاری مہمان خانے موجود تھے۔ جن میں ہر قسم کی سہولت ہمیں مہیا کی گئی۔ لذیذ طعام پلاؤ جو یہاں کے عوام کی عام پیش کش تھی سے لطف اندوز ہوتے جا رہے تھے۔ نیلا پڑاؤ کے مہمان خانے میں شام کا کھانا کھانے کے بعد تھکان کے باعث ہم لوگ جلدی سو گئے۔ ابھی آنکھ جھپکنے بھی نہ پائی تھی کہ ہمیں جگا کر رعیت نامے پر جس میں ہمارا پورا حلیہ درج تھا ہم سے دستخط حاصل کئے گئے بعد میں ہر شخص کو اپنا رعیت نامہ جو کہ ایک پاسپورٹ کی حیثیت رکھتا تھا دیتے ہوئے ہمیں تلقین کی گئی کہ اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں تاکہ داخلی افغانستان میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

مولانا کا خواب

رعیت نامہ حاصل کرنے کے بعد ہم لوگ پھر سو گئے۔ میرے نزدیک جو ساتھی پڑا تھا وہ دہلی کا رہنے والا تھا۔ ہم لوگ اسے مولانا کے نام سے پکارتے تھے۔ کمزور اور نحیف بدن کا مالک تھا۔ جب ہماری نیند ذرا گہری ہوئی تو مولانا صاحب اچانک چلّا اٹھے۔ ان کے ہائے پکار سے مہمان خانے میں ایک کہرام مچ گیا۔ ہم سب لوگ جاگ اٹھے۔ مولانا نے نیند میں شور و غوغا کے بعد بھاگنے کی تیاری کی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے ہاتھ سے تھام لیا۔ جس پر اس نے مزید کہرام مچا دیا۔ مولانا میری گرفت سے ہاتھ

چھڑانے والے ہی تھے کہ میں نے اسے گردن سے دبوچ کر زمین پر بٹھا دیا۔ وہ ہانپتے کانپتے نیند سے بیدار ہوئے۔ ہم سارے ساتھی پریشان تھے کہ آیا مولانا کا دماغ چل گیا یا کسی گہرے خوف سے گھبرا گئے ہیں۔ آخر مولانا نے زبان کھولتے ہوئے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ پشاور ریلوے اسٹیشن پر پولیس نے بڑھ کر مجھے گرفتار کر لیا۔ میں امداد کے لئے چلا رہا ہوں کہ اتنے میں سپاہیوں نے پہلے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر میری گردن دبوچ کر مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ اس لئے میں چلّا رہا تھا۔ جب ساتھیوں کو معلوم ہوا کہ مولانا کی گردن اور ہاتھ میں نے پکڑے تھے تو وہ لوگ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

خاک جبار

ہم نیلا سے صبح سویرے روانہ ہوئے۔ راستہ سخت ناہموار تھا جہاں نشیب و فراز کے باعث گھوڑے تانگہ کھینچنے سے عاجز آتے تو ہم لوگ تانگہ سے اتر کر ساتھ پیدل ہو لیتے تھے۔ فتح آباد سے کابل تک سطح مرتفع ہے۔ راستہ خشک اور ویران تھا۔ بعض جگہ نالوں میں پانی بہہ رہا تھا۔ کناروں پر کچھ کھیتی باڑی بھی نظر آئی۔ دوپہر تک ہم جگدلک اور سرخ پل عبور کر گئے۔

شام خاک جبار نامی مقام پر پہنچے اور چوتھے روز دوپہر ڈھلے کابل خورد نامی درے کو عبور کیا۔ درہ مذکورہ وہ جگہ ہے جہاں انگریز افغان جنگ میں انگریزی فوج کے بارہ ہزار افراد افغانوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ جنگ مذکورہ کی کہانی ایک زخمی ڈاکٹر[۲۱] جو گھوڑے پر سوار واپس جلال آباد پہنچا تھا نے انگریز ہائی کمان کو بیان کی تھی۔

عصر کو ہم بت خاک پہنچے۔ یہاں سے کابل شہر سامنے نظر آ رہا تھا۔ گمرک میں ہمارے سامان کی تلاشی لی گئی اور ہمیں اس وقت تک وہاں بیٹھنا پڑا جب تک انہوں نے ہم سے "اپنا" محصول وصول نہیں کیا۔ جلال آباد سے کابل تک مجھے بیدانہ شہتوت اور میٹھے پانی کی یاد ہمیشہ رہے گی۔ جہاں کہیں پانی نظر

آتا مجھے بیدانہ شہتوت کی کشش تانگے سے اترنے پر مجبور کر دیتی۔ بس پھر کیا ایک سایہ دار درخت پر چڑھ کر ایک دو جھٹکے جو دیتا تو نیچے بیدانہ توت سے ہماری چادروں کی جھولیاں بھر جاتیں اور ہم وہ مزے لے لے کر کھاتے۔

کابل

کابل شہر سے باہر وسیع چمن اور باغات ہیں۔ جنوب مغرب میں سلسلہ کوہ۔ شمال کی جانب کنڈاؤ ہے جسے سر کرنے کے بعد کوہ دامان شروع ہو جاتا ہے۔ کابل کے شمال مشرق میں وسیع میدانی علاقہ ہے جہاں میوے کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں روٹی سے میوے ارزاں نرخ پر دستیاب ہیں۔

قاضی عبدالولی[۲۲]

افغان حکومت کی جانب سے مہاجرین کے لئے کابل میں جو سرائے مخصوص تھی ہمیں وہاں پہنچا دیا گیا۔ وہاں ہم سے پہلے ایک فرنگی مہمان بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم نے سرائے کے کچھ کمروں پر قبضہ کر لیا۔ تھوڑا ہی سستانے پائے تھے کہ اچانک میری نظر اپنے گاؤں کے محمد نامی شخص پر پڑی۔ میں حیران ہو گیا کہ یہ شخص کس طرح بدرشی سے کابل پہنچ گیا۔ محمد نے علیک سلیک کے بعد ہمیں قاضی عبدالولی خان کی طرف سے کھانے کی دعوت دی۔ جسے ہم نے بخوشی منظور کر لیا۔ محمد، میرے گاؤں والا ہم سے ایک سال پہلے گھر سے نکلا تھا اور کابل پہنچنے کے بعد قاضی عبدالولی خان کے پاس ٹھہر گیا تھا۔

یہ ۱۹۱۹ء کی بات ہے جن دنوں انگریزوں نے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں نہتے ہندوستانی عوام پر گولی چلا کر سینکڑوں افراد کو ہلاک کیا تھا[۲۳] اور جب اس کی صدائے بازگشت سارے ہندوستان میں ہوئی تھی تو قاضی عبدالولی خان صاحب جو پشاور کے ہر دلعزیز لیڈر تھے نے انگریز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے عوام کو جنگ آزادی کے لئے ابھارا اور یہی للکارا اس کی جلاوطنی کا باعث بنی۔ قاضی صاحب ایک گوجر (دودھ والا) کے لباس میں کندھے پر ڈانگ اٹھائے تیراہ کے راستے

افغانستان پہنچے تھے۔

کابل میں ہم دو روز تک قاضی صاحب کے مہمان رہے۔ انہوں نے ہماری خوب خاطر مدارات کی۔ علاوہ ازیں وزارت خارجہ میں خود حاضر ہو کر بڑی کوشش کی کہ کابل میں ٹھہرنے کی اجازت مل جائے لیکن اعلیٰ حضرت کے حکم کے مطابق ہمیں جبل السراج جانا تھا۔ نہ تو اعلیٰ حضرت تک ہمارے کابل میں ٹھہرنے کی خواہش پہنچی اور نہ ہی ان کے طے شدہ احکام تبدیل ہو سکے۔

قاضی صاحب کے حجرہ پر پہلی شام ہماری ملاقات مولانا عبید اللہ سندھی اور مولوی بشیر سے ہوئی۔ میں پہلے ہی تحریر کر چکا ہوں کہ مولوی بشیر صاحب کابل میں مجاہدین کے نمائندے تھے اور مولانا عبید اللہ سندھی پرانے انقلابی لیڈر اور کابل میں قائم کی گئی "موقتی حکومت ہند"[۲۴] کے صدر تھے۔

ایم اے مجید موچی گیٹ لاہور نے قاضی صاحب کے تفصیلی حالات اپنے ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کے اخبار "محنت کش" میں شائع کئے تھے۔ ایم اے مجید صاحب اس ٹولی میں شامل تھے جو ہم سے جلال آباد میں بچھڑ گئی تھی۔ انہوں نے قاضی صاحب کے پُرخلوص کردار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "چند ہندوستانی جو حکومت افغانستان کی ملازمت میں تھے اور جن میں سے بعض ہمارے واقف بھی تھے ہمیں خوش آمدید کہنے اور کھانے پر مدعو کرنے کے لئے صبح سویرے حاضر ہوئے ہم ان کے باوجود ان کی دعوت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انکار و اصرار کی تکرار جاری تھی کہ قاضی صاحب جنہیں حکومت افغانستان کی جانب سے "خان اعلیٰ" کا خطاب ملا تھا کی طرف سے ہمیں روزہ افطار کرنے کی دعوت دی گئی جو ہمیں منظور کرنی ہی پڑی۔ شام سے پہلے قاضی صاحب کے گھر پہنچے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ افطاری کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ قاضی صاحب پشاور کے رہنے والے لمبے تڑنگے پشتون تھے۔ ان کی عمر پینتالیس برس تھی۔ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں جنگ طرابلس کے دوران غازی الزر پاشا کے ہمراہ ہلال احمر میں کام کیا تھا۔ یعنی قاضی صاحب اس وفد[۲۵] کے ایک رکن تھے جو ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں جنگ طرابلس اور بلقان کے دوران ہندوستان سے امداد کے لئے گیا تھا۔ قاضی صاحب ہندوستان میں نفاذ مارشل لاء کے دوران انگریز سرکار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر افغانستان کو پہنچے تھے۔ آج کل امیر کابل کے مشیروں میں شامل ہیں

اور ان کے تمام تر اخراجات حکومت افغانستان کے ذمہ ہیں قاضی صاحب نے دوران گفتگو بتایا کہ میں اس وقت تک دربار میں جانا پسند نہیں کرتا جب تک امیر صاحب خود طلب نہ کریں۔

مولانا عبیداللہ سندھی

قاضی صاحب کے گھر پر ہی یہ اطلاع ملی کہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب تشریف لا رہے ہیں یوں تو مولانا صاحب کے حالات چمرقند اور جلال آباد میں کچھ معلوم ہوئے تھے لیکن مولانا کی انقلابی زندگی کے جوہر ان سے ملاقات کے بعد اور خصوصاً روس میں ہم پر ظاہر ہوئے۔ مدتوں ہمیں حسرت تھی انہیں دیکھنے کی ہماری یہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ مولانا عام پنجابیوں کی طرح بھاری بھرکم جثہ، لمبی اور گھنی کھچڑی داڑھی سیاہ مقناطیسی آنکھوں کے فرد تھے۔ مولانا صاحب کے متعلق مشہور رہے کہ وہ ۱۹۱۴ء میں ایک انقلابی جماعت کے خفیہ نمائندہ کی حیثیت سے امیر حبیب اللہ خان کے دور حکومت میں کابل آئے تھے۔ انہی دنوں ایک جرمن وفد[۲۹] فون ہینیٹک کی رہنمائی میں افغانستان ان ہندوستانی مجاہدین سے رابطہ قائم کرنے کی غرض سے آیا تھا جو انگریز کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ مولانا نے فون ہینیٹک وفد سے کہاں تک تعلق رکھا تھا البتہ یہ بات ظاہر تھی کہ مولانا کئی بار خفیہ طور پر ہندوستان گئے اور فون ہینیٹک وفد کے لئے واپس کابل آئے تھے۔ مولانا صاحب کابل میں قائم کی گئی "موقتی حکومت ہند" کے پہلے صدر تھے

ان کے نزدیک یہ خوشی کی بات تھی کہ انگریز پر بم چلائے جا رہے تھے اور جب بھی ان کو یہ خبر ملتی کہ ایک ہندوستانی نے انگریز پر بم چلایا ہے تو وہ حاضرین سے دعا کراتے ہوئے کہتے کہ "دعا کریں اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں کہ مسلمانوں کو خدا انگریزوں پر اور ایسے بم پھینکنے کی توفیق عطا فرمائیں"۔ اسی طرح جب ان کو کسی کی راہ آزادی میں شہادت کی خبر ملتی تو فرماتے کہ "اللہ تیرا شکر ہے کہ ایک ہندوستانی کو تو نے یہ ہمت عطا کی اے خدایا تو اور ہندوستانیوں کو بھی یہ سعادت نصیب فرما"۔

مولانا صاحب سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر آپ ڈیرہ غازی خان اپنے ماموں کے ہاں پرورش پاتے رہے۔ بچپن میں آپ کا تمام وقت

مسلمان بچوں کے ہمراہ گزرتا۔ ان کے ساتھ اکٹھا لکھے پڑھے اور کھیلے۔ اس بنا پر کچھ ان کی صحبت اور باہم میل جول کا اثر تھا اور کچھ اسلامی کتب کی تاثیر کہ آپ مسلمان ہو گئے۔ تبدیلی مذہب کے بعد ماموں کے گھر سے اُٹھ کر ضلع مظفر گڑھ کے ایک بزرگ عالم دین کی شاگردی میں آ گئے۔ اسی طرح مولانا جلد ہی حضرت شیخ الہند حکیم اجمل خان اور ایسے دوسرے آزادی خواہ مسلمانوں کے زیر اثر آ گئے اور ان کی صف میں شامل ہو گئے۔

محمد شفیق

محمد شفیق سے جو ایک پختہ کار انقلابی تھے میری ملاقات تاشقند پہنچ کر ہوئی۔ وہ ایم این رائے کے ہمراہ "ریفکم" یعنی "انقلاب کا گھر" میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی ہم سے ملنے کے لئے "اندوسکی دوما" یعنی "ہندوستانی گھر" تشریف لایا کرتے تھے۔ میں تاشقند میں محمد شفیق صاحب کے زیادہ قریب رہا تھا لیکن مجھے کبھی یہ علم نہیں ہو سکا کہ آپ اکوڑہ خٹک کے رہنے والے پشتون ہیں۔ اکوڑہ خٹک بدرشی سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

میں جب اپنے وطن واپس پہنچا تھا تو اپنے مقدمے کی سماعت کے دوران ایک دن جبکہ ہم آٹھ ساتھی سٹی مجسٹریٹ کی عدالت کے باہر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے سنگین بردار پولیس کے نرغے میں بیٹھے ہوئے تھے تو میرے والد صاحب نے میرے نزدیک ہو کر کہا کہ میرے ساتھ کھڑے یہ بزرگ اکوڑہ خٹک کے رہنے والے ہیں اور اپنے بھائی کے متعلق معلومات چاہتے ہیں۔ جس پر میں نے انہیں بتایا کہ اکوڑہ خٹک کا کوئی شخص ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ بزرگ نے فوراً دریافت کیا کہ کیا محمد شفیق آپ کے ساتھ نہیں تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کیا محمد شفیق آپ کے بھائی ہیں؟" میں حیران تھا کہ ایک ساتھ رہنے کے باوجود محمد شفیق نے ہم پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اکوڑہ کا رہنے والا ہے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ محمد شفیق انقلابی تھے اور انقلابی تعلیم کی ابجد یہ ہے کہ ہر ایک بات خفیہ رکھی جائے۔ محمد شفیق صاحب ۱۹۲۱ء میں ماسکو سے جرمنی کے راستے بھیس بدل کر ہندوستان آئے تھے اور پشاور کے راستے پھر کابل گئے تھے۔ محمد شفیق جب ہرات سے ایران ہوتے ہوئے سیستان پہنچے تو سیستان کے حکمرانوں نے جو انگریزوں کے زیر اثر تھے ان کو گرفتار کر کے پا پیادہ

کوئٹہ (بلوچستان) پہنچایا۔ کوئٹہ سے جب محمد شفیق پشاور پہنچے تو جیل میں ان کی پرانی بیڑیاں بدل کر نئی پہنا دی گئیں۔ ان کے پاؤں میں بیڑیوں کے زخم دیکھ کر ہمیں بہت صدمہ ہوا۔

مجھے آزادی وطن کی جدوجہد میں ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہی کہ اندرون ملک جو انقلابی قربانیاں دے رہے ہیں یقیناً ملک کا پڑھا لکھا طبقہ ان کی جدوجہد کو تاریخ کے اوراق پر ثبت کرے گا۔ لیکن بیرون ملک پشتونوں اور عام ہندوستانیوں نے ہند کی آزادی کے لئے جو مہم شروع کر رکھی ہے اور ایک غریب الوطن ہونے کی حیثیت سے ان پر جو گزرتی ہے اور جن ناگفتہ بہ حالات کا انہیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاید وہ المناک اور دردناک افسانے تاریخ کی زینت نہ بن سکیں۔ اور یہ ایک بہت بڑا المیہ ہوگا۔ جس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ ہماری آئندہ نسلیں صرف ان مجاہدوں کے کارناموں سے واقف ہوں گی جن کے کارنامے تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں اور وہ عظیم جدوجہد جو بیرون ملک انقلابیوں نے آزادی وطن کے لئے شروع کر رکھی ہے سے تاریخ کا دامن خالی ہوگا اور صرف گمنام جان بازوں کا نام اختیار کرے گا۔

مولانا عبدالرّب

مولانا عبدالرّب صاحب پشاور میں پلے بڑھے، مولانا صاحب اپنی فہم و فراست کی وجہ سے برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئٹہ میں اسسٹنٹ گزیٹیر تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے بغداد کے برطانوی سفارت خانہ میں متعین ہوئے۔ جب ترکوں نے انگریز کے خلاف اعلان جنگ کیا تو انگریزوں کو بغداد خالی کر دینا پڑا۔ اور مولانا عبدالرب صاحب کونسلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔ مولانا صاحب نے انگریزوں کی غلامی سے نجات پاتے ہی ترکوں کی امداد و اعانت شروع کر دی اور حکومت برطانیہ کے خفیہ راز ترکوں کے حوالے کر دیئے۔

مولانا عبدالرب صاحب اس نامور ہندوستانی انقلابیوں کے وفد کے اہم رکن تھے۔ جو مارچ ۱۹۱۹ء میں تاشقند پہنچا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ مذکورہ وفد کہاں سے اور کس راستے سے تاشقند پہنچا تھا۔ تاہم اس میں بھوپال کے مولانا برکت اللہ صاحب صوبہ جات متحدہ اودھ آگرہ کے راجہ مہندر پرتاب[۲۷] اور اکوڑہ

خٹک کے محمد شفیق صاحب بھی شامل تھے۔

مولانا عبدالرب صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انہوں نے اسی سال ماسکو میں کامریڈ لینن سے ملاقات کی تھی اور لینن کی درخواست پر انہیں آزادی ہند پر لکھی گئی معیاری کتابوں کی فہرست دی تھی ہم نے جون ۱۹۲۰ء کے دوران کابل کے روسی سفارت خانہ میں مولانا صاحب سے ملاقات کی تھی۔ انہی دنوں مولانا صاحب کابل سے پھر تاشقند (روس) روانہ ہو رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سال ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے دوران مولانا عبدالرب صاحب کی سوویت روس میں بڑی عزت تھی۔ روس کے بڑے بڑے لیڈروں پر انکا اثر تھا۔ ہم انہی کی دعوت پر تاشقند جا رہے تھے۔ لیکن تاشقند پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ہندوستان کے انقلابیوں کی قیادت مولانا کی بجائے ایک بنگالی لیڈر ایم این رائے صاحب کے ہاتھ آگئی تھی۔ مولانا صاحب روسی لیڈروں کی نظروں سے گر چکے تھے اور وہ ہمارے ساتھ ہی "اندوسکی دوممہ" (انڈیا ہاؤس) میں اکیلے ایک کمرے میں پڑے وقت گزار رہے تھے۔ ہم لوگ ابھی تاشقند ہی میں تھے کہ مولانا صاحب تاشقند سے ماسکو کے راستے جرمنی چلے گئے۔

افغانستان

مولانا عبدالرب سے ملاقات

کابل پہنچنے کے دوسرے روز ہی ہمیں معلوم ہوا کہ آج مولانا عبدالرب صاحب تاشقند روانہ ہونے والے ہیں۔ مولانا صاحب کے حالات ہم پہلے سن چکے تھے۔ اس لئے بڑے ذوق و شوق سے روسی سفارتخانے گئے۔ وہاں ہم نے چند نوجوان ہم وطنوں کو گھڑ سواری کا لباس زیب تن کئے ہوئے دیکھا۔ ساتھ ہی انکے آٹھ دس زین چڑھے گھوڑے (تیار گھوڑے) اور کچھ سامان سے لدے ہوئے خچر کھڑے تھے۔ ان انقلابیوں سے جلد ہی تعارف ہو گیا۔ ان میں سے چار آدمی پشاور کے ایک انقلابی اچاریہ نامی مدراس کا فقیر محمد خان اور عبدالکریم خان صاحب کوہاٹ کے اور ایک بلوچستان کا رہنے والا تھا۔ ہم ابھی ان انقلابیوں

سے مصروف گفتگو تھے کہ سفارت خانے سے درمیانے قد، گندمی رنگ، خشخشی داڑھی والا تقریباً پچپن سالہ ایک شخص برآمد ہوا۔ یہ تھے مولانا عبدالرب۔ ان کے دائیں بائیں دو فرنگی چل رہے تھے جن میں سے ایک روسی سفیر تھا اور دوسرا ترجمان جو کہ تقریباً بیس سال کی عمر کا نوجوان تھا۔ یہ لوگ ہمارے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ پھر روسی سفیر نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں ترجمان نے کچھ یوں کیا:

"سوویت روس مزدوروں اور کسانوں کی جمہوریت ہے۔ اس کی تمام تر ہمدردیاں دنیا بھر کے مظلوموں کے ساتھ ہیں۔ سوویت روس ہندوستان کے انقلاب کو بہت دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔ ہندوستان کے انقلابی سوویت روس کو اپنا گھر سمجھیں۔ سوویت روس نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ نہ صرف انقلابیوں کو اپنے ہاں پناہ دے گا۔ بلکہ ہندوستان کے انقلاب میں ہر ممکن مدد کرے گا۔"

مولانا عبدالرب صاحب نے کھڑے کھڑے جوابی تقریر میں اعلان کیا کہ میرے ساتھ روسی سفیر یہ وعدہ کر چکے ہیں کہ "ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان اگر تاشقند آئیں تو سوویت روس ان کے لئے ایک فوجی سکول قائم کرے گا جس میں پیدل اور ہوائی فوج کی ٹریننگ دی جائے گی۔"

مولانا صاحب نے ہم سے بھی اسی مختصر سی ملاقات میں کہا کہ ہم تاشقند چلے آئیں تاکہ ہوابازی کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ مولانا صاحب اس کے بعد اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور یہ مختصر لیکن پُروقار قافلہ سفارتخانے سے نکل کر ہمارے سامنے ہی تاشقند کی جانب روانہ ہو گیا۔

ہم نے کابل شہر میں صرف دو دن بسر کئے اس لئے اس شہر کے متعلق میرے مشاہدات سرسری ہیں۔ لیکن یہاں پڑھنے والوں کے لئے اتنی تفصیلات اس لئے بھی ضروری نہیں کہ ہر زمانے میں کابل کے حالات سیاح دنیا کو پیش کر چکے ہیں۔

کابل کا میٹھا پانی اور ٹھنڈی ہوا

ہم جیٹھ (مئی) کے آخری دنوں میں کابل پہنچے تھے۔ اساڑھ کی ابتدا تھی۔ گرمیاں جوبن پر تھیں۔ وطن

عزیز میں گرمی کی وجہ سے جو حال ہوتا ہے اس کے یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن بہر کیف اتنا بتا چلوں کہ گرمی کی شدت سے کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ لیکن کابل میں ان دنوں موسم نہایت خوشگوار تھا بالکل ایسا موسم تھا جیسا وطن میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔

کابل قدیم طرز پر بنا ہوا شہر ہے۔ جگہ جگہ بازاروں پر چھتیں لگی ہوئی ہیں۔ میں اس بات پر حیران ہوں کہ یہ چھتیں تو بارش سے انسان کو بچا نہیں سکتیں البتہ دھوپ سے بچنے کے لئے ایک سائبان کا کام دے رہی تھیں۔ لیکن دھوپ سے بازار کو محفوظ کرنا صحت کے لئے نقصان دہ ہے اس لئے یہ چھتیں نہ تو بارش سے محفوظ رکھنے کے لئے تعمیر کی گئی ہیں اور نہ ہی دھوپ سے بچاؤ دیتی ہیں۔ میرے خیال میں وسط ایشیا میں برفباری سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ بنائی گئی تھیں۔ لیکن کابل کا میٹھا پانی اور ٹھنڈی ہوا انسان پر ہر چیز سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں کابل سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہو گا۔ لیکن زیادہ سرد مقام نہیں ہے۔ گرمیوں میں معمولی کپڑوں میں بھی گزارا ہو جاتا ہے۔ گرم کپڑوں کی چنداں ضرورت نہیں۔

کابل شہر کی صفائی کی حالت اچھی نہیں۔ لیکن صفائی تو ایشیا کے کسی بھی قدیمی شہر کی اچھی نہیں۔ افغانستان ایک چھوٹا سا ملک ہے اور کابل اس کا مرکزی مقام۔ لیکن بہتر تجارت نہ ہونے کے باعث بلدیہ کابل کی اتنی آمدن ہرگز نہیں کہ یورپ کی مانند صاف اور ستھرا شہر آباد رکھے۔ کابل کی تجارت پشاور سے اونٹوں اور خچروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے بغیر کسی مبالغے کے کہا جا سکتا ہے کہ کابل ایک دولت مند شہر ہرگز نہیں۔ اسی لئے شہر بھی پرانا ہے۔ نئی عمارتیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ اور اگر کوئی ہے تو وہ بھی حکومت کی تعمیر کردہ، تجارت کا حال کابل کے بازار سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے۔

کوہ دامان

تیسرے روز قاضی صاحب نے ہمارے لئے تانگے حاصل کئے اور ساتھ ہی ایک اشرفی فی کس زادِ راہ عطا کی۔ کابل سے جبل السراج تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سارے افغانستان میں صرف یہی

ایک پختہ سڑک ہے۔ اور اس پر پختہ پل بھی تعمیر کئے گئے ہیں۔ دراصل یہ سب برکت جبل السراج میں بجلی گھر کی بدولت ہے۔

راستے میں ایک خوبصورت مقام چار یکار آیا۔ یہاں ایک بہت بڑا بازار بھی ہے۔ ہم نے یہاں دو گھنٹے قیام کیا اور شام سے پہلے جبل السراج پہنچے۔ یہاں ایک فوجی قلعہ موجود تھا اور ساتھ ایک دوسرا چھوٹا سا قلعہ بھی موجود تھا جو سرور خان قلعہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس قلعے میں اُوپر بالا خانے میں ہمیں جگہ دی گئی۔

جبل سراج

یہ کوہ دامان کا ایک بہت صحت افزا اور مشہور مقام ہے۔ یہاں کے فوجی قلعہ میں چار سو فوج کے سپاہی رہتے ہیں۔ یہاں کا بجلی گھر کابل شہر کو بجلی مہیا کرتا ہے۔ نیز اس پر سول اور فوجی کارخانے بھی چل رہے ہیں۔ کوہ دامان کی یہ وادی پچیس میل لمبی اور تقریباً اتنی ہی چوڑی ہے۔ جہاں دریائے پنج شیر اور کئی دوسرے پہاڑی نالے بہتے ہیں۔ اس وادی کی سرسبزی اور شادابی بے نظیر ہے۔ یہاں کی پیداوار بیدانہ شہتوت، انگور، خوبانی اور خربوزہ ہے۔ چاول اور گندم بھی ایک قلیل مقدار میں پیدا ہوتی ہے۔ لوگ سردیوں میں شہتوت، انگور اور دوسرے میووں پر گزارہ کرتے ہیں۔ جبل السراج پہاڑ کے درمیانی حصے میں بلندی پر واقع ہے۔ اور قلعہ سرور خان تو ایسی جگہ ہے جہاں سے کوہ دامان کی وادی نیچے ایک خوشنما باغ کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ ہم یہاں مئی کے اواخر اور جون کے ابتدا میں پہنچے تھے۔ یہاں ہم نے تقریباً ڈیڑھ ماہ بسر کیا۔ جبل السراج آب و ہوا کے لحاظ سے نہایت صحت افزا مقام ہے۔ ہم لوگ یہاں دن کو تین مرتبہ کھانا کھاتے تھے لیکن پانی پینے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسا سب کچھ ہضم ہو چکا ہے۔

افغانستان میں صرف جبل السراج ہی واحد صحت افزا مقام نہ تھا۔ بلکہ تمام افغانستان صحت کے لئے مفید جانا جاتا ہے۔ یہاں کے صحت افزا مقامات قابلِ دید ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امیر شہید حبیب اللہ خان کے لئے پینے کا پانی گل بہار سے لایا جاتا تھا۔ گل بہار جبل السراج سے چند میل پرے جانب مشرق واقع ہے۔

امین اللہ خان مہمند

حکومت نے مہمند علاقہ کے لئے ایک علیحدہ ایجنسی بنائی تھی۔ امین اللہ خان اس ایجنسی کا پہلا پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ شان میں رہتا تھا اس لئے لوگ اسے شاہی کہتے تھے۔ ان کے مہمند ہونے کی وجہ سے یہ لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ امین اللہ خان کا ہیڈ کوارٹر شبقدر میں تھا۔ شبقدر سے کچھ فاصلے پر جبل السراج کے دامن میں لیویز کا ایک تھانہ تھا۔ جبل السراج کے دامن میں کریل اور لیویز کے تھانے ہونے کی وجہ سے ہماری کھیلنے کی جگہ وہی تھی۔ ہم کالج کے ہندوستانی انقلابیوں کی طرف سے ہماری مدد جاری تھی۔ امین اللہ خان مہمند کی ہم سے ہمدردیوں کے ساتھ بے پناہ محبت تھی۔ جس عصر کے وقت وہ اپنے ساتھ اکثر ہمیں اسپ کے لئے چل قدمی کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اعلیٰ حضرت تعلیم کے نہایت قدردان ہیں۔ آپ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ان کے منظور نظر ہوں گے۔ لگن ہے آپ لوگوں کو وہ اعلیٰ ملازمت کی پیش کش کر دیں۔

جبل السراج میں آفریدی قبیلہ کے دو سو نوجوان فوج میں بطور سپاہی ملازم تھے۔ یہ وہ کی افغان انگریز جنگ میں اسلحہ سمیت غیر ملکی اثر سے جاگ کر افغانستان آ گئے تھے۔ تھانہ میں دوسرے سپاہی بھی موجود تھے جن میں سے اکثریت کوہ دامانیوں کی تھی۔ کوہ دامان میں پشتو نہیں بولی جاتی یہاں کی زبان فارسی اور باہر سے تاجک ہیں۔ آفریدی نوجوان ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ لہٰذا کبھی کبھی ہم ان کے ہاں موجود ہوتے۔ آفریدی سپاہیوں کی تنخواہ صرف بیس کابلی روپے تھی لیکن کپڑا اور راشن سرکاری تھا۔ چاول اور دنبے کا گوشت ان کی غذا کا ضروری جزو تھا۔ یہی مرغوب غذا دنبے کا گوشت ہی ہے۔ جس روز آفریدی یہاں خوش نہیں تھے کچھ نوجوان تو واپس وطن لوٹ گئے تھے۔ آفریدی نوجوانوں کو دادی کوہ دامان کے لوگ ان کی تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے باغی کہتے تھے۔

سرور خان کا قلعہ

جیسے کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ جبل السراج کے فوجی قلعہ کے علاوہ سرور خان کا قلعہ بھی ہے جو

اندر اندر یہ ثابت ہو گیا کہ کمیٹی اپنا کام احسن طریقے سے سرانجام دے رہی ہے۔ مہاندار اس لئے خوش تھے کہ ہر وقت کی مشکلات سے انہیں نجات مل گئی اور ہمیں خوشی تھی کہ ہمارے مسائل اندرونی طور پر حل ہو کر ہماری ندامت کا باعث نہیں بن رہے۔

مہاجرین کی فوجی تربیت

مہاجرین کی کمیٹی نے سب سے پہلے ایک مرکزی فنڈ قائم کیا جس میں صاحب استطاعت حضرات نے چندے دیئے۔ کابل سے مہاجرین کی امداد کے لئے آنے والی رقوم بھی کمیٹی کے پاس آنے لگیں چونکہ مہاجرین نے ترک وطن اس خیال سے کیا تھا کہ وطن عزیز کے لئے جنگ آزادی لڑیں گے لہذا ان کے لئے فوجی تربیت لازمی تھی۔ کمیٹی نے مہاجرین کو فوجی ٹریننگ دینے کا آغاز کر کے گویا انکی دلی خواہش پوری کر دی۔ ہر ایک شخص فوجی تربیت کے لئے تیار ہو گیا۔ مہاجرین کی خواہش کا یہ عالم تھا کہ ہم میں سے دو عالم دین جو معمر اور بزرگ تھے ایک حاجی معراج الدین اور دوسرے لاہور کے حاجی شہاب الدین۔ دونوں کو مہاجرین میں بہت قدر و منزلت حاصل تھی لیکن اپنے اس ذوق و خواہش کی تکمیل کے لئے وہ دونوں بھی فوجی تربیت کے لئے تیار ہو گئے۔

جبل السراج کے بجلی گھر کے ساتھ ایک وسیع میدان تھا۔ میدان میں علی الصبح سو تک مہاجرین قواعد (پریڈ) کے لئے روزانہ جمع ہوا کرتے تھے۔ مہاجرین میں انگریزی فوج سے بھاگ کر آنے والے اشخاص بھی تھے۔ ان کو انسٹرکٹر بنایا گیا۔ ساری فوج کی کمان پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم عبدالرحیم کے سپرد کی گئی۔ جناب عبدالرحیم صاحب لاہور یونیورسٹی ٹریننگ کور کے تربیت یافتہ تھے۔ چند دنوں کے اندر اندر پریڈ کا دورانیہ صبح کے علاوہ عصر کو بھی مقرر کیا گیا۔

کمیٹی نے وزارت خارجہ کو باقاعدہ ایک درخواست بندوقوں کے لئے بھی دی لیکن وسائل کی کمی کی بنا پر ان کی یہ درخواست قبول نہیں ہوئی۔ مہاجرین بھی مایوس ہونے والے لوگ نہیں تھے۔ کمیٹی نے جلد ہی اس کا حل نکالا کہ لکڑی کے لٹھ سے بندوق کا کام لیا جا سکتا ہے۔ کمیٹی نے شہتوت کے درخت سے

لکڑی کٹوا کر بڑے بڑے لٹھ تیار کر لئے جن کو بندوق کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ قومی پرچم لگانے کے لئے ایک بہت بڑی لکڑی میدان میں گاڑی گئی اور ڈھولک کی تھاپ پر قدم مارتے ہوئے مہاجرین فوجی تربیت حاصل کرتے رہے۔ بطور کمانڈر عبدالرحیم کا کام نہایت ہی تسلی بخش تھا۔ مہاندار اور افغان کرنیل ہماری پریڈ دیکھنے کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔ انہیں لکڑی کے لٹھ سے بندوق کا کام لینا بہت پسند آیا۔ صرف بوڑھے اور بیمار مہاجر روزانہ پریڈ سے مستثنیٰ تھے۔

سعید خان

انہی دنوں گھٹنوں تک لمبے بوٹ پہنے ایک سپاہی خصلت مہاجر یہاں پہنچا۔ اصل میں یہ بوٹ لمبے نہ تھے بلکہ بوٹوں کے اوپر چمڑے کی پٹیاں گھٹنے تک بندھی ہوئی تھیں۔ جیسے کہ ہندوستانی رسالے میں گھڑسوار سپاہی باندھ کر رکھتے ہیں۔ یہ مہاجر ہندوستانی رسالہ میں جمعدار تھا۔ اونچا قد، چست و چابک بدن اپنی حسین جوانی اور خوبصورتی کے علاوہ شیریں زبانی سے بہت جلد ہر دلعزیز بن گیا۔ اس کا نام سعید خان تھا اور ضلع پشاور کے مشہور قصبے اکوڑہ خٹک کے قریب ڈنگر زئی نامی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس نے آتے ہی اعلان کیا کہ مہاجروں کی فوج کی کمانداری میرے حوالے کی جائے۔ اگر میرا یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو پشتون دوسرے مہاجرین سے الگ ہو جائیں گے۔ اگرچہ ان کا یہ اعلان مہاجرین کمیٹی کی نظروں میں ایک ناپسندیدہ اقدام تھا تاہم آپس کی نااتفاقی اور پھوٹ سے بچنے کے لئے سعید خان کو کماندار مقرر کیا گیا سعید خان کی ارنچی اور دبنگ آواز میں احکامات ایک عجیب لطف دیتے تھے اس پر طرہ یہ کہ ان کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں۔ یقیناً مہاجرین اپنے اس نئے انتخاب سے جلد ہی مطمئن اور مسرور ہو گئے۔

جبل السراج میں نئے مہاجرین کی آمد

ہر روز نئے مہاجرین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا اور ہم نے روزانہ ڈیڑھ میل آگے چل کر ان کا استقبال کرنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ مہاجرین کی آمد ہمارے لئے جہاں خوشی تھی وہیں افسوس کا بھی باعث بنی۔

خوشی اس لئے کہ ہم نے وطن کو خیر باد کہہ کر چلے آنے والا قدم درست اٹھایا تھا جس کی حمایت نئے آنے والوں کی آمد سے ہو رہی تھی۔ نیز ہمارے لئے وہ وطن کی باتیں بھی ساتھ لاتے تھے۔ ملک کے تازہ ترین حالات سے واقفیت بھی خوشی کا باعث بنی۔ علاوہ ازیں ہم وطنوں سے مل کر غریب الدیار ہونے کا غم بھی کم ہوا۔ لیکن جب قلعہ پہنچ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں آرام کے لئے جاتے تو وہاں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ ہمیں وطن اپنا پیارا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ دوبارہ اس کو دیکھنے کی حسرت ہی رہتی جو ایک خواب سے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر یہ خیال بھی آتا کہ آہستہ آہستہ عزیز و اقارب دوست احباب کو بھی بھول جائیں گے یہ بھی الگ روگ بن گیا۔

یوں تو سفر کا سلسلہ عرصہ دراز سے قائم ہے۔ اور پھر اگر کوئی یورپ کے سفر پر نکل جائے تو ایک طرف تو اسے روپے پیسے کی فکر نہیں ہوتی کیونکہ روپیہ اس کے پاس وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے اسی لئے تو وہ سفر کرتا ہے۔ نیز وہاں ان مسافروں کو دولت کی فراوانی رات بھر تھیٹر، سینما اور دلچسپی کے دیگر مشاغل مہیا کرتی ہے تو اسے سفر کی تکالیف کا کوئی احساس نہیں ہوتا ہے۔ لیکن افغانستان کے دشوار ترین اور سخت ملک میں ناواقف لوگوں میں کوئی شخص مسافر کی حیثیت سے آئے اور اپنے وطن سے اس کا کوئی رابطہ بھی نہیں ہو خط و کتابت کا سلسلہ بھی منقطع ہو تو انسان کو پھر اس مسافری اور سفر کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے ہمارے وطن کا افغانستان سے فاصلہ تو بہت کم ہے لیکن حالات نے اس کو دشوار ترین اور ناممکن بنا دیا تھا۔ ان بے انتہا مشکلات نے وطن اور اہلِ وطن سے محبت کو بے قراری کا رنگ دے رکھا تھا۔ ایک شام جب کہ میں کھانا کھا رہا تھا کسی نے آکر اطلاع دی کہ ایک خوبصورت داڑھی والا تنومند نوجوان جو اپنا نام غلام یحییٰ بتاتا ہے اور جس کے کندھے پر بندوق لٹک رہی ہے آپ کا پوچھ رہا ہے۔ وہ خود کو آپ کا بھائی بتاتا ہے۔ میں نے کھانا ادھورا ہی چھوڑ دیا اور قلعے کے اونچے برج سے دوڑتا ہوا اس کے استقبال کے لئے باہر نکلا۔ بازو پھیلا کر آنے والے مہاجر سے گلے ملا۔ کیونکہ وہ ایک ایسا ساتھی تھا جس کے ساتھ میرا سارا بچپن بھی اکٹھا گزرا تھا ساتھ ہی کھیل کود کر جوان ہوئے اور سب سے بڑی بات کہ وہ گاؤں سے چل کر آیا تھا جس کے کوائف و حالات سننے کا میں بے حد مشتاق تھا۔

افغانستان اور انگریز میں صلح کی خبر کا

جبل السراج پر بجلی بن کر گرنا

اسی طرح جبل السراج میں زندگی گزر رہی تھی۔ ہم تھے اور ہماری روزانہ کی پریڈ۔ کبھی ہمیں کوئی مدعو کرتا کبھی ہم کسی کو مہمان بناتے۔ دن ہنسی خوشی بسر ہو رہے تھے۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ اس پر اضافہ جبل السراج کا خوشگوار موسم۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن جلسے منعقد کرواتے، ہمیں پتہ تھا کہ ہندوستان کی قانونی پابندیوں سے آزاد اور مبرا ہیں اس لئے جو کچھ دل میں آتا وہ کر گزرتے۔ زبان سے بھی فوراً اس کا اظہار و اقرار کر لیتے۔ تقریریں ہمارے لئے موسیقی کا کام دینے لگی تھیں۔ آزادی ایک بہت بڑی نعمت غیر مترقبہ ہے اور پھر ہمارے جیسے لوگوں کے لئے جنہوں نے کبھی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور اچانک اس طرح آزادی حاصل ہو گئی تو خوشی سے جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔

لیکن افسوس پردہ بہت جلدی ہی اٹھ گیا۔ ہمارے ذہنوں میں مستقبل کی تصویر جو بہت خوشنما اور دلکش تھی زیادہ دیر نہ رہی۔ یہ کیا ہوا؟ ہمارے دلوں میں تو اور کچھ تھا لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس نکلا۔ ہم کیا سوچ رہے تھے اور کابل کے "امان افغان" نے ہمارے دامن میں یہ کیا لا کر پھینک دیا؟ "امان افغان" کی اس خبر کا جتنا اثر ہم نے لیا وہ تحریر میں نہیں آسکتا۔ یہی خبر مہاجرین کو وہاں سے روانہ کر کے بھوکے پیاسے افغانستان کے پہاڑوں اور جنگلوں سے گزار کر ترکستان اور پھر وہاں سے روس لے گئی۔ وہ قفقاز کی پہاڑیوں کو پیدل سر کر کے اناطولیہ پہنچے۔ اور وہاں سے واپس مفلوک الحال مصیبت زدہ لیکن ہوشیار بن کر وطن واپس پہنچے۔ وہ خبر یہ تھی۔

"انگریزوں اور ہمارے درمیان عارضی صلح ہو گئی۔ اب بمقام راولپنڈی انگریز اور افغان نمائندوں کے درمیان بات چیت ہو گی۔ غیور افغان قوم عنقریب اپنی بہادری کا صلہ پائے گی۔"

یہ خبر بجلی بن کر جبل السراج کی خوشیوں پر گری۔ مہاجرین کے چہرے غم و غصہ سے سرخ ہو گئے۔ ایک مہاجر بولا "افغانستان کی حکومت نے پشتونوں کے ساتھ غداری کی ہے۔" کوئی بولا "کیا اسلام کے ساتھ

یہ غداری نہیں ہے؟" ایک اور نے درمیان میں آواز دی "کیا اب افغانستان اور ہندوستان میں کوئی فرق رہا"۔ اور پھر خود ہی اس کا جواب دے دیا "نہیں"۔

حاجی معراج الدین ہماری رہنمائی کرتے ہیں

مہاجرین پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹا۔ سمجھدار رہنما سوچ میں پڑے ہوئے تھے۔ تھوڑے ہی وقت میں ایک بن بلایا جلسہ اکٹھا ہو چکا تھا۔ محمد اکبر خان بھی بیٹھے ہوئے تھے لیکن صدارت کی جگہ خالی تھی۔ کسی کو کوئی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ باری باری مہاجر اٹھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ مجمع آہستہ آہستہ ایک بڑے جلسے کی شکل اختیار کر گیا۔ محمد اکبر خان نے اپنے فرائض بحیثیت صدر کے سنبھال لئے۔ ویسے تو وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ کسی کو بولنے نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس وقت جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک وقت میں دو دو چار چار مقرر اکٹھے تقریریں کر رہے تھے۔ اس طرح یہ عظیم جلسہ ٹولیوں میں بٹ کر رہ گیا لیکن سبھی کا مقصد ایک ہی تھا۔ کسی کی رائے تھی کہ اب افغانستان سے بھی ہجرت کر لینا چاہیئے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ باغستان لوٹ جانا چاہیئے اور چمرقند کے مجاہدین کی طرح انگریز سے لڑائی جاری رکھنی چاہیئے۔ کسی کا خیال تھا کہ وطن واپس لوٹ جانا چاہیئے۔ اور وہیں سے انگریز کے خلاف جد و جہد جاری رکھنی چاہیئے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مہاجرین دو ٹولیوں میں بٹ کر رہ جائیں گے۔ اتنے میں کسی کی نگاہ ایک سفید ریش معزز بزرگ آدمی پر پڑی۔ یہ سفید ریش حضرت حاجی معراج الدین تھے جو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اور بھی ممتاز و احترام کے قابل شخصیت ہو چکے تھے۔ مہاجر انہیں بے پناہ عزت اور محبت سے دیکھتے تھے۔ اس وقت تک اور مقرر بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ حاجی صاحب سے استدعا کی گئی کہ وہ اس کٹھن وقت میں مہاجرین کی صحیح رہنمائی کریں۔ حاجی صاحب جب اٹھے تو چاروں طرف خاموش خاموش کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مجمع بالکل خاموش ہو گیا اور تمام توجہ حاجی صاحب کی طرف ہو گئی۔

حاجی صاحب کھانسے اور پھر خاموشی سے زمین کی جانب دیکھنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب بھی کسی گہری سوچ میں پڑے ہوں۔ مہاجر دم بخود حاجی صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حاجی صاحب

نے آہستہ آہستہ اپنی تقریر شروع کی۔

" میرے مسلمان بھائیو! آپ نے دوپہر سے عصر تک کئی گھنٹے بحث و مباحثے میں گزار دے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے۔ جب تھک گئے اور بات کرنے کی طاقت نہ رہی تو مجھ بوڑھے سے رجوع کیا۔ میں آپ کی توجہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب میں جو کچھ کہوں گا اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند کریم کے احکامات کی روشنی میں عرض کروں گا۔ ہم سب مہاجر ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اپنا وطن عزیز، بال بچے، دوست احباب صرف احکامات خداوندی بجالانے کی خاطر چھوڑے ہیں۔"

حاجی صاحب کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔

" میرے مسلمان بھائیو! ہم نے خون کے آنسو بہاتے ہوئے وطن عزیز کو الوداع کہا۔ ہم جب وطن سے چل رہے تھے تو ہمارے بال بچے اور عزیز و اقارب زار و قطار روتے ہوئے ہم سے پوچھ رہے تھے کہ یہ تم جو واپس آنے کی امید قطع کئے جا رہے ہو تو ہم کس کے سہارے جئیں گے۔ ہمیں ان کے الفاظ نے پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن حکم خداوندی کے آگے سر جھکا کر نم آنکھوں سے وہاں سے چلے آئے۔ اب میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایسے حالات میں ہم نے وطن کیوں چھوڑا؟ ہمیں کس نے وطن سے نکالا؟ ہم پر ایسا کوئی خاص ظلم تھا کہ ہم وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟"

" بھائیو! میرے پاس ان تمام سوالات کے جوابات موجود ہیں۔ پہلا یہ کہ کوئی غلام شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہلوا سکتا۔ اس لئے ہم نے وطن کو خیرباد کہا تاکہ ہماری مسلمانی قائم رہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ غلامی سے نجات پائی جائے تو ہم نے یہ پرواہ کئے بغیر کہ ہم سے ہمارا مال اسباب اولاد سب کچھ چھوٹ رہا ہے اپنا عمل برضائے خداوند تعالیٰ جاری رکھا۔"

" بھائیو! ایسے حالات میں ہماری نگاہیں افغانستان کی طرف اٹھیں جس نے نہ صرف ہمیں پناہ دی بلکہ اپنی روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے ہماری خاصی اچھی خاطر مدارت بھی کی۔ جس کے لئے ہم افغانستان کے شکر گزار ہیں۔ کہ اس نے ہمارے ساتھ نیکی کی اور ہم جیسے مظلوموں کو سہولیات فراہم کیں۔ ہمیں یہ احساس ہے کہ ہم بے بس مہاجرین ان کی اس مہربانی کا کوئی صلہ ادا نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ

دعا ضرور کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ افغانستان کو اس اجر خیر کا ثواب دے۔" (آمین)

" لیکن اے افغانستان (اہل افغانستان شاید مراد ہو) یاد رکھ ہم نے یہ قدم کسی اصول کے تحت اٹھایا تھا اور اصول ہی کے تحت یہ قدم آگے بڑھتے اور ہٹتے رہیں گے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم مانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ہندوستان کو دارالحرب اور افغانستان کو دارالسلام قرار دیا تو ہمیں حکم ہوا کہ اسلام کی خاطر ہندوستان کو چھوڑ کر افغانستان جاؤ۔ ہم افغانستان آ گئے۔ جو مصیبتیں ہم نے جھیلیں وہ دنیا پر آشکارا ہیں۔ مہاجرین نے یہ مشکلات صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے برداشت کیں۔ میں اب آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس مقصد کے لئے آپ افغانستان آئے تھے کیا اب وہ مقصد حاصل کریں گے"

" نہیں۔ نہیں" ہر طرف سے مہاجرین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حاجی صاحب پھر شروع ہوئے۔

" میرے بھائیو! آپ نے اخبار "امان افغان" کی خبر پڑھی ہو گی کہ انگریز نے افغانستان کے ساتھ صلح کر لی ہے۔"

یہاں حاجی صاحب کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے تاکہ مہاجر بھی کچھ بولیں لیکن مہاجر سکتہ کی حالت ہی میں رہے اور کوئی گویا نہیں ہوا۔ حاجی صاحب نے غصہ بھرے لہجے میں پوچھا "کچھ تو کہیے۔ آخر انگریزوں سے صلح کر کے مہاجرین کے ساتھ کیا کیا گیا؟" لیکن مجمعے پر بدستور سناٹا چھایا رہا۔ حاجی صاحب سمجھ گئے کہ مہاجر لاجواب ہو گئے تو کہا کہ "آخر میں ہم مہاجروں کو لات ماردی گئی۔" حاجی صاحب نے عملاً ایسی لات ہوا میں ماری کہ نزدیک سامنے بیٹھے ہوئے مہاجر کو لگی۔

" تو اے بھائیو! کیا اب افغانستان اور ہندوستان میں کوئی فرق باقی رہ گیا؟"

" نہیں بالکل نہیں"۔ کی آوازیں مہاجرین کے مجمع سے بلند ہوئیں۔

" تو آج میں جبل السراج کے قلعہ کی اس چوٹی سے ببانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ اب افغانستان بھی ہندوستان کی طرح دارالحرب ہے۔ اب یہ سوال کہ افغانستان سے کس طرح کا رخ کیا جائے۔ کیا ہندوستان کو لوٹ جانا چاہیے۔ ہرگز نہیں کیونکہ پیچھے ہٹنا مومن کی شان کے خلاف ہے۔" حاجی صاحب نے مجمع پر نظر دوڑاتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ "اے مسلمانو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ترکوں پر

کیا گزر رہی ہے اگر نہیں تو آیئے میں آپ کو بتا دوں کہ ہر ترک کے گھر میں ماتم کا سماں ہے۔ وہ ترک جنہوں نے ہمیشہ اسلام کے ناموس پر تلوار اٹھائی اور جنہوں نے جان و مال کی قربانی دے کر اسلام کا علم بلند رکھا آج ان کا اپنا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ تو اے مسلمانو! یاد رکھیئے اگر ترک غلام ہو گئے تو اسلام کفر و الحاد میں گھر جائے گا۔ پھر جو آج اسلامی حکومت کے خواب دیکھ رہے ہو تو پھر تمہاری کیا حالت ہو گی۔ یاد رکھیئے اگر ترک نہ رہے تو پھر کوئی اپنے آپ کو مسلمان بھی نہیں کہہ سکے گا۔ آج ترکوں کے گرد یونانی کافروں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ ترک نوجوان ملک کا دفاع کرنے کے لئے صرف کافی نہیں۔ کیونکہ یونانی ایک اور دس کی نسبت سے اکثریت میں ہیں۔ لیکن ترک ایک جانباز قوم ہے۔ آج ترک بہنیں، بیٹیاں اور مائیں اپنے بھائیوں۔ باپ اور بیٹوں کے ہمراہ نقاب اتار کر ناموس اسلام کے لئے میدان جنگ میں برسرِ پیکار ہیں۔ یہ بھی کیا غیرت اور مردانگی ہو گی کہ ہم مسلمان عورتوں کو میدان میں چھوڑ کر بستر سر پر اٹھائے بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ کر درہ خیبر سے واپس وطن لوٹیں"۔

"اے ہندوستانیو! کیا آپ عورتوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ بے غیرتی کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے اے بے غیرت مسلمانو! ایسی صورت میں واپس جانے سے تو بہتر ہو گا کہ ہم جبل السراج کے دریا میں ڈوب مریں تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے باعث ننگ تو نہ ہوں"۔

حاجی صاحب کی نگاہیں شدت جذبات سے بالکل انگارہ بن چکی تھیں۔ منہ میں زیادہ غصّے کی وجہ سے جھاگ بن گئی تھی۔ پگڑی سر سے گر چکی تھی۔ دونوں مٹھیاں بھینچے حاجی صاحب کے لئے تقریر جاری رکھنا مشکل تھا۔ لیکن ایسی حالت میں بھی انہوں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "کیا آپ لوگ مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ میں پچاس برس کا بوڑھا صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ جس پر کھال چڑھی ہوئی ہے، ہوں لیکن میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ تیار ہوں۔ ترکی جانے کے لئے تیار ہوں اسلام کے ننگ پر مرنے کے لئے تیار ہوں۔ کوئی ہے جو اسلام کے ناموس کے لئے میرا ساتھ دے"۔

"میں ہوں۔ میں ہوں" کی آوازیں ہر مہاجر کی طرف سے آنے لگیں۔ ہر کوئی اپنی جگہ کھڑا ہو کر ساتھ

دینے کی آوازیں لگا رہا تھا اور کہنے لگتا کہ "حاجی صاحب ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ ہماری رہنمائی کیجیے ہم آپ کے ساتھ دنیا کے آخری کونے تک چلنے کو تیار ہیں۔ تاآنکہ ہمیں کوہ قاف کیوں نہ پھلانگنا پڑے۔ حاجی صاحب کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولے۔ "اے مہاجرین آپ کا کیا خیال ہے کہ اسوقت آپ دارالسلام میں ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ افغانستان اب دارالحرب بن چکا ہے۔"

تمام مہاجرین نے آہ بھر کر "اللہ اللہ" کی آوازیں بلند کیں۔ حاجی صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "جو کوئی بھی یہاں مرا تو وہ کتے کی موت مرے گا۔"

مہاجرین نے جوش جذبات میں نعرے بلند کرتے ہوئے کہا کہ "چلو دارالحرب سے نکل چلو ایسا نہ ہو کہ کتے کی موت مریں"۔ حاجی صاحب کی تقریر نے ان میں کھلبلی مچادی تھی۔ ہر طرف سے تحسین و ارشاباش کی آوازیں آنے لگیں۔ ناعاقبت اندیشوں نے حاجی صاحب کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا کہ حاجی صاحب نے ہماری صحیح ترجمانی کی ہے۔

تعلیم یافتہ اور سمجھ بوجھ والے افراد نے جو اس سفر کی نزاکت اور مصائب بھری منزلوں سے آگاہ تھے۔ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بٹ کر کھسر پھسر شروع کی۔ میں اس تمام کارکردگی کو حیرانگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نیند کے مارے فوری رائے ظاہر کرنے سے معذور تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر میری رائے دوستوں سے مختلف ہوئی تو ان کو صدمہ ہوگا اور میرے لئے بھی کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔

میرے دوستوں میں میرا ایک پنجابی دوست محمد صادق گورداسپور کا رہنے والا بہت سنجیدہ اور متین لڑکا تھا اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ میری نگاہوں کے اشارے کو سمجھ گیا اور ہم دونوں مجمع سے اٹھ کر باہر چہل قدمی کے انداز سے چل پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اس پر متفق ہو گئے تھے کہ اس بے سروسامانی میں اس طویل سفر پر جانا ممکن نہیں۔ گھپ اندھیرے میں ایسی ٹامک ٹوئیاں مارنا خودکشی سے ہرگز کم نہیں ہوگا ہم دونوں مہاجرین کی ناعاقبت اندیشی پر خندہ زن بھی تھے اور ان کی ناسمجھی پر ترس بھی آرہا تھا لیکن کسے اسوقت معلوم تھا کہ دوسرے مہاجرین کی طرح ہماری قسمت میں بھی یہ سختیاں کچھ کم نہ ہوں گی۔ ہم جب قلعہ واپس لوٹے تو مہاجرین کے جوش و خروش میں ابھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

"آیئے آیئے خیر سے آیئے" گوہر رحمان ہمیں دور سے ہی دیکھتے پکارا۔ "آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ہمیں سخت فکر دامن گیر تھی"۔ ساتھ ہی کہا۔ "دیکھ لیا حاجی صاحب کا تدبر کہ کس طرح ایک گھمبیر مسئلہ حل ہوا ورنہ ہم تو حیران تھے کہ ہمارا چمر قند والا وعدہ کس طرح ایفا ہو گا؟" وہ بے حد مسرور دکھائی دے رہا تھا میری اور صادق کی دلیلیں اس کے لئے ایک مذاق سے زیادہ کا درجہ نہیں رکھتی تھیں۔

"دیکھئے اور باتیں اب چھوڑ دیجئے۔ فیصلہ اب اس پر ہو گیا کہ سفر آگے جاری رکھنا ہو گا۔ کتنا لطف آئے گا ہر روز ایک نیا غم اور ایک نئی خوشی ہو گی۔ آج ایک شہر تو کل دوسرا شہر دیکھتے ہوئے جائیں گے"۔ کب؟ میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ گوہر رحمان خاموش ہو گیا۔ میں نے جب بات شروع کی تو کہنے لگا "کیا کہا آپ نے؟"

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "یہ تو اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے والی بات ہوئی"۔

"کیسے چھلانگ۔ دیکھو یہ تو دنیا کی سیر بغیر خطرے کرنے والی بات ہوئی۔ ہم آخر گھروں سے کس لئے نکلے ہیں۔ اگر ہمیں پرسکون زندگی ہی گزارنی تھی تو وطن میں آرام سے گزر رہی تھی"۔ گوہر رحمان بولا۔

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "مجھے اپنا کوئی خوف دامن گیر نہیں نہ میں ڈرتا ہوں سفر کی مشکلات سے۔ اور نہ ہی مصائب سے گھبرا کر واپس ہونے والا ہوں۔ لیکن ہم اس سفر پر اکیلے نہیں جا رہے۔ ہمارے ہمراہ بوڑھے اور کمزور بھی چلنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ اگر یہ لوگ راہ میں بیمار پڑے تو کیا ہو گا؟ ترکی دور بھی کافی ہے۔ سال بھر پیدل چلنے کے باوجود بھی نہ پہنچ پائیں گے۔ راستے میں سردی کا موسم پڑے گا۔ ہر طرف برف ہی برف ہو گی۔ یہ بوڑھے اور ناتواں لوگ کیا کریں گے؟ قفقاز کے پہاڑوں کی چوٹیاں تو برف سے اٹی ہوئی ہوں گی اس کو یہ بوڑھے اور کمزور کیسے عبور کریں گے؟"

گوہر رحمان نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "ان بوڑھوں کو اور کیا چاہیئے۔ یہ کیا کوئی کم بات ہو گی کہ وہ راستے میں شہادت پالیں اور ہم ان کی آخری رسومات انجام دے کر ان کو بغیر کتبے کے چھوڑ کر گمنام شہیدوں میں شامل کر لیں۔ بھائی تمہاری بابت میری رائے کچھ اور بنی تھی۔ وہ آج آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ جن دنوں قریشی محمد اکبر کے پیچھے گھر سے خط آیا تو مجھے ڈر پیدا ہوا کہ قریشی چلے جائیں گے۔ سرفراز صاحب میرے

گاؤں کے ہیں اور میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کس طبیعت کا شخص ہے۔ مجھے چرتند میں آپ کے متعلق پورا یقین تھا کہ آپ بہت سخت جان ہیں اور مجھے تسلی بھی آپ ہی کی وجہ سے تھی۔"

گوہر رحمان کی ان فکر آمیز درد بھری باتوں نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ میرا دل بھر آیا۔ عقل آگے بڑھنے کو بالکل تیار نہیں تھی۔ لیکن دل گوہر رحمان کی باتوں میں آچکا تھا۔ دس بارہ مہاجرین اردگرد حیران کھڑے تھے۔ ان میں عبداللہ نامی ایک معمر شخص بھی تھا جو ہندوستان میں ہیرہ گیری کرتا تھا آگے بڑھ کر بولا۔

" دیکھو اکبر شاہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ میری اس سفید داڑھی کی طرف دیکھو۔ آپ تو جوان آدمی ہیں۔ اپنی جوانی کا صدقہ دیجئے اور اس جہاد میں شامل ہو جایئے۔"

میں نے اس بوڑھے شخص کو جواب دینا مناسب نہ سمجھا لیکن میرے دل میں خیال آیا کہ اے بوڑھے میں دیکھ رہا ہوں کہ راستے کی صعوبتوں کے مارے لمبے لمبے راستے میں پڑے ہوں گے نہ تو ساتھ لے جا سکیں گے اور نہ راستے میں چھوڑ سکیں گے۔ اور مہاجرین نے بھی آگے بڑھ کر مجھے ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ رہی سہی کسر صوابی کے رہنے والے ایک یوسف زئی سپاہی نے پوری کر دی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

" چھوڑو تم بھی اپنے آپ کو پشتون کہتے ہو؟ قسم ہے مجھ کو ترکی تک نہیں کندھے پر اٹھائے لے جاؤں گا۔ اب اپنے وطن سے اتنی دور آگئے ہیں تو اب ترکی جانا کیا مشکل ہے؟" میں نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو محمد خان یوسف زئی کھڑا تھا مجھے ہنسی آگئی اور دل میں میرے بے اختیار یہ خیال آیا کہ اس بے چارے کا کوئی گناہ نہیں یہ کتنا معصوم ہے۔ ترکی تک پہنچنا کتنا مشکل ہے اسے کیا معلوم۔

افغانستان سے باہر نکلنے کی راہ داری

اگلے روز مہاجرین کی کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا جس میں طے پایا کہ شاہ افغانستان سے اجازت کے لئے وزارت خارجہ کو پاسپورٹوں کے لئے درخواست دی جائے۔ موضع تہکال ضلع پشاور کے عبدالرحیم خان نے بیاسی (۸۲) افراد کی طرف سے فارسی زبان میں وزارت خارجہ کو ایک درخواست لکھی جو مختصر ہونے کے

ساتھ کافی دلچسپ تھی اس لئے اس کا ترجمہ یہاں لکھتا ہوں:-

ترجمہ

عریضہ بخدمت اعلیٰ حضرت امان اللہ خان شاہ افغانستان

ہم درج ذیل مہاجرین حکومت افغانستان کی ہمدردی اور مہمان نوازی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ تحریر کرنا مقصود ہے کہ ہم لوگ جس مقصد کے لئے افغانستان آئے تھے وہ پورا ہو نہ سکا اب دنیا کی ایک اور اسلامی مملکت کو ہماری ضرورت ہے۔ جو ملک ہمیں پکار رہا ہے۔ وہ مقدس وطن ترکوں کا ارض روم ہے۔ اس اسلامی ملک پر یونانی کافروں نے حملہ کر رکھا ہے اور بعض مقامات پر یہ کافر قابض بھی ہو چکے ہیں۔

ایسی حالت میں مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ جہاد کے لئے ترکی پہنچیں۔ ہم مجاہدین ہیں اور اپنے سر کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارے پاس اسلحہ بالکل نہیں ہے۔ افغانستان بھی ایک اسلامی مملکت ہے اس لئے ہم پر اور افغانستان دونوں پر جہاد فرض ہے۔ ہم یہ درخواست اس لیے دے رہے ہیں کہ حکومت ہمیں جہاد کے لئے بیاسی بندوقیں اور سفر جاری رکھنے کے لئے پاسپورٹ مہیا کرے نیز ہمیں امید ہے کہ افغانستان کی حکومت ہمیں زاد راہ بھی عطا کرے گی۔ ہم مشکور و ممنون ہوں گے۔"

امین اللہ خان مہاندار نے پہلے تو اپنی کوشش کی کہ مہاجرین اپنی درخواست واپس لے لیں لیکن اس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ عرضی مذکورہ جو جمعہ کو لکھی گئی کے جواب کی امید ایک ہفتہ بعد ہو سکتی تھی۔ لیکن چھ روز گزرنے کے بعد مہاجرین جیسے انگاروں پر لوٹنے لگے۔ کوئی کہتا کہ بغیر راہداری جاتے ہیں کوئی کہتا کہ اس میں ہماری تو کوئی غلطی نہیں اگر وزارت خارجہ اعلیٰ حضرت کو وہ درخواست نہ پیش کرے تو اس میں ہم پھر کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ صبح جانا ہو گا۔

اسی طرح جمعہ کا دن بھی گزر گیا۔ ہفتے کے روز صبح سویرے مہاجرین کی کمیٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں پُرزور تقریروں کے بعد طے پایا کہ ایک وفد مہاندار صاحب کے پاس جا

کر اس کے ذریعے وزارتِ خارجہ سے ٹیلیفون پر بات کی جائے۔ اس گفتگو کا جو بھی نتیجہ نکلے ان کو مہاجرین کی طرف سے مطلع کیا جائے کہ پیر کے دن وہ کوچ کریں گے۔ مہاندار کی کوششوں سے جب راہ داری کی امید پیدا ہوئی تو مہاجرین نے جبل السراج میں اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔

میں بھی اثر لئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس عالم میں محمد اکبر خان نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ میں نے جواب دیا نہیں نہیں۔ وہ پھر بولے" تو پھر کیوں درخواست نہیں بھیجتے۔ جلد جواب آجائے گا۔ ہم جگہ بہ جگہ آپ کا آگے انتظار کریں گے۔" انہوں نے ساتھ ہی یہ تجویز پیش کی۔

" ہم قافلے کے ساتھ ہی جائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ اتنے میں سامنے سے محمد صادق ایک مضبوط یابو ساتھ لئے آتے دکھائی دیئے۔ یابو ایک قسم کا پستہ قد گھوڑا ہوتا ہے۔ جو افغانستان میں مال برداری کے کام آتا ہے۔ لگتا تھا کہ محمد صادق پر بھی قافلے والوں کا جوش و خروش غالب آچکا تھا۔ اس لئے سواری کے لئے یابو خرید لیا۔

ہفتے کے دن راہ داری آگئی۔ محمد اکبر نے وہ مجھے دکھائی۔ یہ ایک حکم نامہ تھا جس کی رو سے بیاسی مہاجرین کو از راہ سرات یا مزار شریف افغانستان سے خارج ہونا تھا۔ اس کا مختصر سا مضمون یہ تھا:

" ہشتاد و دو نفر مہاجرین ہندی را یا از راہ سرات یا مزار شریف خارج بکنید"۔

چونکہ حکم نامے میں ناموں کا اندراج نہ تھا لہذا جانے والے مہاجرین کو مطلع کر دیا گیا کہ کل بروز اتوار قافلہ جبل السراج سے کوچ کرے گا۔ اس خبر کے سنتے ہی چار مہاجرین نے جنکو ابھی آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا آکر ساتھ چلنے کو کہا۔ ان کی درخواست بھی منظور کر لی گئی۔

اب ہمیں متعین تعداد سے زیادہ افراد کو قافلے کے ہمراہ لے جانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ قافلہ کسی وجہ سے صبح کی جگہ عصر کو کوچ کرنے کے لئے رک گیا تھا اور دروازے کے پہرے داروں کو بھی یہ علم ہو گیا تو ہم چھ افراد کسی حیلے بہانے قلعے سے نکل کر منتشر ہو کر جگہ جگہ قافلے کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ جب مہاندار صاحب کو یہ علم ہوا کہ چھ افراد تعداد سے زیادہ بھاگ نکلے ہیں تو انہوں نے دس آفریدی سپاہیوں کا دستہ ہمارے پکڑنے کو روانہ کیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آفریدی سپاہیوں کا رویہ ہمارے

ساتھ بہت دوستانہ تھا۔ کیونکہ وہ ہمیں اپنا ہم وطن تصور کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں آگے راستے کے نشیب و فراز سمجھائے اور ہمیں خدا حافظ کہہ کر واپس چلے گئے۔ ان کی ہدایات کے مطابق ہم قافلے کے ساتھ اکٹھے شامل نہیں ہوئے اور ان سے علیحدہ اپنا سفر جاری رکھا۔ شام ڈھلے ہم لوگ سرائے گل بہار پہنچے۔ گل بہار کابل بلخ اور مزار شریف کی عظیم شاہراہ پر واقع ہے۔ سرائے گل بہار میں ہمارے ساتھیوں نے نہ صرف بڑی ہمدردی اور پیار سے ہمارا استقبال کیا بلکہ ہمیں ہر ممکن امداد دینے کا وعدہ بھی کیا۔

جبل السراج سے ہماری گرفتاری کے احکامات

ہمیں بیٹھے ہوئے ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ تین افغانی سپاہی سرائے میں داخل ہوئے اور آتے ہی اپنا حکم صادر فرمایا کہ "بیاسی مہاجرین کے علاوہ جو فالتو افراد قافلے کے ہمراہ ہیں وہ صبح سویرے اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کر دیں۔" لیکن انہیں جواب دیا گیا کہ ہمارے ساتھ کوئی فالتو شخص نہیں ہے۔ وہ تو چلے گئے لیکن ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ منظور شدہ تعداد سے زیادہ افراد کا یہاں سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان تین افغانی سپاہیوں میں سے ایک گل بہار کے کوتوال صاحب بہ نفس نفیس یہاں تشریف لائے تھے۔

ہمارا گل بہار سے بچ نکلنا

رات گئے جب اکثر مہاجرین میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے محمد اکبر نے نمائندوں کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ کس طرح یہ فالتو چھ آدمی کوتوال کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جائیں۔ کیونکہ صبح سرائے سے نکلتے ہی ان کی گرفتاری یقینی تھی۔ اس پر یہ صلاح ٹھہری کہ رات کے آخری پہر جبکہ سرائے کا دروازہ ابھی بند ہو ہمیں رسیوں کے سہارے سرائے کی دیوار سے اتارا جائے اور ہم لوگ آگے کھیتوں میں چھپ کر قافلے کا انتظار کریں اور یکے بعد دیگرے پھر اس میں شامل ہوتے جائیں۔ پروگرام کے مطابق ہم اٹھ کر تیار ہو گئے اور جب دیوار پر چڑھنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اچانک ایک ساتھی بھاگتا ہوا

آیا اور کہنے لگا کہ سرائے کا صدر دروازہ کھلا ہوا ہے اور دربان نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ اس کو تائید غیبی جانتے ہوئے فوراً ہم لوگ رفع حاجت کے بہانے یکے بعد دیگرے سرائے سے نکلے۔ اور فاصلے سے کھیتوں میں چھپ کر قافلے کا انتظار کرنے بیٹھ گئے تقریباً چار طویل گھنٹوں کے انتظار کے بعد جو ہمیں ایک شب کے انتظار سے بھی زیادہ لگ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے قافلے کے آثار نمودار ہوئے اور ہم بھی ان سے مل گئے۔

راہداری دیکھنے کی چوکی:۔

گل بہار سے دو میل آگے درہ پنج شیر کے دہانے پر راہداری دیکھنے کی چوکی تھی جہاں سے کسی کا بچ کے نکلنا معجزے سے کم نہیں تھا کیونکہ دونوں طرف بلند و بالا پہاڑ کھڑے تھے۔ رات کو سرائے میں ملنے والا کوتوال ہمارے انتظار میں یہاں کھڑا تھا۔ اس نے اپنا حکم صادر کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی افراد سے زیادہ کا جانا موقوف ہے۔ ہمارے ساتھیوں کے باہمی مشورے سے ہم چھ افراد کو پہلی گنتی میں نکل جانے کا موقع فراہم کیا گیا اور باقی ہمارے پیچھے آہستہ آہستہ چلتے گئے۔

درہ پنج شیر:۔

تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ آگے دریائے پنج شیر سڑک کو کاٹتا ہوا نظر آیا۔ گزرنے کے لئے قطعاً کوئی راستہ نہیں تھا۔ کھڑے ہو کر اس مقام کا بغور جائزہ لیا۔ دونوں طرف سیدھے اور بلند و بالا پہاڑ کھڑے تھے جن کے درمیان دریائے پنج شیر اتنا تیز بہہ رہا تھا کہ بڑے بڑے پتھر لڑھکتے جا رہے تھے قافلے کے تمام مہاجرین آہستہ آہستہ یہاں پہنچ گئے۔ ہمیں اپنے پیچھے کوتوال کے آنے کا خطرہ بھی لاحق تھا لہٰذا انتظار کئے بغیر اس جگہ کو پار کرنے کے متعلق سوچا۔ چھوٹی چھوٹی رسیوں کو آپس میں باندھ کر ایک لمبی رسی تیار کی گئی اور ایک مہاجر کے کندھے کو باندھ کر اللہ کا نام لے کر پتھروں اور جھاڑیوں کے سہارے پہاڑ پر چڑھایا گیا۔ رسی کا دوسرا سرا اس طرف والے مہاجرین کے ہاتھ میں تھا۔ اگرچہ ہر وقت دریا میں

لڑھکنے کا خطرہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی امداد شامل تھی وہ بہ خیریت پانی کے دوسری طرف اتر گیا۔ وہاں اس نے رسی کا سرا مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور ادھر سے باری باری مہاجر سڑک کے اس پار اترنے لگے۔ تمام مہاجرین نے خیریت سے دریا پار کیا۔ گھوڑے تو آسانی سے گزر گئے لیکن گدھوں نے کافی پریشان کیا۔ ہماری حالت اس وقت بڑی دگرگوں ہوئی جب گدھوں کو ہم آگے دھکیلتے اور وہ الٹی طرف مڑ کر زور آزمائی پر اتر آتے۔ باورچی خانے کا سارا سامان ان پر لادا ہوا تھا۔ ورنہ مہاجرین کے غصے کا یہ عالم تھا کہ دھکا دے کر ان کو پانی میں لڑھکا کر اپنے وطن پہنچا دیتے۔ دریائے پنج شیر کے کنارے کئی حادثوں سے مہاجرین کو دوچار ہونا پڑا۔ اس کی مختصر تفصیل ہمارے ایک ساتھی مجید لاہوری صاحب نے افسانہ ہجرت کے عنوان سے رسالہ "محنت کش" لاہور کے مورخہ ۲۸ جون ۱۹۲۷ء کے شمارہ میں تحریر کرتے ہوئے لکھا:

"پہاڑ سے نیچے اترتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر خشک راستہ تھا۔ مگر پندرہ گز کا فاصلہ طے کرنا کارے دارد تھا۔ کیونکہ پانی نہایت سرد اور تیز رو تھا۔ دو تین آدمی رسے لے کر بمشکل پار اترے۔ گھوڑوں اور گدھوں کو رسے سے باندھ کر بمشکل پار اتارا۔ ایک سیونگ مشین جو کہ ایک گدھے پر رکھی ہوئی تھی، گر پڑی جس کی تلاش کے لئے تین چار اشخاص مسمی نور احمد، خدا بخش، ملک فضل الٰہی لاہوری، خیر الدین امرتسری مالک مشین فوراً کمر میں رسے باندھ کر دریا میں کود پڑے۔ آدھ گھنٹہ ادھر ادھر غوطے لگائے۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ پانی اس قدر تیز بہتا تھا کہ بڑے بڑے پتھر اس کے آگے تنکے کی مانند ہو جاتے تھے۔ اس کے آگے مشین کیا حقیقت رکھتی تھی جس وقت تلاش کرنے والوں کا بدن سن ہو گیا۔ تیرنے اور غوطہ زنی کی طاقت نہ رہی تو ان کو باہر کھینچا۔ بات تک نہ کر سکتے تھے۔ بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ فوراً ان کو لٹا دیا اور ریت سے ان کے بدن کو خوب رگڑا۔ اور گرم گرم کپڑے ڈال دیئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ان کی حالت درست ہوئی اور وہ چلنے کے قابل ہو گئے۔ باقی آدمی بھی رسوں کے ذریعے پار ہوئے۔ جس وقت ہم نے اس ظالم دریا کو پار کیا وہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تحریر و تقریر کے احاطے میں نہیں آ سکتا۔"

ہمارا نقصان تو کافی ہوا اور بہت سارا سامان دریا کی نذر ہو گیا لیکن یہ بات ثابت ہو چکی کہ مہاجرین

کے حوصلے بلند ہیں۔ پار جانے کا نظارہ کافی حوصلہ افزا تھا۔ ہم چھ آدمی قافلے سے کافی آگے جا رہے تھے۔ بغیر راہداری والے تھے۔ میل دو میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک مہاجر گھوڑے پر سوار ہوا کی مانند تیز چلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور دور سے ہی پکارا کہ بھاگئے کو تو ال معہ سپاہیوں کے آپ کا پیچھا کر رہا ہے۔ شناخت کے لئے وہ جبل السراج سے اپنے ساتھ سپاہی بھی لایا ہے کہ بغیر راہداری والے افراد کا پتہ کر سکیں یہ خبر سنتے ہی ہم لوگ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ ہماری یہ دوڑ شام تک جاری رہی کم از کم دو پڑاؤ کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ مغرب کی نماز سے پہلے اگلے پڑاؤ پہنچے۔ مارے تھکان کے برا حال تھا ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ لیکن ہمارا پشاور کا رہنے والا ایک ساتھی سکندر شاہ جو کھانے پکانے میں ماہر تھا۔ کافی باہمت واقع ہوا تھکان اور بھوک سے ہماری بری حالت دیکھ کر اس نے فوراً کھانے پکانے کا انتظام سنبھالا۔ یہاں انڈے اور مرغی بآسانی دستیاب ہوتے تھے جو کافی سستے بھی تھے۔ چند ہی لمحوں میں گرم گرم اور لذیذ کھانا ہمارے سامنے پڑا تھا جس پر ہم ٹوٹ پڑے۔ سکندر شاہ کی بدولت ہمیں یہ آسانی ہوئی کہ اگر رات گئے بھی کسی پڑاؤ پر پہنچتے تو سب سے پہلے وہ مرغ کا پتہ کرتے کہ دستیاب ہوگا یا نہیں۔ مرغ پکانا تو اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض مقامات پر ہم تھکان کے مارے پہنچتے ہی سو جاتے تو آغا صاحب اپنے ساتھیوں میں سے کسی کے ہمراہ یا اکثر اکیلے ہی کھانا تیار کر کے ہمیں نیند سے کھانے کے لئے بیدار کر دیتے۔ روزانہ علی الصبح ہم چل پڑتے۔ ہماری چال ابتدا میں تیز تر ہوتی اور پھر آہستہ آہستہ کم ہونے لگتی اور پھر آہستہ روی سے منزل کی جانب چلتے۔

درہ پنج شیر افغانستان کا ایک سرسبز درہ ہے۔ یہاں کے پہاڑ کوہ ہندوکش (۳۰۰) کے سلسلے کی کڑی ہیں۔ قدرت نے دو متوازی پہاڑوں کو ایسی بلندی عطا کی ہے کہ ہر شخص کو اوپر دیکھتے ہوئے صرف اپنے حصے کا آسمان ہی نظر آسکتا ہے۔ دریائے پنج شیر ان پہاڑوں کے درمیان بہہ رہا ہے۔ تمام درہ تنگ واقع ہوا ہے۔ کوئی مقام بھی سو گز سے چوڑا نہیں۔ یہاں بعض مقامات پر راستہ کے علاوہ بیس فٹ چوڑا دریا جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ اور بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں دریا اور پہاڑ کے درمیانی راستے سے گھوڑا بھی بمشکل گزر سکتا ہے۔ دریا کہیں بھی پچاس فٹ کی چوڑائی میں نہیں بہہ رہا۔ دریا راستے کے بائیں جانب

بہتا ہے۔ جگہ جگہ کہیں آبادی بھی نظر آجاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک آدمی تھوڑی تھوڑی زمین کا مالک ہے لیکن یہ تھوڑی زمین بھی ایسی سرسبز و شاداب تھی کہ اسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ دریا کا پورا کنارہ تقریباً باغات سے بھرا ہوا تھا۔ جس میں انگور اور شہتوت کے پودے بکثرت تھے۔

جگہ جگہ پہاڑوں سے ڈھلکتے ہوئے آبشار ایک عجیب خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے اور باوجود اس خطرے کے کہ کوتوال ہمارا پیچھا کر رہا تھا ہم ان مناظر کو دیکھنے کے لئے رک جایا کرتے تھے۔ اگر کبھی بھی افغانستان نے ترقی کی اور ان آبشاروں کو بجلی بنانے کے لئے قابو میں کر لیا تو اور آبشاروں کی تو صرف بات ہی چھوڑیئے بلکہ تمام دریائے پنج شیر کو بجلی بنانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے پنج شیر کا درہ ایک قابل دید مقام بن جائے گا۔ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ تمام تر افغانستان صحت افزا مقام ہے لیکن درہ پنج شیر کی تو بات ہی چھوڑیئے۔ یہ ایک بوڑھے کو جوان بناتا ہے۔ پنج شیر کے مکین چاہے وہ سفید ریش بوڑھے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے گال بالکل کشمیر کے سیبوں کی طرح سرخ نظر آتے ہیں۔

ہم نے سرائے گل بہار سے یہاں تک کا اسی، سو میل کا سفر دو دن میں طے کیا۔ بدن تھکان سے چور تھے۔ ہمارا قافلہ بھی اب بڑھ چکا تھا۔ دو مقامی قندفروش جو اپنے چار گدھوں پر مصری (چلیپی) لادے ہوئے تھے پچھلے پڑاؤ سے ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ اب ہمارے قافلے میں چھ مہاجرین ایک لغمانی (لغمان کا رہنے والا) اور دو قندفروش شامل تھے۔ اتنے سارے ساتھیوں کے ایک ساتھ چلنے کے باوجود ہم نے ایک دوسرے سے کبھی پوچھ گچھ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور نہ ہی ہم نے ان سے کچھ پوشیدہ رکھا تھا۔ یہ لغمانی ایک غریب لیکن محنتی، سخت جان اور پُرخلوص لڑکا تھا۔ گھر سے سخی سرور کی زیارت کرنے کے ارادے سے نکلا تھا۔ اللہ تعالیٰ ایسے نیک ارادے رکھنے والوں کی مدد ضرور کیا کرتا ہے۔ اس لئے اس کو ہمارا سہارا میسر کر دیا۔ لغمانی نے سخت سے سخت مشکلات میں بھی اپنی شرافت، ہمدردی اور دوستی کا ثبوت دیا۔ ہم نے نہ صرف اس کو اپنا ساتھی تصور کیا بلکہ اس کی حد سے زیادہ خاطر مدارات کی۔ قندفروش بھی غریب اشخاص تھے راستے میں اکیلے جا رہے تھے کہ انہیں ہم سفر مل گئے۔

اب تک ہم درہ پنج شیر میں مغرب سے مشرق کی جانب جا رہے تھے۔ اب یہ [illegible]

جہاں سے دریے کا رخ شمال کی طرف ہوتا تھا۔

میرا اور صادق کا اور ساتھیوں سے پیچھے رہ جانا

قندفروشوں کے مشورے پر ہم نے بڑی شاہراہ کے کنارے رات بسر کی۔ معمولی سی آہٹ پر بھی ہم لوگ گرفتاری کے خوف سے اچھل پڑتے۔ اس خوف و ہراس کے باعث ہم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کبھی بھی ان قندفروشوں کے مشورے پر عمل نہیں کریں گے۔

صبح جب اٹھے تو آغا سکندر شاہ نے تجویز پیش کی کہ کب تک اس طرح بھاگتے رہیں گے اور اپنے آپ کو تھکان سے ہلکان کرتے رہیں گے۔ ہم میں سے دو مضبوط آدمی ٹھہر کر قافلے کا انتظار کریں اور آنے پر ان سے معلوم کریں کہ گرفتاری کے وارنٹ اسی طرح ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو پھر اسی طرح چلنا پڑے گا ورنہ اپنے آپ کو کب تک اس طرح ذلیل و خوار کرتے رہیں گے۔ بقایا آدمی قندفروشوں کے ہمراہ چلنے نہیں چاہیئے۔

حالات اس طرح رُخ اختیار کر چکے تھے کہ ان ساتھیوں میں سے دو کا پیچھے رہنا اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنے والی بات تھی لیکن جذبہ کچھ اس طرح پروان چڑھ رہا تھا کہ ہر ایک ساتھی خود کو دوسرے کے لئے قربان کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ قرعہ فال میرے اور صادق کے نام نکلا۔ ہم نے باقی ساتھیوں کو قندفروشوں کے ہمراہ الوداع کہا۔

ہم لوگ بڑے راستے سے ہٹ کر پچاس قدم دور ایک پہاڑی چٹان کے اوٹ میں قافلے کا انتظار کرنے بیٹھ گئے۔ انتظار کرتے کرتے ہماری آنکھیں پتھرا گئیں لیکن دور دور تک قافلے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ افغانستان کو قدرت نے جو دولت عطا کی ہے ہم اس کی تعریفوں میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک ایک گھڑسوار بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے پاس سے گذر گیا اور آگے چل کر جہاں ہمارا

گھوڑا چر رہا تھا وہاں رک گیا۔ ہم نے اسے پہچان لیا۔ اپنی کمین گاہ سے نکلے اور دوڑ کر اس کی طرف گئے۔ علیک سلیک کے بعد اس نے باقی ساتھیوں کا دریافت کیا۔ ہم نے اسے سب واقعہ سنا ڈالا۔ اس نے کہا کہ خان (محمد اکبر خان کو قافلے میں اسی نام سے پکارا جاتا تھا) نے کہلا بھیجا ہے کہ اسی طرح بھاگتے جایئے ورنہ گرفتار کر لئے جاؤ گے۔

خوش آمدید مہمانہائے ما (ہمارے مہمانو خوش آمدید)

ہم نے شودا (جو کہ ہمارے یابو کا نام تھا) پر زین کس کر تیزی سے چلنا شروع کیا۔ دن بھر مسافت طے کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ آگے پانی کا ریلہ پُل بہا کر لے گیا ہے۔ اور ہمارا راستہ اب صرف پہاڑ کی چوٹی پر ہی ہو سکتا تھا۔ رات اندھیری تھی اور اس تاریکی میں پہاڑ پر چلنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہماری معمولی غلطی ہمیں عمیق گھاٹیوں میں پہنچا سکتی تھی۔ تاریکی کے باعث راستہ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ارد گرد کہیں آبادی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پنج شیر کے تنگ درے میں ویسے بھی سر شام ہی سے اندھیرا ہو جاتا تھا۔ آج ہماری تعداد بھی کم تھی ہم صرف دو آدمی تھے۔ اچانک ہماری نظر پہاڑ کے ایک کونے میں دو چار جھگیوں پر پڑی۔ ہم ہمت سے کام لے کر ان کی طرف روانہ ہوئے۔ اگرچہ ہمیں ان جھگیوں کی جانب جانا سخت ناپسند تھا لیکن اب مجبور تھے کیونکہ اس وقت ہم درہ پنج شیر کے اوپر خاصی بلندی پر تھے اور برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں جو دن کو دھوپ کی روشنی میں چمکتی تھی اور ان چوٹیوں سے بہنے والا پانی جو آبشاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا میں پھنس چکے تھے۔ قدرت کی یہ حسین بلندیاں جو دن کو دل لبھاتی تھی۔ اس وقت کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ ٹھنڈک اور وحشت سے ہمیں سر چھپانے کو کوئی جگہ چاہیئے تھی لہٰذا بادل ناخواستہ ہم ان جھگیوں کی جانب بڑھے۔ میرا دل غیر معمولی خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ ایک نوجوان ایک جھگی کے آگے کھڑا تھا ہم نے جا کر اس کو السلام علیکم کیا۔ نوجوان نے

ہمارے سلام کا جواب بہت محبت بھرے انداز میں دیا۔

"یہ راستہ آگے گیا ہے ؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔ وہ مسکرا دیا اور بہت شائستہ لہجے میں ہمیں اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دی۔ غالباً وہ ہمارا مطلب سمجھ چکا تھا اور جان گیا تھا کہ راستے کا پتہ دریافت کرنا دراصل ٹھہرنے کے لئے ایک بہانہ ہے۔

ہم نے ابھی دعوت قبول کرنے نہ کرنے کا جواب دیا بھی نہیں تھا کہ محمد صادق نے ایک معصوم بچے کو جو کہ اپنے باپ کی گود میں تھا ایک قران (سکہ) پیار بھرے انداز میں تھما دیا۔ اتنے میں اجنبیوں کو دیکھ کر وہاں ایک چھوٹا سا مجمع لگ گیا۔ ان سب میں اس بچے کا باپ جس کو صادق نے محبت بھرے انداز میں ایک قران دیا تھا۔ معتبر معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے ساتھی کے اس خلوص سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ہمیں اپنی جھگی کے ساتھ ہی واقع پتھروں کے ایک کھنڈر میں رات بسر کرنے کے انتظامات سے آگاہ کیا۔ ہمارے لئے وہاں عمدہ قالین بچھائے گئے۔ یہ مہینہ جولائی کا تھا اور نصف سے زیادہ مہینہ گذر چکا تھا۔ اپنے وطن میں ان دنوں سخت گرمی پڑتی ہے لیکن یہاں اہل خانہ کے دیے ہوئے قالین اور لحافوں کے علاوہ جو کمبل ہمارے پاس تھے انہیں اوڑھ کر بمشکل سردی سے بچ سکے۔ ایک دفعہ گرم ہو کر ہمیں کسی چیز کی سدھ بدھ نہ رہی۔ رات گئے اہل خانہ نے ہمیں کھانا کھانے نیند سے جگایا۔ میزبان ہمیں اپنے جھگی میں لے گیا۔

جھگی کے اندر قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ قالینوں کی بہتات کی وجہ سے فرش روئی کی مانند نرم تھا۔ ہمارے اعزاز میں اس نے دو ڈیلیاں (دیودار کیل وغیرہ کی لکڑی میں ایک خاص قسم کی لکڑی ہوتی ہے جو بہت زیادہ روغنی ہوتی ہے اور اسے جلا کر روشنی کا کام لیا جاتا ہے) جلا رکھی تھی۔ ہمارے داخل ہوتے ہی میزبان کی بیوی نے ہمیں خوش آمدید ان الفاظ کہا:۔

"خوش آمدید مہمانھائے ما۔"

یعنی "ہمارے مہمانوں تم کو خوش آمدید کہا جاتا ہے"۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد ہی وہ میاں بیوی بیٹھے۔ بات چیت ساری فارسی میں ہو رہی تھی کیونکہ کوہ دامان اور پنج شیر میں تاجک بستے ہیں۔ جنکی زبان فارسی تاجک ہے۔ عام طور پہ یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ پس ماندہ اقوام اس قابل نہیں ہوتے کہ ان سے "مہذب" انسان قربت داری کر سکیں۔ لیکن جن لوگوں کو عرب کے بدوؤں۔ افریقہ کے حبشیوں اور افغانستان کے خانہ بدوش کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ان لوگوں میں ان نام نہاد تہذیب کے دعویداروں سے زیادہ خلوص محبت اور اخلاق پایا جاتا ہے میں اس اہل خانہ کا حسن سلوک اور اس کی بیوی کی شیریں اور میٹھی آواز زندگی میں کبھی بھول نہ سکوں گا۔ فرنگی کی خوش لباسی خوش خوراکی زیادہ علم اور مہذب ہونا کس کام کا کیونکہ وہ ایک اجنبی کے کام نہیں آسکتا۔ اور اپنے سے کم تر حیثیت کے انسان کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے۔

کھانے کے بعد دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ انہیں بہت زیادہ حیرانگی ہوئی جب ان کو پتہ چلا کہ میں کونڑ کا سید ہوں اور صادق سرکانئی کے کرنیل صاحب کا فرزند ارجمند ہے

خانہ بدوش نے ہمیں نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ پھر یابو پر سواری نہ کریں بلکہ زین کسے ہوئے خوبصورت گھوڑوں پہ آپ کو سفر جاری رکھنا چاہیئے۔ ہم نے ان کی یہ نصیحت ایک شان بے اعتنائی سے ٹالتے ہوئے کہا کہ خوبصورت گھوڑے کی سواری سے زیادہ ضروری اعلےٰ حضرت کی حکم کی تعمیل ہے۔

کوہ ہندوکش کو عبور کرنا

میزبان کی اس نازک بحث سے مزید بچنے کے لئے ہم نے جلدی سونے کا بہانہ کیا۔ صبح سویرے پھر چل پڑے۔ میزبان نے دستور کے مطابق کچھ دور تک ہمارا ساتھ دیا۔ کوہ ہندوکش کی بالکل عمودی

پہاڑی پر شودا ہمیں چڑھانے سے انکاری تھا۔ تاہم دوپہر تک ہم چڑھائی طے کر چکے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر برف پڑی ہوئی تھی۔ مجھے خود یاد پڑتا ہے کہ بچوں کی طرح برف دیکھ کر میں اپنے آپے میں نہ رہا۔ برف پر خوب پھرا۔ کیونکہ زندگی میں اس طرح کا یہ پہلا موقعہ ملا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جب وطن عزیز واپس لوٹوں گا تو پھر بڑے بوڑھوں کی طرح میں بھی کہہ سکوں گا کہ ہم نے برف پر سفر طے کئے ہیں۔

ہمیں گالیاں سننا پڑیں

تھوڑی دیر میں ہم پہاڑی کی دوسری طرف اترے۔ یہاں پانی کا ایک نالہ جو بمشکل چار گز چوڑا ہو گا۔ نہایت تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ نالے کے اس پار دو آدمی کھڑے چیخ چیخ کر ہمیں کچھ کہہ رہے تھے۔ پانی کے شور کی وجہ سے ہمیں ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ ہم دونوں شودا پر سوار تھے۔ ہم نے اسے پانی میں دھکیل دیا۔ صادق نے پیچھے سے شودا کو تیز چلنے کے لئے ایک چابک رسید کیا۔ پانی گولی کی سی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا اس میں یابو کے پاؤں پھسلے۔ پانی اس کے سینے تک پہنچ گیا۔ اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں احساس ہوا کہ شاید ہمارا کام تمام ہو چکا ابھی یہی فکر دامنگیر تھی کہ پیچھے سے گڑگڑاہٹ کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑا پتھر پانی میں بہہ نکلا ہے۔ اگر ہم ایک فٹ پیچھے بھی ہوتے تو اس نے ہمارا کام تمام کر ہی دیا تھا اور یہ چٹان ہماری ہڈیاں پیس کر پانی کے بہاؤ پر وطن عزیز تک پہنچا دیتی۔[۳۱] پانی کے دوسری طرف جو آدمی کھڑے تھے وہ اس سرکاری پڑاؤ کے چوکیدار تھے۔ ان کا سارا شور وغل اس لئے تھا کہ وہ پانی پر بنے ہوئے ایک چھوٹی سی پلی کے بارے میں ہمیں بتا رہے تھے جو چند قدم نیچے تھی لیکن شور وغل کی وجہ سے ہم ان کی آواز نہیں سمجھ سکے۔ پار اترنے کے بعد جو سب سے پہلی بات ہم نے سنی وہ یہ تھی کہ اے کم بختو اگر تمہارا یابو مضبوط نہ ہوتا تو پانی میں جو چابک تم نے اس کو رسید کیا تھا وہ تم لوگوں

کو جہنم تک پہنچانے کے لئے کافی تھا۔ ہم سمجھ چکے تھے کہ ایسے تیز رو پانی میں جانور کو چابک رسید کرنا کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ دونوں چوکیداروں نے ہمیں سخت برا بھلا کہا۔ ایک ہی یابو پہ دو آدمیوں کا بیٹھنا اور اس کے سوا یابو پہ پڑی ہوئی زین ہماری بے عزتی کا موجب بنے ہوئے تھے۔

ہم نے چوکیداروں کے گالیوں کو جیسے سنا ہی نہیں۔ خود کو بہرا ثابت کر کے آگے چل دیئے۔ اس پڑاؤ پہ مزید ٹھہرنا اپنی بے عزتی کروانا تھی۔ ابھی وقت بھی ہمارے پاس کافی تھا اس لئے بغیر رُکے اپنا سفر جاری رکھا اور شام پڑنے سے پہلے دوسرے پڑاؤ تک پہنچ گئے۔

کرنیل کے ساتھ ملاقات

ہماری قسمت اچھی تھی ایک افغان کرنیل بدخشان سے پہنچا تھا اس نے ہمارے پہنچتے ہی ہمیں چائے پر بلوایا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہم سے بے تکلف ہو گیا۔ چائے پینے کے بعد اس نے اپنی رائفل اٹھا کر نشانہ بازی خود بھی شروع کی اور ہمیں بھی ایسا کرنے کی دعوت دی۔ اس نے تو پہلے ہی فائر میں نشانے پر گولی لگائی پہلے پہل تو اپنی کمزوری چھپانے کے لئے ہم نے انکار کیا لیکن اس کے بے حد اصرار پر ہمیں بھی نشانہ بازی میں حصہ لینا ہی پڑا۔ صادق اور میری گولیاں نشانے سے ہٹ کر کتنی دور لگیں۔ ہمیں کچھ اندازہ بھی نہ ہو سکا۔

کرنل صاحب ایک لمبی مسافری کے بعد بدخشاں سے اپنے بھائی کی سفارش پہ کابل واپس جا رہے تھے۔ حکومت سے کافی نالاں تھے لیکن اپنی حکومت کے بدخواہ نہیں تھے۔ اس نے اپنی تمام کہانی ہمیں بڑی تفصیل سے بیان کی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شکر ہے کہ افغانستان کے قبطی علاقے کابل سے ٹیلی فون یا ٹیلیگراف کے ذریعہ رابطہ نہیں رکھے ہوئے ورنہ کرنیل کا رویہ ہمارے ساتھ ایسا نہ ہوتا اور وہ کبھی بھی ہماری اتنی عزت اور خاطر مدارت نہ کرتا۔

اگلی صبح کرنیل سے اس وعدہ پر رخصت ہوئے کہ مزار شریف کی زیارت کرنے کے بعد جب پشاور واپس جائیں گے تو ان سے کابل میں ضرور ملاقات کریں گے۔ کرنیل صاحب بڑے آدمی تھے اس لئے انہوں نے ہمیں پتے بھی بڑے آدمیوں کے ہی دیے جو ہم نے بخوشی اپنے پاس نوٹ کر لئے۔

ہم تمام دن آہستہ آہستہ چلتے گئے لیکن شام تک کوئی پڑاؤ نہیں آیا۔ رات ایک قہوہ خانہ میں بسر کی۔ وہاں علم ہوا کہ ہمارے ساتھیوں نے بھی رات وہیں بسر کی تھی اور آگے بازارگے میں وہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ علاقہ غیر آباد تھا اور غیر آباد علاقوں میں پڑاؤ نہیں ہوتا۔ جیسے بھی ہو۔ مسافروں کو آگے بڑھنا پڑتا ہے کیونکہ راستے میں سہولتیں میسر نہیں آتیں۔

بازارگی

ہم لوگ صبح دس بجے بازارگی پہنچے۔ بازارگے اپنے نام کی طرح نسبت بھی رکھتا تھا کیونکہ یہاں صرف چند دکانیں تھیں اور ان کے علاوہ کسی کی ایک ذاتی سرائے تھی۔ ہمارے ساتھی ہمارے انتظار میں یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ہمیں ایسے بغل گیر ہوئے جیسے ہم کوئی بہت بڑی مہم سر کر کے آئے تھے۔ مرغ پلاؤ وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ ہم پنج شیر کی گھاٹیوں کے مارے ہوئے تھے اس لئے اس کھانے سے پورا پورا انصاف کیا۔

افغانستان بھی ایک عجیب ملک ہے۔ کابل میں بے حد مہنگائی جبکہ کوہ دامان میں بہت ارزانی۔ فاصلہ دونوں کے درمیان صرف چند میل کا ہے۔ اسی طرح پنج شیر میں بے اندازہ گرانی جبکہ بازارگی میں بہت ارزانی۔ ہمارے ساتھیوں نے بازارگی میں جہاں ہر قسم کی چیزیں میسر تھیں ہمارے لئے خوب بہت سی چیزیں پکائیں۔ چھوٹی لیکن گول گول اور نرم نرم روٹیاں پیسے میں تین تین بک رہی تھیں۔ ذائقہ اور نرمی میں انگریزی طرز کی کوئی بیکری اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس مقام پر ازبکوں کی تہذیب کا اثر دکھائی دیتا تھا۔ یہاں کا پانی دریائے آمو کی جانب بہہ رہا تھا۔ لیکن اس نالے کا پانی (جسے ہم نے یابو پر بیٹھ کر پار کیا تھا) ہمارے وطن کی طرف بہہ رہا تھا۔ اور اس سے ذرا اوپر ایک چھوٹے کنڈاؤ سے قطب کی طرف کا پانی دریائے آمو کی جانب بہہ رہا تھا۔

شاہی راستے میں ہم پڑا کہ پڑتا ہے

دوپہر ڈھلے قافلہ بازارگی سے آگے روانہ ہوا۔ کوئی ایک میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ شاہی راستے

پر ایک درخت کے سائے میں ایک سفید ریش شخص صاف ستھری دری بچھائے اس پر بیٹھا ملا۔ ہمیں دیکھتے ہی بولنے لگا کہ محصول ادا کر کے جایئے۔ ہم نے پوچھا کیسا محصول؟ اس نے جواب میں بڑے رعب سے کہا۔

"حکم حاکم است گمرکی بدہ"

دراصل اس بدمعاش شخص نے بازارگی میں ہمیں پہچان لیا تھا کہ یہ لوگ مسافر ہیں۔ اور ان سے کچھ ہتھیانا چاہیئے۔ اسی لئے اس نے اس جرأت کا مظاہرہ کیا۔ ہم نے پہلے تو فیصلہ کیا کہ اس کو پکڑ کر کوتوالِ شہر کے حوالے کر دیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ خود تو چوروں کی طرح چھپتے پھر رہے ہیں ایسے میں چور کسطرح چور کو پکڑے۔ چنانچہ اسے کچھ رقم پکڑا کر آگے بڑھ گئے۔ اگلے پڑاؤ عصر تک پہنچ گئے لیکن وہاں کھانے کی کوئی چیز بھی نہ ملی۔ نزدیک آبادی کا نام ونشان بھی نہیں تھا اس لئے بھوکے ہی سو رہے۔ علی الصبح پھر روانہ ہو گئے اور سارا دن چلتے رہے نہ کہیں آبادی نظر آئی نہ روٹی اور پانی دستیاب ہوا۔

نارین

عصر کو نارین کے قریب پہنچے۔ راستے میں ایک تنگ مگر گہرا نالہ بہہ رہا تھا۔ پانی کی گہرائی معلوم کرنے کے لئے ہم نے اپنا ٹٹو اس میں ڈالا۔ پانی اس کے پیٹ تک بہہ رہا تھا۔ اگرچہ پانی کا زور پنج شیر میں بہنے والے پانی کی طرح نہیں تھا تاہم افغانستان کا ہی پانی تھا آخر اسی لئے کافی تیز بہاؤ تھا۔ اس لئے اس کی تیزی نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہمارے ساتھی سرفراز خان کے ٹٹو نے جب دو پھیرے لگائے تو ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں پانی کا تیز بہاؤ اس کو ساتھ نہ لے جائے تاہم خلاف توقع اس نے پانی کے پار جانے میں کوئی سستی نہ دکھائی۔ لیکن چوتھے پانچویں آدمی کو لے جاتے ہوئے آخر ٹٹو پھسل گیا ہم نے بمشکل اسے پانی سے باہر نکالا۔ وہ پانی سے باہر آتے ہی کنارے پر دراز ہو گیا اور ہم نے اسے اس کی حالت پر تھوڑی دیر رہنے دیا۔ اور ہم تب ہی آگے بڑھے جب وہ اپنی مرضی سے اٹھ گیا اور چل کر اس نے ہمیں باور کرا ہی دیا کہ میں اب چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ ہم نے اپنے طویل راستے کے ساتھی پر اس کی مرضی کے

خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب تک اس کا پیٹ بھرا نہ ہوتا اس پر کوئی سواری بھی نہیں کرتا۔ آج اگر وہ بھوکا تھا تب بھی اس کو کوئی گلہ اس لئے نہیں تھا کہ اسے پتہ تھا کہ ہم بھی بھوکے ہیں اور حقیقت بھی یہ تھی کہ ہم میں صرف وہ آدمی اس پر سوار ہوتا جو یا تو بیمار ہوتا اور یا حد سے زیادہ تھک جاتا۔ قندفروشوں کی مصری بھی آدھی سے زیادہ بھیگ چکی تھی۔ ان کے گدھوں کو ہم نے زور سے پار دھکیلا۔ قندفروشوں کا کہنا تھا کہ یہاں ایک پُل بنا ہوا تھا لیکن آج تو اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ آگے ایک سرسبز میدان میں نارین کا بڑا وسیع گاؤں واقع تھا۔ نارین کے لوگوں کا دارومدار اسی پانی پر تھا۔ نارین میں ایک بہت بڑا بازار بھی تھا اور تجارت کا مرکز بھی تھا لیکن پھر بھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ باوجود اس کے وہ اس پانی پر ایک مستقل پُل کیوں نہیں باندھ لیتے تھے۔ نہ ہی تو سارے افغانستان میں راستوں کی مرمت کی طرف حکومت کی توجہ ہے اور نہ ہی پُلوں کی تعمیر کی طرف۔ پرانے زمانے کے تعمیر کردہ پُل بھی بغیر مرمت کے پڑے ہوئے تھے۔ قندفروش فریاد کر رہے تھے کہ ہم تو تباہ و برباد ہو گئے۔ یقیناً یہ فریاد بہت سے سوداگروں نے کی ہو گی۔ افغانستان میں تجارت کی ترقی کے لئے پُلوں اور راستوں کی تعمیر بہت ضروری ہے۔ رستوں کے نہ ہونے سے ایک جگہ اور دوسری جگہ کے نرخوں کے بارے میں مکمل لاعلمی کی ہے۔ اگر کوئی باہمت آدمی قندفروشوں کی طرح ارادہ کر بھی لے تو ان کی حالت بھی قندفروشوں جیسی ہی ہو گی۔ جو اگر ہماری مدد سے محروم ہوتے تو نارین میں صرف گدھے ہی پہنچتے مال راستے میں تلف ہو چکا ہوتا۔ ہم نے حکومت افغانستان کی اس غفلت پر افسوس کیا۔

ہم مغرب سے پہلے نارین پہنچ گئے۔ ایک سرائے میں تھکے ماندے جا کر سو رہے۔ عشاء کو اُٹھ کر کھانا کھایا اور پھر سو گئے۔ صبح اُٹھ کر نارین کی سیر کی۔ ایک بڑا قصبہ تھا۔ اور تجارت کی مرکزی منڈی تھی۔ چاروں طرف سے تجارت کے راستے نارین آ کر ختم ہو جاتے تھے۔ یہاں سے ایک راستہ بغلان اور ایبک کو جاتا تھا۔ اور یہ وہی راستہ تھا جس پر ہم جا رہے تھے۔ دوسرا خانہ آباد اور بدخشان کی طرف گیا تھا اور پنج شیر کی طرف سے ایک اور راستہ کابل کی طرف گیا تھا۔

نارین شہر اور بازار کی عمارتیں مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ یہاں تجارت زوروں پر تھی۔ بازار بہت تنگ

تھا۔ اس علاقے میں گاڑی کہیں نہ تھی اور نہ ہی اس بازار میں سے گاڑی گذر سکتی ہے۔ پیدل چلنے والے بمشکل چلتے۔ صفائی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ دکانداروں کا یہ طریق تھا کہ دکانوں کی گندگی بازار کی طرف جدھر مرضی ہوئی پھینک دیتے اور پھر یہ گندگی لوگوں کے پاؤں سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی رہتی۔

ایک ساتھی کا ہم سے جُدا ہونا

دوپہر کو جب ہم کوچ کرنے والے تھے معلوم ہوا کہ میرے ہم وطن غلام یحیٰی کا جانے کا ارادہ بدل گیا ہے۔ اکثر اوقات میں نے اس کو قندفروشوں کے ساتھ چہ میگوئیاں کرتے دیکھا تھا۔ اور انہی قندفروشوں نے اس کا ارادہ بدل دیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں قندفروشوں کے ساتھ خانہ آباد تک چلا جاؤں گا اور وہاں سے پھر چترال کافی نزدیک پڑتا ہے۔

غلام یحیٰی ہمارے ساتھ نارین سے باہر تک آیا۔ میں اور میرے ساتھیوں نے اسے بہت سمجھایا کہ بھائی قندفروشوں پر اعتبار مت کرو۔ اپنے گروہ سے جُدا ہونا عقلمندی نہیں۔ اس نے مجھ پر واضح کر دیا کہ مجھے اپنا گاؤں بدرشی بہت یاد آ رہا ہے اور آگے بڑھنے کو بالکل دل نہیں کرتا اور جب خانہ آباد پہنچ جاؤں تو وہاں سے چترال صرف سات دن کی مسافت پر ہے اور جب چترال پہنچ گیا تو سمجھ جاؤ کہ گھر پہنچ گیا۔

شام سے پہلے ہم لوگ خانہ بدوشوں کے ایک کیمپ پہنچے۔ ان کے نزدیک ہی ہم نے ڈیرہ جما دیا۔ یہ خانہ بدوش نہایت خوش اخلاق اور شریف لوگ تھے۔ وہ ہمیں نہ صرف خوش آمدید کہنے آئے بلکہ انہوں نے ہمیں کھانے کی دعوت بھی دی جسے ہم نے بڑی مہربانی اور شکریے کے ساتھ مسترد کر دیا کیونکہ ہم اپنا کھانے کا انتظام خود کر آئے تھے۔ ہم کمبل بچھا کر اس پر لیٹ گئے۔ یہ وطن گرم تھا اور یہ ایک بڑا چٹیل میدان تھا۔ دور دور تک کہیں پہاڑ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب ہم کل چھ افراد رہ گئے تھے۔ چھٹا ہمارا لغمانی دوست تھا جس کو ہم اپنے آپ کا ہی ایک حصہ سمجھنے لگے تھے اور اس کو اب خود سے

علیٰحدہ تصور نہیں کرتے تھے۔ اس نے بھی اپنے اعتبار کا ثبوت ہمیں فراہم کیا اور توقعات جو اس سے وابستہ تھیں ان پر پورا اترا۔

بغلان

علی الصبح خانہ بدوشوں سے رخصت ہو کر آگے روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک متواتر چلتے رہے حتیٰ کہ تھکان سے چُور چُور ہو گئے۔ سارے راستے میں نہ پانی تھا اور نہ خوراک بس بھوکے پیاسے ایک صحرا میں چلتے رہے کبھی کبھی کوئی آدمی جب نظر آجاتا تو اس سے دریافت کرتے کہ اگلا پڑاؤ کتنا دور ہو گا وہ جواب دیتا۔

"ایں ھمیں دو کروہ" (یہی کوئی دو کوس ہو گا)

پھر کوئی چار چھ میل سفر طے کرتے اور جب پڑاؤ کا دریافت کرتے تو پھر یہی جواب ملتا کہ کوئی دو کوس ہو گا۔ سارا دن چلنے میں گزرا اور ہر ایک نے یہی جواب دیا۔ عشاء گئے بغلان پہنچے۔ دو دن کا سفر ہم نے ایک ہی دن میں طے کیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ مہاجرین کے قافلے سے آگے نکل جائیں اور دوسری یہ کہ بغلان اور نارین کے درمیان جو سرائے تھی وہاں رُکنا بھوک کے مارے مرنے کے برابر تھا۔

بغلان پہنچ کر ایک سرائے میں اترے۔ مارے تھکان کے ہلا نہیں جا رہا تھا۔ سرائے میں صرف تین روٹیاں دستیاب ہو سکیں جو ہم نے آپس میں بانٹ لیں۔ اسے کھانے کے بعد سو گئے۔ جبل السراج سے یہاں تک آرام نصیب نہیں ہوا تھا۔ منہ اندھیرے اٹھتے اور شام اندھیرے تک متواتر چلتے رہے۔

بغلان ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں کوئی بازار نہیں تھا۔ مکان مٹی کے بنے ہوئے تھے لیکن روٹی۔ انڈے اور مرغ وافر مقدار میں دستیاب تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جب تک ہمارے قافلے کا پتہ نہیں چلتا ہم یہیں رُکے رہیں گے۔ ہمیں پتہ تھا کہ قافلہ تیز رفتاری سے نہیں چل سکے گا کیونکہ اس میں بوڑھے اور کمزور افراد بھی ہیں۔

بغلان کے کوتوال کے سامنے پیشی

دوپہر تک ہم پڑے سو رہے۔ جب آنکھ کھلی تو سرکاری ہرکارے کو سر پر موجود پایا۔ کہنے لگا کہ آپ کو کوتوال صاحب نے یاد کیا ہے۔ ہم جلدی سے کوتوال صاحب کی خدمت میں حاضری کے لئے تیار ہو گئے۔ افغانستان میں کوتوال ایک اہم حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہمارے وطن کی طرح یہاں بھی تھانیدار بڑی بارعب شخصیت ہوتی ہے۔ ہم نے آپس میں طے کیا کہ بس ایک آدمی باتیں کرے گا اور باقی یہ ظاہر کریں گے کہ وہ فارسی زبان نہیں جانتے۔ بات چیت کے لئے مجھے منتخب کر لیا گیا۔ جولائی کے آخری ایام تھے۔ پانی کے پنکھے چل رہے تھے۔ کوتوال صاحب قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اردگرد ان کے سپاہی کھڑے تھے۔ ہماری توقع کے خلاف انہوں نے ہم کو قالین پر بٹھایا اور ساتھ ہی ہم سے راہداری کا مطالبہ کیا۔

پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ حکومت افغانستان نے ہمیں نیملا میں راہداریاں دی تھیں۔ کوتوال صاحب نے وہ راہداریاں ہاتھوں میں الٹ پلٹ کر دیکھیں اور کہا

"عجب پاسپورت است ہیچ ندیدہ ام"

(عجیب راہداری ہے کبھی نہیں دیکھی) اس نے ساتھ ہی پاس بیٹھے ہوئے مرزا کے حوالے کیں جس نے ان کا بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ ہم خاموش تھے اور مرزا کے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے جو ہماری راہداریاں الٹ پلٹ رہا تھا۔ دل کانپ رہے تھے۔ مرزا نے ایک راہداری کو شروع سے آخر تک پڑھا اور چلایا۔

"این یکش دستخط ندارد"

یعنی اس ایک پر دستخط نہیں۔

یہ رعیت نامہ مولوی فخر عالم کا تھا۔ پڑھنے والوں کے ساتھ اس کا تعارف ہو چکا ہے بیحد کم عقل تھا۔ اس نے یکدم منہ کھولا "من .... من ..... مہاندار .... جبل السراج ...." ہم حیران تھے کہ اب کیا گل افشانی کرے گا۔ بہرحال اسکو احساس دلایا تو وہ خاموش ہو گیا۔

"بگو! بگو" (بولیے بولیے) کوتوال بولا۔

میں نے جھٹ پٹ درمیان میں مداخلت کی "صاحب این کس فارسی نمے داند" یعنی صاحب یہ آدمی فارسی نہیں جانتا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فخر عالم مولوی کی طرف منہ کر کے کہا "آپ صاحب کیا بک رہے تھے" جواب میں مولوی صاحب نے کچھ آیتیں شائیں کی۔ میں کوتوال کو تشریح میں کچھ کہنے کی تیاری ابھی کر ہی رہا تھا کہ اچانک سکندر شاہ نے پانی کے پنکھے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "دیکھو! کیسے قابل اور ہنر مند لوگ ہیں۔ پانی سے پنکھا چلاتے ہیں۔"

"این دگر چہ مے خواہد" (یہ دوسرا کیا مانگ رہا ہے) کوتوال کو غصہ آگیا۔ لیکن میں سکندر شاہ کے مطلب کو سمجھ گیا تھا اس لئے کوتوال کو کہا "صاحب! میرا یہ ساتھی حیران ہے کہ کیسے اچھے طریقے سے پانی پر پنکھا چل رہا ہے" کوتوال ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ "کیا تمہارے وطن میں ایسے پنکھے نہیں ہیں؟" "نہیں صاحب ایسے پنکھے ہمارے وطن میں کہاں؟" میں نے جواب دیا۔

کوتوال راہداری کو اپنی جگہ چھوڑ کر ہمارے وطن کے حالات پوچھنے لگا۔ ہم نے اپنی کمزوری اور افغانستان کی بڑائی بیان کرنی شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ سخی سرور صاحب کی زیارت کی تعریف کی اور ان کو بتایا کہ ہم وطن سے صرف سخی سرور صاحب کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ حاکم بے تعلیم تھا۔ مرزا بھی نیم تعلیم یافتہ تھا۔ انہوں نے اس قسم کے رعیت نامے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ کیونکہ اس راستے پر غیر ملکی بہت کم آتے تھے۔ اس لئے ہمارے رعیت ناموں نے ان کو حیران کر دیا تھا۔ حاکم ایک شریف آدمی تھا اس نے ہمارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی۔

ہمیں شتواریوں کے چراگاہ کے جلانے پر سزا ملتی ہے

ہم سرائے واپس آئے اور قافلے کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے وہاں چار دن بسر کئے۔ چوتھے روز ایک سرکاری آدمی آیا اپنے ساتھ ایک گھوڑا بھی لایا تھا آکر کہنے لگا کہ اس گھوڑے کے ساتھ حاکم کے لئے اپنے شودا کو تبدیل کر لو۔ ہم نے انکار کیا اور وہاں مزید ٹھہرنا مناسب بھی نہ سمجھا۔ دوپہر کو وہاں سے کوچ کیا۔ بغلان کے اردگرد کا علاقہ کافی آباد تھا یہاں سے ایک دریا گزرتا ہے جو پوری زمین کو سیراب کرتا ہے۔ میری یادداشت

کے مطابق جولائی کا آخری دن تھا جو ہمارے وطن میں برسات کا آدھا ہوتا ہے۔ ہمارے علاقے میں گندم کی فصل بساکھ اور جیٹھ کے مہینوں میں کاٹی جاتی ہے لیکن بغلان میں فصل کی کٹائی دو مہینے لیٹ ہو رہی تھی۔ گل بہار اور جبل السراج میں جہاں سے ہم پندرہ یوم پہلے گذرے تھے فصل کٹائی کے لئے بالکل تیار نہیں تھی لیکن پک چکی تھی۔ درہ پنج شیر میں فصل صرف، بالشت بھر اونچی تھی۔ بغلان سے باہر کے علاقوں میں زور و شور سے کٹائی جاری تھی۔ بغلان کے گرد و نواح میں فصل کی کٹائی کرنے والے فارسی بان تھے لیکن جب کھیتوں کے آخر میں پہنچے جہاں سے سطح مرتفع شروع ہونے والی تھی تو وہاں فصل کی کٹائی کرنے والے شینواری پشتون تھے۔ یہ شاہی سڑک کے کنارے آباد تھے۔ تھوڑی بہت کھیتی باڑی بھی کرتے تھے اور بھیڑوں کے ریوڑ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر چراتے تھے۔ یہاں سے دریائے آمو تک سڑک کے کنارے پشتون آباد ہیں۔ افغانستان کے پشتون بادشاہوں کی یہ حکمت عملی رہی تھی کہ سڑک کے ساتھ ساتھ پشتون قبائل کو آباد کرلیں۔ ہم نے شینواریوں سے علیک سلیک کی۔ وہ اس وقت گندم اور بھوسہ الگ کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے کام بند کیا ہمیں اپنی قیام گاہ پر لے جاکر پانی پلایا۔ رات ٹھہرنے کے لئے کہا لیکن ہم نے سفر جاری رکھنے پر اصرار کیا اور پھر عزت کے لئے دستور کے مطابق ایک نوجوان راستہ بتانے کیلئے ہمارے ساتھ کچھ فاصلے تک بھی آیا۔ ہمارا سفر خوشی کے عالم میں جاری تھا۔ مولوی فخر عالم اور وہ لغمانی ہمارے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ ہم باتوں میں مشغول تھے کہ اچانک پیچھے سے ٹک ٹک کی آوازیں سنائی دیں۔ مڑکر دیکھا تو آگ لگی ہوئی تھی اور گھاس میں موجود ٹڈیاں جب جلتی تو اس سے ٹک ٹک کی آوازیں آتیں۔ فخر عالم نے ہمارے سامنے ایک جلتی ہوئی تیلی راستے کے دوسری طرف گھاس میں پھینک کر وہاں بھی آگ لگادی۔ ٹڈیوں کو جلتا دیکھ کر میں نے مولوی فخر عالم کو بُرا بھلا کہا۔ اس نے جواب میں کہا کہ مجھے ٹڈیوں کے جلنے کی آواز بڑی پیاری لگ رہی ہے۔ آنکھ جھپکنے میں راستہ کے دونوں طرف آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ ہوا پیچھے سے ہماری جانب تیز تیز چل رہی تھی۔ آگ کے شعلے بھی تیزی سے ہماری طرف لپکنے لگے۔ آگ کے شعلے ہمارے پیچھے اور ہم آگے تیز تیز چلتے گئے۔ ہم بمشکل دو میل گئے ہوں گے جب مڑکر پیچھے دیکھا تو ہوا کی وجہ سے خشک گھاس میں آگ ایک میل کی چوڑائی میں پھیل چکی تھی۔ ہم آگے آگے تیز دوڑ رہے تھے اور مولوی فخر عالم کی

اس حرکت کی سخت مذمت کر رہے تھے کہ اس نے بے گناہ اتنی ساری ٹڈیوں کو جلا دیا اور گھاس کا بھی نقصان کیا۔ لیکن ہمارے دل میں اس وقت یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس کی ایسی سزا ملے گی جو تمام عمر یاد رکھیں گے۔

ہم ایک چڑھائی پر چڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک مضبوط آدمی پر نظر پڑی۔ دیکھا کہ ہاتھ میں لٹھ اٹھائے ہمیں للکار رہا تھا۔ آدمی کافی مضبوط تھا لیکن ہماری تعداد کی زیادتی اس کو ہم پر حملے کرنے سے منع کئے ہوئے تھی ورنہ وہ کافی غصے میں تھا اور بدستور گالیاں دیے جا رہا ہے۔ سرفراز نے فوراً اپنے گھوڑے سے اتر کر بندوق ہاتھ میں لے کر اس کی طرف اس کا رُخ کیا اور جواباً اسے گالیاں دیتے ہوئے دھمکی دی کہ لاٹھی نیچے کرو ورنہ گولی چلاتا ہوں۔ اس سے اس شخص کا لہجہ کچھ نرم ہو گیا لیکن جیسے جیسے ہم قدم بڑھاتے گئے اس کے شور و غل میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ کہنے لگا "جب تک تم میرے ساتھ آگ نہیں بجھاؤ گے اگر مر بھی جاؤں تو تم لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں۔"

سرفراز خان نے اپنی بندوق سے بڑا کام لیا۔ اگرچہ بندوق خراب بھی تھی اور ہمارے پاس کوئی کارتوس بھی نہیں تھا لیکن سرفراز خان اسی خراب بندوق کو شینواری کی طرف کر دیتا اور گالیاں بھی دیتا اور دھکیاں بھی لیکن اس پر کوئی دھمکی کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ ہم یہ ظاہر کرتے کہ سرفراز سخت غصے میں ہے اور بندوق چلانا چاہتا ہے لیکن ہم اسے ایسا کرنے سے روک رہے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ جس طرح شینواری ہمارے خالی بندوق کے رُعب میں آ گیا تھا۔ اسی طرح ہم اس کے قبیلے کے رُعب میں آ گئے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان کی سرزمین میں کوئی ایسا خلاف قانون کام کریں کہ ہماری دوسری گرفتاری کا حکم جاری ہو جائے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اور بات یہ بھی تھی کہ شینواری متواتر فریاد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "ظالمو تم نے یہ کیا کیا۔ ہمارے ریوڑوں کی ایک سال کی خوراک ضائع کر کے ہمارے بال بچے کو بھوکوں مار دیا۔" ہم سمجھ گئے کہ واقعی ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ ہمارے ضمیر نے ہم پر ملامت کی اور آخر کار شینواری کی تجویز ماننے پر راضی ہو گئے۔ فیصلہ کچھ اس طرح ہوا کہ شینواری نے اپنی لاٹھی زمین پر رکھ لی۔ ہم اس کے ایک طرف بیٹھ گئے اور دوسری طرف وہ بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ

"اے تم قرآن سمجھو۔ اس قرآن پہ ہاتھ رکھ کر میں تمہارے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا بشرطیکہ کہ تم میرے ساتھ آگ بجھانے میں مدد کرو۔"

شام ہونے کو تھی۔ ہم شینواری کے ہمراہ واپس ہولئے۔ آگ بجھانے کی جگہ کے قریب جب پہنچے تو دیکھا کہ بارہ شینواری پسینے میں ڈوبے ہوئے لاٹھیوں کو کندھوں پر رکھے آرہے تھے۔ سب نے قمیضیں اپنی اتاری ہوئی تھیں اور شلواروں کے پائنچے چڑھائے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ آتے ہی وہ لوگ ہماری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ جو شینواری سب سے آگے آرہا تھا وہ دور سے ہی چلانے لگا کہ" یہ پشاوری بے پیر اور بدمذہب ہیں۔ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں" لاٹھیاں ہل رہی تھیں۔ اور وہ ہم پر پل پڑنے کے لئے پر تول رہے تھے کہ امان دینے والا ہمارا شینواری درمیان میں بول پڑا۔" خبردار! میرے اور ان اشخاص کے درمیان قرآن پر حلف ہوا ہے کہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گئے اور یہ آگ بجھانے میں ہماری امداد کریں گے۔" اس پر شینواری نرم پڑ گئے۔ لاٹھیاں انہوں نے نیچے کرلیں۔ ان میں سے ایک نے سکندر شاہ کی طرف دیکھ کر غصے میں اسے پیچھے سے مکا مارتے ہوئے کہا" تمہارا رنگ چرسیوں جیسا ہے تم سگریٹ پیتے ہو تم نے یقیناً جلتی ہوئی تیلی سگریٹ سلگانے کے بعد گھاس میں پھینکی ہے اور ہمیں معہ اپنے قبیلہ کے غرق کر دیا۔" مجھے دل میں ہی ہنسی آگئی۔ فخر عالم ایک طرف کھڑا تھا خوش قسمتی سے وہ پشتو نہیں سمجھتا تھا اور پھر شینواریوں کی پشتو کی تو اسے سدھ بدھ بھی نہیں تھی ورنہ بے چارہ ڈر کے مارے مرجاتا۔ مجھے دل ہی دل میں ہنسی اسلئے آئی کہ جرم کس نے کیا تھا اور سزا کون بھگت رہا تھا۔ سکندر شاہ رنگ سے کمزور دکھائی دیتا تھا اب تو بیچارہ کوئی نشہ نہیں کرتا تھا شاید وطن میں افیم کھاتا ہو لیکن اس کا رنگ چرسیوں کی طرح جلا ہوا تھا۔ شینواری کو یہ علم نہیں تھا کہ اس دنیا میں فخر عالم جیسی مخلوق بھی موجود ہے جو صرف اس لئے چراگاہ جلا رہا تھا کہ ٹڈیوں کے جلنے کی آواز سے ان کو لطف مل رہا تھا۔

ایک شینواری نے زوردار الفاظ میں ہمیں حکم دیا " آگے بڑھو اور آگ بجھاؤ جب تک یہ نہیں بجھاؤ گے اس وقت تک تمہارا چھٹکارہ پانا مشکل ہے۔" آگ کے شعلے سڑک کے دونوں طرف میلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہم نے جھاڑیوں کی شاخیں توڑ لیں اور ہاتھ میں شاخیں لئے شینواریوں کی مزید تلخ کلامی

اور گھورنے سے بچنے کے لئے آگ پر ٹوٹ پڑے۔ آگ کو بجھانا تو اتنا مشکل نہیں لیکن میلوں پھیلی ہوئی آگ کو بجھانا بہت مشکل تھا اور پھر ایسی حالت میں کہ ہمارے بجھاتے ہوئے آگ کی چنگاریاں ادھر ادھر گھاس میں اور آگ لگا دیتی تھیں۔

یا چار یار

ہم آگ بجھانے میں ایسے پھنسے ہوئے تھے کہ شینواریوں کی گالیاں اور مار پیٹ سہنا محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جس کسی کو شینواری ذرا سست دیکھتے زور سے یا چار یار کا نعرہ لگا کر لاٹھی اس کی پیٹھ پر ایسے مارتے جس طرح کوئی پرائے مویشی کو مارتا ہے۔ ہم بھی چار و ناچار آگ بجھانے میں ایسے مصروف تھے کہ شعلے لپک لپک کر چہرے کو جلاتے لیکن ہمیں کوئی پرواہ نہیں تھی۔ آنکھوں کی پلکیں سب کی جل گئیں لیکن سب اپنے کام کو تن دہی سے سرانجام دے رہے تھے۔ سوکھی گھاس کے شعلے چہرے کو جو پہلے ہی سے جلا چکے تھے مزید تکلیف نہیں دے رہے تھے اور ہر کوئی انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھا کہ اچانک شور زیادہ ہوا۔ ایک شینواری زور زور سے چلا رہا تھا "او بد پدر (ایک قسم کی گالی ہے) چرسی جو شیطانی کی ہے اب اس کا مزہ چکھو" ہوا یوں کہ سکندر شاہ ایک چھوٹے سے نالے میں چھپ گیا تھا لیکن اتفاق سے ایک شینواری کی نظر اس پر پڑی جس نے اس کو کھینچ کر مار مار کر باہر نکالا۔ ہم خود ایسی مصیبت میں مبتلا تھے کہ سکندر شاہ کی طرف نگاہ اٹھانا بھی مشکل تھا۔ جتنا مغرب کی سمت آگ کم ہو رہی تھی اتنی ہی ہم زیادہ توانائی اس پر صرف کر رہے تھے۔ میں بہت سرگرمی سے کام کر رہا تھا اور اس کا پتہ ہی نہ چل سکا کہ میرے سر کے بالوں کے اوپر پگڑی نے آگ پکڑ لی ہے۔ لیکن یہ کیا مجھ سے ہمدردی کے بجائے سر پر تھپڑوں کی بارش ہو رہی تھی اور ساتھ ہی کہہ رہے تھے کہ خدا تمہیں غرق کر دے اس کا پتہ ہی نہیں کہ تمہاری پگڑی نے آگ پکڑ لی ہے۔ میں نے جلدی پگڑی سر سے اتار کر دور پھینکی۔ اس پر لگی ہوئی آگ بجھائی اور پھر اسے پہن لیا کیونکہ بغیر پگڑی کے آگ کے نزدیک جانا بھی ناممکن تھا۔ ساڑھے بارہ بجے تک ہم نے مغرب کی سمت آگ بجھا لی۔ ابھی کمر سیدھی نہ کر پائے تھے کہ شینواریوں

کی طرف سے حکم صادر ہوا کہ مشرق کی سمت آگ پر حملہ کر دو۔ اس حکم نے ہمارے اوسان خطا کر دیے۔ کیونکہ پیاس کے مارے حلق اور آنتیں دونوں خشک ہو چکے تھے۔ باتوں کے قابل نہیں رہے تھے۔ شینواری خوش وخرم تھے۔ نہ تو انہوں نے کام کیا تھا نہ ان کے چہرے جلے تھے اور نہ ہی وہ تھکے تھے۔ میں نے جرأت سے کام لے کر ان سے پانی مانگا۔ انہوں نے بُرا نہیں منایا۔ ایک نے خندہ پیشانی سے جواب دیا کہ "ہمیں علم ہے کہ تمہیں بھی پیاس لگی ہو گی کیونکہ ہم بھی پیاسے ہیں لیکن مجبوری ہے پانی بہت دور ہے"، لیکن ساتھ ہی ان کے دل پسیج گئے اور انہوں نے ہمیں تھوڑا ستانے کی اجازت دے دی۔

غیبی امداد

ہم بے آسرا مظلوم شاہراہ کے کنارے بیٹھ گئے۔ شینواریوں نے اپنی عادت کے مطابق اپنی تعریفیں شروع کر دیں۔ اپنی بہادری کے واقعات وہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی صورت میں سنانے لگے۔ وہ شینواری جس نے ہمیں روکا تھا اپنے ایک ڈاکے کا ذکر سنانے لگا جو اس نے پشاور پر ڈالا تھا اور بارہ پشاوری اس کو نہ روک سکے۔

ہم تھکے ماندے اس پر خوش تھے کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور شینواری ہمیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم سے جرم سرزد ہوا تھا یہ تو درست ہے لیکن اس جرم کی انہوں نے ایسی سزا دی جو یاد رکھنے والی تھی۔ مشرق کی جانب آگ کے شعلے اور بلند ہوتے۔ ہم آرام کر رہے تھے اور تازہ دم شینواری کہانیاں سُنا رہے تھے۔ بے شک شینواریوں کا بہت نقصان ہوا تھا لیکن میں حیران تھا کہ انہوں نے خود آگ بجھانے کی زحمت کیوں نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اگر ہمارے ساتھ دل جمعی سے آگ بجھانے کی کوشش کرتے تو اب تک آگ بجھ گئی ہوتی۔ شینواری ہمیں اور آگ کو بھول چکے تھے۔ لیکن ہم پریشان تھے۔ بلند شعلوں کو دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے آگ نہیں بجھا سکتے۔ ہم دل میں خوف لئے بیٹھے تھے کہ اب وہ ہمیں اور آگ بجھانے کے لئے حکم دیں گے اور وہ لوگ ایک دوسرے سے باری چھین کر اپنی بہادری کی داستانیں سنا رہے تھے۔ اتنے میں پاؤں کی

آہٹیں اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائیں دیں۔ ہم نے دیکھا کہ اندھیرے سے سفید کپڑوں میں ملبوس اور سفید پگڑیوں کو سر پہ باندھے چار آدمی یغلان کی طرف والے راستے پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے علیک سلیک کے بعد آگ لگنے کی وجہ دریافت کی۔ شینواریوں نے ہماری طرف اشارہ کرکے ان کو پورا قصہ سنایا۔ ہم دل ہی دل میں ڈر رہے تھے کہ یقیناً یہ بھی شینواریوں کے ہی رفیق ہونگے لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ ہم شام سے اس جہنم میں گھرے ہوئے ہیں اور پیاس سے ہلکان ہو رہے ہیں تو انہوں نے شینواریوں کی منت سماجت کی لیکن شینواری پس پیش کر رہے تھے۔ نووارڈوں میں سے ایک نے کہا۔

"بھائیو! یہ آگ بجھنے کی نہیں۔ اس کو بجھاتے بجھاتے یہ غریب مسافر ختم ہو جائیں گے۔ ہاں اگر آپ لوگوں کا ارادہ ان کو مارنے کا ہو تو پھر اور بات ہے ورنہ ان غریب مسافروں کو چھوڑ دو۔"

شینواری خاموش ہو گئے۔ شاید ان کے دل میں کچھ رحم کا جذبہ آچکا تھا۔ مان گئے اور ہمیں آزاد کر دیا۔ رخصت ہونے سے پہلے شینواریوں میں سے ایک بولا "اگر تمہاری کسی چیز کو کوئی نقصان پہنچا ہے تو وہ بھی بتا دو تاکہ اس کا مداوا ہو سکے۔" ہمارے دو جستی (ٹنکی) پانی کے برتن تھے وہ انہوں نے ہمیں دیے اور سفید پوش اشخاص ہمیں ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ اب ہم سب چھ کے چھ پیادہ چل پڑے۔ کیونکہ سواریاں زیادہ تھیں اور دو یا بوسب کے لئے ناکافی تھے اس لئے ٹٹو بھی خالی ہمراہ چل رہے تھے۔ ہم مروت کے مارے ایک دوسرے کو سوار ہونے کے لئے کہتے رہے لیکن کوئی بھی سوار نہیں ہوا۔ سب پیادہ ہی چلتے رہے۔ سوار آگے چل رہے تھے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے۔ ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ ہمارے لئے ایک غیبی امداد بھی گئی ہے کیونکہ ہم نے اسلام کی خدمت کے لئے کمر باندھ لی ہے اور اللہ تعالیٰ اس میں ہماری پوری مدد کر رہا ہے۔ اگر شینواری اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتے اور ہمیں دوسری سمت آگ بجھانے پر ڈال دیتے تو ہمارے بچنے کی امید پھر کوئی نہیں تھی۔ ہمارے سر کے بال، آنکھوں کی پلکیں اور چہرے سب جلے ہوئے تھے اور اپنی بدن کی تکلیف کا صبح بیدار ہو کر ہی پتہ چلا۔

سفید پوشوں کی رہنمائی سے رات کے سخت اندھیرے میں ہم ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے پہنچ گئے بھوک کی ہمیں پرواہ نہیں تھی اور پانی خوب ڈٹ کر پیا۔ راستے سے ذرا ہٹ کر سو رہے۔ ہمارے دل

میں اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ بھائی انسان تو ہمیں اچھی نظروں سے دیکھتا نہیں تو لغمانی پر ہنسنے لگے کہ بھائی ضد کیوں کرتے ہو۔ ہمارے ساتھ تو سراسر مصیبت میں رہو گے لیکن اس کا جواب ہمیشہ کی طرح مختصر ہی رہا کہ خیر دے (فکر کی کوئی بات نہیں ٹھیک ہے)

شہاب الدین محمد غوری کا پایۂ تخت "غور"

صبح نہار منہ چل پڑے۔ دوپہر کے قریب ایک پُل کو عبور کیا جو دریائے بغلان پر واقع تھا۔ یہ دریا بغلان کی زمینوں کو سیراب کرتا ہے اور بغلان سے کچھ فاصلے پر گذر کر دریائے آمو میں گرتا ہے یہ پُل تنگ دریا پر بغیر پائے کے واقع تھا۔ اس کی اونٹ کی طرح کوہان نکلی ہوئی تھی۔ سورج ڈھل چکا تھا جب ہم غور پہنچے۔ ایک وسیع اور غیر آباد میدان میں آٹھ دس مٹی کے بنے ہوئے گھر نظر آئے۔ گاؤں کے ارد گرد سرسبز علاقہ ہے لیکن غیر آباد۔ ایسا لگتا ہے کہ آباد کرنے کے لئے کوئی نہیں ملتا۔ یہ وہی غور ہے جہاں پر بیٹھ کر شہاب الدین غوری نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں پر حملوں کے منصوبے بنائے اور جس کے نام سے شمالی ہندوستان کے راجے مہاراجے کانپتے تھے۔ اب زمانے کی گردش نے یہ حال کر دیا کہ کھنڈر بھی باقی نہیں رہے۔ مٹی کے بنے ہوئے گھر نو آباد لوگوں کے معلوم ہوتے تھے جن کو حکومت افغانستان نے یہاں لاکر بسا دیا تھا۔ میلوں سرسبز میدان ہے اور تھوڑی سی محنت سے یہاں پانی پہنچ سکتا ہے۔

ہم پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ تمام دن دہی روٹی اور انڈے کھاتے رہے۔ شام کو پڑاؤ کے اندر گئے۔

ایبک

دوسرے دن صبح سویرے غور سے چل پڑے۔ غور اور ایبک کے درمیان دو پڑاؤ آتے ہیں۔ تین دن کا راستہ ہے۔ راستے میں ہمیں ایک سرکاری رسالہ ملا۔ افغانستان میں رسالے کے گھوڑے

قد کاٹھ سے چھوٹے لیکن مضبوط ہوتے ہیں اگر انہیں یابو یا ٹٹو کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ رسالے کے درمیان میں دو گھوڑوں کے درمیان ایک (کیجاوہ) پنگھوڑا لٹک رہا تھا اور اس پنگھوڑے میں ایک آدمی جس کے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں تھیں بیٹھا ہوا نظر آیا۔ ہم بھی پانی کے لئے ایک چشمے پر ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ رسالہ بھی اسی مقصد کے لئے رُکا ہوا تھا معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ مزار شریف میں ایک جرنیل نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی اور اب اسے پکڑ کر پابہ جولان کابل لے جایا جا رہا ہے۔

ہم نے پہلے دن دو پڑاؤ طے کئے اس لئے ایبک دو دن میں پہنچ گئے۔ یہ کافی بڑا قصبہ ہے۔ گردونواح کافی سرسبز ہے۔ تجارت کا مرکز بھی ہے۔ شہر کے گرد مٹی کی دیواریں قلعے کی طرح تعمیر کی گئی ہیں۔ درمیان میں بڑا بازار ہے۔ جہاں ہر وقت کاروبار زوروں پر رہتا ہے۔ یہ کابل اور مزار شریف کو ملانے والی سڑک پر واقع ہے۔

ایبک ایک اونچی جگہ پر واقع ہے۔ بازار میں پانی بہتا ہے۔ اردگرد سرسبز باغات ہیں۔ جولائی کے آخری دن تھے۔ ہم نے موسم کا پہلا خربوزہ چکھا۔ افغانستان میں دو قسم کا خربوزہ پایا جاتا ہے۔ ایک کو سردا کہتے ہیں۔ جبکہ دوسرا گرما کہلاتا ہے۔ گرما ہمارے وطن کے خربوزے کی مانند ہے اور سردے سے کافی پہلے بازار پہنچتا ہے۔ ہم نے اتفاق سے ایک پشاوری سوداگر کو دیکھ لیا۔ وہ ہمیں اور ہم اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہم ایبک میں ایک دن ستانے کے لئے ٹھہرے تاکہ قافلے کے متعلق کچھ معلومات بھی حاصل ہو سکیں۔ لیکن دوسرے دن یہ سوچ کر روانہ ہوئے کہ مزار شریف سے پہلے قافلے کا کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ ہم جانتے تھے کہ مہاجرین کا قافلہ بہت سست روی سے چلتا ہوگا اور پھر جس جگہ پانی اور روٹی دستیاب ہو تو وہاں بوڑھوں اور کمزوروں کے لئے تو لازماً ٹھہرنا پڑے گا۔

تاش قرغان اور راہداری کی چوکی

دوسرے دن تاش قرغان پہنچے۔ تاش قرغان داخل ہونے سے پہلے ایک تنگ درہ آتا ہے وہاں ایک راہداری دیکھنے کی چوکی ہے۔ ہم سویرے اس چوکی پر پہنچے۔ سپاہیوں نے حاکم کے پاس پہنچایا جو اس وقت قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول تھا۔ ہمیں ان کے نزدیک ہی روک دیا گیا۔

ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ حاکم تعلیم یافتہ اور سمجھ دار معلوم ہوتا ہے۔ بغلان کے کوتوال کی طرح غیر تعلیم یافتہ نہیں ہے اگر ہم تلاوت کے دوران ہی ان کے سامنے اپنے رعیت نامے پیش کر دیں۔ تو وہ یقیناً ان کو غور سے نہیں دیکھیں گے۔ ہماری خوش قسمتی سے اس جگہ اور کابل کے درمیان ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کا کوئی سلسلہ بھی نہیں تھا اس لئے توکل بر خدا آگے بڑھے۔ حاکم راستے کے کنارے ایک کوٹھے کی چھت پر بیٹھا تھا ہم نے نیچے آ کے بڑھ کر اپنے ہاتھوں میں رعیت نامے پکڑے اور کھول کر ان کے سامنے کئے۔ حاکم نے ان کو دیکھے بغیر سر کے اشارے سے ہمیں آگے جانے کا اشارہ کیا۔ یہ چوکی سخت جانچ پڑتال کے لئے مشہور تھی۔ لیکن قدرت نے یہاں بھی ہماری مدد کی۔ اور ہم آگے بڑھ کر تاش قرغان میں داخل ہوئے۔ دوپہر کو ہم تاش قرغان پہنچے۔ یہ شہر افغانی ترکستان میں ایک مشہور تجارتی منڈی ہے نارین سے دو راستے تاش قرغان آ کر ملتے ہیں۔ ایک جس پر ہم نے سفر کیا اور دوسرا نارین سے براستہ خانہ آباد تاش قرغان پہنچتا ہے۔ یہاں تین چار ہم وطن سوداگروں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے ہماری اچھی خاطر و مدارات کی۔ یہاں سردا اور گرما دونوں قسم کے خربوزے کھانے کا اتفاق ہوا۔ دونوں کا موسم ابھی شروع ہی ہوا تھا۔

مہاجرین کے قافلے کی اطلاع

شام کو اچانک چنگیز دو ساتھیوں کے ہمراہ تاش قرغان پہنچا۔ ہم حیرانی و خوشی کی ملی جلی کیفیت میں تھے لیکن چنگیز سے پتہ چلا کہ قافلے کے جلد آنے کی اُمید نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ کچھ افراد بیمار اور بوڑھے ہیں۔ کچھ مہاجرین راستے میں شہادت پا چکے ہیں۔ چنگیز نے قافلے کے متعلق یہ دردناک کہانی سنائی کہ ہر سرائے یا پڑاؤ میں دو تین آدمیوں سے زیادہ کا کھانا میسر نہیں ہوتا اور چند افراد اس ناکافی غذا کی وجہ سے بھوک پیاس کے مارے راستے میں گر جاتے اور جو ایک دفعہ گر جاتا پھر وہ وہیں رہ جاتا۔ ہم نے شہید ہونے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں بخشش کی دعا مانگی۔ اور بقیہ کے لئے اپنے ارادوں میں استقامت اور استقلال کے لئے دعا کی۔ چنگیز ہماری بابت معلومات کرنے کے لئے قافلے سے آگے روانہ

ہوا۔ نارین میں وہ اور محمد اکبر خان سالار قافلہ دونوں کافی حیران ہوئے جب لوگوں نے ان کو ہماری بابت بتایا۔ قافلے والوں کے باہم صلاح ومشورہ سے چنگیز خانہ آباد کے راستہ نکلا اور بغیر رُکے متواتر چلتے چلتے تاش قرغان میں ہم سے آملا تھا۔

افغانی ترکستان

تاش قرغان میں بھی ایک بڑا بازار ہے۔ یہ ایک سے بڑی جگہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ شہر پہاڑ کے دامن میں آباد ہے۔ تاش قرغان سے شمال کی طرف دریائے آمو تک پچاس ساٹھ میل ایک وسیع میدان ہے۔ یہ میدان دریا کے کنارے کنارے سینکڑوں میل تک بلخ اور بخارے تک پھیلا ہوا ہے۔ اُس جگہ اُزبک اور ترکمان گڈریوں کی آبادی ہے۔ بڑے بڑے ریوڑ ان کے آگے ہوتے ہیں اور گھوڑوں پر سوار وہ ان کے پیچھے ہوتے ہیں۔

مزار شریف[۳۲]

ہم نو ساتھی صبح سویرے تاش قرغان سے روانہ ہوئے۔ جس طرح سارے افغانستان میں نہ کبھی سڑک کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور نہ ہے اسی طرح تاش قرغان سے مزار شریف بھی ایک وسیع راستہ جاتا ہے جو کچا لیکن مضبوط ہے۔ چار دنوں میں ہم مزار شریف پہنچے۔ راستے میں آبادی بہت کم ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ اسی راستے کی وجہ سے تھی جس پر پشتون آکر آباد ہوئے تھے۔ سارا راستہ ہموار میدان سے گذرتا ہے۔ مزار شریف تک قابل ذکر کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ راستے میں ہم نے جس سرائے کو شب باشی کیلئے پسند کیا وہیں پر ایک رسالہ بھی آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ کہ افغان رسالے میں مضبوط یابو ہوتے ہیں۔ ان کو قابو میں رکھنے کے لئے سپاہی رات بھر ہاتھوں میں لاٹھیاں پکڑے پہرہ دیتے رہے۔ ساری رات سپاہیوں کی لاٹھی زنی اور ٹٹوؤں کی آوازوں کی وجہ سے جاگتے رہے اور صبح تب ہی جا کر کہیں آنکھ لگی جب سواروں کا قافلہ وہاں سے کوچ کر گیا۔ ہم حیران تھے کہ جنگ کے دوران سپاہی کیسے ان

پر قابو رکھتے ہیں کیونکہ ساری رات کبھی ایک کبھی دوسرا رسی تڑوا کر دوسرے پر حملہ آور ہو جاتا اور سپاہیوں کے مارنے کے باوجود باز نہ آتا۔

مزار شریف میں وزیر انصاف کے باڈی گارڈ کے ہاتھ ہماری گرفتاری

سہ پہر ڈھلے مزار شریف پہنچے۔ شہر کے درمیان ایک مسافر خانہ میں رات بسر کی۔ صبح آرام سے حجامت بنوانے اور سیر کی خاطر بازار کو نکلے۔ ایک حجام کی دکان میں داخل ہوئے وہاں بیٹھا ہوا ایک شخص اپنی جگہ سے اٹھا اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ میں حیران تھا کہ اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟ اور یہ کون ہے؟ ساتھیوں کے دریافت کرنے پر انہیں بھی بتایا کہ "کہہ نہیں سکتا کہ اس آدمی کے ساتھ میری کیا واقفیت ہے؟ شاید پشاور میں کہیں آمنا سامنا ہوا ہو گا۔" وہ شخص ہمیں حیران و پریشان چھوڑ کر دکان سے باہر نکل گیا۔ ہم دوپہر تک بازار میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ ہمیں ایک چترالی فوجی کپتان ملا ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ "وطن عزیز سے تعلق رکھنے والو خوش آمدید" اس نے ہمیں سبز چائے پلائی اور چترال اور پشاور کا بہت خوش کن انداز میں ذکر کیا۔ ہم خوش و خرم اپنے مسافر خانے لوٹ آئے۔ روٹی کا وقت تھا۔ نزدیکی ہوٹل سے تیار روٹی منگوائی اور کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ ابھی چند نوالے ہی کھائے ہونگے کہ کمرے کے دروازے سے ایک سیاہ وردی پہنے ہوئے فوجی افسر پستول تانے نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اور فوجی افسر بھی اسی انداز میں کھڑا نظر آیا۔ باہر صحن میں اور سپاہی بھی ہاتھوں میں بندوقیں لئے کھڑے تھے۔ ہمارا منہ کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا۔ لیکن افسر فوراً پشتو میں بولے "جدودئی او خورئی"! جدودئی او خورئی!! (کھانا کھالیں۔ کھانا کھالیں) اور یہ کہتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ہم سب خاموش رہے۔ کوشش کے باوجود نوالہ حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ کھانا سمیٹ کر صحن میں نکل آئے۔ صحن میں دس سپاہی سیاہ وردیاں پہنے کارتوسوں کی بھری پٹیاں سینے پر سجائے سیاہ کشتی نما ٹوپی پہنے ہوئے کھڑے تھے۔ کپتان کابلی تھا اور سپاہی پشتون تھے۔ کپتان نے کہا کہ تم کو نائب الحکم صاحب (گورنر) نے یاد کیا ہے۔ جب ہم

سرائے سے باہر نکلے تو بیس پچیس سپاہی اسی انداز میں باہر کھڑے تھے۔ سب سپاہیوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا اور خود فوجی ترتیب سے ہمارے دائیں بائیں آگے پیچھے ہو گئے اور ہمیں چلنے کا حکم دیا۔ بازار میں حجام کی دکان پر جس شخص نے ہمارے ساتھ مصافحہ کیا تھا وہ بعد میں پتہ چلا کہ مخبر ہے۔ سرکار کی طرف سے وہ بھی ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ راستے میں جب چترالی کپتان نے ہمیں اس حال میں دیکھا تو منہ پھیر کر ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ بازار میں لوگ کام کاج چھوڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگتے۔ ہم بھی سخت گھبرائے ہوئے تھے کہ یا الٰہی کیا ماجرا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ راستے میں اس گارڈ کے صوبیدار نے مجھ سے پوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو۔"

"میں خٹک ہوں" میں نے جواب دیا۔ "تم انگریزی سمجھتے ہو؟" وہ پھر بولا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ افغانستان میں میرا بھی کافی عرصہ گزر چکا تھا اور ایسے سوالوں کو بخوبی جانتا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم شہر سے باہر نائب الحکمہ صاحب کے دربار پہنچائے گئے جو ایک بڑے باغ کے درمیان لگا ہوا تھا۔ وزیر عدلیہ جو کابل سے یہاں ایک بغاوت رفع کرنے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ وہاں تشریف رکھے ہوئے تھے۔ دربار زمین سے گز بھر اونچی ایک گول بارہ دری میں لگا ہوا تھا۔ ہمیں لانے والے سپاہی ہمارے اردگرد سنگینیں تانیں کھڑے ہو گئے۔

نیلی آنکھوں والا مسافر

نائب الحکمہ کے حکم سے ایک آدمی ہمارے متعلق معلومات حاصل کرنے مقرر ہوا۔ یہ پشتون تھا۔ اور وزارت عدلیہ کا پشتون سیکرٹری تھا ہر ایک سے اس نے علیحدگی میں جدا جدا بیان لیا۔ جب میری باری آئی تو مجھ سے دریافت کیا جس پر میں نے جواب دیا کہ پشاور کے علاقے کا رہنے والا ہوں۔ صوبیدار جو میرے عقب میں کھڑا تھا یہ سن کر اچانک آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا "پدرسگ! پہلے کہہ رہے تھے کہ میں خٹک ہوں اور ابھی کہہ رہے ہو کہ پشاوری ہوں"۔ یہ گالیاں سن کر میں ناراض ہوا اور پُرزور الفاظ میں احتجاج کیا کہ "یہ آپ کی حکومت ہے۔ بھرے بازار میں ایک مسافر کو گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ یہاں کیا خاک انصاف ہوگا۔"

ہر چند میں نے تشریح کی کہ میرے بیان میں تضاد نہیں میں پشاوری خٹک ہوں لیکن صوبیدار کا غصہ کم نہ ہوا بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ آخر سیکرٹری نے بھی صاف صاف اعتراض کیا کہ "تم افغان نہیں ہو۔ اچھا چلو اپنا بازو دکھاؤ۔" میں نے فوراً اپنی آستین ہٹا کر بازو دکھایا اس پر اس نے ایک حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ اپنا بازو دکھاتے ہوئے کہا کہ "یہ دیکھو افغانوں کے بازوں پر ایسے کالے بال ہوتے ہیں۔ تمہارے بازو پر سُرخ بال ہیں۔ تم کیسے افغان ہو سکتے ہو؟" صوبیدار نے معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ "صاحب نیلی آنکھوں والا مسافر انگریزی بھی جانتا ہے۔"

"سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو اور کس ارادے سے ہمارے وطن میں داخل ہوئے ہو؟" سیکرٹری نے غصے میں کہا۔

میں حیران ہکا بکا کھڑا تھا۔ بڑا نازک موقع تھا کیونکہ قانون فوج کے ہاتھ میں تھا۔ ایسی گالیاں سننی پڑیں کہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ نائب الحکمہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے وزیر انصاف نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ سیکرٹری نے جواب دیا کہ "یہ نیلی آنکھوں والا مسافر مشکوک دکھائی دیتا ہے۔" وزیر عدلیہ مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔ کیونکہ وزیر صاحب کی اپنی آنکھیں بھی نیلی تھی اور رنگ سرخ و سفید تھا۔ ڈر اور آداب مجلس کی وجہ سے ان کی طرف اشارہ نہیں کر سکا ورنہ ضرور سیکرٹری صاحب کو انکی آنکھوں کی طرف متوجہ کرتا۔ قریب ہی سیاہ چوغہ پہنے ہوئے ایک سائل بیٹھا ہوا تھا اس کا رنگ بھی سرخ و سفید تھا اور آنکھیں نیلی تھیں اور قدوقامت میں بھی انگریزوں کی طرح تھا میں نے فوراً اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "دیکھئے صاحب اس کی آنکھیں بھی نیلی ہیں اور رنگ بھی میرے سے زیادہ سُرخ و سفید ہے۔ افغانستان میں یہ رنگ اور ایسی آنکھیں کچھ نئی چیز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے دربار میں مجھے ایسی گالیاں سننی پڑیں جو کسی وطن میں بھی روا نہیں۔ افغانستان میں تو نیلی آنکھیں عام ہیں پھر ایک نیلی آنکھوں والے "مسافر پر یہ سختی کیا حیثیت رکھتی ہے"؟ وزیر انصاف نے اپنا رخ اس طرح دوسری طرف کو پھیر لیا جیسے انہوں نے میری بات سنی ہی نہ تھی۔

آخر کار سیکرٹری صاحب نے مولوی فخر عالم کو اٹھایا اور اپنے ہمراہ لے گئے۔ جاتے وقت سکندر شاہ

نے اس کو سنوادیا کہ "خیال کریں دھوکا نہ کھائیں" (یہ بات اس نے اُردو میں کہی)۔ کافی دیر بعد مولوی فخر عالم کو واپس لایا گیا۔

"فخر عالم نے بعد میں ہمیں بتایا کہ ساتھ لے جا کر اس نے عزت سے ایک قالین پر بٹھالیا اور خدمت میں میوہ اور پلاؤ پیش کئے۔ اور ساتھ ہی کہا کہ اگر سچ کہو گے تو انعام واکرام سے بھی نوازے جاؤ گے۔ ساتھ ہی کہا: "دیکھو تم ایک دین دار مسلمان دکھائی دیتے ہو اور تم نے داڑھی بھی رکھی ہے سچ سچ بتادو کہ یہ نیلی آنکھوں والا کون ہے"؟ جواب میں مولوی فخر عالم نے کہا کہ "میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں صحیح مسلمان ہے۔"

اس پر فخر عالم کے آگے قرآن شریف رکھا گیا کہ وہ اس پر میری مسلمانی کی تصدیق کرے۔ اس کی تصدیق کرنے کے بعد کہیں جا کر سیکرٹری کو یقین آیا۔ اس کے بعد سیکرٹری نے ہمارے مزار شریف آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے اسے وقتی مصلحت کے تحت بتایا کہ ہم انا طولیہ جا رہے ہیں۔ ہم کافی آدمی ہیں۔ ہمارا قافلہ پیچھے آ رہا ہے۔ ہمارے پاسپورٹ بھی پچھلے ساتھیوں کے پاس ہیں۔ اس جواب سے سیکرٹری نے قصہ مختصر کیا اور فیصلہ کیا کہ اگر چند دنوں میں ہمارا قافلہ نہ پہنچا تو تو وہ پھر ہم سے اچھی طرح نمٹ لے گا۔

ہم سرائے واپس پہنچے۔ دو سرکاری نمائندے ہمارے سروں پر مسلط کئے گئے۔ تاکہ جہاں بھی ہم جائیں تو یہ ہمارے ساتھ ہی رہیں۔ ابتدا میں تو یہ پابندی بہت گراں معلوم ہوئی لیکن جلد ہی جان گئے کہ وہ سپاہی ہمارے لئے رحمت ثابت ہوئے۔ ہم مزار شریف آنے پر پریشان تھے۔ تاش قرغان سے ہم سیدھے جا کر دریائے آمو سے پار ہو سکتے تھے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔

ایک روز ہماری اس چترالی کپتان سے پھر ملاقات ہوئی۔ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے فوراً سبز چائے پلائی۔ ساتھ ہی خدا تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "تم لوگ بہت خوش قسمت ہو۔ کیونکہ جب وزیر انصاف کے خاص حفاظتی دستے کے پنجے میں تم لوگوں کو میں نے گرفتار

دیکھا تو دل میں کہا کہ چلو سب ختم ہو گئے۔ کیونکہ جو ایک دفعہ ان کے پنجے میں آجاتا ہے پھر مشکل ہی سے بچتا ہے۔ بے حساب افراد اس دستے کے ہاتھوں مارے گئے۔ ایک دفعہ ان کے ہاتھ جو پڑا پھر مشکل سے ہی بچا۔ ہم نے اس ظلم کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ" ابھی تھوڑے ہی دنوں پہلے مزار شریف میں فوج کے ایک جرنیل نے بغاوت کی تھی۔ اس نے مزار شریف کو کابل سے آزاد کرا لیا تھا اور مزار شریف کے نائب الحکمہ کو گرفتار کر لیا تھا۔ لیکن اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کے حکم سے کابل سے وزیر عدلیہ فوجی امداد کے ساتھ پہنچ گیا۔ باغی جرنیل مقابلے میں زخمی اور گرفتار ہوا اور پابہ جولاں کابل بھیجا گیا۔ وزیر عدلیہ کے اس حفاظتی دستے کے ہاتھوں بہت لوگ ذلیل وخوار ہوئے۔ تم لوگوں کی قسمت اچھی تھی کہ ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔" چترالی کی باتیں سُن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

سرفراز خان اور سکندر شاہ حوالات میں بند کر لئے گئے

ساتویں دن محمد اکبر خان معہ اپنے قافلے کے پہنچ گیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ چند ساتھی قافلے سے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان کے آنے کی اُمید بھی فی الحال کوئی دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے فرمان شاہی میں آپ کی جگہ ہو جائے گی۔

اگلی صبح نائب الحکمہ کی عدالت میں ہماری پیشی ہوئی۔ ہم پانچ ساتھی قافلے کے ساتھ شامل ہو گئے۔ نائب الحکمہ ہاتھ میں ایک کاغذ لئے ہوئے پڑتال کر رہے تھے۔ اس نے ہمارے ساتھی سکندر شاہ جو پشاور کا رہنے والا تھا اور سرفراز خان جو جبئی تحصیل نوشہرہ کا رہنے والا تھا۔ دونوں کو پکارا۔ دونوں کو قافلے سے الگ کیا۔ میرا نام غلام یحییٰ کا پکارا گیا لیکن اس کو بتایا گیا کہ وہ خانہ آباد سے نارین کی طرف گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وارنٹ صرف ان افراد کے نام جاری ہوا ہے جو قافلے کے ساتھ جبل السراج سے نووارد آئے تھے۔ اور بغیر اجازت کے بھاگ آئے تھے۔ سکندر شاہ اور سرفراز خان دونوں حوالات میں اس حکم کے ساتھ بند کر دیئے گئے کہ انہیں کابل واپس بھیجا جائے گا۔

روسی سفارت خانہ

مزار شریف میں ہم روس میں داخل ہونے کا اجازت نامہ لینے کے لئے روسی سفارت خانہ گئے۔ کونسل (سفیر) ہمارے انتظار میں تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ہمارے دیکھنے پر بہت خوش ہوئے اور بڑی خندہ پیشانی سے کہا۔ "ہمارا وطن آپ کا اپنا گھر ہے۔ آپ لوگ بخوشی جا سکتے ہیں۔"

سفیر اور اس کی بیوی دونوں نوجوان تھے۔ دونوں کم عمر تھے۔ بیوی شوہر سے زیادہ ہمارے استقبال میں پیش پیش تھی۔ اس نے سر کے بال لڑکوں کی طرح کاٹے تھے۔ جس سے اس کے حسن و خوبصورتی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

مہاجرین نے کافی عرصہ بعد فرنگی دیکھے تھے۔ ہماری مجلس میں ایک دو دن تو ان کی خوبصورتی کا ذکر ہوتا رہا۔ اکثر کی یہ رائے تھی کہ روسی انگریزوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔

سخی سرور صاحب کی زیارت

جانے سے پہلے ہم نے سخی سرور صاحب کی زیارت کی۔ ایک عالیشان گنبد ان کے مزار پر بنا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ایک خوبصورت مسجد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ حضرت علیؓ دفن ہیں۔ اس زیارت کے لئے دور دراز سے لوگ آتے ہیں۔

مزار شریف اور بلخ[۳۳]

مزار شریف افغانی ترکستان کا مرکز ہے اور دریائے آمو سے جنوب کی جانب پچاس میل پر واقع ہے۔ خانہ آباد۔ تاش قرغان اور مزار شریف کے شمال میں ایک وسیع میدان واقع ہے۔ جو لمبائی میں سینکڑوں میل ہے اور جسکی چوڑائی پچاس میل سے ہرگز کم نہیں۔ ایک زمانے میں یہ

میدان دریائے آمو کے پانی سے سیراب ہوتا تھا لیکن اب یہاں آبادی نہیں۔ جگہ جگہ لوگوں نے حکومت کی امداد کے بغیر اپنی مدد آپ کے تحت پتلے پتلے نالے کھودے ہیں اور اس پانی سے تھوڑی بہت زراعت کی جاتی ہے۔

حکومت افغانستان نے مہاجرین کو اسی زمین کی پیش کش کی تھی جو حکومت کی امداد سے آباد کی جا سکتی تھی لیکن مہاجرین کے دماغ آسمان کو پہنچے ہوئے تھے جن کا زمین پر اترنا ناممکن تھا۔ ورنہ اس جگہ کو زرخیز بنایا جا سکتا تھا۔

موجودہ وقت میں بھی ازبک اور ترکمان یہاں بھیڑوں اور گھوڑوں کے بڑے بڑے ریوڑ پالتے ہیں لیکن حکومت افغانستان کی یہی خواہش ہے کہ یہاں بھی پشتونوں کو بسایا جائے۔

مزار شریف کی ترقی کا راز تجارت میں پوشیدہ ہے۔ یہ شہر کابل اور بخارا کی تجارتی شاہراہ پر واقع ہے۔ ایک زمانے میں یہ راستہ بلخ کے ساتھ گذرتا تھا لیکن اب بلخ سے چھ میل دور مزار شریف کے ساتھ گذرتا ہے۔

سرفراز آفندی

یہاں اپنے ایک نئے ساتھی کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک ترک فوجی جنگ عظیم کے دوران زار روس کے فوجیوں کے ہتھے چڑھا جنہوں نے اسے قید کر لیا۔ بالشویکی انقلاب کے دوران اس کو رہا ہونے کا موقع ہاتھ آیا اور سائبیریا کے دشوار گذار اور لمبے راستوں سے ہوتا ہوا افغانستان آیا اور آکر مزار شریف میں ٹھہر گیا۔ زندگی گذارنے کے لئے موچی بن گیا اور بہت اچھے بوٹ بنانا سیکھ گیا۔ ایک دن جب ہم سخی سرور صاحب کی زیارت سے نکلے تو ایک دکاندار نے اس کا تعارف ہمارے ساتھ کیا اور کہا کہ انا طولیہ جا رہے ہو۔ اس بے چارے کو بھی ہمراہ لے جاؤ۔ کافی عرصے سے بال بچوں سے بچھڑ کر زندگی گذار رہا ہے۔ یہ آپ کے لئے باعث ثواب بنے گا۔ دکاندار ہی کے کہنے پر ہم نے سوویت اور افغان حکومت دونوں سے یہ بات مخفی رکھی۔ ہمارے

دو ساتھی سکندر شاہ اور سرفراز خان ویسے بھی گرفتار ہو چکے تھے اس لئے اس کا نام سرفراز آفندی رکھا گیا۔ یہ آدمی فارسی اچھی طرح جانتا تھا۔ دراز قد، مضبوط پختہ عمر کا آدمی تھا۔ سنجیدہ طبیعت کا حامل تھا جس سے ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ باوجود اس کے کہ اپنے آپ کو سپاہی کہتا ہے ضرور ترک فوج کا کوئی افسر ہے۔

سیاہ گرد

نویں دن صبح سویرے ہم مزار شریف روانہ ہو گئے۔ راستہ خشک اور ریگستانی تھا۔ سارا دن چلنے میں گذارا۔ آخر ایک پرانے شہر کے کھنڈرات میں پہنچے جس کا نام سیاہ گرد تھا۔ یہ کھنڈرات کافی وسیع اور بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اب تو چار چھ گھر نو واردوں نے اس پرانے کھنڈرات کے ملبے سے آباد کر لئے ہیں۔ کھنڈرات پکی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ یہ بات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی کہ یہ شہر کس زمانے میں موجود تھا۔ اس کا بھی علم کسی کو نہیں کہ کس وجہ سے یہ شہر یوں برباد ہوا۔ نہ جانے کوئی ظالم فاتح آیا یا آفات سماوی کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ شہر کے باہر اور اندر زمین میں نالیوں کے نشان پڑے ہوئے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ خشک علاقہ جس میں انسان اور حیوان پیاس سے مرتے ہیں یقیناً ایک زمانے میں شادابی اور سرسبزی میں اپنی مثال آپ ہو گا۔ سیاہ گرد سے باہر بھی ایسے نالیوں کے نشانات پائے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی بڑی نالیوں کے ذریعے شہر لایا گیا تھا۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بلخ کی آبادی ایک زمانے میں دو چار لاکھ سے بڑھ چکی تھی۔ ان کھنڈرات سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ گرد کی بھی یہی صورت ہو گی۔ سنسکرت کی کتابوں سے پتہ چلا ہے کہ بلخ دریائے آمو کے کنارے ترمذ کے بالمقابل آباد تھا۔ سیاہ گرد سے دریائے آمو تقریباً پچیس میل پر ہو گا۔ سیاہ گرد اور دریا کے درمیان سارا علاقہ بالکل ریگستان ہے۔ شاید دریائے آمو کا یہ کنارہ سیاہ گرد کے ساتھ ہی ہو اور وقت کے ساتھ ساتھ پانی نے اپنا بہاؤ اس رخ کر لیا ہو اور دراصل یہی کھنڈرات آریا کے زمانے کا بلخ ہو۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید[۳۲] میں بلخ کا ذکر موجود ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنسکرت کے زمانے کے بلخ کے کھنڈرات کیسے باقی رہ گئے ہوں گے تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ بلخ ان کے زمانے میں نہ مٹا ہو اور بعد میں بھی بلخ آباد رہ چکا ہو۔

عشاء کے وقت ہم سیاہ گرد کے پڑاؤ پہنچے۔ اتنی تھکاوٹ تھی کہ ٹانگیں پھیلا نہیں سکتا تھا اس لئے لیٹ گیا اور پاؤں اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دیے۔ کمر زمین پر لگ گئی۔ اسی حالت میں سو گیا۔ صبح سویرے کسی نے پاؤں کھینچ کر جگا دیا۔ بالکل تر و تازہ ہو چکا تھا۔ اس لمبے سفر میں ہمیں یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ جب تھکاوٹ حد سے زیادہ ہو جائے تو اسی طرح دیوار کے ساتھ ٹانگیں لگا کر سونا چاہیئے جس سے تھکاوٹ بالکل ختم ہو جاتی اور آدمی پھر سے تر و تازہ ہو جاتا ہے۔

صبح سویرے پھر آگے چل پڑے۔ چلنا اسی طرح ریت میں پڑا۔ پانی کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ محمد اکبر خان کے ساتھ ایک بنسری تھی جس کو وہ کبھی کبھی بجاتے تھے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو اس ریگ میں راستے کا پتہ چلنا ناممکن ہو جاتا اور بہت سے راستے سے بھٹک جاتے لیکن محمد اکبر خان ایسے قائد نہ تھے کہ کسی کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ جاتے اس کی بنسری راستے کی نشانی تھی۔ ہر کوئی اس آواز کے پیچھے چلتا۔ بہرحال دریا کے قریب آتے گئے۔ ریت زیادہ ہوتی گئی۔ عصر کو دریائے آمو کے کنارے پہنچے۔ افغانستان کے بندرگاہ میں صرف ایک افسر تھا اور وہ بھی ایک جھونپڑی میں بیٹھا ہوا جو اس وقت ہمیں بہت برا لگا لیکن صبح جب دھوپ چڑھ آئی تو دریا کے کنارے سے دور ترمذ چھاؤنی کی شان جو دیکھی گرجوں کے اونچے منارے بتا رہے تھے کہ

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا۔

اب ہم سوویت یونین میں داخل ہو رہے ہیں۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنسکرت کے زمانے کے بلخ کے کھنڈرات کیسے باقی رہ گئے ہوں گے تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ بلخ ان کے زمانے میں نہ مٹا ہو اور بعد میں بھی بلخ آباد رہ چکا ہو۔

عشاء کے وقت ہم سیاہ گرد کے پڑاؤ پہنچے۔ اتنی تھکاوٹ تھی کہ ٹانگیں پھیلا نہیں سکتا تھا اس لئے لیٹ گیا اور پاؤں اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دیے۔ کمر زمین پر لگ گئی۔ اسی حالت میں سو گیا۔ صبح سویرے کسی نے پاؤں کھینچ کر جگا دیا۔ بالکل تر و تازہ ہو چکا تھا۔ اس لمبے سفر میں ہمیں یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ جب تھکاوٹ حد سے زیادہ ہو جائے تو اسی طرح دیوار کے ساتھ ٹانگیں لگا کر سونا چاہیئے جس سے تھکاوٹ بالکل ختم ہو جاتی اور آدمی پھر سے تر و تازہ ہو جاتا ہے۔

صبح سویرے پھر آگے چل پڑے۔ چلنا اسی طرح ریت میں پڑا۔ پانی کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ محمد اکبر خان کے ساتھ ایک بنسری تھی جس کو وہ کبھی کبھی بجاتے تھے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو اس ریگ میں راستے کا پتہ چلنا ناممکن ہو جاتا اور بہت سے راستے سے بھٹک جاتے لیکن محمد اکبر خان ایسے قائد نہ تھے کہ کسی کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ جاتے اس کی بنسری راستے کی نشانی تھی۔ ہر کوئی اس آواز کے پیچھے چلتا۔ جتنا ہم دریا کے قریب آتے گئے۔ ریت زیادہ ہوتی گئی۔ عصر کو دریائے آمو کے کنارے پہنچے۔ افغانستان کے بندرگاہ میں صرف ایک افسر تھا اور وہ بھی ایک جھونپڑی میں بیٹھا ہوا جو اس وقت ہمیں بہت برا لگا لیکن صبح جب دھوپ چڑھ آئی تو دریا کے کنارے سے دور ترمذ چھاؤنی کی شان جو دیکھی گرجوں کے اونچے منارے بتا رہے تھے کہ

.بیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا۔

اب ہم سوویت یونین میں داخل ہو رہے ہیں۔

سوویت یونین

ترمذ

بخارا

ترمذ[۳۵]: بالشویک ہمارا شاہانہ استقبال کرتے ہیں

ہم نے رات دریائے آمو کے کنارے ریت میں لیٹے ہوئے بغیر روٹی کے گذار دی لیکن پانی وافر مقدار میں تھا۔ صبح جب اٹھے تو کشتی کے انتظار میں جگہ جگہ کنارے کے ساتھ بیٹھ گئے۔ جب دھوپ پوری طرح نکل آئی تو ہمارے لئے ایک بڑی کشتی آگئی۔ تقریباً تین مہینے ہم عیسائی اور یورپ کی تہذیب سے دور رہے تھے لیکن یہ تین مہینے کبھی بھی نہ بھلا سکیں گے۔

دریا اس جگہ آدھ میل سے زیادہ چوڑا تھا۔ دوپہر سے کچھ پہلے ہم کشتی کے ذریعے دریا پار کر کے اتر گئے۔ اترنے کی جگہ خشک تھی لیکن آگے زمین دلدلی تھی۔ میرے بوٹ جو کافی پرانے ہو چکے تھے۔ دلدل میں پھنس کر رہ گئے۔ جب ایک کو نکالنے کی کوشش کی تو دوسرا پھنس کے رہ گیا۔ ایک بوٹ بغیر تسموں کا اور وہ بھی پھٹا ہوا، دوسرا پاؤں بغیر جوتے کے کیچڑ سے اٹے پڑے، قمیض اور شلوار دونوں پھٹے ہوئے اس عجیب ہیئت کذائی میں ترمذ کے شہر کے اندر داخل ہوئے اور سیدھے ایک سرائے جا پہنچے۔

ترمذ کا انقلابی کمشنر

ہم سرائے میں زمین پر بیٹھ کر پاؤں سے کیچڑ ہٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی منہ ہاتھ دھو رہا تھا اس اثنا میں دو فرنگی سرائے کے اندر داخل ہوئے۔ بہت عرصے بعد ایسی شکلیں دیکھیں تھیں اور اس وقت ان کی آمد سرائے میں بھی غیر متوقع تھی اس لئے سب کی نگاہیں ان پر

مرکوز ہوگئیں۔ ایک کے سر پر قراقلی ٹوپی تھی اور اس کی داڑھی بھی تھی۔ اس نے گھٹنوں تک لمبے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تاتار تھا۔ دوسرے کے سر پر قیمتی فرنگی ہیٹ تھا۔ نیلے رنگ کا کوٹ اور ٹاٹ کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں جوتی نہیں تھی اور پاؤں کا انگوٹھا سفید کپڑے کی پٹی سے بندھا ہوا تھا۔ تاتار اس کا تعارف کرتے ہوئے گویا ہوا " یہ ترمذ چھاؤنی کا کمشنر ہے "۔ اس نے سر سے ٹوپی اٹھائی اور ہمیں سلام کیا۔ ہم حیران تھے کہ فرنگی اور برہنہ پاؤں سر پر ہیٹ لیکن ٹاٹ کا پتلون یا الٰہی یہ کیا معمہ ہے ؟ تاتار فارسی جانتا تھا اس لئے کمشنر کی ترجمانی کر رہا تھا۔ کمشنر نے خواہش ظاہر کی کہ آپ لوگ مجھے خدمت کا موقعہ دیں۔ یہ ایک ایسی درخواست تھی جسے منظور کر لینے میں کچھ بھی دیر نہیں لگی۔

ہمیں فوجی سلامی دی جاتی ہے

ہمیں معلوم ہوا کہ سرائے سے باہر فوج معہ بینڈ کے کھڑی ہے اور ہمارے باہر نکلنے پر وہ ہمیں فوجی سلامی دیں گے۔ جبل السراج کی فوجی تربیت ہمارے کام آئی۔ غلام احمد آف گڑھی حبیب اللہ (ہزارہ) اور گوہر رحمٰن نے فوجی رعب داب دکھانا شروع کیا۔ انہوں نے سب کو چار چار کی قطار میں کھڑا کر کے چلنے کا حکم دیا۔ جب سرائے کے باہر جانے لگے تو کمشنر ہمارے آگے ہو لیا۔ کمشنر معہ فوجی بینڈ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ ہم ان کو بھی دیکھ رہے تھے اور اپنی حالت کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ہماری اکثریت برہنہ پا تھی۔ پائنچے پھٹے ہوئے قمیضیں پھٹی ہوئی اور شلواروں کی بھی یہی حالت۔ یہ ہمارا سارا لباس تھا۔ میرے ایک پاؤں میں تو پرانا بوٹ بغیر تسموں کے تھا اور دوسرے پاؤں سے میں بھی برہنہ تھا۔ سر پر بھیڑ کی کالی کھال سے بنی ہوئی ٹوپی۔ اکثر کے سروں پر کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن فوجی بینڈ کے ساتھ کندھوں پر شہتوت کی لاٹھیاں رکھے فوجی انداز میں مارچ پاسٹ کرتے جا رہے تھے۔ ازبک اور ترکمان ہمیں حیرت بھرے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ اکثر ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چھاؤنی سے باہر داخل ہونے سے پہلے کافی فوج سڑک کے دونوں طرف

کھڑی تھی ہمارے پاس سے گذرتے وقت انہوں نے ہمیں فوجی سلامی دی۔ ہم نے بھی فوجی قواعد کے مطابق لاٹھی سے بندوق کا کام لیتے ہوئے (EYES LEFT) کے حکم کے مطابق بائیں طرف نگاہیں موڑلیں۔ فوجیوں کے کپڑے اچھے تھے۔ گھٹنوں تک لمبے لمبے بوٹ تھے۔ چھوٹا کوٹ اور برجیس پہنے ہوئے تھے اور سر پہ بالشویکی فوجی ٹوپی تھی۔ تمام راستے پر چھوٹے بڑے لڑکے لڑکیاں مرد عورتیں غرض سب ہمیں دیکھنے امڈ پڑے تھے۔

کمشنر کی انقلابی تقریر

تھوڑی ہی دیر میں چھاؤنی کے اندر ایک وسیع میدان میں ہم فوجی ترتیب میں کھڑے تھے۔ ہمارے عقب کی قطاروں میں باقاعدگی سے ترمذ کی فوج بندوقیں لئے کھڑی ہو گئی۔ ہمارے سامنے ایک میز رکھی گئی اور اس میز پہ کمشنر صاحب کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے تقریر شروع کی۔ تین سپاہیوں نے وہ میز پکڑی ہوئی تھی لیکن کمشنر کی جوشیلی تقریر جو کہ تقریر سے زیادہ جنگ دکھائی دے رہی تھی۔ کے آگے وہ بھی بے بس نظر آرہے تھے۔ کمشنر صاحب جوش کے مارے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا لہرا کر کچھ کہہ رہے تھے اور اگر سپاہی ان کے ذرا قریب ہوتے تو یقیناً کمشنر صاحب کے ہاتھ ان کو پڑتے۔ میز ساری ہل رہی تھی اگر سپاہیوں نے مضبوطی سے اسے نہ پکڑا ہوتا تو یقیناً وہ میز سمیت نیچے گر جاتے۔ تقریر روسی زبان میں تھی۔ جس کی ہم کو سمجھ نہیں تھی۔ تاتار نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ کمشنر صاحب نے ہمیں سراہا تھا اور انگریزوں کی مذمت کی تھی۔

"سبحان اللہ! خلفائے راشدین کا زمانہ ہے!"

تقریر ختم ہونے کے بعد بینڈ بہت زور و شور سے بجایا گیا۔ اس کے بعد چھاؤنی کے بڑے بڑے افسروں کا ہم سے تعارف کرایا گیا۔ تعارف کے دوران ہی ایک اہم سول افسر پہنچ گیا۔ سب نے اس کی بڑی عزت کی۔ معزز آدمی لگتا تھا لیکن لباس اس کا کمشنر صاحب سے بھی عجیب تھا۔ پتلون کے پچھلے حصے

میں پُشت پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ قمیض خاکی زین کی تھی اور بٹن تو چمڑے کے گول گول ٹاکیوں میں سوراخ کرکے بنائے گئے تھے۔ اور قمیض پر ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ مہاجرین پر ان کی سادگی کا اثر تو بہت پہلے ہی ہو چکا تھا اور اب جب اس شخص کو دیکھا تو آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ حاجی شہاب الدین نے تو بے اختیار اونچی آواز میں کہا

"سبحان اللہ! خلفائے راشدین کا زمانہ ہے!"

اس کے بعد ہمیں ایک بڑے بارک پہنچایا گیا۔ وہاں پر ہمارے لئے سو چارپائیوں کا انتظام کیا گیا تھا جو پچاس پچاس کی دو قطاروں میں بچھائی گئیں تھیں۔ بڑی کھلی جگہ تھی اور ہم بھی آرام سے جاکر پڑ رہے۔ اتنے میں آکر کسی نے دریافت کیا کہ روٹی سپاہیوں کے ہاتھوں کی بنی ہوئی کھاؤ گے یا کچا راشن لے کر خود پکاؤ گے؟ تجویز کا دوسرا حصہ پسند کیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک چکی والا ترکی دنبہ، سب کے لئے چاول اور پندرہ بیس پونڈ ڈبل روٹیاں ایک ریڑھے میں پہنچا گیا۔

کھانا کھانے کے فوراً بعد چھاؤنی کے افسر پھر آگئے۔ اس دفعہ ان کے ساتھ دو لڑکیاں بھی اپنے خاوندوں کے ہمراہ آئیں تھیں۔ لڑکیوں کے بال لڑکوں کے طرح کٹے ہوئے تھے اور انہوں نے آتے ہی ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ چھاؤنی کمشنر نے ہمیں مطلع کیا کہ یہ ساتھی آپ کو خوش آمدید کہنے آئے ہیں۔ یہ کہہ کر افسروں اور لڑکیوں نے سب کے ساتھ علیحدہ علیحدہ گپ شپ شروع کر دی۔ گفتگو کے دوران دلچسپی کا مرکز وہ دونوں عورتیں رہیں۔ عورتیں ترجمان کو بھی ایک کی جانب کھینچتیں اور کبھی دوسرے کی طرف لے جاتیں۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ تھکے ماندے اور غم زدہ مسافروں کو بہلا سکیں۔ شیخوپورے (پنجاب) کا ایک کم عمر لڑکا فیروز نامی تھا۔ ابھی اس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ کافی حسین تھا، ایک لڑکی نے ترجمان کو اس کی طرف کھینچا اور کہا کہ "تم بہت خوبصورت ہو میں تم پر عاشق ہو گئی ہوں"۔ یہ سُن کر فیروز بھاگ کر مہاجرین کے پیچھے چھپ گیا اور منہ کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اسکی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر سب بہت لطف اندوز ہوتے۔ میزبان اور مہمان دونوں اس بات کو دیکھ کر بہت ہنسے۔ ترمذ کی ساری چھاؤنی میں دو یہ لڑکیاں اور دو اور تھیں۔ بحری جہاز جو کبھی کبھی ناغہ بھی کر دیا کرتا تھا۔ ترمذ اور ترکستان کے درمیان آمد و رفت کا واحد

ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ اور سب ذرائع منقطع ہو چکے تھے۔ اردگرد سب ترکمان رہتے تھے۔ اگرچہ ترکمانوں اور سوویت روس کے درمیان ابھی باقاعدہ جنگ نہیں تھی تاہم جنگ کی تیاری تھی۔ حقیقت میں ترمذ محصور ہو چکا تھا۔ ترمذ چھاؤنی سے بخارا ۳۶ ایک ریل کی پٹڑی دریا کے کنارے کنارے تباہ کر دی گئی تھی۔ ہمارے ساتھ ترمذ چھاؤنی کے افسران اور سپاہیوں کا سلوک بہت اچھا تھا۔ لیکن جب ہم ترمذ شہر جاتے تو امیر بخارا کے افسر ہمیں واضح الفاظ میں بتاتے کہ حکومت بخارا آپ کے چھاؤنی رہنے پر ناخوش ہے ترمذ میں امیر بخارا کی حکومت برائے نام ہی تھی اس لئے ہم نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

ترمذ ایک چھوٹی سی چھاؤنی ہے جس کے اردگرد چاروں طرف ایک قد آدم دیوار بنی ہوئی ہے اور اس دیوار میں مورچے بنے ہوئے تھے۔ ترمذ کے پرانے شہر کی آبادی کم تھی اور مٹی کا بنا ہوا شہر تھا۔ لوگ غریب تھے بازار چھاؤنی کی بدولت آباد تھے۔ ہم نے مزار شریف میں زار کے زمانے کے نوٹ ارزاں نرخ پر خرید لئے تھے اور ترمذ میں وہی رائج تھے۔ زار کے زمانے کا ایک روبل ہندوستان کے ڈیڑھ روپیہ کے برابر تھا۔ لیکن مزار شریف میں یہ چار آنے کا بکتا تھا۔

مجھے بھڑ نے کاٹا

میں نے روسی زبان سیکھنے کی بے حد کوشش شروع کی تھی۔ اس خاص کوشش کی وجہ یہ تھی کہ پہنچنے کے دوسرے روز میں بازار میں ایک دکان پر کھڑا تربوز خریدنے میں مشغول تھا کہ اچانک ایک بھڑ نے شلوار کے پائنچے میں داخل ہو کر مجھے ڈنگ مارا۔ سارے جسم پر چھوٹی چھوٹی پھنسیاں نکل آئیں۔ میری حالت خراب ہو گئی ہسپتال گیا تاکہ ڈاکٹر سے معائنہ اور علاج کروا سکوں۔ وہاں جا کر میں نے ہر چند کوشش کی لیکن اسے سمجھا نہیں سکا۔ جس فٹن میں ہسپتال گیا تھا اسی میں واپس آیا۔ ایک بھڑ کو دکان کے اندر مارا اور وہ اٹھا کر ڈاکٹر کے سامنے ڈال دیا۔ ڈاکٹر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور فوراً اسے لے کر جا کر اپنے کمپوڈروں کو دکھایا کچھ کہا اور سب ہنس پڑے۔ شاید اس نے یہی بتایا ہو گا کہ اس مسافر نے کیسے زبان کی کمی پوری کر دی۔ پھر اس نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور مجھے ہسپتال میں داخل کر دیا۔

تفریح طبع

اس چھوٹی سی چھاؤنی میں ایک سینما اور ایک تھیٹر تھا۔ ہم دونوں میں شرکت کرتے۔ مہاجرین نے ایک دن جلیانوالہ باغ کے المناک واقعے کو ایک چھوٹے سے ڈرامے کی صورت میں پیش کیا۔ کبھی کبھی اردو پنجابی اور پشتو کی غزلیں تھیٹر میں سنائی جاتی تھیں۔ ان کے فارسی اور روسی زبانوں میں ترجموں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔

دن رات آرام سے گذر رہے تھے۔ ہمیں لباس اور جوتے بھی مہیا کئے گئے تھے اور خوراک بھی بہترین مل رہی تھی۔ اسی انتظار میں تھے کہ جب جہاز آئے گا تو اس میں آرام سے سفر کریں گے۔ چھاؤنی کے کمیسار نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہوا تھا کہ جب بھی پہلا جنگی جہاز روانہ ہوگا اسی میں ہمیں آگے روانہ کردیا جائے گا۔

مہاجرین کبھی کبھی جلسہ کرکے تجویز پاس کر لیتے کہ مزید ٹھہرنا ہمارے مقصد کے منافی ہے کمیسار کو فوراً یہ تجویز پہنچا دی جاتی اور وہ ہماری فوراً دلجوئی کر لیتا کہ راستہ خطروں سے اٹا پڑا ہے اسی وجہ سے کشتی کے سفر سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ایک دو دن ہم خاموش ہو جاتے لیکن مہاجرین میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو دلیل پر یقین نہیں رکھتے تھے اور ان میں سوچ کا مادہ کم ہی تھا۔ خطرہ ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کے دلوں میں بے پناہ جذبہ تھا۔ اسی نے ان کو ہند سے ترکستان پہنچایا اور اب ترکستان میں بھی وہ جذبہ ان کو آرام سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ حاجی معراج الدین اور حاجی شہاب الدین جو جبل السراج کے شہرت یافتہ تھے مزید صبر نہیں کر سکے اور آہستہ آہستہ ان میں بے قراری آنے لگی۔ ایک آخری جلسہ بلوایا گیا۔ جس طرح ہم نے امان اللہ خان کی حکومت کو دھمکی دی تھی کہ فلانے دن ہمیں روانہ ہونا ہے اسی طرح ہم نے ترمذ کے روسی کمیسار کو بھی اطلاع دی تھی کہ "ہم نے آج سے تیسرے دن روانہ ہونا ہے۔ اگر حکومت نے ہمیں کشتیاں فراہم کیں تو ہم شکر گذار ہوں گے اور اگر نہیں دیں تو ہم پیادہ روانہ ہوں گے"۔ یہ فیصلہ ہو گیا کہ بالشویک کا یہ کہنا کہ آگے خطرہ ہے بالکل فضول بات ہے۔ "خطرہ اگر ہے تو حکومت کے لئے ہوگا جن کی ترکمانوں کے ساتھ کھلی لڑائی ہے

کی بات ہوگی۔ ترکمان مسلمان ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔ ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں"۔

یہ تجویز اتفاق کے ساتھ پاس ہوگئی۔ اس الٹی میٹم کے پہنچتے ہی کمیار ہمارے بارک کو دوڑتا ہوا آیا اور منت سماجت کرنے لگا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ ہم اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے بچالیں۔ دریا میں اس طرح چھلانگ لگانا بقول اس کے کوئی دانائی نہیں۔ اس نے کہا آج کل آنادی پسندوں اور امیر بخارا کے درمیان جنگ شروع ہے اور ترکمان یقیناً آپ کو نقصان پہنچائیں گے۔ لیکن ہمارا مختصر جواب یہی تھا۔ کہ "ہمارے اور ان کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ تو ہمارے بھائی ہیں، ہمیں بھلا کیوں نقصان پہنچائیں گے"۔

ترمذ سے رخصت

پورے ایک مہینے پہلے جس شان و شوکت سے ہمارا استقبال کیا گیا تھا اب اسی شان و شوکت سے ہمیں رخصت کیا جا رہا تھا۔ دریا کے کنارے ہمارے لئے جن دو کشتیوں کا انتظام کیا گیا تھا ان کو کھڑے پایا۔ شام کے کھانے کے بعد اسی فوجی ترتیب سے ہم کو چھاؤنی سے رخصت کیا گیا۔ آگے آگے بینڈ بج رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم بیاسی مہاجرین ایک نامعلوم منزل جو خطروں سے بھرپور تھی کی طرف گامزن تھے۔ دو ترکی دنبے، کافی چاول اور بہت سی ڈبل روٹیاں ہمارے ساتھ کشتی میں رکھی گئیں۔ کشتیاں کیا تھیں انہیں چھوٹے جہاز کہا جا سکتا ہے۔ اکتالیس آدمی ایک میں سوار ہوئے اور اکتالیس دوسری میں بیٹھ گئے۔ پھر بھی دونوں کشتیوں میں کافی خالی جگہ رہ گئی تھی۔ کشتیوں پر ہی چولہے بنائے گئے پھر بھی کافی جگہ سونے کے لئے بچ گئی۔

صبح سویرے بادبان اٹھا لئے گئے۔ بیڑہ مغرب کی سمت بہنے لگا۔ دریا کا پاٹ کافی وسیع تھا۔ ملاح بھی خوش طبیعت تھے۔ جگہ جگہ کشتیوں میں کھڑے اندازہ لے رہے تھے۔ آگے آگے دیکھ رہے تھے اور ذرا سی دیر میں آرام سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ کشتیاں آرام سے ایک دوسرے کے پیچھے چل رہی تھیں۔ باد صبا نرم روی سے چل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا اور دریا کا سرسبز و شاداب کنارہ دکھائی دینے لگا۔ ہم سب نے عاجزی اور انکسار کے ساتھ رب لایزال کے دربار میں

دعا مانگی۔

"اے خدایا! ہمارے پیارے وطن کو بھی آزاد کرا دے تاکہ ہم بھی اور قوموں کی مانند عزت سے زندگی گزار سکیں۔"

سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا تاہم روشنی پھیل چکی تھی۔ چائے کا دور چل رہا تھا کشتیاں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ہم باتوں میں مشغول تھے۔ سوویت حکومت کی میزبانی کی تعریف ہر ایک زبان پر تھی اور کیوں نہ ہوتی ہمیں صبح کے ناشتہ کے ساتھ بھی خشک میوہ کھانے کو ملتا۔ سارا دن خوشی سے گذرا۔ سفر کی تکلیف کا کچھ احساس بھی نہیں تھا۔ سارا دن کھانا پکانے اور اس کو کھانے میں مشغول رہے۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ کبھی دریا کے سیر کے لئے اور کبھی کسی خاص ضرورت کے لئے کشتیاں کنارے پر رک جاتیں ہم اتر کر ترکمانوں کے وطن کا نظارہ کرتے رہے اور پھر آگے روانہ ہو جاتے۔ سارے دن میں ہم نے کافی فاصلہ طے کیا۔ مغرب کی نماز بھی کنارے پر پڑھی اور کھانا بھی زمین پر ہی بیٹھ کر کھایا۔ رات گئے تک سفر کے دوران تاروں بھرے آسمان کا مزہ لیتے رہے اور پھر سو گئے

لڑائی کی بُو آنے لگی

دوسرے دن ہمارے ملاحوں نے دریا کے کنارے گڈریوں اور باغبانوں سے آگے کا حال دریافت کیا۔ ہم میں سے اکثر تو اپنی باتوں میں مشغول تھے لیکن ترک آفندی اور اس کے علاوہ ایک اور پشتون جو ترکی جانتا تھا سمجھ گئے کہ آگے لڑائی ہو رہی ہے۔ ملاح متفکر تھے ان کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ سب افسردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جنگ کی اطلاعات نے ہم پر کوئی خاص اثر نہیں کیا۔ ہماری دل جوئی سے بھی ملاح خوش نہیں ہوئے۔

کِلف یا کیف (KIEV)

دوپہر کو ہم کِلف پہنچے۔ یہ افغانستان اور بخارا کے درمیان تجارتی بندرگاہ ہے ہم وہاں اترے۔

لیکن ہمیں کوئی تجارتی مال نظر نہیں آیا۔ ہر طرف بربادی کا منظر تھا۔ دفتر۔ چنگی اور مکانات وغیرہ مسمار تھے۔ انقلاب نے اپنے اثرات چھوڑے تھے۔ نماز ہم نے وہیں پڑھی۔ اور واپس ہو لئے لیکن آکر پتہ چلا کہ ہماری امداد کے لئے ہمارے ساتھ ترمذ سے جو آدمی بھیجے گئے تھے وہ فرار ہو گئے تھے۔ اب ہمیں بھی یقین آنے لگا کہ واقعی آگے لڑائی ہے۔ لیکن "انگار جانے اور لوہار جانے" کے مصداق ہمیں اس سے کیا غرض۔ ترکمانوں نے ہمیں کیا کہنا تھا؟ وہ جانیں اور سوویت حکومت جانے۔

ہم ترکمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے

رات گئے تک ہماری کشتیاں آگے چلتی رہیں۔ ہوا موافق تھی۔ ہم کھانا کھا چکے تھے اور سونے کے فکر میں تھے۔ ملاح کافی فکر مند تھے اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کشتیاں منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔ لڑائی اور اس کے متعلق باتوں سے ہم نے حق الوسع پرہیز کیا۔ سب خاموش تھے کوئی سو گئے اور کوئی سونے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اس دوران دریا کی جانب سے ایک آواز آئی۔ ملاحوں نے جواب دیا اور کشتیوں کا رُخ موڑ لیا۔ ہم نے ملاحوں کو ٹوکا لیکن انہوں نے کہا کہ اب کنارے سے فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ اس لئے ہم بھی چُپ ہو رہے۔

جب ہماری کشتیاں کنارے لگیں تو ترکمان ہمارے قریب آئے اور آکر کہنے لگے کہ "آپ ناراض نہ ہوں صبح تک آپ کو رخصت کر دیا جائے گا۔ ہم نے اپنے بڑوں کو اطلاع دے دی ہے۔ آگے دریا کے دونوں کناروں پر مجاہد پڑے ہوئے ہیں اس طرح بے خبری میں آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔"

"ان روسیوں کو ساتھ کیوں لائے ہو؟"

ہم بے فکر سو گئے۔ صبح یہاں سے آگے روانہ ہونا تھا لیکن اس وقت کس کو خبر تھی کہ اس قرب و جوار میں ہمیں ایک مہینہ گذارنا ہو گا۔ اس وقت آنکھ کھلی جب سورج ابھی پوری طرح نکلا نہیں تھا بلکہ نکل رہا تھا۔ ابھی ہم کشتی میں لیٹے ہوئے تھے کہ کنارے سے دو ترکمان لڑکے کشتی کی جانب آئے۔ انہوں نے ہمیں گھور گھور کر

دیکھا اور پھر پہلے کی طرح واپس ہو کر بیٹھے ہوئے اشخاص کی ٹولی میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہم کشتیوں میں بیٹھے ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ کر رہے تھے کہ کیوں نہ بادبان اٹھا لیے جائیں۔ آخر کب تک ان کا انتظار کریں گے۔ اتنے میں ان کی طرف سے ایک ترکمان آیا اور آ کر کہنے لگا کہ اپنے سردار (کلان تر) کو مع اپنے اور نمائندوں کے بھیجو۔ سالار قافلہ اکبر خان ہمارے چند ساتھیوں کے ہمراہ گفت و شنید کے لئے ان کے پاس گیا۔ میں بھی ان میں موجود تھا۔ سرفراز آفندی کو ترجمانی کے لئے ساتھ لے جایا گیا۔ ریت ہی کے اوپر ایک طرف ترکمان بیٹھ گئے اور دوسری طرف ہم بیٹھ گئے۔ گفت و شنید شروع ہوئی۔ اکبر خان کے بازو پر اللہ اکبر لکھا ہوا تھا ترکمانوں نے فوراً اس کا نام اللہ اکبر رکھ دیا۔ ہمیں جلدی احساس ہو گیا کہ ہم محاصرے میں ہیں۔ جھاڑیوں کے پیچھے ترکمان کی بھیڑ کی کھال کی بنی ہوئی ٹوپیاں اور بندوقیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ لوگ بغیر ٹوپی کے بھی خوفناک لگتے تھے۔ ایک بھیڑ کی پوری کھال کی ٹوپی بنا لیتے اور اس ٹوپی کے اوپر والے سرے پر دنبے کے بال ان کی خوفناک شکل کو اور ہیبت ناک بنا دیتے۔

ترکمان مغل نژاد ہیں۔ آنکھیں ذرا ترچھی ہوتی ہیں۔ ان کی ٹھوڑیوں کے نیچے ڈاڑھیوں کے بال لٹکتے ہیں۔ کپڑے کا بنا ہوا لمبا چوغہ ٹخنوں تک ہوتا ہے اور ان کے گھٹنوں تک لمبے لمبے بوٹ اس چوغے میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

انہوں نے ہم پر الزام لگایا کہ "تم جدیدی ہو۔ بالشویک ہو۔ نئے اصولوں پر تمہارا عقیدہ ہے آگے کرکی کی چھاؤنی ہے اور تم وہاں محصور بالشویکی فوج کی امداد کے لیے جا رہے ہو"۔ محمد اکبر خان نے جواب میں مختصر تقریر کی کہ "ہم ہندوستانی مہاجرین ہیں۔ ترکوں کی امداد کے لیے اناطولیہ جا رہے ہیں۔ ہمارا بالشویکی جدیدیوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔"

جواب میں کلان ترا اپنے پرانے دعوے پر ڈٹے رہے اور آخر ثبوت میں انہوں نے ہمارے ترمذ والے ایام یاد دلا دیے۔ کہ کیسے تم کافروں کے سینماؤں اور تھیٹروں کو دیکھتے بھی رہے ہو اور بڑی بات کہ خود بھی اس میں شرکت کرتے رہے ہو۔ اکبر خان نے اس کا بھی جواب دے دیا لیکن وہ نہیں مانے اور آخر چند کلان تران نے اکبر خان پر انکھیں نکالیں اور گویا ہوئے ساتھ ہی انہوں نے

میری طرف اور پشاور کے ایک شیعہ فدا علی کی طرف اشارہ کیا کہ

"اچھا اگر تم جدیدی نہیں ہو تو ان روسیوں کو ساتھ کیوں لائے ہو۔ یہ ضرور تمہیں محصور کر کی چھاؤنی تک پہنچانے والے ہیں۔"

اکبر خان اپنی عادت کے مطابق پہلے تو مسکرایا اور پھر سنجیدہ بن کر پُر زور طریقے سے ہماری مسلمانی کی تائید کی۔ اس جھگڑے کا فیصلہ نہ تو دلیلوں سے ممکن تھا اور نہ ترکمان یہ چاہتے تھے بلکہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر یہ معلوم کرنا تھا کہ ہمارے پاس اسلحہ موجود ہے یا نہیں۔ ہم کو بات چیت میں مشغول رکھا اور خود کبھی ایک بہانے کبھی دوسرے بہانے کشتیوں کی تلاشی میں مصروف رہے۔ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں سوائے ایک تلوار کے اور ان لاٹھیوں کے جو ہم جبل السراج سے ساتھ لائے تھے تو ہمارے سب آدمیوں کو کشتیوں سے نیچے اتار لیا۔ تلوار تو انہوں نے دریا میں پھینک دی اور لاٹھیاں اپنے پاس رکھ لیں۔

"ھائیکو یا اللہ"

آؤ مومنوں کافروں کے خلاف جہاد میں حصہ لو

ترکمانوں کے کلاں تر نے ہمیں حکم دیا کہ چل کر کشتیوں سے اپنے سامان ساتھ لے لو اور ہمارے ساتھ چلو تاکہ تمہیں اپنے قبیلے کے "شیخ" کے آگے پیش کریں۔ ہم نے ان سے اجازت مانگی کہ پکے ہوئے چاول ہمارے ساتھ دیگچیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے گرم کرنے اور کھانے کی اجازت دے دو۔ اس کے کھانے کے بعد پھر چلے جائیں گے۔ ترکمان کو غصہ آگیا۔ اس نے ایک آواز دی اور ساتھ ہی جھاڑیوں میں چھپے ترکمان باہر نکل آئے۔ انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھالیا۔ ہمارے چند ساتھیوں کو جو ابھی تک کشتیوں سے اتر رہے تھے بندوقوں کے بٹ مار مار کر نیچے اتارا۔ ایک ترکمان نے پکے ہوئے چاول دریا میں پھینک دیئے اور دیگچے ہمارے سروں پر رکھ دیئے۔

مہاجرین درمیان میں اور ترکمان ان کو گھیرے ہوئے مغرب کی جانب روانہ ہو گئے۔ پیچھے چلنے والے مہاجرین پر ایسی مار پڑ رہی تھی کہ پرایا جانور بھی اتنی بے رحمی سے کوئی نہیں مارتا۔ نوجوان آگے آگے چل رہے تھے اور ضعیف اور کمزور پیچھے پیچھے۔ حاجی معراج الدین اور حاجی شہاب الدین پیچھے رہے۔ اول الذکر کی انتہا پسندی سے ہم اس نوبت کو پہنچے تھے۔ دوئم اسکا تائید کنندہ تھا۔ حاجی معراج الدین ضعیف تھا اس لئے تیز نہیں چل سکتا تھا جبکہ حاجی شہاب الدین کے ساتھ کپڑوں سے بھرا ہوا ایک بقچہ تھا۔ اس وجہ سے وہ بھی تیز چلنے سے قاصر لاٹھیاں سہہ رہا تھا۔ بقچہ کافی بھاری تھا اور اس اکیلے سے نہیں اٹھایا جا رہا تھا میں اس کی مدد کے لئے تھوڑا رُکا تو ہم پر بندوقوں کے بٹوں کی بارش ہو گئی۔ نعرہ لگتا۔

"ھائیکو! یا اللہ!" (شاباش! یا اللہ!)

یہ کہہ کر ترکمان پھر سے ایک نئے جوش کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہو جاتے۔ لیکن مہاجرین نے بھی کافی سختیاں جھیلیں تھیں اور سرد و گرم کے عادی ہو گئے تھے۔ کتنی بار آزمائشوں سے گذر کر کامیاب ہو چکے تھے ایک ہی اپیل پر اتیار کے مارے نوجوان پیچھے ہو گئے اور بوڑھوں اور کمزوروں کو مار سے بچانے کے لئے کر آگے کر دیا۔ "ہائیکو یا اللہ" کی آواز بار بار بلند ہوتی اور اس کے ساتھ بندوقوں کے بٹوں کی بارش ہو جاتی۔ ہمارے چلنے سے راستے میں گرد و غبار اتنا پھیل گیا کہ ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک بوڑھا ترکمان ہم سے آگے آگے گدھے پر سوار چل رہا تھا اور اپنی زبان میں اونچی آواز سے پکارتا:

"او مومنو! کافروں کے مارنے میں جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو جاؤ"۔ یہ علاقہ دریائے آمو کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ نہایت سرسبز و شاداب اس علاقے میں قدم قدم پر گاؤں آباد تھے۔ ہمارے پہنچنے پر لوگ پتھر اور مٹی کے ڈھیلے اُٹھا کر ہم پر پھینکتے مکانوں کی چھتوں پر عورتیں کھڑی ہمیں خوفناک نظروں سے دیکھتیں۔ اسی حالت میں ہم نے تقریباً دس میل کا فاصلہ طے کیا۔

سرائے نظام بیگ

تھکے ماندے، زخمی۔ چہروں سے خون پونچھتے اس حال میں ہم سرائے نظام بیگ پہنچے۔ گھبرائے

ہوئے مویشیوں کی طرح وہ ہمیں ہانکتے ہانکتے ایک سرائے میں لے آئے۔ یہ چوپایوں کی سرائے تھی۔ ایک طرف سرے کے ساتھ ساتھ ایک لمبا دالان تھا جو گدھوں کی لید اور گایوں بیلوں کی گند سے بھرا ہوا تھا۔ مہینوں سے اس کی صفائی نہیں ہوئی تھی لیکن ہمارے لئے اس لید نے بستروں کا کام دیا۔ ہم اسی پر بیٹھ گئے۔ سرائے کے دروازے پر پہرا بٹھا دیا گیا۔ اردگرد کی دیواروں پر چند ترکمان ہاتھوں میں بندوقیں لئے کھڑے ہو گئے۔ اعلان کیا گیا کہ جو کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلے گا گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ سرائے میں داخل ہونے والے دروازے کے ساتھ صرف دونوں طرف ایک ایک کمرہ تھا باقی کھلا میدان تھا اور سرائے کی آبادی بھی کچی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ ذرا سی دیر میں پھر ہم پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اردگرد کے درختوں پر شریر لڑکے چڑھ گئے اور انہوں نے وہاں سے پتھر برسانا شروع کر دیے۔ ہمیں یہاں لانے والے ترکمانوں نے شاید ان کے ہاتھوں ہمارا ہلاک ہونا منظور نہیں کیا۔ اس لئے کسی کو ہمارے نزدیک نہیں آنے دیا گیا۔

تکلیف میں انسان کو خدا یاد آجاتا ہے

پہلے پہل تو ہم بالکل ہوش و حواس میں نہیں تھے۔ آہستہ آہستہ اوسان بحال ہوئے تو چند باہمت ساتھیوں نے دروازے کے پہرے داروں سے باہر بہنے والی چھوٹی سی نہر پر وضو کرنے کی اجازت طلب کی۔ وضو کرنا تو درکنار پانی پینے کے لئے بھی باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صبح کی نماز کا وقت تو ایسے ہی گذر گیا۔ ظہر کی نماز کے وقت پھر پانی طلب کیا گیا لیکن بے سود۔ آخر سب نے بالاتفاق تیمم کیا اور باجماعت نماز پڑھی۔ ترکمان ہمیں ہماری اس حرکت پر حیرانی سے گھورتے رہے۔

سرائے میں پہلا دن ہمیں کھانے کو کچھ نہ ملا اور نہ ہی پانی دستیاب ہوا۔ بھوکے پیاسے سارا دن پڑے رہے۔ سارے علاقے میں پانی کی بہتات تھی لیکن ہمارے نصیب میں پیاس ہی لکھی تھی۔ رات کو بھوک اور پیاس کے مارے نیند بھی نہ آئی۔ دوسرے دن دروازے میں دکاندار آموجود ہوا۔ اس نے ہمیں روٹی اور قاغون (سروے) فروخت کرنا شروع کر دیے۔ پڑھنے والا خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ ہم مجبور لوگوں سے اس نے ضروریات زندگی کی اس چیز کی کیا قیمت وصول کی ہوگی؟۔

ہمارا امتحان

دوسرے دن ایک ایک دو دو ترکمان سرائے کے اندر آنا شروع ہو گئے۔ یہ نو وارد اکثر اردگرد کے دیہات کے باشندے تھے جو ہمیں دیکھنے کے لئے آتے۔ ہمارے ساتھ گفتگو بھی کرتے اور دوران گفتگو قسم قسم کی باتیں پوچھتے۔ ان میں سے زیادہ تر باتیں مذہب کے متعلق ہی ہوتیں۔ ہمارے ساتھ کافی تعداد میں قرآن شریف بھی موجود تھے اور جب ہم اپنا عقیدہ بتانے کے لئے قرآن شریف ان کے سامنے پڑھتے تو وہ سر ہلا ہلا کر کہتے رہتے کہ

"بعض روسی اپنا مطلب نکالنے کے لئے قرآن شریف سیکھ لیتے ہیں۔ ہماری مسجدوں میں اکثر روسی امام بھی رہ چکے ہیں۔"

ہم پانچوں وقت کی نماز باجماعت پڑھتے۔ کوئی مہاجر بھی نماز نہ پڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا ہر وقت قرآن شریف کی تلاوت جاری رہتی۔ ترکمانوں نے ہر ایک شخص سے کلمہ سُن لیا تھا لیکن پھر بھی ان کو یقین نہیں آیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ تیسرے دن تین آدمی سرائے کے اندر آئے۔ شکل و صورت سے وہ کلان تر معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے دالان کا ایک سرے سے دوسرے تک معائنہ کیا۔ چند آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "تم یہودی ہو"۔ مہاجرین نے انکار کیا۔ اور جواباً کلمہ پڑھ کر سنایا تو کہنے لگے کہ پھر تم لوگوں نے یہ داڑھیاں اتنی کیوں بڑھائی ہیں۔ آخر میں جب وہ میرے اور فدا علی کے قریب آئے تو وہی بات پھر دہرادی کہ یہ دونوں تو روسی ہیں۔ ہم لوگوں نے بلا خوف تردید اس کا جواب دیا کہ نہیں ہم مسلمان ہیں۔ تائید میں فوراً کلمہ پڑھا۔ کچھ مذہبی سوالات پوچھنے کے بعد ایک کلان تر نے پوچھا "کیا تمہارے ختنے ہو چکے ہیں؟" ہم نے فوراً اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "ہمیں اعتبار نہیں اس لئے ہمیں دکھا دو۔"

ہم حیران رہ گئے لیکن انکار کا نتیجہ یقیناً ہمارے حق میں نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ "ہمیں اپنے آپ کو دکھانے میں کوئی حرج و مضائقہ نہیں لیکن ایسا نہ ہو کہ ہر کوئی یہی مطالبہ کرے۔ اس لئے آپ لوگ جو ملاحظہ فرمائیں اس کا تحریری ثبوت پھر ہمیں دے دیں تاکہ جو کوئی ہم سے پھر یہ مطالبہ کرے ہم اس کو وہ دکھلا سکیں۔"

کلان تر تحریری سند پر دینے کو راضی نہ ہوئے ۔ تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد وہ سرائے سے چلے گئے ۔ ویسے تو بہت کلان تر ہمیں دیکھنے آتے تھے ۔ اور تھوڑی بہت فارسی بھی جانتے تھے لیکن یہ تین آدمی عالم تھے اور فارسی بھی اچھی طرح سمجھتے تھے ۔

ہمیں سزائے موت سنائی جاتی ہے

میں نے کلان تروں کو جو جواب دیا سب مہاجرین اس پر بہت خوش ہوئے ۔ اب ہم میں کافی جرأت آگئی ۔ لہٰذا ترکمانوں کے ساتھ ہر بات پر خاصی بحث و تمحیص کرتے تھے ۔ وہ لوگ ٹوٹی پھوٹی فارسی جانتے تھے ۔ اور ہمیں اب ٹوٹی پھوٹی ترکی آگئی تھی ۔ اب ہم ان کی ہیبت ناک شکلوں اور خوفناک ٹوپیوں کے ساتھ بھی عادی ہو چکے تھے ۔ ہمارے ساتھ اب وہ ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے ۔ انہوں نے ہمیں تسلی دی ہوئی تھی کہ ہم نے بخارا اپنا ایک آدمی بھیجا ہوا ہے جو " جناب عالی " سے پیغام لے کر آجائے گا تمہیں بھی " جناب عالی " کی خدمت میں پیش کیا جائے گا ۔ ہم اس پر راضی تھے اور بخارا جانے کا انتظار کر رہے تھے ۔ ہمیں پتہ تھا کہ امیر بخارا اور جدیدی خیالات کے حامل طبقے میں جنگ شروع ہو چکی تھی ۔ سرائے نظام بیگ میں ہمیں ترکمانوں سے پتہ لگا کہ انگریزی حکومت اور امیر بخارا کے درمیان دوستانہ تعلقات ہیں[۳۸]، دونوں کا آپس میں رابطہ بھی قائم ہے ۔ ترکمان ٹوٹی پھوٹی فارسی میں کہتے

" روس کافرست ۔ انگلیس و افغان خوب است "۔

(روس کافر ہے ۔ انگریز اور افغان اچھے ہیں)

سرائے نظام بیگ میں چوتھا دن بھی اسی طرح ہنسی خوشی شروع ہوا ۔ وقت گذاری کے لئے ترکمانوں کی نقل ہم چھوٹے چھوٹے ڈراموں کی شکل میں پیش کرتے تھے ۔ لیکن اس دن ہم نے دیکھا کہ سرائے کے باہر غیر معمولی آمد و رفت ہے ۔ نئے نئے ترکمانوں کی شکلیں دیکھنے میں آرہی تھیں ۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے لیکن ہمارے قریب کوئی بھی نہیں آرہا تھا ۔ قہر و غصہ میں ڈوبے ہوئے لگ رہے تھے ۔ تھوڑی ہی دیر میں چودہ پندرہ کلان تر دائرہ کی شکل میں بیٹھ گئے ۔ ہم سمجھ گئے

کہ موضوع گفتگو ہم ہی ہوں گے۔ ہم نے جاننے کی کوشش کے لئے ایک آدھ آدمی ان کی طرف بھیجا لیکن انہوں نے اسے دھتکار دیا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی آپس میں گفتگو کی تھی کہ ایک آدمی کو ہمارے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اپنا ایک نمائندہ ان کے پاس بھیجو۔ سرفراز آفندی کے علاوہ اور کسی کو بھیجنا فضول لگتا تھا۔ فوراً اسے بھیج دیا۔ وہ جلدی ہی واپس آگیا اور اس حالت میں کہ آنکھوں میں آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ ہم سب گھبرا کر فوراً اس کے پاس دوڑے۔ اس نے مختصر سا جواب دیا "فیصلہ ہوگیا۔ ہم قتل کئے جائیں گے۔"

اس چنگیزی حکم کے ساتھ ہی باری باری ہر مہاجر کو دروازے پر بلایا۔ مکمل تلاشی لی جاتی اور پھر اس کو دروازے کے باہر دھکیل دیا جاتا۔ باہر پچاس اسلحہ بند آدمیوں کے نرغے میں اس کو دے دیا جاتا۔ وہاں اس کو دائرے میں کھڑا کر کے شلوار قمیض کے علاوہ تمام کپڑے اتروائے جارہے تھے اور نقدی بھی چھینی جارہی تھی۔

ہمارے سامنے بہت سخت گھڑی تھی۔ ہر ایک کے چہرے سے خون کی سرخی غائب ہوگئی تھی۔ حاجی شہاب الدین اور چند اور اشخاص نے اکبر خان کو کہا کہ قرآن شریف ہاتھ میں پکڑ کر دروازے کی طرف جاؤ۔ وہاں ان کو اس قرآن کا واسطہ دو تاکہ ہمیں معاف کردیں اور یہ ظلم نہ کریں۔ ان پر واضح کرو کہ ہمارے بال بچے تم کو بددعائیں دیں گے۔ ہمارے مارنے سے تم کو کوئی فائدہ بھی نہ پہنچے گا۔ لیکن اکبر خان اس پر راضی نہ ہوا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا "قبر کی رات گھر پر نہیں گذرتی۔ یہ ہماری تقدیر میں لکھا ہوگا۔ مجھے آہ و فریاد سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ ترکمان ویسے بھی ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔ بہتر یہ ہی ہے کہ آخری وقت میں سنجیدہ رہیں۔ موت قبول ہے لیکن منت سماجت نہیں کریں گے۔"

ان افراد کی معہ آفندی کے آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔ ہر چند انہیں سمجھایا گیا کہ رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن وہ چپ نہ ہوئے۔ درحقیقت یہ افراد بال بچے دار تھے۔ آفندی بھی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ جنگ عظیم کے زمانے کا قیدی تھا۔ انقلاب روس میں موقع پاکر افغانستان

بھاگ گیا تھا۔ اب ہمارے ساتھ وطن جانے کے خیال سے آرہا تھا۔ اس کی یہ موت ناگہانی بھی تھی اور بے فائدہ بھی اس لئے اس کے آنسو کسے نہیں تھے۔

اشارے سے یا آواز سے باری باری سب مہاجروں کو دروازے کی طرف بلا کر اس کی مکمل جامہ تلاشی لی جاتی اور پھر اس کو باہر دھکیل دیا جاتا۔ اس کے بعد دوسرے کا نمبر آجاتا۔ میرا نمبر بھی جلد ہی آگیا میری جیب میں چند روسی کاغذی روبل تھے۔ تلاشی کے دوران وہ مجھ سے چھین کر ایک چادر پر اوروں کے ساتھ ڈال دیے گئے۔ میری بغل میں ایک کوہاٹی چادر تھی وہ انہوں نے نہیں لی۔ میں حیران تھا کہ یہ کیوں نہیں لی۔ دروازے میں چھوٹی سی جگہ گذرنے کی تھی جب میں نے اس میں سے گذرنے کے لئے سر جھکایا اور باہر نکلنے لگا تو ایک ترکمان نے میری گردن پر ہاتھ مارا اور چادر پیچھے کھینچ لی۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اوروں کے ساتھ دائرہ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ موت آگئی ہے۔

ہمارے اردگرد چاروں طرف ہیبت ناک شکلوں والے ترکمان سیاہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب میں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو لرز اٹھا۔ میرا یقین پختہ ہو گیا کہ یہ انسان نہیں بلکہ جن ہیں۔ ٹیڑھی ترچھی آنکھیں، سروں پر بھیڑ کی کھال کی بنی ہوئی اونچی اونچی ٹوپیاں۔ بھیڑ ہی کے بال ان کے کندھوں پر اور لمبے لمبے کرتج (تلواریں) ان کی زینوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سوار اور انکے سواری کے گھوڑے سب ہی غصے سے دانت پیس رہے ہیں۔ ان کے گھوڑے بے قرار اور بے آرام تھے شاید وہ بھی ہماری موت پر کمربستہ تھے۔

ہمیں پھر غیبی امداد پہنچتی ہے

تھوڑی ہی دیر میں سب مہاجرین دائرے کے اندر کھڑے تھے لیکن اس حال میں کہ ان کے سر ننگے تھے۔ پاؤں برہنہ تھے گردنیں جھکائے ہوئے سب اپنے اپنے غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ترکمان مال و اسباب کی تقسیم کے لئے ابھی سرائے کے اندر ہی تھے۔ اس سے قبل

میں نے پھانسی پانے والے قیدیوں کی آخری حالت دیکھی تھی۔ جب ان کو تختہ دار پر لے جایا جاتا ہے تو وہ بالکل باتیں نہیں کر سکتے جیسے ان کے بدن میں سانس نہیں۔ چل نہیں سکتے۔ جلاد اس کو کھینچ کر تختے کی طرف لے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم میں سے صرف چند ساتھی ہی ایسے تھے جو باتیں بھی نہیں کر رہے تھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے علاوہ باقی سب ایک دوسرے کو حوصلہ دلانے کے لئے کہہ رہے تھے کہ "ہم گھروں سے اس خیال سے نہیں نکلے تھے کہ زندہ سلامت واپس لوٹیں گے۔ ہم تو غزا کے لئے نکلے ہیں اگر شہید ہو جائیں تو ٹھیک۔ اے خدایا تو ہمیں اس امتحان میں سرخرو رکھنا۔"

قصاب خانے کو چالان تیار تھا۔ صرف کلان ترانوں کے حکم کا انتظار تھا۔ موت سر پر کھڑی تھی۔ لڑکے ہمیں پتھر مار رہے تھے۔ گالیاں بھی ان کی ہم سہہ رہے تھے۔ دور دور سے مکّے ہلا رہے تھے۔ سوار ہمیں پیچھے سے چابکوں سے مار رہے تھے۔ موت کے منہ میں تھے۔ اچانک مغرب کی طرف سے گرد اٹھتی دکھائی دی۔ ترکمان اس کی طرف تجسّس سے دیکھنے لگے۔ گرد و غبار جو آہستہ آہستہ ہماری طرف آنے لگا تھا اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہمیں خیال آیا کہ شاید اور بھی آ گئے ہیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگے کہ اوروں کی کیا ضرورت تھی یہ جو ہیں ہمارے مارنے کے لئے یہ بھی کافی ہیں۔

پچاس سوار معہ بندوقوں اور کرچوں کے اور دوسری جانب خانماں برباد مہاجرین، زمانے کے مارے ہوئے بدنصیب وطن سے جلاوطن بے دست و پا ہمارے لئے اس وقت ایک سنگدل ترکمان بھی کافی تھا۔ نئے آنے والوں کا ہم پر کچھ اثر اس لئے نہیں ہوا کہ ہم نے اپنے آپ کو مردہ جان لیا تھا اور مردے کے لئے ایک اور ہزار ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔

گرد و غبار لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ ترکمانوں نے اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ اِدھر اُدھر بالکل نہیں دیکھ رہے تھے اتنے میں اس گرد سے ایک سفید ریش شخص برآمد ہوا۔ اس شخص نے ریشمی عبا پہنی ہوئی تھی اور تندرست و توانا شخص تھا۔ ہمارے دل میں آیا شاید انتظار اسی معزز آدمی کا ہی تھا لیکن ہماری حیرانگی کی کوئی حد نہیں رہی جب اس بوڑھے نے گھوڑے سے

اترتے ہی ہاتھ میں پکڑے ہوئے چابک سے ان کو مارنا شروع کیا۔ وہ گھوڑوں سے اترے عزت سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ لیکن جب چابک کی مار شروع ہوئی تو انہوں نے پلک جھپکتے میں میدان خالی کر دیا۔ بوڑھا ہماری طرف متوجہ ہوا لیکن ہماری تو جان پہلے سے ہی نکل چکی تھی۔ مرغی کے بچوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بوڑھا فارسی میں ہمیں تسلی دے رہا تھا لیکن ہماری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ہمارے بدن میں باتوں کے لئے کچھ طاقت پیدا ہوئی۔ ہم نے اس معمر بزرگ کو اپنی شکائتیں سنا دیں۔ اس کو بہت افسوس ہوا اور کہنے لگا " ساری دنیا میں ہمارے تو صرف انگریز ہی ہمدرد اور دوست ہیں۔ ان جاہلوں کو اتنی خبر نہیں اور انہوں نے آپ کو تکلیف پہنچائی "۔

ہم دل ہی دل میں اس کی اس غلط فہمی پر خوش ہوئے۔ اور اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اتنا ہمارا خیال کیا اور ہمیں موت کے منہ سے بچایا۔ جب ہم نے اسے اپنے لٹنے کی داستان سنائی تو اسے اور بھی افسوس ہوا۔ اس نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہمیں ضرور بخارا جا کر امیر بخارا جناب عالی کی خدمت میں حاضری دینی چاہیئے وہ آپ کو اس کا عوض اور خلعت دے دیں گے۔

ہم بخارا کی طرف چلتے ہیں لیکن
جلد ہی پھر قید ہو جاتے ہیں،

تھوڑی ہی دیر میں چند سوار اور پیادے آہستہ آہستہ اس معزز آدمی کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے ان کو حکم دیا کہ مہمانوں کو بخارا پہنچایا جائے۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے پھر یاد دہانی کی کہ بخارا میں جناب عالی آپ کی عزت و مدارت کرینگے۔

سفر پھر شروع ہوا۔ پہلے تو ہمیں مدد دینے والوں کا ہمارے ساتھ سلوک خاصا اچھا رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ پھر کچھ وہی پرانے اور کچھ نئے ترکمان پہنچے اور ہمارا مارنا پیٹنا پھر سے شروع ہو گیا۔ اب تو سختی اس حد کو پہنچی کہ ہمیں پانی بھی نہیں پینے کو دیا جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے پانی کی چھوٹی نہریں بہہ رہی تھیں لیکن جہاں جب ان کی طرف جھکتے تو ترکمان دیوانوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑتے۔ سوداگر کے نوکروں

کے آگے مویشیوں کی حالت بھی اس سے بہتر ہوگی جو اس وقت مہاجرین کی تھی۔ ہم خوب جانتے تھے کہ لاٹھی ہمارا پیچھا کر رہی ہے لیکن پھر بھی آنکھیں بند کر کے پانی کی طرف لپکتے لیکن پانی تک پہنچنے سے پہلے ہی ہماری وہ درگت بنائی جاتی کہ پیاس کو اس پانی پر ترجیح دے دیتے۔ اور پھر روانہ ہو جاتے۔ گرد اتنی اٹھ رہی تھی کہ ایک دوسرے کو شناخت کرنا مشکل تھا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مار پیٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ آگے آگے ترکمان گھڑسوار تھے جنہوں نے گھوڑوں کو بھاگنے کے لیئے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ اور ہمارے پیچھے پیادہ اور گدھوں پر سوار ترکمان آ رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ یہ کیا معمہ ہے۔ پھانسی کا حکم شیخ کا پہنچنا (بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں موت سے بچانے والا اس قبیلے کا سردار تھا اور شیخ کہلاتا تھا) ہمیں بچانا اور بخارا بھیجنا اور راستے میں اس ناگفتہ بہ سلوک کا اعادہ ہونا۔ آخر اس ڈرامے کا کیا مقصد ؟ ہماری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ ہماری یہ مصیبت اس حد کو پہنچ گئی کہ ایک پشاوری جیلانی نام کا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ پیاس کے مارے بے ہوش ہوا تھا۔ اس کے بھائی نے جب اس کو گرتے دیکھا تو بھاگ کر گیا اور اسے اٹھانے کے لئے نیچے جھکا۔ مہاجرین ہرنوں کے غول کے طرح رکے اور پیچھے دیکھنا شروع کیا۔ ہم جیلانی کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ترکمانوں نے بندوقوں کے بٹوں سے مارنا شروع کیا اور ہم نے ان کے گرد جمگھٹا لگا لیا۔ مارنے کی ہر آواز کے ساتھ وہ نعرہ لگاتے کہ "حائیکو! یا اللہ"۔ لیکن ہم اپنے ساتھی کو نہ تو چھوڑ سکتے تھے اور نہ ساتھ لے جا سکتے تھے۔ ترکمانوں کی مار پیٹ بھی ہمیں وہاں سے ہلانے پر مجبور نہ کر سکی۔ ایک دم ترکمانوں کی حالت بدل گئی۔ شاید ان کے دلوں میں بھی رحم آ گیا۔ ہم ان کی ہیبت ناک شکلوں کو دیکھ رہے تھے کہ پتہ لگا کہ وہ بھی نرم دل رکھتے ہیں۔ وہ افسردہ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اجازت دے دی اور ہم نے جیلانی کے منہ میں پانی ٹپکایا۔ ہاتھ پاؤں کے تلے مسلے۔ آہستہ آہستہ اس کو ہوش آ گیا۔ ہم سب ساتھیوں نے پیٹ بھر کر پانی پیا۔ ایک دوسرے کو دیکھا۔ چہرے گرد و غبار میں چھپے ہوئے تھے صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ پانی پینے کی وجہ سے ایک دوسرے کے اب سفید دانت بھی نظر آنے لگے۔ ترکمانوں نے جیلانی کی سواری کے لئے ایک گدھا دیا۔ جیلانی کا چہرہ بالکل زرد پڑ چکا تھا۔ دونوں طرف ساتھیوں نے اس کو

سہارا دیا ہوا تھا اور قافلہ اب آہستہ آہستہ انسانوں کے طرز پر روانہ ہوا۔ ترکمان ہمارے آگے اور پیچھے اسی طرح خاموش اور افسردہ چل رہے تھے۔ یا تو وہ ظلم دیکھتے ہوئے اور کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کرتے تھے اور یا اب ان کو جیلانی کی مظلومیت نے ایسا خاموش کیا کہ منہ سے اُف تک نہیں کرتے تھے۔

عشا کے وقت ایک پڑاؤ پر پہنچے۔ کافی اندھیرا تھا۔ ہم بھوک سے نڈھال سرائے میں داخل ہوئے۔ سرائے کے درمیان ایک اونچا لیکن کافی چوڑا چبوترا بنا ہوا تھا اس پر بیٹھنے کو کہا گیا۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا روٹی کا کھانے کو دیا گیا اور ساتھ ہی حکم سنوا دیا گیا کہ "اگر کوئی بھی چبوترے سے اترا تو بغیر پوچھے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا"۔

صبح روانہ ہونے سے پہلے ہم نے سرائے نظام بیگ میں صرف کڑوی وہ بھی بغیر دودھ والی چائے پی تھی۔ اس کے بعد تمام دن نہ ہمیں روٹی ملی اور نہ روٹی کے متعلق سوچنے کا موقعہ ملا تھا۔

اگلی صبح پھر چل پڑے۔ ایک دفعہ پھر گزشتہ روز والا حال دہرایا گیا۔ دوپہر ہونے سے پہلے ایک قہوہ خانہ میں پہنچے۔ کڑوی چائے بغیر دودھ والی اور ایک ایک ٹکڑا روٹی کا کھانے کو دیا گیا اتنی کم روٹی دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اتنی آدمیوں کو کھانا کھلانا ایسی غیر منظم قوم کے لئے کچھ آسان کام نہیں تھا۔ قہوہ خانہ کے باہر اور اندر کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی پتہ چلا کہ قریب ہی تھوڑا آگے جنگ چھڑی ہوئی ہے اس کو سنتے ہی ہم میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ دلوں میں اُمید ہوئی کہ ان ظالموں کے پنجوں سے رہائی تب ہی ممکن ہے جب دشمن ان کی خوب پٹائی کرے اس جگہ ہم نے کافی دیر آرام کیا اور پھر آگے چل پڑے۔ آگے راستے میں جگہ جگہ لڑائی کی خبروں کی تصدیق ہوتی گئی جو ہماری خوشی کا باعث بنتی گئی۔

ہم پر پھر موت کی سختی آئی

عصر کو ایسی جگہ پہنچے جہاں سے ترکمانوں کا ایک کیمپ دور سے نظر آ رہا تھا۔ ہمیں ایک قطار میں

کھڑا کر کے حکم سنا دیا گیا کہ دو جگہوں میں تقسیم ہو جاؤ۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کبھی کوئی ایک گروپ میں جا کر کھڑا ہو جاتا اور کبھی دوسرے میں۔ جب اپنے کسی دوست کو کوئی شخص ایک ٹولی میں دیکھتا تو اس کی طرف دوڑ پڑتا۔ چند منٹ تو ہم اسی میں مصروف رہے۔ مصیبت میں دوسروں سے جدائی اور بھی کٹھن ہو جاتی ہے۔ لیکن زیادہ دیر تک ترکمانوں نے ہمیں اس میں نہیں رہنے دیا۔ جب وہ سمجھ گئے کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہونے کے لیئے تیار نہیں تو ان میں سے ایک جسیم دیو ہیکل اور بے رحم ترکمان جس کی آنکھیں جنوں کی طرح ٹیڑھی تھیں اور اس ہیبت ناک شکل کے ساتھ ساتھ بھیڑ کی کھال کی بنی ہوئی لمبی ٹوپی سر پر رکھے آگے بڑھا اور مہاجرین کو اس طرح جدا کرنا شروع کیا کہ کبھی ایک کو کندھے سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیتا اور کبھی دوسرے کو بازو سے پکڑ دوسری طرف دھکیل دیتا۔ اسی طرح دو ٹولیوں میں ہمیں تقسیم کر کے ایک ٹولی کو ایک طرف لے جایا گیا اور دوسری کو دوسری طرف لے جایا گیا۔ ایسے ایسے عزیز دوست جدا ہو گئے جو ہندوستان سے ساتھ چلے آ رہے تھے اور ابھی تک جدا نہیں ہوئے تھے۔

ہماری ٹولی کو ایک کھائی کی طرف لے جایا گیا۔ وہاں سب کو کھڑا کر دیا گیا۔ ہم میں سے دو دو تین تین کو جدا کر کے ایک ریت کے ٹیلے کے پیچھے لے جاتے۔ ان کے وہاں پہنچتے ہی فائروں کی آواز سنائی دینے لگتی۔ یہ فائر سن کر ہم کانپ اٹھتے۔ ایک دوسرے کیطرف دیکھکر دل میں کہتے کہ ہمارا خون ناحق بہایا جا رہا ہے۔

ترکمانوں کے کیمپ میں تین راتیں پاؤں سے بندھے ہوئے۔

اتنے میں میری باری بھی آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہمراہ دہلی کے مولوی فخر عالم اور پشاور کے ولایت شاہ کندھے سے کندھا لگائے چل رہے ہیں۔ ہمارے لیئے مشکل ہو گیا تھا۔ جب فائر والی جگہ پہنچے تو وہاں فائر کے سُنتے ہی لرز اٹھتے اور گرنے کے لیئے تیار ہو جاتے۔ لیکن جب پتہ چلتا کہ یہ فائر ہم پر نہیں ہوا تو پھر چل پڑتے۔ ہم ایک کیمپ کے اندر پہنچائے گئے۔ وہاں ایک جھگی کے سامنے آٹھ دس مسلح ترکمان کارتوسوں کی پیٹیاں سینوں پر سجائے بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک نے اُٹھ کر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم آرام سے ریت پر بیٹھ گئے۔ میں نے آہستہ آہستہ چاروں طرف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ حالات کچھ ساز گار معلوم ہو رہے تھے۔ ایک ترکمان نے اٹھ کر چائے دی اور ساتھ ہی کھانے کو روٹی

کا ایک ٹکڑا بھی دیا۔ ہم میں پھر جیسے زندگی آنے لگی۔ عصر کی نماز تیار تھی۔ ہم بھی جا کر صف میں کھڑے ہو گئے۔ نماز پڑھی۔ تو دل کو کچھ قرار آیا۔ نہ ہی تو کسی نے ہم پر اور نہ ہماری نماز پر اعتراض کیا۔ اس کے بعد جھگی کی طرف نظر دوڑائی۔ سرکنڈوں سے بنی ہوئی مضبوط جھگی تھی۔ اسی طرح جب شام ہو گئی تو چھوٹی سی روغنی روٹیاں جو وہ گھروں سے اپنے ہمراہ لائے تھے ایک ایک سب کو دے دی۔

ترکمان یہاں جہاد کے لئے پڑے ہوئے تھے۔ ہماری شمال مشرق کی طرف کرکی چھاؤنی انہوں نے محاصرہ کی ہوئی تھی۔ اس کیمپ میں کھانے پکانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھ گھروں سے چھوٹی چھوٹی روغنی روٹیاں لائے تھے۔ جب وہ کھا لیں تو پھر انہوں نے ہمیں جھگی کے اندر کر لیا۔ ہمارے ایک ایک پاؤں کو انہوں نے جھگی کے درمیان میں گاڑے ہوئے لکڑی کے کھبے کے ساتھ باندھ دیا۔ ایک پاؤں بندھا ہوا اور دوسرا زمین پر کھڑا اس حالت میں نیند آنی ناممکن تھی۔ ظالم نے اتنا سخت باندھ رکھا تھا کہ ولایت شاہ نے تو درد کے مارے سسکیاں بھرنی شروع کر دیں۔ رات گئے ایک بوڑھے ترکمان نے آکر تینوں کے پاؤں کی رسی ذرا ڈھیلی کی تب ہی جا کر سونا ممکن ہوا۔

ہر قوم میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ بوڑھے ترکمان نے ہماری رسیاں اتنی ڈھیلی کر دیں کہ آرام کرنا ممکن ہوا۔ رات ہم نے آرام سے گذاری۔ جب تک ہم اس کیمپ میں رہے اور کوئی دوسرا نہ ہوتا تو بوڑھا ترکمان ہم پر بہت مہربان ہو جاتا لیکن کسی کے سامنے وہ ہمارے نزدیک بھی نہیں آتا تھا شاید کہ دوستوں سے ڈر لگتا ہو۔

صبح جا کر پتہ چلا کہ میدان جنگ قریب ہی ہے اور ہم ان ترکمانوں کے ہاتھوں قید ہیں۔ جنہوں نے کرکی چھاؤنی کو محصور کر رکھا ہے۔ پہلے تو ان کی پیشانیاں سلوٹوں سے بھری ہوئی تھیں لیکن بہت جلد ان کا غصہ ہمارے ساتھ پیار میں بدل گیا۔ آہستہ آہستہ ہم ان کے ساتھ ہل گئے۔ جب ہم نماز پڑھنے لگتے تو بعد میں وہ کچھ نہ کچھ گپ شپ ہمارے متعلق ضرور لگاتے تھے۔ انہیں یقین ہی نہیں تھا کہ ہم مسلمان ہیں بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ نماز ہم ان کے ڈر سے پڑھ رہے ہیں۔ لیکن ہم نے ان کی ہنسی مذاق کی پرواہ نہیں کی اور اپنی نماز باقاعدگی سے پڑھتے رہے۔ آہستہ آہستہ وہ ہمارے ساتھ عادی ہو گئے۔

ایک دن نماز میں جب ہم صف باندھے کھڑے تھے ایک ترکمان نے دوسرے ترکمان کے بغل میں ہاتھ مار کر ایک طرف کو اشارہ کر دیا۔ وہ شخص سلام پھیرے بغیر اس طرف گیا۔ کیونکہ اس کا گھوڑا رسی تڑوا چکا تھا اسے باندھ کر پھر آکر ہمارے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا۔ اور جب نماز پڑھی جا چکی تو اس نے بھی ہمارے ساتھ ہی سلام پھیرا۔ اسی طرح ہر وقت کچھ نہ کچھ عجیب بات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے ہم تینوں دل ہی دل میں ہنستے رہتے۔

ترکمان امام شافعی صاحب کے مذہب کے پیروکار ہیں۔ ہم سے اکثر پوچھا کرتے تھے کہ تمہارا کونسا مذہب ہے ہم جواب میں کہتے کہ ہم امام اعظم صاحب کے پیروکار ہیں تو وہ کہتے " شافعی مذہب یعشی باد،، (یعنی شافعی مذہب اچھا ہے)

ترکمان اچھے شہسوار ہوتے ہیں۔ کیمپ میں ان کے ساتھ بہت سے گھوڑے تھے۔ اگرچہ میدان جنگ میں گھوڑوں کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی مورچوں پر جاتے وقت گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے۔ گھوڑا ترکمان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہماری جھگی سے روزانہ ایک سوار مورچے پر جاتا اور شام کو واپس لوٹتا۔ جب بھی وہ واپس آتا تو پہلے گھوڑے کی خدمت کرتا اپنی فکر بعد میں کر لیتا۔

بالشویکی فوج کرکی میں محصور تھی۔ ترکمان ارد گرد پڑے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ علاقہ ریتلا اور میدانی ہے۔ اسی لئے گھوڑے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پیدل چلنا ریت میں مشکل ہے پھر بھی دریائے آمو کا کنارہ تھا اس لئے سرسبز و شاداب تھا۔ ریت بھی اسی لئے بہت نمایاں نہیں تھی۔ گھوڑے کے لئے نہایت موزوں جگہ ہے۔

ترکمان انسانی ترقی کے قبائلی زندگی کے مدار پر تھے۔ وہ قبائلی پشتونوں کی طرح بہادر اور نڈر ہیں لیکن قبائل پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ اس لئے ان کو جنگ کے مواقع زیادہ ملتے ہیں۔ پشتون قبائل سمجھدار بھی زیادہ ہیں۔ میرے خیال میں بندوق کی لڑائی میں ترکمان ہمارے قبائل تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اگر باقاعدہ تربیت دونوں کو دی جائے تو پھر یقیناً دونوں ایک دوسرے سے بہادری میں کم نہیں۔ ترکمان دلیر تو ہیں لیکن بہت غیر منظم ہیں۔

دوسری رات پھر ہمیں اسی طرح سخت باندھا گیا۔ ولایت شاہ نے پھر فریاد شروع کر دی۔ آدھی رات کو وہ نرم دل بوڑھا آ گیا اور ہماری رسیاں ڈھیلی کر دیں۔ یہ بوڑھا ہماری روٹی اور پانی کا خیال رکھتا تھا۔ اور لوگ ہمارے پاس بھی نہیں آتے تھے۔ ہر قوم میں اچھے افراد ہوتے ہیں اگر ترکمان ہمارے ساتھ ظلم کرتے رہے تو اس بوڑھے کی رحم دلی سے ثابت ہو گیا کہ ان میں اچھے انسان بھی ہیں۔

کلان ترکی زمین پر زمینداری کرتے ہیں

تیسری رات بھی اسی طرح پاؤں بندھے ہوئے جھگی میں گزاری۔ جب صبح ہوئی تو ہمارے کیمپ کا کلان تر اور امام دونوں ہمارے پاس آئے۔ کلان تر کو فارسی نہیں آتی تھی اس لئے چپکے کھڑا رہا اور امام نے جو کہ "اخوند" کہلاتا تھا ہمارے ساتھ گفتگو کی۔ ہماری طرف بھی عام طور پر ملاؤں کو اخون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عام طور سے ہم اس شاعر یا ملا کو جو تھوڑا بہت پڑھا ہو اخوند کہتے ہیں اسی طرح ترکمان بھی ہماری طرح امام کو اخون ہی بولتے تھے۔ اخون فارسی بھی بہت کم جانتا تھا اس نے ہمیں کہا "برادر کاغان چوک" یعنی "بھائی سردے بہت زیادہ ہیں"۔ کلان تر کی طرف ہاتھ لے جا کر پھر اس کے گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ ہمیں اس نے اشاروں ہی اشاروں میں سمجھا دیا کہ تم لوگوں کو اس کی زمین پر کام کرنا پڑے گا۔ اور وہاں بہت سردے کھاؤ گے۔ اس کو صرف اتنی فارسی آتی تھی کہ ہمیں کہا "شما" اور پھر ساری اور بات ہاتھ کے اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ہاتھ کو وہ کھرپے کے انداز میں چلانے لگا کہ کام کرو گے۔ اور پھر کہنے لگا کہ "کاغون" یعنی سردا اور "نان" (روٹی) "چوک"۔ ہم بھی ترکی زبان میں اخون جتنے ماہر تھے۔ "چوک" کا مطلب ہم سیکھ گئے تھے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے تعاون سے بات سمجھنے لگے۔ لیکن اس تبادلہ خیالات نے ہم پر سب سے برا اثر چھوڑا۔ پہلے والے مظالم سے بھی یہ امتحان کڑا معلوم ہوا۔ ہم ڈر گئے کہ ایسے حالات میں ترکمانوں سے ہماری خلاصی کس طرح ہو گی۔ دور دراز کے دیہاتوں میں قدیم زمانے کے غلاموں کی سی زندگی بسر کرنا ہو گی۔ میرا دل اخون کی یہ بات سن کر بہت افسردہ ہوا۔ سارے راستے جس سے ہمیں لے جایا جا رہا تھا۔ میں پکی نشانیاں ڈھونڈ رہا تھا۔ ذہن میں فرار کے لئے افغانستان کو پسند کیا۔ اتنا تو سمجھتے تھے کہ ہم افغانستان اور

۔سرحد پر کہیں جا رہے تھے۔

عبدالرحمان کا قتل (شہید) ہونا

تین آدمی ہمارے ساتھ حفاظت اور چوکیداری کی غرض سے ساتھ کئے گئے۔ ایک کوئی اہم آدمی تھا کیونکہ گھوڑے پر سوار تھا۔ دوسرا اخون تھا جو گدھے پر سوار تھا اور تیسرا کوئی نوکر لگ رہا تھا کیونکہ وہ پیدل ہی چل رہا تھا۔ سارا سارا دن آرام سے سفر کرتے رہے۔ اخون ایک ہر دلعزیز آدمی تھا۔ سردے اور روٹی وافر مقدار میں تھی۔ عصر کو ایک سرائے پہنچے۔ اندر داخل ہوتے ہی ہم نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن جلال پور جٹاں کا رہنے والا اور دوسرا امرتسر کا رہنے والا ایک مہاجر چارپائی میں بندھے پڑے تھے۔ ہم بے بس تھے لیکن ان کو تسلی دی اور ان کا حتی الوسع حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ میں نے ان سے کہا" وطن کو آزاد کرانا ہمارا ایک مقدس فرض ہے اس کے لئے جتنی قربانیاں ہم دیں وہ کم ہیں۔ دوستو! اپنے قدم مستحکم رکھو۔ یہ تکالیف یقیناً بارآور ثابت ہوں گی۔ خدا تعالےٰ یقیناً ہماری مدد کریگا"

عبدالرحمان جو ایک بہادر پنجابی تھا جواب میں فوراً بول اٹھا " میری جان وطن پر قربان " تھوڑی دیر تک ہم ان کے ساتھ بیٹھے۔ اخون پہ ہمیں اعتماد تھا۔ وہ ہمارا پیش امام تھا اور سارا دن اس نے ہمارے ساتھ کافی بہتر سلوک کیا تھا بالکل بھائیوں جیسے پیش آ رہا تھا لیکن یہ کیا؟ جلد ہی ہم تینوں نے بھی عبدالرحمان کی چارپائی کے ساتھ ہی دوسری جگہ اپنے پاؤں بھی بندھے ہوئے پائے۔ دھوپ چڑھنے تک یونہی پڑے رہے۔ چارپائی کیا تھی۔ ایک بڑی بھاری لکڑی کا بلاک تھا جس میں ایک پاؤں پھنسانے کے لئے ایک سوراخ کیا گیا تھا۔ اس میں پاؤں پھنسا کر پھر تالا لگا دیا جاتا تھا۔ ساری رات اسی طرح پھنسے ہوئے پاؤں کو ہلا جلا نہیں سکتے تھے ایسی حالت میں تمام رات سو یا نہ جا سکا۔

صبح سویرے عبدالرحمان اور اس کے ساتھی سے رخصت لے کر ہم آگے چل پڑے۔ اگرچہ اس کی امید تو نہیں تھی کہ ان دونوں جوانوں سے پھر جلدی ملاقات ہو سکے گی لیکن یہ بھی گمان میں نہیں تھا کہ بے رحم ترکمانوں کے ہاتھوں وطن سے دور یہ دونوں جوان بلا سبب شہید کر دیے جائیں گے اور پھر ہمیں ان کے خوبصورت چہروں کا دیدار کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ چند دنوں بعد جب ان ظالموں کے چنگل سے ہمیں نجات ملی اور کر کی

چھاؤنی پہنچے تو وہاں پتہ لگا کہ عبدالرحمان اور اس کے ساتھی کی لاشیں اس سرائے کے قرب وجوار میں پائی گئیں

اخون اپنے اصلی رنگ میں آتا ہے

صبح سویرے پھر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج اخون اپنے اصلی رنگ پر اتر آیا۔ جب تقریباً ایک گھنٹہ مسافت طے کی تو ہمیں روک کر ہم سے نقدی کا مطالبہ کیا۔ ہم نے جواب میں کہا کہ سرائے نظام بیگ میں ہم سے ہر چیز چھین لی گئی ہے کوئی چیز ہمارے پاس نہیں رہنے دی گئی۔ اب ہم کیا چیز تمہیں دیں۔ اخون آگ بگولہ ہو گیا بے محابہ گالیاں دینے لگا۔ اسکے بعد کہا کہ میں نے تمہاری تلاشی لینی ہے۔ ہم بولے کہ بہت اچھا اخون صاحب آپ ہماری تلاشی لے سکتے ہیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس وقت اخون مجھے ایک خطرناک ڈاکو نظر آ رہا تھا۔ اس کے دو ساتھی اسکے پیچھے کھڑے تھے شاید وہ اس سے اس بات پر متفق نہ تھے پھر بھی ان کی موجودگی ہمارے لئے دل شکنی کی اور اخون کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث تھی۔ اخون کی کمر بند کے ساتھ اس کی تلوار لٹک رہی تھی۔ اخون نے میری اور فخر عالم کی تلاشی لی اور پھر ولایت شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ولایت شاہ نے سخت احتجاج شروع کیا۔ وہ اخون کو تلاشی دینے پر بالکل آمادہ نہیں تھا۔ میں نے اسے ایسے لہجے میں ڈانٹا جس طرح ایک بزرگ اپنے سے چھوٹوں کو ڈانٹتا ہے۔ "بیوقوف تلاشی کیوں نہیں دیتے۔ تمہارے پاس آخر کیا ہے جو تم تلاشی نہیں دے رہے ہو۔"

مجھے یقین تھا کہ ترکمانوں نے کسی کے ساتھ کوئی چیز نہیں چھوڑی ہوگی لیکن ولایت شاہ بالکل راضی نہیں ہو رہا تھا۔ اخون کو جو غصہ آیا تو اپنی داڑھی فوراً منہ میں پکڑ لی اور بغل سے تلوار نکال کر ہوا میں لہرانے لگا۔ اور ولایت شاہ پر حملہ آور ہوا۔ میں ڈرا کہ ولایت شاہ کی گردن دھڑ سے جدا ہو گئی ہوگی لیکن اخون میں شاید کچھ شرافت تھی اس لئے تلوار کا الٹا ہاتھ چلایا۔ اس کے بعد اخون نے اس کی تلاشی لے لی۔ ولایت شاہ اب اعتراض کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اخون نے اس کی تلاشی لی لیکن اس کے نظام آباد والے بھائیوں نے اس کے لئے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ سوا سے کیا ملتا۔

سفر پھر سے جاری ہو گیا۔ اب اخون اور اس کے ہمراہیوں نے ہمارے ساتھ ترکمانوں والا سلوک شروع

گیا لیکن اس کی شرارت ہی تھی کہ ہمیں ہمیشہ آگے ہانکتی چلاتا تھا۔ ہم آگے آگے اور سوار ہمارے پیچھے۔ اگر سوار ہم تک پہنچ جاتے تو پھر ہر ایک سے ہمارے بدن کی خبر لی جاتی۔ یہ ہماری بڑی قسمت تھی کہ ہر ایک کسی جگہ بندھتا ہے

پھر جنگ کی خبر آتی ہے اور ہم میں زندگی کی نئی رمق آتی ہے

خوب اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہم اونٹوں کے غول سے بھاگتے جا رہے تھے۔ نہ ہمارا کوئی جگری دوست تھا نہ کوئی سننے والا تھا۔ اگر شور کرتے تو اور بھی زیادہ سختی کرتا۔ خلاصی کی کوئی امید نہیں تھی۔ ہر پتھر پھینکنے میں ہر ایک سے نجات کا راستہ سوجھتا تھا۔ پیاس اور بھوک کے مارے بدنوں میں جان نہ تھی۔ ہر ایک کی زبانیں منہ سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ لیکن پھر بھی اتنے تیز جا رہے تھے کہ اونٹ کا گھوڑا ہم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اتنے میں سامنے سے ایک سوار تلوار ہاتھ میں لئے گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے ہماری طرف آیا۔ اونٹ کا گھوڑا سوار سے تھی۔ اس کو دیکھتے ہی جوار کے کھیتوں میں چھپ گیا۔ پیادہ کس طرف کھسکا۔ یہ ہم نے نہیں دیکھا۔ اونٹ گھوڑے پر سوار ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ سوار نے آتے ہی اس پر اپنی آنکھیں نکالیں۔ اونٹ ایک فقیر کی طرح گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی زبان تو جیسے گنگ ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنی کوشش کی کہ پتہ چل سکے کہ یہ نوواردہ کس بات پر اتنا بگڑ رہا ہے اور اونٹ کو کیا سنا رہا ہے لیکن اونٹ جواب میں جیسے ہی گردن گھما کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا سوار اس پر چھڑی گرم ہو جاتا۔ ہمیں وہاں چھوڑ کر سوار اور اونٹ دونوں ایک چھوٹے سے مکان میں گھسے۔ ادھر بھی یہی حال رہا۔ ہم شکر کر رہے تھے کہ کوئی شیر کی طرح بھاگتا آتا تھا اور اس کی برکت سے ہم نے تھوڑا بہت سستا لیا۔ جب سوار کی آواز زیادہ زور سے آنے لگی تو ہم گھبرا کر اٹھنا چاہتے تھے لیکن ترکی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ہمارے بیٹھے ہی سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کا ایک قافلہ پہنچا۔ قافلے میں بڑھے، بچے، عورتیں اور بچے سب پیدل چلنے والوں کے تھے جو بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ ہم نے اتنا اندازہ تو لگا لیا کہ آگے جنگ ہے لیکن ان کے بھاگنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ہم ابھی سوچوں میں پڑے ہوئے تھے

کہ سوار باہر نکل کر اپنی راہ چل دیا۔ اخون بھی اٹھ کر اپنی راہ پر ہو لیا۔ ہم وہیں رہ گئے۔ اخون ہماری طرف بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہم حیران تھے کیا ماجرا ہے؟ سمجھ میں آ رہا تھا کہ واپس ہو جائیں یا اخون کے پیچھے چل پڑیں۔ واپسی کا تو ڈر کے مارے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اخون کے ڈر سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ تھوڑی دور آگے بقیہ دو ساتھی بھی اس کے ہمراہ ہو گئے۔ لیکن مڑ کر ہماری طرف بالکل نہیں دیکھ رہے تھے۔ اور ہم دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے کہ چلو اچھا ہوا ہمیں جیسے بھول گئے لیکن تھوڑی دیر بھی نہیں گذری تھی کہ اخون پہلے والا اخون پھر بن گیا اور ہمیں دوڑانا شروع کیا۔ ساتھ ہی گالیاں اور مارنا بھی شروع کر دیا۔

اخون ہمیں چھوڑتا ہے لیکن ہم اسے نہیں چھوڑتے

گھڑی بہ گھڑی سامان سے لدے ہوئے اونٹ اور گھوڑے راستے میں ملتے گئے۔ ان پر لحاف اور گھر کا اور سامان بندھا ہوا ہوتا۔ خوب سمجھ گئے کہ دلی آرزو پوری ہو رہی ہے۔ آگے ترکمانوں اور بالشویکوں کے درمیان لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ اور اسی میں ہماری رہائی تھی۔

جب ہمیں ترکمانوں کے پنجے سے نجات ملی تو ہمیں پتہ چلا کہ ہماری گرفتاری پر چارجوئی کی چھاؤنی سے ایک مہماتی فوج ہماری رہائی کے لئے بھیجی گئی اور اسی فوج نے منتشر مہاجرین کو اکٹھے کرنے میں کافی کام کیا اور کافی مہاجرین کو انہوں نے ترکمانوں کے ظالم پنجے سے رہائی دلوائی۔

ہم میدان جنگ کے قریب ایک گاؤں میں پہنچے۔ لوگ مکانوں کی چھتوں پر چڑھے ہوئے مجاہدین (ترکمان) کی حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ اخون نے وہاں لوگوں سے معلومات حاصل کرنی شروع کر دیں۔ ہم ان کی زبان تو نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن جس بات پر اخون سر ہلا ہلا کر خفگی کا اظہار کرتا وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث بن جاتی۔ تھوڑی دیر بعد اخون نے ہماری طرف رخ کیا اور ہمیں ایک مسجد میں لے گیا۔ جہاں اس نے پر اعتماد لہجے میں ٹوٹی پھوٹی فارسی میں کہا کہ

"برادر۔ کافر چوک۔ خانہ کافر۔ بذبچہ نمے دانی"

اس نے ٹوٹی پھوٹی فارسی جو غلط انداز میں تھی اور ہاتھ کے اشارہ سے سمجھانے کی کوشش کی کہ اے برادرو! کافروں کا غلبہ ہے۔ ہمارے مکانوں پر کافروں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ مجھے اپنے بال بچے کے حال احوال کے متعلق کچھ علم نہیں اور یہ کہہ کہ ایک لمبی سرد آہ بھری۔

شام قریب تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اخون مصیبت میں گرفتار تھا۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ رات کی تاریکی میں دشمن کے مورچوں کو یاد کرے گا۔ اخون کی افسردہ باتوں نے ہمیں بھی افسردہ کر دیا۔ اب تک تو ہم اس سے رہائی پانے کی سعی میں تھے لیکن اب اس سے کہا:

"اخون تم تو جا رہے ہو تو ہمیں کس کے سہارے چھوڑے جا رہے ہو؟"

اس نے کندھے ہلاتے ہوئے لیکن بڑے محبت بھرے انداز میں جواب دیا "بھائیو! میں کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔"

چاروں طرف ترکمانوں کی ہیبت ناک شکلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ممکن ہے وہ ہمیں کچھ نہ کہتے لیکن بیتے دنوں میں ان کا ہمارے ساتھ سلوک ہمیں اچھی طرح یاد تھا۔ ان کے ہاتھوں ہمیں اتنی اذیت پہنچ چکی تھی کہ ان کی شکلیں ہی ہماری جان نکالنے کے لئے کافی تھیں۔ ہم اخون کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے اور اس کو مشورہ دیتے رہے کہ دشمن کی صفوں سے رات کو گذرنا ٹھیک نہیں۔ شاید ہماری باتوں کا اس پر کچھ اثر ہوا۔ اس نے ہمیں کہا کہ تم اسی مسجد میں رات گذارو میرا ساتھ والے گاؤں کا ایک شیخ (رئیس) دوست ہے میں اس سے مشورہ کرنے جا رہا ہوں۔ اخون آگے آگے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ اگرچہ اخون نے ہمیں ہر چند منع کیا لیکن ہم مسجد میں نہیں ٹھہرے۔ رات گئے شیخ کے گھر پہنچے۔ وہ ایک قلعہ نما گھر میں رہتا تھا۔ دروازے کے باہر ایک مسجد میں ہمیں ٹھہرایا گیا اور اخون اندر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں شیخ نمودار ہوا۔ ہمارا جگری دوست اخون اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے ہمارا تعارف ان الفاظ میں کرایا:

"یہ تینوں جدیدی[۳۹] ہیں۔"

شیخ ایک عالم شخص تھا اور فارسی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے کہا

"اچھا! تم جدیدی ہو۔"

ہم نے عرض کی کہ "ہم مسلمان ہیں۔"

لیکن ہمارے اس اعلان پر شیخ نے کان نہیں دھرا۔ اندر گیا اور ہمیں بچی ہوئی روٹی کے چند ٹکڑے بھیجے۔ ہم نے وہ کھا کر بھرے پیٹ نیند کی۔

صبح سویرے شیخ کی اذان پر اٹھے۔ سنت پڑھنے کے بعد شیخ نے محراب میں کھڑے ہو کر اتنے زور سے نماز پڑھانی شروع کی جیسے اس کے پیچھے خاصے لوگ نماز پڑھ رہے ہوں حالانکہ صرف تین آدمی اور وہ بھی ایک دوسرے سے کافی دور دور کھڑے ہو کر اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم تینوں نے بھی ایک صف میں کھڑے ہو کر شیخ کے پیچھے نماز پڑھی۔

اخون سے فرار لیکن مجبور ہو کر پھر اس کے پاس آنا

نماز کے بعد شیخ اور اخون پھر گھر کے اندر چلے گئے۔ مسجد خالی ہوئی۔ رات کو اخون کے تعارفی الفاظ نے ثابت کر دیا کہ اخون کا دل ہمارے لئے کبھی صاف نہیں ہوگا۔ وہ ہمیں جدیدی سمجھتا ہے اور جدیدی ترکمانوں کی نظروں میں کافر تھے۔ ہم تینوں اس پر متفق ہوئے کہ ہمیں بھاگنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا ایسا نہ ہو کہ پھر اخون کے ہتھے چڑھ جائیں۔

مسجد سے نکل کر دریائے آمو کا رُخ کیا۔ ہم متواتر دوڑتے رہے۔ آخر تھک کر ایک جگہ ٹھہر گئے ہمارے اردگرد سرسبز باغات تھے۔ ہمارے لئے مغرب مشرق کی تمیز نہیں رہی تھی۔ راستہ نہ سمجھ سکے۔ آخر یہی طے پایا کہ لوٹ کر اخون کے پاس پھر جایا جائے۔ کیونکہ اخون کے ظلم کے ساتھ تو ہم ویسے بھی عادی ہو گئے تھے اور نئے ظالم کا ظلم نئے سرے سے سہنا اب اسکی ہمت نہیں رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں اخون قلعے سے نکل آیا۔ وہ آگے اور ہم اس کے پیچھے۔ آج تو اخون محبت سے پیش آرہا تھا اور بغیر برا بھلا کہے اور کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ ہمیں خیال آیا کہ آخر اب اس کے ساتھ اتنے عادی ہو گئے ہیں آخر کب تک اسی طرح ظلم کرتا رہے گا۔ چار پانچ میل کا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک طرف سے غازی (ترکمان) دوڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ کسی کے ہاتھ میں بندوق تھی اور کوئی چھری اٹھائے ہوئے تھا کسی کے

ہاتھ میں تلوار تھی اور کوئی ہاتھ میں کلہاڑی لئے ہوئے تھا دوڑتے ہوئے جا رہے تھے اور دوڑنے میں ایک دوسرے سے سبقت کر رہے تھے۔ انھوں نے جب غازیوں کا یہ زور دیکھا تو اس کی آنکھیں پھر بدل گئیں بغیر کسی وجہ کے ہمیں پیٹنا شروع کر دیا۔ اب تک وہ آگے تھے اور ہم اس کے پیچھے چل رہے لیکن اب اس نے ہمیں آگے کر دیا اور خود ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ کبھی ایک کو کہتا کہ یہ جدیدی ہیں اور دوسرے کو آواز دیتا کہ یہ کافر ہیں۔ اس دن تو انھوں سب دنوں سے زیادہ خطرناک لگ رہا تھا۔ مجاہدین (ترکمان) تو ویسے بھی جہاد کے لئے جا رہے تھے ہمیں ڈر تھا کہ کہیں قریب ہی وہ ہم پہ جہاد نہ کر دیں۔ اگر اس دن ہم نے مار کم سہی تو اس کی بڑی وجہ ہی تھی کہ اس دن انھوں بھی پا پیادہ تھا اور ہمارے پیچھے پہنچ نہیں سکتا تھا۔

دوپہر تک میدان جنگ کے اتنے قریب آ گئے کہ توپوں کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔ دل ہی دل میں خوش ہو رہے کہ خلاصی کا وقت قریب آ گیا۔ لیکن انھوں کے ظلم کا پارہ اس وقت حد سے بڑھ گیا۔ اس نے ہمیں انتہائی زیادہ مارنا شروع کیا اور گالیوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ ہم ایک گاؤں پہنچے جہاں کے مغربی سمت غازیوں کے مورچے تھے۔ توپوں، مشین گنوں اور بندوقوں کی آوازوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ میدان جنگ زیادہ دور نہیں۔

ہمیں اس نے ایک مکان میں دھکیل دیا۔ روٹیوں کا ایک بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہمیں اس ڈھیر کے نزدیک بٹھایا گیا۔ گرد و نواح سے روٹیوں کے بھرے ہوئے چنگیر (ٹوکرے) آ رہے تھے اور چار مُلا صاحبان جو ایک بڑے قالین پر بیٹھے تھے ان کے درمیان رکھے جا رہے تھے۔ مُلا صاحبان روٹی پر کوئی دعا بار بار پھونک رہے تھے۔ روٹیاں اتنی زیادہ تھیں اور ہم بھوکے ہی بیٹھے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انھوں کی بدولت بہت تھک گئے تھے۔

تین دن بھوکے پیاسے چارے کے کمرے میں بند رہے۔

اچانک ایک مُلا کی نگاہ ہم پر پڑی۔ فوراً دریافت کیا:

"بوکیم وار؟" (یہ کون ہیں؟)

اخون دست بدستہ کھڑا ہو کر ساری داستان سنانے لگا۔ اس نے ہماری گرفتاری کا قصہ بیان کیا۔ بڑے ملا صاحب نے اشارے سے ایک طرف اشارہ کیا اور اخون کو کوئی حکم دیا۔ اخون ہمیں اٹھا کر اس طرف لے جانے لگا۔ اسی گاؤں میں ایک مکان میں بھوسے کی ایک کوٹھڑی تھی اس میں لے جا کر ہمیں بند کیا۔ ہم بھوسے پر بیٹھ گئے۔ کمرہ اتنا بھرا ہوا تھا کہ ہم اس میں کھڑے ہو کر پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ تین دن اور تین راتیں ہم نے اسی کمرے میں گزاریں۔ پینے کے لئے پانی نہیں تھا۔ ایک صراحی کمرے کے اندر دروازے کے پاس پڑی ہوئی تھی پہلے روز ہم نے بڑی خوشی کے ساتھ اس کی طرف کا رُخ کیا اور پانی پینا چاہا لیکن اس سے بہت سخت بدبو آ رہی تھی اور ہم ایک گھونٹ پانی پینے کی جرأت نہ کر سکے۔

پہلے دن جب قضائے حاجت کی ضرورت پڑی تو دو آدمی بیٹھ کر لیتے اور تیسرا فارغ ہو جاتا اس طرح باری باری ہم فارغ ہوتے گئے۔ اسی کمرے کی چھت کے پاس ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جسے روشندان کہنا تو مناسب نہیں اپنے اپنے فضلے کو بھوسے سمیت اٹھا کر باہر اس سوراخ سے پھینک دیتے۔ اس کے بعد نہ ہمیں روٹی ملی اور نہ قضائے حاجت کی ضرورت پڑی پہلے دن تو گھٹن کے مارے سانس بند ہو رہی تھی اس لئے باری باری جا کر اپنی ناک اس سوراخ سے باہر کر لیتے تاکہ تازہ ہوا میسر ہو سکے لیکن آہستہ آہستہ اس کے عادی ہو گئے۔ آہستہ آہستہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے نقاہت بڑھتی گئی اور پھر بیٹھنے سے لیٹنے میں زیادہ آرام محسوس کر رہے تھے۔ کیونکہ اس طرح چھت اور ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

میرے ساتھی گرفتاری سے پہلے مجھ سے واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اس تازہ افتاد میں بھی ولایت شاہ کی ظرافت میں کچھ کمی نہ ہوئی اور نہ ہی مولوی فخر عالم اپنے متانت اور سنجیدگی کے خول سے باہر آیا۔ بھوسے کے اوپر بیٹھے ہوئے تمام دن افغانستان میں سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات ایک دوسرے کو سناتے رہے اور یہ سب کچھ ہم اس دلچسپی سے سنتے کہ جس طرح

گویا ہم پر نہیں اور کسی پر گذری ہو۔

کمرے کے اندر جنگ کی اُمید میں جاگ رہے تھے۔ پہلے دن تو فائروں کی آوازیں دور تھیں لیکن دوسرے دن مشین گنوں کے فائروں کی آوازیں مغرب کے سمت گاؤں میں آتی سنائیں دیں۔ آہستہ آہستہ فائروں کی گونج مشرق کی سمت دکھائی دینے لگی۔ اتنا تو ہم سمجھ گئے تھے کہ کمرے کے اندر بند ہوتے ہوئے بھی ہم آزاد تھے۔ اسی سہارے کہ بس ابھی زندان کا در کھلا ہی جاتا ہے وہ دن بھی گذر گیا۔ تیسرا دن شروع ہوا۔ دن گذرا اور شام ہونے لگی لیکن کوئی نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا والے ہم کو بھلا چکے تھے۔ کمرے کے اندر ہی کبھی کبھی نعرے بھی لگا لیتے اور چیخ و پکار بھی کر لیتے کہ شاید کوئی پاس سے گذرنے والا اس کو سُن لے لیکن ہر سو خاموشی تھی۔ کون تھا جو ہمیں جواب دیتا۔ دروازہ کھولنے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ کیونکہ دروازے کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا اور مضبوطی کی وجہ سے توڑنا بھی ناممکن تھا۔

بھوسے کے کمرے کی قید سے رہائی ملتی ہے

دن رات یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کمرے سے کیسے نکلا جائے۔ دروازہ کافی مضبوط تھا اور بہت کوشش کر کے بھی نہ توڑا جا سکا۔ دیواریں بھی کافی مضبوط تھیں اور ہمارے پاس اپنے ہاتھوں کے سوا اور کوئی اوزار بھی نہیں تھا۔ جس سے دیواروں میں سوراخ کر سکتے۔ چھت بھی اتنی مضبوط تھی کہ اس کا پھاڑا جانا ناممکن تھا۔ حیران و پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا؟ ہمیں یقین ہو گیا کہ گاؤں والے لڑائی کی وجہ سے گاؤں چھوڑ چکے ہیں اور حملہ آور بھی یہاں اس وجہ سے نہیں ٹھہرے کہ گاؤں چھوٹا تھا۔ حیران تھے کہ کیا ہوگا؟ جب سے قید میں آئے تھے روٹی اور پانی بالکل میسّر نہیں آیا۔ اس وجہ سے نقاہت اتنی بڑھ گئی کہ بس ہر وقت لیٹے ہی رہتے تھے۔ اتنے میں یہ خیال آیا کہ شاید کافی عرصے اس کمرے سے ہماری گلوخلاصی نہ ہو سکے یہ سوچتے ہی بھوک پیاس غائب ہو گئی۔ تینوں اٹھ کر چستی سے دروازے پر پھر پل پڑے لیکن اس میں ہمیں ناکامی ہوئی۔ چھت اور دیواروں کو ٹھونک ٹھونک کر دیکھا لیکن کہیں سے کسی جگہ کامیابی کی صورت

نظر نہیں آرہی تھی۔ آخر تنگ روشندان جو رہ گیا اس پہ انگلیاں گاڑ لیں۔ مٹی کے پلستر کو اکھاڑ دیا جس سے ہماری انگلیاں بھی زخمی ہوگئیں لیکن دیوار پھر بھی کافی مضبوط ہی نظر آرہی تھی۔ رات گئے تک کام کیا انگلیاں جب بہت تھک گئیں تو تھوڑی دیر آرام کیا اور اس کے بعد پھر کام کی فکر ہوئی۔ مجھے پورا یقین تھا اور امید بھی ایک یہی رہ گئی تھی کہ آخر ہم روشندان معہ چوکاٹھ باہر نکال پھینکیں گے۔ اگر یہ ہو جاتا تو پھر سوراخ کو مزید چوڑا کرنا آسان تھا۔

ساری رات جاگتے رہے۔ خالی پیٹ ویسے بھی نیند کم ہی آتی ہے پریشانی کی وجہ سے بھی آرام بالکل نہیں تھا۔ ساری رات باتوں میں گزری۔ گاؤں میں صرف مرغ ہی ہمارا ساتھ دینے کو رہ گئے تھے۔ انہوں نے اذانیں دینی شروع کیں۔ ہم نے اپنی انگلیوں کا جائزہ لیا کہ مزید کام کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ جواب اثبات میں تھا۔ لیکن ابھی روشنی نہیں پھیلی اور اندھیرا ہی تھا۔ روشنی کے انتظار میں لیٹے ہوئے تھے کہ اسی اثنا میں تالا کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ہم نے فوراً بیٹھ کر دروازے کی طرف نگاہیں جمالیں۔ تالا کھل گیا۔ زنجیر گرنے کی آواز بھی آئی۔

"برادر! برادر!" کسی نے آواز دی۔ دروازہ کھل گیا۔ ہم بھوسے سے چھلانگ لگا کر باہر نکلے۔ دو آدمی نظر آئے جنہوں نے فوراً "اسلام علیکم برادر" کہا اور کہنے کیساتھ ہی جوار کی آدھی روٹی ہماری طرف بڑھا دی۔ ہم کمرے سے نکل کر ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ نہ تو وہ ہمارے ساتھ باتیں کر رہے تھے اور نہ ہی ہم ان سے پوچھ رہے تھے کہ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ گاؤں سے باہر نکل آئے۔ روٹی ہم نے تین حصوں میں تقسیم کی اپنا اپنا حصہ کھانے میں مشغول ہو گئے۔ دنیا کا بہترین کیک اتنا میٹھا اور لذیذ نہیں لگ رہا تھا اس وقت جو مزہ اس روٹی میں ہمیں ملا۔

ترکمان گاؤں سے باہر جا کر ٹھہر گئے۔ ہاتھ دعائیہ انداز میں کھڑے کئے اور منہ پر پھیر لئے اور ساتھ ہی کہا کہ

"اَللّٰھُمَّ اٰمین۔"

اندھیرے میں ہمیں چھوڑ کر پلک جھپکتے غائب ہو گئے۔ ارد گرد باغات تھے جن کے بڑے بڑے

درختوں نے اندھیرا اور بھی پھیلایا ہوا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرف اور کہاں جائیں ؟ ایک ہی طرف کا اندازہ لگا سکتے تھے اور وہ دریائے آمو کا کنارہ تھا۔ اب ہمیں یقین ہوگیا کہ اردگرد کا سارا علاقہ خالی تھا۔ اور ترکمان دشمن کے ہاتھوں تہس نہس ہوگئے تھے۔ یہ یقین آتے ہی خوشی سے چھلانگیں مارنے لگے۔ اس کے بعد بیٹھ کر آگے کے مشورہ کیا۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ آمو دریا کے کنارے کنارے رو بہ مغرب چلنا چاہیئے۔ ہمیں امید تھی کہ اس طرح چار جوئے کی چھاؤنی تک پہنچ جائیں گے۔ میرے دونوں ساتھی میرے ہی جغرافیے کے آسرے پر میری رہنمائی میں روانہ ہو گئے۔ مجھے اندازہ لگ رہا تھا کہ ہم کرکی چھاؤنی سے بہت آگے نکل آئے ہیں اور چار جوئے کے قرب وجوار ہی میں کہیں ہیں۔

دریائے آمو کا کنارہ

سورج کی پہلی کرن کے نکلنے سے پہلے ہی ہم دریا کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ نماز وہیں پڑھی اور صدق دل سے دعا کی کہ پھر ترکمانوں کے چنگل میں نہ پھنس جائیں اور یہ آزادی جو ملی ہے ہمیں نصیب ہو جائے۔ ہمارے نزدیک ہی ایک کشتی ریت سے بھری ہوئی زمین میں دبی ہوئی نظر آئی۔ آستینیں چڑھا کر ہاتھوں سے ریت کشتی سے ہٹانا شروع کی۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ کشتی سے ریت ہٹا کر اس میں چار جوئے کی چھاؤنی پہنچ جائیں گے لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ سارا دن لگا کر بھی اس کو ہم خالی نہیں کر سکتے۔ اس میں ناکام ہو کر ہم پھر مغرب کی جانب چل پڑے۔ ہمارا اندازہ شام تک چار جوئے پہنچنے کا تھا۔

آدھے دن تک تو تیز تیز چلتے رہے۔ لیکن کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے جو دریا کے کنارے اُگی ہوئی تھیں۔ پاؤں زخمی ہو گئے اور اوپر سے تیز دھوپ جو پڑ رہی تھی۔ اس نے ساتھیوں کو کم ہمت کر دیا لیکن میں انہیں ہمت دلاتا رہا کہ چار جوئے کی چھاؤنی بہت نزدیک ہے۔ اسی امید پر چل رہے تھے چلنے کے قابل نہیں رہے تھے لیکن کرتے بھی کیا چلنے کے بغیر اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

دوپہر تک تقریباً بھاگتے ہی رہے۔ پاؤں جھاڑیوں کیوجہ سے لہولہان ہو گئے۔ خون ان سے رسنا شروع ہوا۔ لیکن دریا کی نرم ریت ہماری حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ جب کنارے پر ان جھاڑیوں کی وجہ سے چلنا

ناممکن ہو جاتا تو پھر پانی میں چلنے لگتے لیکن جہاں پانی گہرا ہونا شروع ہو جاتا وہاں پھر جنگل میں چلنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے بھی کنارے سے دور دور چلنا ہمیں ناپسند تھا۔ دریا والا سیدھا راستہ تھا اور پھر جنگل ہمیں پناہ بھی دے رہا تھا۔ کبھی کبھی اتفاق سے کسی ترکمان کی ہم پر یا ہماری کسی ترکمان پر نظر پڑ جاتی تو فوراً اپنے آپ کو چھپا لیتے۔ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں آگے چلنے سے منکر تھے۔ چار جوئے کی چھاؤنی کے لئے آنکھیں ترس گئیں تھکیں لیکن اس نے نہ نظر آنا تھا اور نہ نظر آئی۔ چھاؤنی کا کوئی نام و نشان بھی پتہ نہیں لگ رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ اب کیا ہو گا؟ پانچ دن کا بھوکا پیاسا دریا کے کنارے جنگل میں رات گزارنا ناممکن سا لگ رہا تھا۔ اس خیال میں ڈوبا ہوا دوستوں سے تھوڑا آگے چل رہا تھا کہ خربوزوں کے چھلکوں پر نظر پڑی۔ خوشی کے مارے فوراً دوستوں کو بھی آواز دی لیکن چھلکے کم تھے اور ہماری بھوک زیادہ۔ اگرچہ اس وقت چھلکے بھی ایک بے بہا نعمت تھی لیکن بہت کم تھے صرف منہ کا ذائقہ ہی بدل سکے۔ میں نے دوستوں سے کہا "ان چھلکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں قریب ہی خربوزوں کے کھیت ہیں۔"

مولوی فخر عالم نے فوراً کہا" ترکمان بھی ساتھ ہی ہوں گے ساتھ ولایت شاہ مسکرایا اور کہنے لگا" لیکن خالی پیٹ بھی گذارہ مشکل ہے۔" کافی دیر بھی ہو گئی تھی۔ چار جوئے کو پہنچنے کی طمع بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ پاؤں من من بھر کا ہو چکا تھا۔ قدم اٹھانا دوبھر ہو چکا تھا کہ اچانک دریا پر سے گذرے ہوئے کسی گاڑی کے پہیوں کے نشانات پر نگاہ پڑی۔ اس سے خیال آیا کہ قریب ہی کہیں توپوں کو جہاز سے اتارا گیا ہے۔ فوج کا پڑاؤ ضرور کہیں قریب ہی ہے۔ پہیوں کے نشانات پر روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد خربوزوں کے ایک باغ میں پہنچے۔ بڑے بڑے موٹے موٹے خربوزے لگے ہوئے تھے۔ کوئی آدمی بھی پاس نہیں تھا۔ دل کو یقین آ گیا کہ ترکمان راہ فرار اختیار کر چکے ہیں۔ کھیت کے ساتھ ہی ایک طرف ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ میرے اور مولوی فخر عالم کے منع کرنے کے باوجود ولایت شاہ آہستہ سے ان کی طرف کھسک گیا۔ اس نے ایک بڑا خربوزہ توڑا جو ہم تینوں نے نگل لیا۔ بدن میں کچھ توانائی پیدا ہوئی۔ ولایت شاہ اور توڑنے والا تھا لیکن ہم نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

خربوزوں سے کھیت بھرے پڑے تھے لیکن ویران تھے - دو لڑکے ایک گدھے پر سوار گذر رہے تھے ۔ جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو گدھے کو ایڑ لگائی لیکن ہم نے انہیں آواز دی اور خربوزوں کے ایک کھیت کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک گدھے سے اترا اور کھیت میں داخل ہو کر چند خربوزے توڑ لایا۔ وہ اور بھی لانا چاہتا تھا لیکن ہم نے ایسا کرنے سے روک دیا ۔ ولایت شاہ نے شلوار کے نیفے سے ایک روسی نوٹ نکالا اور انہیں دے دیا۔ ہمیں ولایت شاہ پر ہنسی آئی اور اخون کو حق بجانب قرار دیا ۔

ہم جدیدی فوج کے پاس پہنچ گئے

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے دور سے ہماری نظر چند کمروں پر پڑی۔ ذہن میں خیال آیا شاید یہ کوئی مسجد ہوگی جہاں ہم رات گذار سکیں گے ۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں پہنچے لیکن گاؤں خالی تھا۔ ایک بوڑھے نے ہمیں دیکھا تو جوار کی فصل میں چھپ گیا ۔ ہم اس کے پیچھے دوڑے اور اس سے پوچھا " آقا مسجد ھاردا " (بڑے میاں مسجد کہاں ہے ؟)

اس نے ایک طرف اشارہ کیا کہ مسجد وہاں ہے اور ساتھ ہی ایک سرد آہ بھر کے کہا

" کافر چوک " (کافر بہت ہیں)

اتنے میں ہمیں ایک فائر سنائی دیا۔ کیا دیکھتے ہیں ایک سرائے کے اوپر ایک سپاہی مشین گن لئے کھڑا ہے ۔ اس کو دیکھ کر ہم بہت خوش ہوئے ۔ جلدی جلدی اس کی طرف قدم اٹھایا۔ سرائے کے دروازے پر ایک سپاہی نے ہمیں ٹوکا

" کیم ور " (کون ہو ؟)

ہم نے جواب دیا

" ہندی " (یعنی ہندوستانی)

اس کے سنتے ہی اس نے اور سپاہیوں کو آواز دی اور ہمیں عزت و احترام کے ساتھ سرائے کے



اندر لے گئے۔ سرائے میں پانچ چھ سپاہی تھے۔ انہوں نے سرائے کے درمیان ہمارے لئے قالین بچھائے اور ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ترکی زبان میں ہم سے گفتگو شروع کی جسے ہم نہیں سمجھ سکے۔ ہم حیران تھے لیکن ان سے معافی مانگ لی کہ ترکی زبان سے نابلد ہیں۔ انہوں نے جلدی سے اپنے ہاتھ سر سے پاؤں تک اپنے بدن پر پھیر لئے۔ ہم سمجھ گئے کہ تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ ہم نے انہیں کہا کہ آپ بڑی خوشی سے تلاشی لے سکتے ہیں۔ تلاشی لینے کے بعد پہریداروں میں سے ایک نے ہمارے ہاتھ سے وہ خراب سا خربوزہ جو ہم ساتھ لائے تھے لیا اور اٹھا کر سرائے سے باہر پھینک دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سپاہی ہمارے لئے تندور کی روٹی معہ چائے لائے۔ اور ساتھ ہی ایک اعلیٰ قسم کا خربوزہ بھی ہمارے سامنے رکھا۔ ہم نے خربوزوں کے کھیت میں پیٹ بھر لیے تھے لیکن چائے اور روٹی دونوں نئی چیزیں تھیں اس لئے خوب ذوق و شوق سے کھائیں۔

سپاہی ہمارے ساتھ بہت محبت سے پیش آ رہے تھے۔ وہ بار بار ہمیں کچھ کہتے جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ مہم دراصل ہماری رہائی کے لئے ترکستانی فوج نے چارجوئے کی چھاؤنی سے بھیجی تھی۔ انہوں نے ہمارے بہت سے ساتھیوں کو رہائی دلائی تھی اور ان کو کرکی چھاؤنی تک پہنچایا تھا۔

یہ پانچ چھ سپاہی ترکی النسل تھے۔ کچھ تو ترکستان کے رہنے والے تھے اور دو ان میں آذربائیجان کے باشندے تھے۔ وہ فارسی نہیں سمجھتے تھے اور ہماری ترکی چند لفظوں تک محدود تھی لیکن پھر بھی آپس میں ٹوٹی پھوٹی فارسی ترکی اور اشاروں سے تبادلہ خیالات کر لیتے تھے۔

دروازہ کا سنتری قابل ذکر ہے۔ اصل میں آذربائیجانی ترک تھا اور فارسی نہیں سمجھتا تھا بس اس کی فارسی صرف ان چند الفاظ تک ہی محدود تھی کہ "خیلے خوب برادر با تو از کجائی"۔

یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا انہیں یہ جتلانا تھا کہ مجھے فارسی آتی ہے۔ ہم جان گئے کہ خوش طبع انسان ہے اور ایسے انسان کی فطرت ہی یہی ہے کہ گپ شپ سے اپنے کو بھی خوش رکھے اور ہمیں بھی مشغول رکھے۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہنسی مذاق کر لیتے تھے لیکن وہ اس کو سمجھتا نہیں تھا پھر

جب اس کو اشاروں میں وہی بات سمجھا دیتے تو بہت خوش ہو جاتا۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے۔ ہم نے اس لئے اس کا نام گنجا رکھ دیا تھا بہت جلد اپنے ساتھیوں میں اس نام سے شہرت پا گیا اور وہ بھی اسے "گنجا گنجا" کہہ کر پکارتے۔

روزانہ کرکی جانے کے لئے سپاہیوں کی ٹولیاں اس راستے سے گذرتیں۔ تیسرے دن ایک ٹولی میں ایک آذربائیجانی سپاہی پہنچا وہ فارسی اچھی طرح جانتا تھا۔ ہمارے ساتھ کافی دیر رکا رہا اور کافی گفتگو کی۔ آخر میں اس نے سرائے کے کماندار سے اجازت طلب کی کہ ہندوستانیوں کو کرکی پہنچانے کا کام وہ انجام دینا چاہتا ہے۔

گنجے کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس سے لڑنے لگا کہ تکلیف جو مجھے ان کی رہائی میں اٹھانی پڑی وہ مجھے ہی معلوم ہے اور اب نام اور لوگ اپنا کریں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ فارسی جاننے والے سپاہی نے جب ہمیں یہ بات بتائی تو ہمیں بہت لطف آیا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

ہم جدیدی فوج کے ہمراہ کرکی کے لئے روانہ ہوئے

چوتھے دن سرائے کے مکین سپاہیوں کے کرکی جانے کا نمبر آیا۔ ہماری سواری کے لئے ایک آرابہ (گاڑی) مہیا کی گئی۔ آرابہ ایک عجیب قسم کی گاڑی ہوتی ہے۔ اس میں گھوڑا جوتا جاتا ہے جو اسے کھینچتا ہے۔ ہمارے وطن کی بیل گاڑی کی ہیئت اور آرابے میں بہت کم فرق ہے۔ فرق صرف پہیوں میں ہے۔ ریڑھے (بیل گاڑی) کے پہیوں کا قطر آرابے کے پہیے کے قطر کے نصف ہوتا ہے۔ ہم حیران تھے کہ آرابے میں اتنے بڑے بڑے پہیوں کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن جس وقت آرابہ کھائیوں اور ناہموار زمین سے گذر رہا تھا تو پھر ہمیں پتہ چلا کہ آرابے کے لئے لمبے پہیوں کی کیوں ضرورت ہے۔

وطن بالکل ویران تھا۔ راستے کے اطراف کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راستے میں ہمارا گذر دیہاتوں سے بھی ہوا۔ ایک آدھ گاؤں کے اندر گئے تو وہاں دیکھا کہ گھر سامان سے بھرپور تھے۔ لحاف بستروں میں پڑے ہوئے تھے اور ایک جگہ لمبے بوٹ پڑے ہوئے نظر آئے۔ ہم میں سے ایک شخص انہیں

اٹھانے کے لئے جھکا لیکن سپاہیوں نے اسے منع کر دیا اور سمجھایا کہ کسی چیز کو اٹھانے یا ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔

دوسرے دن لوگ گھروں کو لوٹتے نظر آئے۔ ایک جگہ ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ امن قائم ہو رہا تھا۔ سپاہی بھی لوگوں کو امن و امان کی ترغیب دے رہے تھے۔ اس میلے میں اطراف کی مصنوعات بک رہی تھیں۔

کرکی چھاؤنی۔ (آمو کے کنارے چھاؤنی کا نقشہ)

تیسرے دن کرکی چھاؤنی کے قرب و جوار میں پہنچے۔ ترکمانی کیمپ کا وہ میدان بھی نظر آیا جس میں ہم دو تین قید رہے تھے خالی پڑا تھا۔ آزادی کی قدر دل میں اور بڑھی۔ جس جگہ ترکمانوں نے ہمیں پکڑا تھا اس جگہ سے کشتی میں کرکی تک ایک دن کا راستہ تھا جو ہم نے پندرہ دن میں طے کیا۔

ہمارے پہنچنے کی کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ خاموشی سے چھاؤنی میں داخل ہوئے۔ چھاؤنی کے چاروں طرف خاردار تار بچھایا گیا تھا اور دروازوں پر سنتری کھڑے تھے۔ ہمارے ساتھ والے حفاظتی دستے کے سپاہیوں نے ان سے مصافحہ کیا اور ہم چھاؤنی میں داخل ہو گئے۔ پختہ مورچوں میں سپاہی مشین گنوں کے ہمراہ تیار بیٹھے تھے۔

کرکی کا کمشنر

سوویت طریقے کے مطابق ہمیں کرکی کے کمشنر (کمیسار) کے دفتر لے جایا گیا۔ ترمذ کے کمیسار کی طرح یہ بھی دلچسپ آدمی تھا۔ ہمیں جلد ہی بازیابی کی اجازت مل گئی۔ کرسی سے اٹھ کر بہت ہنسا اور بہت سی باتیں کیں جنہیں ہم نہیں سمجھ سکے۔ قیاس ہی سے اس کا کچھ ترجمہ اس طرح سمجھ میں آیا۔

"ہندوستانی رفقاء کیسے ہو؟ انقلابی زندگی میں آرام نہیں ہے۔ حوصلے کو مضبوط رکھو۔ یہ بھی ہندوستان کی آزادی کی جنگ کا ایک مرحلہ ہے۔ شاباش۔"

کرکی کا کمسار پختہ عمر کا آدمی تھا۔ ایک ہی رنگ کا گرم سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بوٹ بھی پاؤں میں موجود تھے۔ صرف اس کی پتلون پرانی تھی اور پیٹھ پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ بہت خوش قسمت تھا نہ تو ٹاٹ کی پتلون پہنے ہوئے تھا اور نہ ہی برہنہ پا تھا۔ اس نے پرخلوص طور سے ہمارا استقبال کیا۔ اپنی زبان میں کچھ کہہ کر مخاطب کرتا اور خود ہی ہنس پڑتا۔ ہم بھی جواباً ہنس پڑتے۔ لیکن پلے کچھ بھی نہ پڑتا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ ملاقات ختم ہوئی۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم اپنے ساتھیوں میں موجود تھے۔ وہ لوگ ایک فوجی بارک میں تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ان کو خبر مل چکی تھی وہ باہر نکل آئے تھے۔ بار بار گلے ملتے اور ہزار ہزار شکر ادا کرتے کہ زندہ ہی دوبارہ ان سے ملاقات ہوگئی۔ بیاسی ساتھیوں میں سے بہتر کرکی پہنچ گئے تھے۔ باقی کے زندہ یا مُردہ ہونے کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ صرف دو لاشیں مل گئیں تھیں اور ان کی شناخت ہوگئی تھی ایک تو جلال پور جٹاں کا عبدالرحمٰن تھا اور ساتھ اس کا دوسرا ساتھی تھا۔

ہم ترکمانوں سے لڑتے ہیں

دو دن بمشکل آرام سے گذارے ہوں گے کہ جنگ کے دوبارہ جاری ہونے کی خبر پہنچی۔ چھاؤنی کے بازار میں ترکمانوں نے ہمارے منہ پر ہمیں کہا۔

"اس دفعہ دیکھا جائے گا۔ دس ہزار افراد کا کرکی پر حملہ ہے۔"

یہ تو مبالغہ لگ رہا تھا لیکن جنگ تو یقینی تھی۔ چھاؤنی میں ترکمانوں کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اور حفاظتی تدابیر میں سختی کی گئی۔ ہمیں ملا کر سارے چھاؤنی کی نفری دو سو بہتر افراد تھی۔ اس میں چند روسی عورتیں بھی شامل تھیں۔

ہمیں جنگ کی خبر سے کافی حیرانگی ہوئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر اس دفعہ ترکمانوں کے چنگل میں پھنس گئے تو کلمہ پڑھنے، قرآن خوانی کرنے اور نماز پڑھنے سے بھی چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا۔

تھوڑی ہی دیر میں سب مہاجرین بارک میں جمع ہو گئے۔ غیر رسمی گفتگو بند ہوئی۔ حالات نازک تھے۔ اکبر خان کی صدارت میں باقاعدہ اجلاس شروع ہوا اور یہ تجویز پیش کی گئی:۔

"ہم ہندوستانی مہاجرین وطن کی آزادی اپنا ایک مقدس فرض سمجھتے ہیں۔ یہی مقصد حاصل کرنے کے لئے ہم نے وطن چھوڑا ہے اور افغانستان ایسے وقت پہنچے جب کہ انگریز اور افغانستان میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ہمارا تو یہ مقصد تھا کہ افغانستان کی مدد سے وطن عزیز انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرالیں گے۔ لیکن انگریز اور افغانستان کے درمیان صلح نے ہماری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ہم وطن آزاد کرانے سے محروم رہ گئے۔ حالات ہمیں سوویت یونین لے آئے۔ سوویت انگریز کا دشمن ہے اس لئے ہمارا دوست ہے۔ اس نے ہماری امداد کی اور ہماری خاطر مدارت کر رہا ہے۔

اب سوویت یونین اور ترکمانوں کی جنگ ہے۔ ترکمانوں نے ہمارے ساتھ بغیر کسی وجہ کے کافی ظلم کیا۔ ہمیں ایسے عذاب دے گئے کہ تاریخ سے اس کی مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔ ہمارے عزیز ساتھی اور دوست اور تو دوسروں کو بے گناہ قتل کیا۔ دنیا کی کوئی قوم بھی ترکمانوں کی اس قبیح حرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھے گی۔ دوسری طرف سوویت یونین ہمارے ساتھ اچھا سلوک کر رہی ہے اور یہ بہت نامناسب ہوگا کہ ایک آدمی جو ہمیں مہمان بنا کر رکھے ہوئے ہے اس کے گھر رات کے وقت ڈاکہ پڑتا ہے اور ہم اسے کہتے ہیں کہ اے ہمارے معزز میزبان یہ چور بھی مسلمان ہیں اور ہم بھی مسلمان ہیں۔ اس لئے تمہیں بچانے کے لئے ہم اس وقت تمہاری کوئی امداد نہیں کر رہے ہیں یہ کہہ کر الگ بیٹھ جائیں۔

اس وقت ہم یہاں کرکی میں ترکمانوں کے محاصرے میں ہیں۔ جنگ یقینی ہے۔ ترکمانوں کی جیت ہماری موت ہے اور ہمیں پناہ دینے والوں کے لئے بھی تباہی کا موجب ہوگی بغیر مقابلے کے ترکمانوں کے ہاتھوں مرنا بزدلی ہے اور بے غیرتی ہے۔ تلوار ہاتھ میں لئے اگر موت بھی آجائے تو وہ موت نہیں بلکہ ابدی زندگی ہے۔ یہ بھی یقینی بات ہے کہ ترکمان صرف ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے بلکہ ہمارے محسنوں کے بچے اور عورتیں بھی ان کے ہاتھوں قتل ہوتے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اب فکر کرنی چاہیئے کہ اگر مقابلہ کئے بغیر رہتے ہیں تو دنیا میں ہماری بدنامی ہوگی۔

ان وجوہات کے سبب اس چھوٹی سی بے وطن مسافروں کی ٹولی کی یہ رائے ہے کہ ہم مہاجرین اپنے آپ کو اپنے میزبانوں اور ان کے اہل وعیال کی حفاظت کیلئے وقف کردیں۔ ان کی حفاظت ہمارا فرض ہوگی

اس لئے اپنے آپ پر یہ فرض سمجھتے ہوئے اپنی خدمات اپنی خوشی سے کرکی چھاؤنی کے حاکموں کو پیش کرتے ہیں"

تجویز کے پیش ہونے کے ساتھ گرما گرم بحث شروع ہو گئی۔ کچھ لوگ اس کے حق میں تھے اور کچھ لوگ مخالفت کر رہے تھے۔ ہماری تعداد بڑی مختصر تھی۔ اسی لئے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بہت بحث کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی تبادلۂ خیالات میں وقت لگا۔ تجویز کی جو مخالفت کر رہے تھے ان کے پاس یہ دلیل تھی کہ ترکمان بھی مسلمان ہیں اور ہم بھی مسلمان ہیں۔ اس لئے کسی بھی حالت میں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے خلاف تلوار اٹھانا جائز نہیں۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ سب بحث و مباحثہ دوستانہ ماحول میں ہوا۔ آخر فریقین اس پر راضی ہو گئے کہ ہر شخص کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ چھاؤنی کی حفاظت میں حصہ لیتا ہے یا غیر جانبدار رہتا ہے۔

یہ مہاجرین کے اخلاص کا نتیجہ ہی تھا کہ سینتیس (۳۷) افراد حق میں ہو گئے اور اتنی ہی تعداد مخالفت کرنے والوں کی تھی۔ لیکن سب نے یہ بات پسند کی کہ اجلاس بغیر گنے ختم ہو جانا چاہیئے تاکہ کسی کو اپنی ہتک فتح و شکست وغیرہ کا احساس بھی نہ ہو۔

یہ اصولی اختلاف ہمارے درمیان پہلی مرتبہ آیا۔ بغیر ظاہر کئے سب جان گئے کہ یہ اصولی اختلاف ہے۔ ہمارے سارے سفر میں دو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ کبھی تو ہم ایک ساتھ رہے اور کبھی جدا ہو جاتے۔ پھر مل جاتے لیکن یہ بنیادی اختلاف اپنی ہی جگہ رہا۔ کرکی کے بعد کے سفر کا سارا انحصار اسی اصولی اختلاف پر رہا۔ یہ اختلاف مختلف جگہوں پر مختلف اشکال میں ظاہر ہوتا رہا۔ لیکن خوش اسلوبی سے ہی ختم ہو جاتا۔

چھاؤنی کے حکمرانوں کے پاس ہم نے اپنا فیصلہ بھجوایا۔ ساتھ ہی ہم نے ان سے بندوقوں کا مطالبہ کیا۔ حاکم بہت خوش ہوئے۔ اس لئے بھی کہ بغیر ان کے مطالبے کے ہم نے ان کو یہ پیش کش کر دی تھی کہ ہم چھاؤنی کی حفاظت کے لئے آنا چاہتے ہیں۔ ہماری پیش کش کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر میں دریا کے کنارے کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ اور رات اندھیرے میں ہم پینتیس افراد بندوقیں کندھوں پر رکھے اپنے مورچوں میں پہنچ گئے۔ سپاہی اور افسران سب اس تھوڑی لیکن بروقت امداد پر بہت خوش ہوئے۔

لطیف تاتار

ہمیں بہت جلد پتہ چل گیا کہ ہمیں لطیف نامی ایک تاتاری کی کمان میں دیا گیا۔ وہ کازان کا رہنے والا تھا۔ کرکی کی بالشویکی فوج میں افسر تھا تعلیمیافتہ آدمی تھا فارسی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی لئے ہماری نگرانی اور انتظام کے لئے بے حد موزوں شخص تھا۔ خوش اخلاق اور خوش طبع آدمی تھا اس لئے ہمیں بہت جلد بھا گیا۔ دن رات ہمارے ساتھ ہی رہتا۔ ہماری ہر چیز کا ذمہ اس کے حوالے تھا۔ فوجی تربیت صرف بندوق چلانے تک محدود تھی۔ جو ہمیں مورچوں میں دی جاتی اور ہمارے پیٹ کی فکر بھی تسلی بخش انداز سے لطیف تاتار ہی کرتا۔

لطیف نے چارج سنبھالتے ہی ہمیں دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ہماری خواہش پر محمد اکبر خان کو اس نے کماندار بنایا اور گوہر رحمان اور غلام محمد سابقہ فوجیوں کو ٹولی کا ایک قسم کا رہنما بنالیا۔ ان بڑوں کی کمان میں سترہ سترہ آدمی آ گئے۔ ہمارا محاذ نسبتاً آسان تھا لیکن لمبا اور پھیلا ہوا تھا۔ چھاؤنی کے مشرقی اور شمالی جانب آدھے دائرے کی شکل میں دریائے آمو کا کنارہ تھا۔ اسی طرح آدھی رات تک سترہ آدمی ایک میل جگہ کی حفاظت کے لئے جگہ جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔

جو ہدایات ہمیں لطیف نے اور باقی افسروں نے اس موقعہ پر دیں وہ کافی دلچسپ تھیں۔

ا۔ ممکن ہے کہ ترکمان مشکوں میں دریا پار کرنے کی کوشش کریں۔ اس لئے ہر رضاکار کو چاہیئے کہ معمولی شک کی بنا پر بھی دریا کی طرف چند فائر کر دے۔ یہ انتظار کئے بغیر کہ آیا واقعی دشمن پار آنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اس کا تو یقین کر لوں۔

ب۔ اگر دریا کی سطح حسب معمول خاموش ہو تو ہر پانچ دس منٹ بعد ہر رضاکار دریا کی طرف چند فائر کر دے تاکہ دشمن رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے خبری میں حملہ آور نہ ہو جائے۔

ج۔ رات یا دن کے کسی بھی حصے میں اگر مورچے کے نزدیک کوئی آنے کی کوشش کرے تو بغیر پوچھے اس کو گرفتار کرنا چاہیئے۔

آدھی رات تک پہلی پارٹی نے بغیر کچھ دیکھے دریا کے کنارے کی طرف فائر کیے۔ چھاؤنی کے اعلیٰ

لطیف تاتار

ہمیں بہت جلد پتہ چل گیا کہ ہمیں لطیف نامی ایک تاتاری کی کمان میں دیا گیا۔ وہ کازان کا رہنے والا تھا۔ کرکی کی بالشویکی فوج میں افسر تھا تعلیمیافتہ آدمی تھا فارسی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی لئے ہماری نگرانی اور انتظام کے لئے بے حد موزوں شخص تھا۔ خوش اخلاق اور خوش طبع آدمی تھا اس لئے ہمیں بہت جلد بھا گیا۔ دن رات ہمارے ساتھ ہی رہتا۔ ہماری ہر چیز کا ذمہ اس کے حوالے تھا۔ فوجی تربیت صرف بندوق چلانے تک محدود تھی۔ جو ہمیں مورچوں میں دی جاتی اور ہمارے پیٹ کی فکر بھی تسلی بخش انداز سے لطیف تاتار ہی کرتا۔

لطیف نے چارج سنبھالتے ہی ہمیں دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ہماری خواہش پر محمد اکبر خان کو اس نے کماندار بنایا اور گوہر رحمان اور غلام محمد سابقہ فوجیوں کو ٹولی کا ایک قسم کا رہنما بنالیا۔ ان بڑوں کی کمان میں سترہ سترہ آدمی آئے۔ ہمارا محاذ نسبتاً آسان تھا لیکن لمبا اور پھیلا ہوا تھا۔ چھاؤنی کے مشرقی اور شمالی جانب آدھے دائرے کی شکل میں دریائے آمو کا کنارہ تھا۔ اسی طرح آدھی رات تک سترہ آدمی ایک میل جگہ کی حفاظت کے لئے جگہ جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔

جو ہدایات ہمیں لطیف نے اور باقی افسروں نے اس موقعہ پر دیں وہ کافی دلچسپ تھیں۔

ا۔ ممکن ہے کہ ترکمان مشکوں میں دریا پار کرنے کی کوشش کریں۔ اس لئے ہر رضاکار کو چاہیئے کہ معمولی شک کی بنا پر بھی دریا کی طرف چند فائر کر دے۔ یہ انتظار کئے بغیر کہ آیا واقعی دشمن پار آنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اس کا تو یقین کر لوں۔

ب۔ اگر دریا کی سطح حسب معمول خاموش ہو تو ہر پانچ دس منٹ بعد ہر رضاکار دریا کی طرف چند فائر کر دے تاکہ دشمن رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے خبری میں حملہ آور نہ ہو جائے۔

ج۔ رات یا دن کے کسی بھی حصے میں اگر مورچے کے نزدیک کوئی آنے کی کوشش کرے تو بغیر پوچھے اس کو گرفتار کرنا چاہیئے۔

آدھی رات تک پہلی پارٹی نے بغیر کچھ دیکھے دریا کے کنارے کی طرف فائر کیے۔ چھاؤنی کے اعلیٰ

افسران آدھی رات کو ہمارا معائنہ کرنے آئے اور ہمارے اس طرح احتیاطی فائروں پر بہت خوش ہوئے۔ دوسری ٹولی نے آدھی رات کے بعد غلام محمد کی کمان میں ہم سے چارج لے لیا اور ہم قریب کے ایک مکان میں زمین پر سو گئے۔

ہم میں سے بہت کم آدمی بندوق چلانا جانتے تھے۔ عبدالرحمان بابا نے جو ہندوستان میں بیرہ گیری کرتا تھا صبح سینے میں درد کی شکایت کی۔ ہمیں بہت افسوس ہوا کہ بابا کو نمونیا ہو گیا ہو گا۔ لیکن اس نے ہماری افسردگی ہنسی میں بدل دی جب پتہ لگا کہ وہ بندوق کو سینے کے ساتھ لگاتا تھا۔ لطیف نے تیزی سے فائر کرنے کی تربیت دینی شروع کی۔ بہت جلد اس کی تسلی ہو گئی کہ بابا کے بغیر اور کوئی غلطی نہیں کرتا۔ ہماری خوراک کے لئے لطیف روزانہ ایک ترکی دنبہ، چاول اور ایک ایک پونڈ کی سولہ تیار ڈبل روٹیوں کا بندوبست کرتا۔ جنگ کے دنوں میں ہی دوستوں کی رنگت اس خوراک کی وجہ سے بدلنے لگی۔ ان کے چہروں پر سرخی آنے لگی۔ ہمارے لئے پہلے دن لطیف نے اکیلے کھانا پکانا شروع کیا۔ لیکن بہت جلد ہی اسکو پتہ چل گیا کہ مہاجرین اپنے لئے یہ خدمت خود ہی کر سکتے ہیں۔ لطیف نے ہمارے پکے ہوئے کھانے کی ہمیشہ تعریف کی اور ساتھی بھی اس کو اپنا بھائی ہی سمجھنے لگے۔

لطیف کے حسن سلوک نے سب کو اس کا گرویدہ بنا لیا۔ رات کو ساتھیوں کے مجبور کرنے پر ہی سوتا ورنہ تو ساری رات جاگتا رہتا۔ ہر طرف لطیف کی ہی تعریفیں ہو رہی تھی۔ اور مہاجرین کا حوصلہ لطیف کی ہی بدولت بلند رہا۔ لطیف سچا، صاف گو، سادہ، تکلیف میں نہ گھبرانے والا ایک دلیر نوجوان تھا۔

لطیف کو بھی ہم سے خاصا انس تھا۔ جس بات سے ہم افسردہ ہوتے لطیف وہ کبھی نہ کرتا۔ مورچوں میں پہنچنے کے تیسرے روز لطیف ایک بڑا کنستر شراب کا بھرا ہوا لے آیا ہنسی خوشی وہ اسے ریڑھے سے اتار رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم شراب کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن جلد ہی اس نے سب سے معافی مانگی۔ اور فوراً کنستر واپس ریڑھے میں رکھوایا جب اس کو علم ہوا کہ ہم شراب نہیں پیتے۔

ہم نے اسے کہا "برادر لطیف ما معافی مے خواہیم۔ ما مسلمان ہیچ شراب نمے خوریم"

(برادر لطیف ہم معافی چاہتے ہیں ۔ ہم مسلمان ہیں اور بالکل شراب نہیں پیتے)

لطیف واپس لوٹنے ہی والا تھا کہ آفندی ایک بڑی کیتلی ہاتھ میں لئے ہوئے بھاگتا بھاگتا آیا۔ لطیف نے وہ اس کو بھر کردی۔ لیکن آفندی اس پر قناعت نہیں کر سکا۔ فوراً پھر گیا اور ہاتھ میں بڑا سا جگ لے آیا۔ لطیف نے وہ بھی بھر دیا۔ "بس آفندیم! بس!" لطیف نے اس کی منت کی لیکن سرفراز ایک اور برتن بھی لے آیا۔ لطیف نے خفگی کا اظہار بھی کیا لیکن اس کے باوجود بھی وہ برتن اس کو بھر کر دے دیا۔ اور ریڑھا واپس لے گیا۔

مہاجرین کب خاموش رہ سکتے تھے۔ فوراً کہنے لگے۔

"آفندی تم تو مسلمان ہو۔ یہ کیا کر رہے ہو شراب پی رہے ہو۔"

"بھائی شراب تو ایک اچھی چیز ہے۔ دیکھو کتنی سخت سردی پڑ رہی ہے اور پھر دن کو تو میں زیادہ نہیں پیوں گا۔ رات کو پیوں گا۔ پھر آپ لوگ بے فکر ہو کر پوستین پہنے لیٹے رہیں۔ میں تمام رات پہرہ دوں گا بالکل نہیں تھکوں گا۔"

"برادر! آخر تو مسلمان ہستی" لاہور کے ایک مہاجر تاج الدین نے اسے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا؟" آفندی کو غصہ آگیا "اکیلے تم مسلمان ہو۔ ساری دنیا کے مسلمان شراب پیتے ہیں وہ تو مسلمانی سے نہیں نکلے اور میں جب ذلیل غلام ہندی کے ساتھ چند دن اکٹھے رہ گیا تو مسلمانی سے نکل جاؤں گا!"

ہم نے آپس میں صلاح کی کہ آفندی کو نہ چھیڑا جائے کیونکہ اس سے کوئی فائدہ تو ہوگا نہیں۔ آفندی اکیلا ہے۔ اگر ناراض ہو گیا تو سب لوگ ہمیں ہی برا کہیں گے۔ سب خاموش ہو گئے۔

لیکن آفندی نے اٹھ کر ایک گلاس بھر کر پی لیا۔ اس کی آنکھیں ستر بتر تھیں۔ آفندی کا دل ویسے بھی بھرا ہوا تھا۔ سارے راستے وہ کئی دفعہ ہم سے ناراض ہوا تھا۔ اس کی ناراضگی آہستہ آہستہ زیادہ ہوتی گئی۔ آج کرکی میں تاج الدین کی بات پر بہت خفا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک اور گلاس

پیا۔ ہم سب حیران کہ آفندی کو کیا ہوگیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے آفندی اٹھ کر گلاس پیتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ مدہوش ہوگیا۔ اس وقت آفندی سے بات کرنا اپنے آپ کو بے عزت کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن مہاجرین بھی جتنے منہ اتنی باتیں والا قصہ تھا پھر ایک نے آفندی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"اسلام چہ بکار است۔ عیش باید کرد"

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

آفندی یہ سُن کر آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ اس نے کہا:

"ہندی ذلیل چہ حق دارد کہ بہ ما اعتراض بکند۔ غلام ابچہ غلام! ما ہیچ ایں طور مردم نہ دیدہ ایم"

(ہندی ذلیل کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ مجھ پر اعتراض کرے۔ غلام! ابن غلام! میں نے کہیں ایسے انسان نہیں دیکھے)۔

اس وقت صحیح معنوں میں مہاجرین کے صبر و شرافت کا امتحان تھا۔ کرکی میں آفندی کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ مہاجرین کی عزت بھی تھی اور ان کا زور بھی تھا۔ اگر اس وقت آفندی ہندی ہوتا اور مہاجرین ترک ہوتے تو بہت مشکل سے آفندی کی عزت محفوظ رہ سکتی تھی۔ لیکن مہاجرین قسم قسم کے آزمائشوں سے گذر کر کندن بن چکے تھے اس لئے ہم سب نے اتفاق سے جاکر آفندی سے معافی مانگی اور تاج الدین اور اس کے اور ساتھی جنہوں نے اسے چھیڑا تھا انہیں ملامت کیا۔ لیکن اس واقعے کے بعد آفندی کا دل کبھی ہمارے لئے صاف نہیں ہوا۔ ہمارے ساتھ ساتھ تاشقند تک گیا لیکن صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ہم سے ناراضگی اس کے دل میں ہے۔ مہاجرین کو ہمیشہ یہی احساس رہا کہ اتنے سارے آدمی ایک ترک کو راضی نہیں کرسکے جو ان سے ناراض ہی رہا۔

لطیف نے پروپیگنڈا شروع کردیا

لطیف نے کبھی بھی ہماری موجودگی میں شراب نہیں پی۔ پتہ نہیں کہ ہمارا لحاظ کر رہا تھا۔

یا واقعی نہیں پیتا تھا ۔ چند دنوں بعد جب اس کو احساس ہو گیا کہ مہاجرین میں وہ ہر دلعزیز ہو گیا تو اس نے باتوں ہی باتوں میں زار روس کے مظالم بیان کرنے شروع کئے ۔ ساتھ ہی ساتھ موجودہ نظام کے فوائد اور پرانے سرمایہ دارانہ نظام کے نقصانات بھی گنوائے ۔ بہت ذہین اور ہوشیار آدمی تھا بات کو بے وجہ طول نہیں دیتا تھا فوراً بات بدلنے میں ماہر تھا ۔

لطیف کا اخلاق جتنا اچھا تھا قدرت نے اسے اتنی ہی اچھی جوانی عطا کی تھی ۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے ہمارا پورا اعتماد حاصل کر لیا ۔ اسی کی بدولت ایک میل لمبا محاذ ہم نے بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال رکھا تھا ۔ چھاؤنی کے اعلیٰ افسران لطیف سے بہت خوش تھے ۔

کبھی کبھی رات کو عسکری افسران معائنے کیلئے گشت پر آجاتے ۔ رات کے دو بجے ایک دفعہ دو افسران مورچے کی طرف آئے ۔ میں مورچے میں اس وقت کھڑا تھا فوراً میں نے آواز لگائی :

"کتو تم ؟ ستوئی" (کون ہو! ٹھہرو)

انہوں نے جواب دیا "تاشقند" یہ صحیح جواب تھا اور اسی شام لطیف نے ہمیں سکھایا تھا ۔ آواز کے سنتے ہی اکبر خان اور لطیف بھی آموجود ہوئے ۔ معلوم نہیں کہ وہ پہلے سے باخبر تھے کہ گشت آئے گا یا آواز سن کر نکلے تھے ، اس دن ہم بہت جوش میں تھے ۔ سارا دن ہم پر ایسی فائرنگ ہوتی رہی کہ دونوں مورچوں میں سے کوئی بھی باہر نکل نہیں سکتا تھا ۔ روٹی بھی اس دن ہم نے مورچوں میں ہی کھائی تھی ۔ جب رات کی تاریکی پھیل گئی تو ہمارے عقب میں واقع چھاؤنی کے متصل ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہم پر متواتر فائرنگ ہوتی رہی ۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم پر ترکمانی حملے کی تیاری ہو رہی ہے ۔ عشار کے وقت دو ترکمان جو ہمارے مورچوں کے آس پاس پھر رہے تھے گرفتار کر لئے گئے ۔ سارا دن ان کو باندھ کر مورچوں میں رکھا گیا ۔ اور صبح سویرے مرکزی عسکری دفتر لے جایا گیا ۔ ساری رات ہمارے مورچوں پر متواتر فائرنگ ہوتی رہی اسی لئے ساری رات دونوں گروپ جاگ جاگ کر مقابلہ کر رہے تھے ۔

میں بیمار ہوا

ستمبر کے شروع میں رات کو بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ رات کو مورچوں میں ہم گرم گرم پوستینیں پہنے کھڑے ہوتے تھے۔ بہت عرصے بعد میرے کانوں کی پرانی بیماری عود کر آئی۔ لطیف کی منت سماجت کے باوجود بھی میں ہسپتال میں داخل نہیں ہوا۔ ہر صبح ہسپتال جاتا اور پچکاری سے میرے کان صاف کیے جاتے۔ خون اور پیپ صاف کر کے پٹی اور دوائی وغیرہ لگا لیتے۔

میں سخت تکلیف میں مبتلا تھا لیکن مورچے سے باہر رہنا منا سب نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے اپنے نمبر پر مورچے میں موجود رہتا۔ ساتھی سب سمجھاتے کہ کمرے میں آرام کر لینا چاہیئے لیکن میں اپنی جگہ ان کو تکلیف دینا گوارا نہیں کر رہا تھا۔

پشاور کا ساتھی عبدالرحمان مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ اپنے آرام کو بھی وہ میرے آرام پر قربان کر دیتا۔ میرے لئے وہ انیٹیں گرم کرتا اور انسے میرے کانوں کو سینکتا۔ بڑی افسردگی سے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یہ ذکر نا ہی پڑے گا کہ میرے کچھ ساتھی تو لمبے لمبے لیٹ کر بظاہر میری تکلیف پہ بہت افسوس کا اظہار کرتے لیکن عملاً وہ میری کچھ مدد کرنے کے لئے ہاتھ بھی نہیں ہلاتے تھے سارے سفر کے دوران پہلی مرتبہ مجھے اپنا گھر یاد آیا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس عذاب سے بھرپور سفر کا آخر مقصد ہی کیا ہے لیکن وطن عزیز میں غلامی کی زندگی نظروں کے سامنے گذرتی دل پھر مضبوط ہو جاتا۔ دل میں وطن جانے کے خلاف خیالات ابھر آجاتے اور اس طرح سفر کی صعوبتیں اور مصیبتیں آسان ہو جاتیں۔

جنگ اور تفریح

جتنی جنگ تیز ہوتی گئی۔ اتنا ہی ڈرامے کرنے اور سینما دیکھنے کا زور ہوتا۔ کبھی کبھی جب رات گئے مہاجرین کو فرصت ہوتی تو وہ تفریح کی خاطر سینما دیکھنے یا ڈرامہ دیکھنے چھاؤنی کے سینما میدان کی طرف چلے جاتے۔

ایک شام میں بھی سینما دیکھنے گیا۔ خیال تھا کہ سینما سے دل بہل جائے گا اور کچھ وقت گزاری بھی ہو

جائے گی۔ لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی دھوتی باندھے ہوئے ایک جنگل میں ایک میم صاحب کے پیچھے کچھ اٹھائے ہوئے چل رہا ہے۔ میم صاحب کے ہاتھ میں بندوق تھی اور شیر کا شکار کرنے جا رہی تھیں۔ اس منظر سے دل بہت رنجیدہ ہوا۔ میں دل ہی دل میں سخت بیکی محسوس کرنے لگا اور شرمندگی کیوں نہ ہوتی آخر میں بھی مہاجر تھا اور چھاؤنی میں لوگ ہمیں ہندی مہاجر کے نام سے ہی جانتے تھے۔ بالشویک آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ ترکی زبان مجھے کہاں آتی تھی جس سے مجھے کچھ اندازہ ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پردے پر لکھائی بھی روسی زبان میں آ رہی تھی۔ اس لئے میں نہیں معلوم کر سکا کہ فلم میں کیا دکھا رہے ہیں لیکن ہمارے ساتھ ان لوگوں کی صاف نیتی ان کی انگریز دشمنی سے صاف ظاہر تھی۔ اگر سینما ہوتا یا ڈرامہ وہ لوگ کسی بھی طریقے سے انگریز کا ہندوستانیوں پر ظلم و ستم دنیا کو دکھاتے اور اس طرح ہم سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ بالشویک سپاہیوں نے یقیناً میم کو برا بھلا کہا ہوگا۔

ترمذ میں ہم ڈرامے دیکھنے بھی جاتے رہے اور جلیانوالہ باغ کے قتل عام پر ایک ڈرامہ خود بھی پیش کیا۔ یہاں چھاؤنی کا کمیسار ایک دفعہ خود ہمارے پاس آیا اور ہمارے فارغ ساتھیوں کو اپنے ہمراہ ایک ڈرامہ دکھانے لے گیا۔ اس کا مقصد کسی طرح سے ہمیں خوش رکھنا تھا اور کرکی میں تفریح کا ذریعہ یہی ایک سینما تھا اور دوسرا افسروں کی خوبصورت بیگمات تھیں۔ وہ جنگ کے دنوں میں ہسپتال میں زخمیوں کی تیمارداری کرتیں یا مورچوں میں جا کر اپنی موجودگی سے سپاہیوں کے دلوں کو خوش کرتیں۔ آرام کرنے والے سپاہیوں کے سامنے ڈرامے سٹیج کرتیں اور ساز و آواز کے ذریعے سپاہیوں کا دل بہلاتیں۔

ہمارے محاذ پر ہمارے چند ساتھیوں کے ساتھ بڑے بڑے پہیوں والی مشین گن تھی۔ یہ لوگ انگریزی فوج کے ایک پہاڑی گروپ کے تربیت یافتہ سپاہی تھے اس لئے مشین گن سے کام لینا اچھی طرح جانتے تھے۔ ہمارا محاذ اسی وجہ سے مضبوط بھی تھا۔ ہر رات کو اس مشین گن کی جگہ بدلتے رہتے تاکہ دشمن کو یہ اندازہ نہ ہو کہ ایک ہی مشین گن موجود ہے اور وہ مغالطے میں رہے۔

دس بارہ دن میں چار جوئے کی چھاؤنی سے ہمارے لئے کمک پہنچ گئی۔ ترکمان آہستہ آہستہ بکھرنے لگے۔ قبائلی لشکر کا آخر میں یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک دن صبح سویرے لطیف ہنستا ہوا آیا اور

جائے گی۔ لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی دھوتی باندھے ہوئے ایک جنگل میں ایک میم صاحب کے پیچھے کچھ اٹھائے ہوئے چل رہا ہے۔ میم صاحب کے ہاتھ میں بندوق تھی اور شیر کا شکار کرنے جا رہی تھیں۔ اس منظر سے دل بہت رنجیدہ ہوا۔ میں دل ہی دل میں سخت بیکی محسوس کرنے لگا اور شرمندگی کیوں نہ ہوتی آخر میں بھی مہاجر تھا اور چھاؤنی میں لوگ ہمیں ہندی مہاجر کے نام سے ہی جانتے تھے۔ بالشویک آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ ترکی زبان مجھے کہاں آتی تھی جس سے مجھے کچھ اندازہ ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پردے پر لکھائی بھی روسی زبان میں آ رہی تھی۔ اس لئے میں نہیں معلوم کر سکا کہ فلم میں کیا دکھا رہے ہیں لیکن ہمارے ساتھ ان لوگوں کی صاف نیتی ان کی انگریز دشمنی سے صاف ظاہر تھی۔ اگر سینما ہوتا یا ڈرامہ وہ لوگ کسی بھی طریقے سے انگریز کا ہندوستانیوں پر ظلم و ستم دنیا کو دکھاتے اور اس طرح ہم سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ بالشویک سپاہیوں نے یقیناً میم کو برا بھلا کہا ہوگا۔

ترمذ میں ہم ڈرامے دیکھنے بھی جاتے رہے اور جلیانوالہ باغ کے قتل عام پر ایک ڈرامہ خود بھی پیش کیا۔ یہاں چھاؤنی کا کمیسار ایک دفعہ خود ہمارے پاس آیا اور ہمارے فارغ ساتھیوں کو اپنے ہمراہ ایک ڈرامہ دکھانے لے گیا۔ اس کا مقصد کسی طرح سے ہمیں خوش رکھنا تھا اور کرکی میں تفریح کا ذریعہ یہی ایک سینما تھا اور دوسرا افسروں کی خوبصورت بیگمات تھیں۔ وہ جنگ کے دنوں میں ہسپتال میں زخمیوں کی تیمارداری کرتیں یا مورچوں میں جا کر اپنی موجودگی سے سپاہیوں کے دلوں کو خوش کرتیں۔ آرام کرنے والے سپاہیوں کے سامنے ڈرامے سٹیج کرتیں اور ساز و آواز کے ذریعے سپاہیوں کا دل بہلاتیں۔

ہمارے محاذ پر ہمارے چند ساتھیوں کے ساتھ بڑے بڑے پہیوں والی مشین گن تھی۔ یہ لوگ انگریزی فوج کے ایک پہاڑی گروپ کے تربیت یافتہ سپاہی تھے اس لئے مشین گن سے کام لینا اچھی طرح جانتے تھے۔ ہمارا محاذ اسی وجہ سے مضبوط بھی تھا۔ ہر رات کو اس مشین گن کی جگہ بدلتے رہتے تاکہ دشمن کو یہ اندازہ نہ ہو کہ ایک ہی مشین گن موجود ہے اور وہ مغالطے میں رہے۔

دس بارہ دن میں چار جوئے کی چھاؤنی سے ہمارے لئے کمک پہنچ گئی۔ ترکمان آہستہ آہستہ بکھرنے لگے۔ قبائلی لشکر کا آخر میں یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک دن صبح سویرے لطیف ہنستا ہوا آیا اور

کہنے لگا "ابھی توپ پہنچ جائے گی۔ اور دریا کے اس پار سامنے والی پہاڑی کو نشانہ بنایا جائے گا۔ دن کو خوب تماشا ہوگا۔ ترکمانوں کا زور کم ہو گیا ہے۔ پہاڑی میں چند ترکمان چھپے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہیں سے آپ پر فائر کر رہے ہیں توپ ان کو وہاں سے بھگا دے گی۔"

سہ پہر تک پہاڑی سے گرد و غبار اُٹھتا رہا۔ چھوٹی سی پہاڑی تھی اور دریا اس جگہ کافی چوڑا تھا اسلئے صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ لطیف نے کماندار سے دوربین لی اور اس کے ذریعے ہم نے بھی بندوق اور توپ کا مقابلہ دیکھا۔ اس سہ پہر کے بعد ہم پر پھر کبھی اس جگہ سے فائر نہیں ہوا۔

چودھویں روز خوشخبری سنائی گئی کہ جنگی جہاز پہنچ گیا۔ ہم اس کا تماشہ کرنے گئے۔ اور اس کے اوپر چڑھ کر اس کو دیکھنے لگے۔ اس جہاز میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت کمرے تھے۔ اس طرح دکھائی دے رہا تھا جیسے کہ ایک چھوٹا سا خوش نما بنگلہ ایک کشتی کے اوپر رکھ دیا ہو۔ جہاز کے ارد گرد ریت کی بوریوں کی دیوار بنالی گئی تھی۔ اس میں مورچے بنے ہوئے تھے۔ سپاہی مشین گنوں پر تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاز کے ساتھ ایک بڑی سی کشتی بندھی ہوئی تھی۔

روانہ ہونے سے پہلے ایک افسوس ناک خبر پہنچی اور اس نے سب کو رنجیدہ کر دیا۔ ہوا یوں کہ سپاہیوں کی گشتی ٹولی راستے میں کہیں جا رہی تھی ترکمانوں نے ان سب کو اپنا مہمان بنا کر قتل کر دیا۔ سپاہیوں کا ایک دستہ جس میں ہمارے دس افراد شامل تھے ان کے پیچھے روانہ ہوئے اور شام کو لاشوں کے ہمراہ واپس پہنچ گئے۔

انہی دنوں ظاہر ہوا کہ بالشویک چھاؤنیوں سے باہر کے علاقوں پر قبضہ نہیں جما سکتے۔ صرف چھاؤنی ہی بمشکل ان کے پاس رہ سکتی ہے۔ وہ بھی دریائے آمو کی برکت سے۔

دریا کے شمالی کنارے چھاؤنی کے بالمقابل ریل گاڑی کا مسمار شدہ سٹیشن تھا۔ دریا کے کنارے شمالی طرف نجارا سے ترمذ چھاؤنی تک ریل کی پٹڑی انقلاب کے دوران تباہ ہو گئی تھی۔ ابھی تک ریل بند تھی۔ دریائے آمو کی برکت سے ان چھاؤنیوں اور جمہوریہ ترکستان کے درمیان جنگی جہازوں کی آمد و رفت قائم تھی۔ افغانستان کے اس طرف بالشویکوں کی تین مضبوط چھاؤنیاں ترمذ، کرکی اور

چار جوئے کی ہیں۔ جن کو انہوں نے بڑی قربانیاں دے کر بچایا ہوا تھا۔ چھاؤنی میں تھوڑی سی فوج موجود تھی اور قرب وجوار میں ہر طرف مسلح ترکمان قبیلہ پڑا ہوا تھا۔ زیادہ تر علاقے پر امیر بخارا کی حکومت تھی۔

ترمذ چھاؤنی میں امیر کا نمائندہ حاکم ہماری امداد کے لئے تیار تھا اور اگر ہم نے اس کی پیش کش منظور کر لی ہوتی تو بخارا تک آرام سے پہنچ جاتے۔ لیکن ہم نے یہ پیش کش اس لئے منظور نہ کی کہ ہمیں ترکوں کے وطن اناطول جانا تھا یا تاشقند کے عسکری سکول میں داخل ہونا تھا اور یہ بالشویکوں کی امداد سے ہی ہو سکتا تھا۔

کرکی سے رخصت

صبح سویرے جہاز پہ سوار ہونے کے لئے کنارے کی طرف گئے۔ چھاؤنی کا عسکری کماندار اور سیاسی کمیسار لطیف اور چند افسران معہ اپنی بیویوں کے ہمیں الوداع کہنے آئے۔ وہ اپنے ساتھ ہمارے لئے ایک ہفتے کا راشن بھی لے آئے تھے اور دریا کے کنارے تک ہمارے ہمراہ آئے۔

کماندار اور کمیسار کی الوداعی تقریریں لطیف نے ہمارے لئے فارسی میں ترجمہ کیں کمیسار کے آخری الفاظ سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ اس نے کہا

"سوویت دنیا کے مظلوموں کا اپنا گھر ہے۔ انگریزی استعمار تمام دنیا کا دشمن ہے۔ سوویت یونین تمام دنیا کے آزادی خواہوں کی امداد کے لئے ہمہ وقت تیار ہے۔" آخر میں اس نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی "کرکی کے بچاؤ میں ہندوستانی ساتھیوں کی دلیری کا ذکر کرکی کی انقلابی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا اور یہ جمہوریہ ترکستان اور آزاد ہندوستان کے درمیان تعلقات کو دوام بخشے گا۔"

ہم پر اس مظاہرے کا کافی زیادہ اثر ہوا۔ کرکی کے حاکموں اور خصوصاً لطیف کا زبردست شکریہ ادا کیا گیا۔ ہم سب جہاز کے پیچھے بندھی ہوئی کشتی میں سوار ہو گئے۔ اگرچہ کشتی معمولی سی چیز تھی تاہم ہم سمجھتے تھے کہ یہ صرف ہماری حفاظت کی خاطر چار جوئے سے بھیجی گئی ہے۔ اسی لئے ہم نے اسے اپنے لئے باعث عزت سمجھا۔

خطرے کے وقت کشتی میں نیچے بیٹھ جاتے اور ترکمانوں کی گولیوں سے محفوظ ہو جاتے۔ اس کے

وقت کشتی کے اوپر بیٹھ جاتے۔ کشتی چارجوئے کی طرف روبہ قبلہ رواں تھی۔ راشن کی مقدار سے معلوم ہوا کہ ہمارا چارجوئے پہنچنا کوئی معمولی کام نہیں۔ راستہ بہت لمبا بھی نہیں تھا۔ زیادہ سامان احتیاطاً ساتھ رکھ لیا گیا تھا۔

دریا کے دونوں کنارے بہت سرسبز تھے۔ کشتی کے اوپر بیٹھے ہوئے ہم نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کھانا پکانے کا انتظام کشتی ہی میں موجود تھا۔ اس لئے اترنے کی ضرورت پیش نہیں آرہی تھی۔ کبھی کبھی جب کشتی ٹھہری ہوئی ہوتی ہمارا دل نیچے اتر کر سیر کرنے کو بہت للچاتا لیکن جہاز کے کماندار نے ایسا کرنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔

جہاز دن کے وقت سفر کرتا اور رات کو کسی محفوظ مقام پر کھڑا رہتا تھا۔ دن کو ترکمان ہمیں آرام کرنے نہیں دیتے تھے اور رات کو بھی ان کی وجہ سے نیند مشکل تھی۔ مقابلہ ہاتھی اور مچھر کا تھا۔ چھوٹی توپوں اور مشین گنوں سے ترکمان پھر دیکھنے کو بھی نہیں ملتے تھے۔ کیونکہ دریا کا کنارہ ان کی مدد کرنے سے قاصر تھا اور میدان میں ان کے چھپنے کو کوئی جگہ نہیں تھی۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے .... بس دن یونہی گذرتے رہے اور ہم مشینی بیڑے کی اس رفتار سے اکتا گئے۔ جگہ جگہ کیچڑ اور ریت میں جہاز پھنس جاتا اور پھر نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ کبھی کبھی آگے چلتے اور کبھی پیچھے پلٹ جاتے۔ انقلاب سے دریا کا کنارہ بھی نہیں بچا تھا۔ جہاز کی کیا خطا تھی بس آنکھیں بند کئے چلتے رہے۔ کبھی کبھی جب ہم کم پانی میں آکر پھنس جاتے تو پھر پیچھے کی طرف چل پڑتے۔ کشتی پر اس وقت پیشاب ہو جاتے ایک تو خود کو اس مصیبت سے نکالنا اور اوپر سے اس کا بوجھ ناقابل برداشت ہو جاتا۔

ہم دن گن رہے تھے اور یہ امید رکھے ہوئے تھے کہ سات دن میں پہنچ جائیں گے۔ پانچ دن بیت گئے لیکن چارجوئے کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ چھٹا دن بھی ختم ہونے لگا لیکن چارجوئے ابھی تک عنقاء تھا ساتواں دن شروع ہوا دانہ پانی بھی ختم ہونے لگا لیکن چارجوئے ابھی کہاں۔ جہاز پورا ایک دن تو ایک ہی جگہ کھڑا رہا ساتواں دن جب شروع ہوا تو پتہ چلا کہ خوراک

بالکل ختم ہوگئی ہے۔ جہاز کے ملاحوں کا اللہ بھلا کرے کہ کچھ رس انہوں نے بھیجے جو ہم نے چائے کے ساتھ کھائے اس طرح وہ دن گذارا۔

بھوک مہاجرین کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور ساتھ ہی "کل انشاء اللہ پہنچ جائیں گے" کی اُمید افزا خبریں بھی سننے میں آرہی تھیں۔ ایک دن کی بات ہے۔ ایک دن جب کھانے کو روٹی نہیں ملی تو ملاحوں نے رس بھیجے۔ صبح اگر وہ بھی نہ ملے تو پرواہ نہیں۔ کیونکہ ان غریبوں کی اپنی خوراک بھی ختم ہو گئی۔ اس قسم کی باتیں شروع ہوئیں۔

صبح ہوئی ہم کشتی کے اوپر چڑھ کر اس بیتابی سے چارجوئے کی جانب دیکھنے لگے۔ جیسے لوگ عید کا چاند دیکھتے ہیں لیکن چارجوئے کا کچھ اتا پتہ نہیں تھا۔ کسی کی آواز آتی:

"سپاہیوں کا کہنا ہے کہ آپ لوگ افسردہ مت ہوں۔ چارجوئے قریب ہی ہے۔ جلد ہی پہنچ جائیں گے۔"

عصر کا وقت ہوگیا لیکن پھر بھی چار جوئے کے آثار نہیں نظر آرہے تھے۔ وہ رات بھی گذر گئی۔ نواں دن شروع ہوا۔ ملاحوں نے پھر کچھ رس بھیجے لیکن ان سے کیا بنتا تھا۔ تیسرا دن تھا رسوں پر گذارا چلا رہے تھے اور وہ بھی اتنا کہ ناشتے کے لئے بھی ناکافی تھے۔ اسی اثنا میں ملاحوں کی طرف، سے اطلاع آئی "اگر جہاز شام تک اسی رفتار سے چلتا گیا تو چارجوئے پہنچ جائیں گے۔" ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی ملی کہ دوپہر کو آلو کا شوربہ دیں گے۔

امن کے دنوں میں یہ جہاز کرکی سے چارجوئے تک کا سفر صرف ایک دن میں طے کرسکتا تھا لیکن نو دن تو گذرنے کو آئے اور خدا خبر کہ نویں دن بھی پہنچے گا یا نہیں۔ "دو اور دو، چار روٹیاں" والی بات تھی جب ملاح جہاز میں حرکت کرتے تو ہمیں یوں لگتا جیسے وہ شوربا لا رہے ہیں۔

"یہ آلو کا شوربہ کس طرح کا ہوتا ہے" ایک نے آواز لگائی۔

"کیوں کبھی آلو گوشت نہیں کھایا ہے کیا" دوسرے نے جواب دیا۔

"گوشت کہاں" تیسرا ہنس پڑا "شاید تم لوگ کوئی خواب دیکھ رہے ہو۔"

درختوں کے درمیان دریا کے اوپر لوہے سے بنا ہوا ریل کا اونچا پل نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چھاؤنی میں تعمیر کردہ بڑی عمارتیں بھی نظر آنے لگیں۔ ہم چپ چاپ لیکن پر اُمید بیٹھ گئے۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے ہم ایک عظیم الشان ریلوے پل کے نیچے سے گذر رہے تھے۔ یہ پل دریائے آمو پر باندھا ہوا تھا۔ اس پل پر سے ریل تاشقند بخارے کی جانب سے مرو اور بحیرہ خضر (CASPIAN SEA) کی طرف جاتی ہے۔ ہم پل کے نیچے سے جارہے تھے اور ریل ہمارے سروں کے اوپر پل پر سے گذر رہی تھی۔ بہت عرصے بعد تہذیب کی ایک بڑی نشانی نظر آئی تھی۔

دریا کے کنارے جہاز کے کھڑے ہونے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ ہم وہاں جہاز سے اترے۔ فٹنوں میں سوار ہو گئے۔ ترکمانوں کی برکت سے ہمارا سامان صرف تن ڈھکنے کے تین کپڑوں تک ہی محدود تھا۔

چار جوئے میں بھی ہم سپاہیوں کے مہمان تھے۔ لمبے بارک بنے ہوئے تھے۔ کھانا ہم نے اتنا کھایا کہ صبح تک ہلنے جلنے کے قابل نہیں تھے۔ چار جوئے بھی ایک آباد چھاؤنی ہے۔

مہاجرین میں جدائی آتی ہے

صبح سویرے ہمیں اطلاع ملی کہ تاشقند میں موجود ہندوستانیوں کے وفد کی طرف سے ایک روسی ہمیں لینے آیا ہوا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم جلد از جلد تاشقند پہنچ جائیں۔ اس خبر کے سنتے ہی آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

بارک کے اندر حاجی شہاب الدین ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے اور مہاجرین ان کے اردگرد کھڑے۔ اسی طرح حاجی معراج الدین نے بارک کے باہر اپنے اردگرد ایک جمگھٹہ کھڑا کر رکھا تھا۔ اور ان کے ساتھ کا نا پھوسی میں مصروف تھے۔

اکبر خان نے مجھ سے دریافت کیا۔ "اکبر شاہ کچھ جانتے بھی ہو کہ حاجی صاحبان نے اپنے اردگرد کیا مجالس گرم کر رکھی ہیں"

'میں نے کہا نہیں'۔

اکبر میرے قریب ہو گیا اور کہنے لگا "یہ لوگوں کو تاشقند جانے سے روک رہے ہیں۔ ہم مہاجر ہیں اور غزا کے لئے ترکی جا رہے ہیں تاشقند میں آخر ہمارا کیا کام"۔

مجھے اس بات پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ موجودہ سوال کا فیصلہ تو کرکی میں ہی ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے کے لحاظ سے صاف بات کوئی نہیں کر پایا تھا بس چپکے ہی الگ ہو چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں باقاعدہ ایک جلسہ شروع ہوا۔ دونوں فریقوں نے باری باری اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہاجرین کے رہنما اکبر خان نے سارے سفر کے دوران پہلی بار صدارت کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا " میں خود بھی اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ میری جگہ اور کوئی صدارت کرے"۔

تھکال کے حاجی عبدالرحیم کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ اسی دوران تاشقند سے پیغام لانے والا بھی پہنچ گیا۔ صدر کے کہنے پر اس نے ہندوستانی انقلابیوں کے رہنما ایم این رائے کا پیغام مجھے دیا۔ مجھے کہا گیا کہ پہلے یہ پڑھوں اور پھر اس کا ترجمہ کروں۔ پیغام انگریزی زبان میں تھا۔ اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

" انقلابیو! ہند سے آنے پر آپ کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے متوالو میں سوویت روس کی طرف سے آپ کو تسلی دیتا ہوں کہ سوویت ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لئے آپ کو ہر قسم کی امداد دینے پر تیار ہے۔ میں اور تمام سوویت روس آپ کے ساتھیوں کے قتل ہونے پر سخت غمزدہ ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سوویت نے تاشقند میں آپ لوگوں کے لئے فضائی تربیت کا پورا پورا انتظام کر رکھا ہے اور یہ اس لئے کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں آپ لوگ کامیابی کے ساتھ سامراجی قوتوں کے خلاف لڑ سکیں"۔

اس کے بعد گرم گرما بحث شروع ہوئی۔ تاشقند سے آنے والا پیغام بر ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ بحث کیوں اتنی گرمی اختیار کر چکی ہے۔ دو گروپ پہلے سے بن چکے تھے۔ ہمارا گروپ جس نے کرکی چھاؤنی کے بچاؤ میں ترکمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ تاشقند جانے پر راضی تھا۔ دوسرا گروہ اناطولیہ جانے کے خواہشمند تھا گزشتہ مصیبتوں کی وجہ سے مہاجرین

میں ایک دوسرے کے لئے بڑی محبت اور ہمدردی موجود تھی۔ یہ محبت اور احترام اس حد تک موجود کہ دونوں گروہوں کے نمائندوں نے ایک دوسرے کی منزل کو جہاد کا نام دیا۔ تاشقند جانا اپنے وطن عزیز کو غلامی سے نجات دلانا تھا جبکہ اناطولیہ جانا یونانی ظالم کے ہاتھوں جس نے انگریزوں کی امداد سے ترکی پر حملہ کیا تھا، کی مخالفت کرنا تھا۔

روسی کو بہت زیادہ انتظار کی زحمت اٹھانا نہیں پڑی۔ بہت جلد اس کو بتایا گیا کہ سینتیس افراد تاشقند جائیں گے۔ ان کے جانے کا انتظام کیا جائے۔ اور ساتھ ہی چھاؤنی کے کمشنر کو اطلاع دی گئی کہ بقیہ سینتیس افراد کا حکومت کے خرچ پر اگر اناطولیہ جانے کا پروگرام بنایا جائے تو ہند کا انقلابی گروہ اس پر بہت مشکور و ممنون ہوگا۔

ہم چند ساتھی سخت مصیبتیں اور تکالیف برداشت کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سب سے پہلے ہم پر وطن کی آزادی کی خاطر جہاد فرض ہے۔ جب ہمیں اپنی آزادی مل جائے تو پھر باقی مسلمان بھائیوں کی آزادی کی خاطر لڑیں گے۔ مزار شریف میں وزیر انصاف کے باڈی گارڈ میں ایک سپاہی کی بات میری کانوں میں ابھی تک گونج رہی تھی "کیا آپ لوگوں نے اپنا وطن آزاد کرا لیا جو ترکوں کی امداد کے لئے جا رہے ہو۔" اسی طرح دوران سفر آہستہ آہستہ بہت سے مہاجرین کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہمارا دشمن انگریز ہے۔ اسی کی وجہ سے ہم در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

میرے سر میں بے شمار جوئیں پڑ گئیں

اس فیصلے کے بعد میں چند دوستوں کے ہمراہ بازار کو نکلا اور ایک وضعدار حجام کی دکان پر حجامت بنوانے کے لئے داخل ہوا۔ کرسی پر بیٹھ گیا اور اشارے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے بال بنا دے۔ حجام نے ایک سفید چادر میرے گرد لپیٹ لی تاکہ بال میرے کپڑوں پر نہ گرنے پائیں اور ایک قینچی اور کنگھی سے بال کاٹنے شروع کئے۔ بال کٹائی ابھی اس نے شروع ہی کی تھی کہ اچانک اس نے ایک آواز لگائی "ادہو" اور ساتھ ہی فوراً مجھے بازو سے زور سے پکڑ کر دکان سے باہر نکالا۔ میں

حیران کہ یہ کیا ہوا۔ جب سفید چادر کی طرف نظر دوڑائی تو اس پر بے شمار جوئیں پھر رہی تھیں ۔ ساتھی بھی حیران اور شرمندہ کھڑے تھے ۔ میں باہر زمین پر بیٹھ گیا ۔ حجام نے قینچی اور کنگھی رکھکر مشین نکالی اور مجھے پوچھے بغیر میرے بال کاٹنے شروع کیئے ۔ تھوڑی ہی دیر میں جس طرح میرے سر کے بے حساب بال زمین پڑے تھے اسی طرح بے شمار جوئیں زمین پر ادھر اُدھر چیونٹیوں کی طرح بھاگ رہیں تھیں ۔ ہم چپ چاپ بیرک واپس آئے ۔ اپنی حالت دیکھ کر مجھے بہت شرمندگی ہوئی ۔

لیکن اپنے گریبان میں نظر دوڑانے پر خود کو اتنا گناہ گار اس لئے نہیں پا رہا تھا کہ ترکمانوں کی قید میں تو منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا جا سکتا تھا ۔ کرکی پہنچنے پر جنگ کی وجہ سے فوراً مورچے میں گئے ۔ ساتھ ہی فوراً میرے کانوں کا درد شروع ہوا ۔ دریائی سفر کے دوران کشتی میں بھی اپنی صفائی ناممکن تھی ۔ ایک تو سفر اور دوسرا کانوں کا درد ، میں سخت پریشان تھا ۔ شام کے وقت چارجوئے پہنچنے پر ہم تو بھوک کی وجہ سے بے حال تھے اور اتنی روٹی کھائی تھی کہ صبح تک بے سدھ پڑے تھے ۔ اگر مجھے اندازہ تک بھی ہو جاتا کہ میرے سر میں اتنی جوئیں پڑ چکی ہیں تو میں حجام کی دکان پر کبھی بھی نہیں جاتا ۔ ایک ساتھی کے پاس قینچی موجود تھی ۔ پردے میں بیٹھ کر بالوں اور جوؤں سے نجات پا چکا ہوتا ۔

دریائے آمو کا کنارہ

ترمذ چھاؤنی سے چارجوئے تک ایک لمبا سفر ہے ۔ دونوں کنارے سرسبز و شاداب ہیں قدم قدم پر باغات اور چھوٹے چھوٹے دیہات واقع ہیں ۔ ترمذ سے چارجوئے تک ہم نے دیکھا کہ یہی ایک ترکمان قبیلہ ہی آباد ہے یہ قبیلہ اور بھی آگے مرو ، عشق آباد اور بحیرہ خضر تک پھیلا ہوا ہے ۔

دریائے آمو کا پاٹ وسیع ہے اور زمانہ قدیم سے اس علاقے کی آمدورفت اور آب پاشی کا ذریعہ ہے ۔ یہ دریا افغانستان اور سوویت ترکستان کے درمیان حد فاصل کا کام دے رہا ہے ۔

چارجوئے سے ہم تیسرے دن مال گاڑیوں میں رخصت ہوئے ۔ چارجوئے کے سٹیشن سے دو گاڑیاں بالمقابل اطراف کو روانہ ہوتیں ہیں ۔ ہمارے سینتیس افراد کے دو ڈبے ایک گاڑی سے بندھے

ہوئے بخارے اور تاشقند کی طرف رُخ کئے ہوئے تھے جبکہ دو اور اس قسم کے ڈبے ایک دوسری مال گاڑی کے ساتھ جس کا رُخ بحیرہ خضر اور باکو کی طرف تھا بندھے ہوئے تھے۔ مہاجرین کبھی اتنے افسردہ نہیں ہوئے تھے۔ کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے سے رخصت لی اور اپنے اپنے گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

بخارا

چار گھنٹوں میں ہم گرگان ریلوے سٹیشن پہنچے۔ یہ سٹیشن تاشقند اور چارجوئے کی راہ میں جنکشن کا کام دیتا ہے۔ یہاں سے ایک لائن بخارا کی طرف آجاتی ہے۔ گرگان سے ہم دو گھنٹوں میں بخارا پہنچے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اردگرد نظر دوڑائی۔ ریل کی بوگیاں الٹی پڑی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ مرے ہوئے گھوڑے پڑے تھے۔ سپاہی ان کے سروں پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ منشویکوں نے اسلحہ اور بارود سے لدی ہوئی ایک گاڑی کو اڑایا تھا۔ اسی کی وجہ سے زیادہ نقصان ہوا تھا۔

بخارا میں ہم نے دو تین دن گذارے۔ شہر کے اردگرد اونچی دیواریں تھیں۔ شہر تنگ اور گنجان آباد تھا۔ گلیاں تنگ تھیں۔ گاڑی کا گذرنا ناممکن تھا۔ صرف پیادہ آدمی یا گھڑسوار بازار میں چل پھر سکتا تھا۔

بخارا کا انقلاب

بخارا میں امیر کی حکومت تھی۔ زار روس کے مرنے کے بعد امیر اور بالشویکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا لیکن اس عہدنامے کے باوجود اس کے اور بالشویکوں کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ اس کی حکومت پامیر سے مرو تک پھیلی ہوئی تھی لیکن چھاؤنیوں پر بالشویکوں کا قبضہ تھا۔

امیر کو لوگ جناب عالی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کی حکومت غیر مشروط طور پر مطلق العنان تھی۔ لوگوں کی آواز کی کوئی رسائی نہیں تھی۔ ساری سلطنت میں اخبار نہیں تھا۔ اگر کبھی کسی بدقسمت انسان کے پاس اخبار پایا جاتا تو بغیر مقدمہ چلائے اس کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ برائے نام بھی کوئی اسمبلی یا کونسل نہیں تھی۔

نہ کوئی آئین تھا اور نہ کوئی قانون ۔ نہ اپیل کے لئے کوئی عدالت تھی اور نہ ہی ہائیکورٹ ۔ صرف جناب عالی تھا اور اس کے نامزد وزراء سلطنت کے ایک سرے دوسرے سرے تک حاکم مقرر تھے ۔ ان کے پاس وطن کے دیوانی اور فوجداری مقدمات نمٹانے کے تمام تر اختیارات موجود ہوتے ۔

امیر کی حکومت میں شریعت برائے نام ہی نافذ تھی ۔ ہر ایک حاکم خود ہی قاضی ہوتا ۔ وہ تمام فیصلے "شریعت" کے مطابق کرتا ۔ جن میں سے اکثر فیصلے زبانی ہوتے ۔ نئے زمانے کے فوجداری یا ضابطہ دیوانی کا اس کی عملداری میں نام لینا جدیدیت سمجھا جاتا ۔ حاکموں نے شریعت کی حرمت خود ہی چھوڑ دی تھی کیونکہ ان کے فیصلے شریعت کے موافق بالکل نہیں تھے ۔ بلکہ ان کی اپنی اپنی مرضی کے مطابق ہوتے ۔ جو ان کے دل میں آتا وہی کر چکتے ۔

جناب عالی کی حکومت کا نظم و نسق بالکل اچھا نہیں تھا ۔ فوج صرف بخارا میں موجود تھی ۔ اور وہ بھی صرف پایہ تخت کے بچاؤ کے لئے قومی امداد غیر یقینی اور کمزور تھی ۔ ترکمانوں کے سردار اور بڑے بوڑھے بھی جدید خیالات کے سخت مخالف تھے لیکن بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں عوام کی کافی تعداد جناب عالی کی حکومت کے برخلاف تھی ۔ امیر، جاگیردار اور سرمایہ دار کے خلاف منظم طور پر پروپیگنڈہ جاری تھا ۔ غریب ترکمان بھی امیر کی حکومت کی تباہی و بربادی پر خوش تھے ۔

ہمارے پہنچنے سے چند دن قبل بخارا میں انقلاب برپا ہو چکا تھا ۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے جدیدی حکومت پر قابض ہو چکے تھے ۔ بتایا گیا کہ جناب عالی انقلاب رونما ہونے کے تیسرے دن پایہ تخت سے فرار ہو چکا تھا ۔ امیر کی ترکمانی فوج پہلی رات جنگ کے شروع ہونے پر بھاگ گئی ۔ لیکن شاہ امان اللہ خان کے بھیجے ہوئے ساڑھے تین سو سپاہیوں نے تین دن تک توپخانے کی مدد سے مقابلہ کیا اور پھر اسلحہ رکھ دیا ۔ اس جنگ میں ترکستانی بالشویکی سپاہیوں نے بخارا کے انقلابیوں کی امداد کی اس وجہ سے جنگ کا فیصلہ بہت جلد ہو گیا ۔

بخارا کی تعلیمی حالت

ہم نے بخارا میں صرف چند ہی یوم گذارے اس لئے پورا احوال درج کرنے سے قاصر ہوں ۔ لیکن ہم نے یہ قلیل عرصہ اچھی طرح استعمال کیا ۔ سارا سارا دن شہر میں گھومتے رہے ۔ شہر کے مختلف محلوں میں واقع

سکول اور مکتبوں کے استادوں اور شاگردوں سے تبادلہ خیالات کیئے۔ یہ پتہ چل گیا کہ تعلیم صرف بغیر ترجمہ کیئے ہوئے قرآن شریف پڑھنے تک ہی محدود تھی۔ مدرسے قابل دید تھے۔ عظیم الشان عمارتیں تھیں لیکن طالب علم چندے محدود ہی رہے اور تعلیم تو نہ ہونے کے برابر تھی۔

میرے خیال میں یہ مدرسے سینکڑوں سال پہلے سے بنے ہوئے تھے۔ بخارا مشرق میں علم کا سرچشمہ تھا۔ اسی جگہ سے دنیا میں علم کی روشنی پھیلی۔ یہ عمارات اس وقت کی ایک یادگار تھیں لیکن اب ان میں کیا رہا تھا۔ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ افسردگی سے طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔ بخارا میں تاریکی تھی۔ جو روشنی سارے جہان کو منور کر رہی تھی اب بخارا شہر کو بھی روشن نہیں کر سکی۔ اس لئے تو وہاں کی حکومت عصر جدید کے تقاضوں کے آگے تین دن بھی نہیں ٹھہر سکی اور جناب عالی نے کابل میں پناہ لے لی۔ کہا جاتا ہے کہ جناب عالی نے سونے کی اینٹوں سے خچر لادے اور ویرانوں سے ہوتا ہوا افغانستان جا پہنچا۔ بخارا کی حکومت وسطی زمانے کی یادگار تھی اسی لئے نئے زمانے کے سیلاب میں خاشاک کی طرح بہہ گئی۔

بخارا میں تعلیم کے لئے کوئی محکمہ نہیں تھا اور نہ حکومت یہ فرض سمجھتی تھی کہ تعلیم پر کچھ خرچ کرے۔ اگر تھوڑی بہت تعلیم بخارا میں موجود بھی تھی تو وہ انفرادی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ ایسے علماء بھی موجود ہیں جو مسجدوں میں طالب علم رکھتے ہیں اور ان کو وہیں تعلیم دی جاتی ہے لیکن امیر کے زمانے میں جدید زمانے کی معیاری تعلیم بالکل نہیں تھی۔

بخارا میں صنعت و حرفت بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ نہ چھوٹے اور نہ ہی بڑے کارخانے موجود ہیں تجارت صرف کپڑے کی درآمد اور زندگی کی اور ضروریات تک محدود تھی۔

انقلاب کی نشانی

جناب عالی کے محل کے اردگرد عمارات گولہ باری کی وجہ سے پیوند خاک ہو چکی تھیں۔ مزدور اس جگہ کو ہموار کر رہے تھے۔ وہ وہاں پر ایک صاف میدان بنا رہے تھے جس میں سرسبز گھاس لگائی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی خوبصورت اور دلکش پھول بھی اُگائے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ گملے بھی رکھے جا رہے تھے۔ نئی حکومت

لوگوں کو یہ ترغیب دے رہی تھی کہ سہ پہر کو ہوا خوری کے لئے اس میدان میں تشریف لائیں۔ بخارا کا شہر قلعہ بند اور گنجان ہے۔ ایک دن ضرور اس کی چار دیواری گرائی جائے گی اور لوگوں کو تازہ ہوا میں نکلنے کی ترغیب ملے گی اور باہر رہ لوگ تازہ ہوا میں سانس لے سکیں گے۔

نئی حکومت کو قائم ہوئے صرف چند دن ہوئے تھے۔ ان کی تعلیمی، صنعتی یا معاشرتی سکیموں کے متعلق ہمیں کچھ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

نوشہرہ اور پشاور کے پرانے تاجر ہمیں خوش آمدید کہنے ہمارے پاس آئے۔ انہوں نے ہمیں اچھی میزبانی دی۔ انہوں نے ہمیں بخارا کی موجودہ اور سابقہ تاریخوں سے واقف کرایا۔ جناب عالی کی حکومت کے وہ مداح نہیں تھے ہاں جدیدیوں سے بھی ناخوش تھے۔ نئی حکومت نے سوداگروں کے کپڑوں کے گودام ضبط کر لئے تھے۔ نوشہرہ کے رہنے والے عبدالرشید کی مشہور "سرائے عبدالرشید" بھی دیکھی۔ توپ کا ایک گولہ سرائے میں بھی آ گرا تھا۔ اس سے ہونے والا نقصان صاف دکھائی دے رہا تھا۔

بخارا میں سفیر افغانستان سے ملاقات

بخارا میں عبدالہادی خان افغانستان کی طرف سے سفیر کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے نہایت مہربانی سے ہم چار اشخاص یعنی اکبر، گوھر، سلطان اور مجھے شام کھانے کی دعوت بھی دی۔ کھانے کے بعد مختلف موضوعات زیر بحث آئے۔ باتوں ہی باتوں میں عبدالہادی خان نے ہمیں واپس افغانستان چلنے کی دعوت دی۔ لیکن ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ سوویت نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تاشقند میں ہمیں ہوابازی کی تربیت ملے گی۔ عبدالہادی خان نے اس بات کی تردید نہیں کی۔ لیکن یہ بات بھی انہیں نہ بھائی فوراً موضوع بدل دیا۔

تاشقند

اکتوبر کے آخری ایام تھے جب ہم تاشقند کے عظیم الشان سٹیشن پر اترے ہمارے پنجاب کے

ساتھیوں کا کہنا تھا کہ تاشقند کا ریلوے سٹیشن لاہور کے ریلوے سٹیشن جیسا لگتا تھا۔ جہاں تک ہماری نگاہ پڑتی تھی ڈبے ہی ڈبے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دُرشکو (فٹنوں) میں بیٹھے تاشقند کے نئے شہر کی وسیع و عریض چوڑی چوڑی گلیوں میں پھر رہے تھے۔ جلد ہی ھندوسکی دوما " ہندوستان گھر" میں اترے۔

بخارا سے ہم تاشقند تک دو دن اور دو راتوں میں پہنچے۔ لمبا سفر تھا۔ راستے میں گاڑی لمبے لمبے دشتوں سے گذری۔ لیکن بخارا اور تاشقند کے درمیان سمرقند کا علاقہ بہت زرخیز تھا۔ راستے میں کئی جگہ بیابانوں میں ریل رُکی۔ ریلوے ملازمین اتر کر جنگلوں سے لکڑیاں کاٹتے اور گیلی ہی ریل کے انجن میں ڈال دیتے اور گاڑی پھر روانہ ہو جاتی۔

تاشقند کا نیا شہر پرانے شہر کے قریب ہی آباد ہوا تھا۔ یہ نیا شہر کافی پھیلا ہوا تھا۔ گھر ایک دوسرے سے آزاد علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک گھر کے ساتھ ایک باغیچہ بھی تھا۔ اور اردگرد اتنی دیوار بنی ہوئی تھی کہ مکین باہر گلی سے نظر نہیں آتے تھے۔ گھر نئے زمانے کے مطابق بنے تھے۔ شہر کے درمیان ایک گول باغ ہے۔ ہر ایک کوچہ اسی باغ سے شروع ہوتا ہے۔ بڑے بڑے سینما۔ ناٹک اور تفریح کی اور چیزیں اسی باغ کے کناروں پر واقع تھیں۔ بڑی گلیاں تو تین تین چار سو فٹ چوڑی تھیں۔

قدیم شہر ایشیا کے دوسرے قدیم شہروں کا نمونہ ہے۔ زار کے زمانے میں انقلاب سے قبل نئے شہر میں روسی بستے تھے اور قدیم شہر میں مسلمان رہتے تھے۔ لیکن اب ترکستان جمہوریہ کے مرکزی دفتر فوجی سکول اور بہت سے دوسرے اہم دفاتر نئے شہر میں واقع ہیں۔ ان دفتروں، سکولوں اور اہم جگہوں پر اب ترک فائز ہیں اسی لئے ان خوبصورت اور دلکش محلات میں اب ترک ہی رہتے تھے۔

ہندوستانی انقلابی لیڈر

تاشقند میں ہر طرف سے ہندوستان کے انقلابی جمع ہو چکے تھے۔ ان کی تین پارٹیاں تھیں ایک دھڑے کی قیادت ایم این رائے۔ دوسرے کی مولانا عبدالرّب اور تیسرے کی قیادت مولانا

فضل حق کر رہے تھے۔

ایم۔این۔رائے

یہ ایک بنگالی انقلابی تھا۔ بالشویکوں کی نگاہ میں اسکی پارٹی قابل عزت تھی۔ ہندوستان میں انقلابی پروپیگنڈے کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھیں۔ رائے رفیکم کے "انقلابی کمیٹی کے گھر" میں رہتا تھا۔ رفیکم ایک بڑی عمارت تھی۔ رائے کے ساتھ ایک اور بنگالی مکرجی بھی ادھر ہی رہتے تھے۔ رائے کی بیوی بھی ایک بڑی انقلابی اور قابل عورت تھی۔ وہ امریکہ کی رہنے والی تھی اور یورپ کے راستے ہندوستان کے لئے خفیہ انقلابی تحریک کی بہت بڑی مددگار تھی۔

ہم نے ایک سال سے کچھ کم عرصہ تاشقند میں گذارا۔ بیگم رائے ہمیشہ ہم چند ہندوستانیوں کو ہفتے میں ایک دعوت ضرور دیا کرتی۔ اس دعوت میں رائے کی موجودگی لازمی تھی۔ اس وقت وہ عام گپ شپ ہی لگاتا تھا۔ اس کی گفتگو سے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ ہندوستان کے انقلاب کے بارے میں وہ ہمارے ساتھ گفتگو کرتا۔ ہم سے ہمارے وطن کے قصے سنتا۔ غرض اس ہفتہ وار گفتگو میں ہمیں وہ چیزیں سکھلاتا جو ہم یونیورسٹیوں میں نہیں سیکھ سکتے تھے۔

رائے کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔ رنگ اس کا عام بنگالیوں کی طرح سانولا ہی تھا۔ قد کا اونچا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ امریکہ اور یورپ میں پھرنے کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں ہمارے سوویت سرحد میں داخل ہونے سے پہلے ماسکو پہنچ چکا تھا۔ اسی وقت جرمنی سے ہندوستانی انقلابیوں کا ایک گروہ چٹوپادیہ کی قیادت میں روس پہنچ چکا تھا۔ اور مولانا عبدالرب تاشقند میں "ہندوستان کے گھر" میں تھے۔

تینوں گروہوں میں بالشویکوں کی نظر التفات رائے پر پڑی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چٹوپادیہ اپنے دوستوں کے ہمراہ ناراض ہو کر واپس جرمنی چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد مولانا عبدالرب بھی ترکیہ، جہاں وہ پہلے بھی رہ چکے تھے لوٹ کر چلے گئے۔

اب ہندوستان کی انقلابی تحریک چلانے کے لئے واحد ذمہ دار آدمی ایم این رائے تھا۔

بالشویک اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ بھی اپنے فرائض پوری اہلیت سے سرانجام دے رہا تھا۔ سوویت روس میں ایم این رائے کافی قابل قدر شخصیت سمجھی جاتی تھی۔

ایم این رائے کی زندگی بھی بڑی دلچسپ ہے جتنا وہ بالشویکوں کی نگاہ میں قابل عزت و قدر سمجھا گیا۔ چند وجوہات کی بنا پر اتنا ہی ان کی نظروں سے گر گیا۔

ہم جب ہندوستان واپس آئے تو وہاں سننے میں آیا کہ ایم این رائے کو ایک روسی بورڈین کے ہمراہ چین بھیجا گیا۔ بورڈین سفیر تھا اور رائے انقلاب کے انچارج کی حیثیت سے گیا۔ اس کی مکمل تفصیلات معلوم نہیں کہ انقلاب کس طرح برپا ہوا۔ لیکن کینٹن اور کچھ اور شہروں میں انقلاب شروع ہوا۔ ادھر انقلاب ناکام ہوا۔ بورڈین ہزاروں چینیوں کے ہمراہ چیانگ کائی شیک کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ایم این رائے کو اس ناکامی کا ذمہ دار گردانا گیا۔ بڑی مشکل سے وہ روس سے جان بچا کر نکلا۔ ہندوستان واپس پہنچا تو اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ بارہ سال قید کی سزا ہوئی لیکن اپیل پر گھٹا کر چھ سال کر دی گئی۔

مولانا عبدالرّب

چٹو پادیہ کے ذکر سے تو میں واقف نہیں لیکن ہندوستان کے انقلابی جدوجہد میں ان کا ذکر ضرور ہو ہوگا۔ مولانا عبدالرّب کو پہلی مرتبہ میں نے کابل میں دیکھا تھا۔ ان کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ مولانا پشاور کے رہنے والے تھے۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے دوران ۱۹۱۴ء میں بغداد کے انگریزی سفارتخانہ میں ملازم تھے۔ انہوں نے سفارت خانہ چھوڑا اور ترکوں کے پاس چلے گئے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی نے ایک وفد وینھنتک کی قیادت میں امیر حبیب اللہ کے زمانے میں افغانستان بھیجا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا عبدالرّب بھی اس وفد میں شامل تھے وفد کا مقصد یہ تھا کہ امیر حبیب اللہ انگریزی سرکار کے خلاف اعلان جنگ کرے۔ یہ وفد کافی مصیبتیں اٹھانے کے بعد ایران کے راستے افغانستان پہنچا۔ لیکن وفد کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔ وینھنتک مایوس ہو کر سطح مرتفع پامیر کے راستے چین چلا گیا۔

مولانا عبدالرب امان اللہ خان کے زمانے میں ہم سے پہلے روس گئے۔ وہاں جو کچھ انہیں پیش آیا

اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مولانا فضل حق

ہمارے بعد دس اعلیٰ تعلیم ہندوستانی مہاجرین کا ایک گروہ ہندوستان کی آزادی کی تلاش میں تاشقند کے لئے کابل سے روانہ ہوا۔ وہ لوگ جب مزار شریف پہنچے تو وہاں ان کو پتہ چلا کہ پہلا قافلہ جس میں راوی بھی شامل ہے ترکمانوں کے چنگل میں پھنس چکا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے راستہ بدل دیا اور میمنے کے راستے سوویت یونین میں داخل ہوئے اور ہم سے پہلے تاشقند جا پہنچے۔

اس ٹولی میں چارسدہ تحصیل کے عمرزو نامی گاؤں کا ایک مشہور انقلابی پشتون شاعر عبدالاکبر[۱۱] خان اور سیالکوٹ کے رہنے والے مشہور انقلابی اقبال شیدائی جیسے لوگ شامل تھے۔ عبدالاکبر خان اسلامیہ کالج پشاور کا طالب علم تھا اور وطن کو آزاد کرانے کے جذبے کے تحت وطن اور کالج دونوں کو چھوڑ آیا تھا۔

ہم جب تاشقند کے ریلوے سٹیشن پر اترے تو یہ نوجوان ہمیں خوش آمدید کہنے سٹیشن پر آئے تھے۔ وہاں جلد ہی ہمیں معلوم ہوا کہ عبدالاکبر خان وغیرہ بھی ہماری طرح ترکمانوں کے چنگل میں پھنس چکے تھے لیکن ہماری گرفتاری کی خبر پاکر انہوں نے راستہ بدل دیا اور میمنے کے سخت اور دشوار گذار راستے سے جو کافی لمبا بھی پڑتا تھا سے ہوتے ہوئے سوویت یونین میں داخل ہوئے اور سخت مصیبت سے محفوظ رہے۔ ان افراد میں سے عبدالاکبر خان سے میری پرانی واقفیت تھی۔ کالج میں اپنی علمی قابلیت اور انقلابی جذبے کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے دیکھنے سے مجھے بے حد خوشی ہوئی لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ عبدالاکبر خان اپنے اکثر ساتھیوں سمیت واپس ہندوستان لوٹ گیا۔

اس گروپ کے قائد مولانا فضل[۱۲] حق بہت دلچسپ آدمی واقع ہوئے تھے۔ وہ ریفکم میں ایم این رائے کا خصوصی طور سے مہمان تھا۔ اس پر اس کا کافی اثر پڑ چکا تھا۔ ایم این رائے کی اس کے متعلق یہ رائے تھی کہ مولانا فضل حق مخلص اور صاف گو آدمی ہے۔ اور قابل اعتبار انقلابی ہے۔ مولانا نے بڑے عجیب طریقے سے ایم این رائے کو

شیشے میں اتار لیا تھا۔ اکثر لوگ جب کسی کو زیر اثر لانے کا سوچتے ہیں تو وہ کام اختیار کرتے ہیں جو اُس شخص کا پسندیدہ ہو۔ ایم این رائے ہندو تھا اور مذہب سے اس کو کوئی لگاؤ اور دلچسپی نہیں تھی۔

مولانا جب بھی اس کے گھر نماز پڑھتے تو آدھ آدھ گھنٹہ سجدہ میں پڑے رہتے۔ اور کبھی کبھی تو سجدے میں رونا شروع کر دیتے۔ ایم این رائے کا اس کے متعلق یہ خیال تھا کہ جب یہ آدمی اتنا پکا مسلمان ہے تو یقیناً یہ انگریزوں کا سخت دشمن ہو گا۔

رائے تو اتنا مجرم نہیں گردانا جائے گا لیکن عجیب و غریب بات یہ ہوئی کہ عبدالاکبر خان جو ایک تعلیم یافتہ اور قابل نوجوان تھا مولانا کے ساتھ کابل تا تاشقند ہم سفر رہا۔ اور پھر واپسی میں بھی ہم سفر ہی رہا۔ اور اقبال شیدائی جو باتوں میں کسی کو نمبر نہیں دیتا تھا اور چالاکی میں اپنے آپ کو یکتا سمجھتا تھا اور جو ان کے ساتھ کابل سے تاشقند تک ہم سفر رہا نے اس کو نہیں پہچانا تھا۔ حقیقت تو عبدالاکبر خان اور اس کے ساتھیوں کو ہی معلوم ہو گی لیکن میں نے سُنا ہے کہ ایم این رائے نے مولانا صاحب کو کافی امداد دی تھی اور اس کے ساتھ کوئی وعدہ بھی کیا تھا۔ مولانا کا واپسی کا سفر افغانستان کے راستے تھا اس لئے افغانستان کے سفیر سے اجازت لینی بھی ضروری تھی۔ عبدالہادی خان نے راہ داری دے دی۔ مجھے کسی نے بتایا کہ دوران ملاقات جب نماز کا وقت ہوا تو وہاں بھی مولانا نے آدھ گھنٹے والے سجدے شروع کیے تاکہ سفیر پر اچھا اثر پڑے لیکن عبدالہادی کو یہ کہتے سنا گیا "میں رائے نہیں ہوں" اگرچہ بہ ظاہر اس نے مولانا کی کافی عزت افزائی کی اور افغانستان کے راستے گذرنے کی اجازت بھی دے دی۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا صاحب بہت روپے اور اسلحے کے ساتھ افغانستان کے راستے ہندوستان کو عازم سفر ہوئے۔ ہرات سے قندھار آیا اور وہاں چند دن گذارنے کے لئے قیام کیا۔ وہاں اس نے ایک خط لکھا اور کسی کے ذریعے وہ کوئٹہ بھیجا۔ خود کابل کو روانہ ہوا۔ خود تو مولانا کابل پہنچ گئے۔ لیکن پیچھے مولانا کی چٹھی معہ آدمی پکڑی گئی۔ کابل سے مولانا رخصت ہوئے لیکن جب قندھار سے اس کے متعلق یہ معلومات کابل پہنچی تو اسے ہندوستان کے راستے میں گرفتار کیا گیا اور واپس کابل لے جایا گیا۔ اس کے بعد مولانا کا کچھ بھی پتہ نہیں چلا لیکن عام طور سے یہ گمان کیا جاتا ہے کہ مولانا کو اپنے مقام پر پہنچا دیا گیا۔

تاشقند میں ہمارے لئے ہوائی جہازوں کا مدرسہ

کابل میں سوویت یونین کے سفیر نے مولانا عبدالرب کے ساتھ ہماری موجودگی میں یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تعلیمافتہ نوجوان تاشقند جائیں تو سوویت ان کے لئے وہاں ہوا بازی کی تربیت کا انتظام کرے گی۔ اب تاشقند میں سفیر کا وعدہ پورا ہوتا دکھائی دیا۔ تاشقند میں عمارتوں کی کمی کی وجہ سے یہ مدرسہ ایک مانسٹری (تارک الدنیا عیسائیوں کے رہنے کی جگہ خانقاہ) میں قائم کیا گیا۔ یہ مانسٹری ایک بڑی پختہ قلعہ کی مانند تھی۔ چاروں طرف اس میں عبادت کرنے کی اور رہنے کی جگہ تھی۔ اس میں راہب اور راہبائیں رہتی تھیں۔ انہوں نے زندگی بھر کنوارا رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ لیکن یہ بات ساری دنیا پر واضح ہے کہ تارک الدنیا راہبان اپنے حلف پر برقرار نہیں رہ سکتے اور معاشرے کے لئے یہ خانقاہیں باعث شرم بن چکی تھیں۔ بالشویک ایسے اداروں کیخلاف تھے۔ انہوں نے گرجے بند کر دیے تھے اور راہبان کو باہر نکال پھینکا تھا۔

شروع میں ہم نو مہاجر اس مدرسے میں داخل ہوئے۔ لیکن مانسٹری میں جگہ نہیں تھی۔ مانسٹری کے درمیان ایک دو منزلہ عمارت اس مقصد کے لئے چنی گئی اور ہم اس میں رہنے لگے۔ ہمارے ساتھ اس وقت صرف ایک روسی استاد مدرسے آیا۔ اس کا نام وژاں تھا۔ (وہ چار سال کینیڈا میں رہا تھا اس لئے انگریزی بخوبی بول سکتا تھا)۔ ہم نے انگریزی طرز کے مطابق اس کا نام جونز رکھا۔ یہ دراصل ایک مکینک تھا۔ جو ہوائی جہازوں کے پرزے کرنے اور ان کو پھر جوڑنے کا ہنر اچھی طرح جانتا تھا۔

ہمارے قریب کوئی ہوائی میدان بھی نہیں تھا اور نہ ہمارے سکول میں کوئی جہاز تھا۔ جونز اپنے ساتھ اپنی موٹر سائیکل لایا تھا۔ پہلے دن ناشتہ کے بعد انہوں نے ہم سب کو بلوایا۔ کلاس روم میں موٹر سائیکل پرزے پرزے پڑا تھا۔ جونز نے ہمیں سبق پڑھانا شروع کیا۔ ہم بہت توجہ سے اس کی تقریر سن رہے تھے۔ پشاور کے ایک ساتھی فدا علی نے اس سے دریافت کیا!

"توارش جونز! کیا یہ ہوائی جہاز ہے؟"

جونز ہنس پڑا۔ اپنی پیشانی کو کھجاتے ہوئے بولا۔

"نہیں یہ تو ہوائی جہاز نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو تو پتہ ہے کہ انقلاب میں ہر چیز ادھر ادھر ہو گئی ہے۔

جب تک ہمارے ہاتھ ہوائی جہاز کی مشین نہیں آتی اسی پر گذارہ کرتے رہیں گے۔ اس مشین میں اور ہوائی جہاز کی مشین میں اصولی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔"

باتوں ہی باتوں میں جونز نے اپنے آپ کو بہت سی گالیاں دیں۔ بظاہر تو یہ گالیاں معلوم ہو رہی تھیں لیکن دراصل یہ اس کے خوش ہونے اور خوش کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ ہم ہنس پڑے۔ یہ ہمارے اور جونز کے ملنے کا پہلا دن تھا۔ جونز بہت دلچسپ آدمی تھا۔ اسی بات پر اصرار کرتے ہوئے اس نے اپنی تقریر جاری رکھی۔" یہ انقلاب کا زمانہ ہے۔ کوئی بھی کام ابھی اچھی طرح سے صحیح نہیں ہوا ہے۔ لیکن انقلابیوں کا تو شیوہ یہی ہے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اسی لئے تو میں نے بغیر انتظار کے آپ لوگوں کو تربیت دینی شروع کر دی۔ تاشقند کے ہوائی میدان کے نزدیک کوئی مکان نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام تاشقند میں اس سکول کے قابل کوئی مکان نہیں۔ جس فوجی سکول میں پہلے ایک شخص ہوتا تھا وہاں اب چار آدمی ہیں۔ سکول بالکل بھرے ہوئے ہیں نہ حکومت نئے مکان بنوانے کے قابل ہے اور نہ آپ لوگ نئے مکان بننے تک فارغ رہ سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو راہبوں کا بے کار فرقہ یہاں سے نکال دیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو جگہ مل سکے۔ ہوائی جہاز کے بجائے میرے موٹر سائیکل کی مشین آپ لوگوں کے لئے حاضر ہے۔"

اس مانسٹری میں ہم نے دس پندرہ دن گذارے لیکن بغیر اس موٹر سائیکل کے پرزوں کے اور مشین نظر نہیں آئی۔ کبھی کبھار جب جونز کہیں جانے کا ارادہ کرتا تو اس موٹر سائیکل کو جوڑ لیتا اور چلا جاتا۔ اس کی غیر موجودگی میں ہم بغیر استاد کے اور بغیر مشین کے بیٹھے رہتے۔ ہوائی جہازوں سے متعلق ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ ہمیں جونز کی غیر موجودگی کا احساس شدّت سے ہوتا۔ جب واپس آتا تو یوں لگتا جس طرح بہت سے استاد اور بے حساب مشینیں سکول پہنچ گئی ہیں۔ کلاس پھر گرم ہو جاتی۔ تربیت کے دوران اڑانے والا حصہ اور مکینیکل والا حصہ ایک ہی کمرے میں ساتھ بٹھائے جاتے اور ساتھ ہی دونوں چیزیں سکھائی جاتیں۔ کمرے میں بیٹھنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔ استاد اور شاگرد سب ہی کھڑے رہتے۔ جونز کی باتیں ہمیں تھکنے کا احساس نہیں ہونے دیتیں۔ سارا دن ہی ہم لوگ ہنستے رہتے۔ جب بھی اس کو اس بات کا احساس ہو جاتا کہ یہ لوگ اب اکتانے لگے ہیں تو فوراً گپ شپ شروع کر دیتا۔ سبق کے علاوہ جونز ہمارے ساتھ

کھانا کھاتا اور ساتھ ہی رہتا تھا۔ ایک رات ہمارے سونے والے کمرے کی انگیٹھی کی آگ بجھ گئی۔ نومبر کا مہینہ تھا ایسی سردی لگی کہ سب نیند سے بیدار ہو گئے اور جب تک نیچے چھت کی انگیٹھی میں دوبارہ آگ نہیں سلگائی گئی تھی۔ اور ہمارے کمرے گرم نہیں ہو گئے تھے اس وقت تک ہمارا سونا ناممکن رہا۔

جونز گپ شپ کا بڑا شوقین تھا۔ بات بات پر اپنے آپ کو کوسنا اور برا بھلا کہنا ہماری خوشی کا موجب بنتا۔ بے پرواہ آدمی تھا۔ عادت میں بالکل انگریز گورا لگتا تھا۔ لیکن اصل میں روسی تھا۔ ایک مضبوط آدمی تھا۔ چھ فٹ سے زیادہ قد بڑے مضبوط اور چوڑے سینے کا مالک تھا۔ بدن اس کا نہ تو اتنا موٹا تھا اور نہ بہت زیادہ پتلا۔ لیکن عام آدمیوں میں بالکل دیو لگتا تھا۔

ہم نوکے نو اشخاص کو ہمراہ لے کر تاشقند کی مشہور و معروف جگہوں پر لے کر پھرتا رہتا۔ جس کوچے سے ہم گذرتے لوگ ہمیں دیکھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ ہم میں سے ایک آدمی سے اس اس نے سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی لے رکھی تھی۔ جب ہا ے ہمراہ ہوتا تو وہ سر پر رکھ کر پھرتا۔

بسا اوقات روسی ہم سے دریافت کرتے کہ آپ لوگ کون ہیں؟ وہ فوراً جواب دے دیتا "ہم ہندوستانی ہیں۔"

جب ہم بازار سے گذرتے تو روسی عورتیں ہمیں دیکھ کر رک جاتیں اور جونز کی طرف دیکھنے لگتیں۔ اس کی جوانی اور قد کاٹھ کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتیں۔ اسی طرح تاشقند سے باہر مانسٹری میں ہم نے دس پندرہ دن گذارے۔ نہ تو ہوائی جہاز تھا اور نہ جونز کے علاوہ اور کوئی استاد۔ مانسٹری میں سکول کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

ہندی فوجی سکول

ہمارا مدرسہ تاشقند کے شہری آبادی کے علاقے میں ایک نئے مکان میں تبدیل ہو کر آگیا۔ یہ عمارت زار روس کے ایک بڑے حاکم کا گھر تھا۔ اس کے اردگرد ایک بڑا صحن تھا۔ جو انقلاب کی وجہ سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ ہمارے سکول کے لئے یہ مانسٹری سے بہتر جگہ تھی۔ لیکن یہاں جونز نہ تو

ہر چیز کا مالک تھا اور نہ سب سے اعلیٰ درجے پر فائز تھا۔ ایک مسلمان کرنیل احمد نامی سکول کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ مقررہ وقت پر ہماری تربیت کے لئے ایک فوجی آتا جو ہم سے پریڈ کرواتا۔ تمام علاقہ برف سے اٹا پڑا تھا۔ اور ہم اس میں فوجی تربیت حاصل کرتے۔ احمد سارا دن ہمارے لئے اِدھر اُدھر سے چیزیں جمع کرتا رہتا جلد ہی تھوڑے دنوں میں ہمارے سکول نے فوجی شکل اختیار کر لی۔

ہمیں نئی روسی بندوقیں، پستول اور چھوٹے ہوائی جہازوں کے لئے مشین گنیں مہیا کی گئیں۔ توپخانے کی کلاس بھی شروع ہوئی۔ جس میں انیس مہاجرین نے داخلہ لے لیا۔ نبی بخش نام کا ایک تعلیم یافتہ مہاجر جو بنوں کا رہنے والا تھا اور ہمارے بعد دوسرے گروپ میں آیا تھا وہ بھی ہمارے ساتھ ہوائی کلاس میں داخل ہو گیا۔ دسمبر کا سارا مہینہ ہم نے صرف بندوق اور پستول چلانے میں گذارا۔

اس اثنا میں احمد تبدیل ہو گیا اور اس کی جگہ پر ایک بوڑھا روسی کرنیل آیا۔ ہم انتیس آدمیوں کو اس نے دو قطاروں میں کھڑا کیا۔ کرنیل عمر کا بوڑھا تھا لیکن گال اس کے بالکل تر و تازہ اور سرخ تھے۔ جب وہ چلتا تو یوں لگتا کہ کوئی نوخیز نوجوان چل رہا ہے۔ ہم سب کو باری باری وہ بازو سے پکڑ کر کہتا کہ آپ لوگوں کے رنگ کیوں اتنے پھیکے ہیں۔ گالوں پر بالکل آپ کے سرخی نہیں۔ پھر خود ہی سینہ پھلا کر کہتا

"تم لوگوں کو میں اپنی طرح صحت مند بنالوں گا۔"

کرنیل کی لمبی لمبی مونچھیں اس کے مضبوط چہرے کے ساتھ بہت دلکش دکھائی دیتیں۔ اس کی عمر پچاس سال سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

ہماری روزمرہ کی زندگی

اس سکول میں بھی اور اس سے پہلے بھی حکومت ہمیں خوراک اور کپڑا مہیا کرتی تھی۔ پانچ ہزار روبل ہماری مہینے کی تنخواہ تھی۔ ہمیں اس نقدی کی بالکل ضرورت نہیں تھی کیونکہ تمام تر ضروریات زندگی یہاں تک کہ میوے بھی (تازہ اور خشک) ہمیں سکول کی طرف سے ملتے۔ یہ روبل کاغذی نوٹوں کی شکل میں ہوتے۔ ہمارا کمانڈر عبدالرحیم سب کو ساتھ لے لیتا اور نزدیکی ہوٹل جا کر وہاں پلاؤ

کی فرمائش کرتا۔ وقت مقررہ پر ہم سب وہاں چلے جاتے اور بہترین گاجر پلاؤ کھاتے۔ اسی طرح ہم سب کی ساری تنخواہ پانچ ہزار روبل فی کس بہترین پلاؤ کی ایک پلیٹ کی نذر ہو جاتے۔ زار کے زمانے میں پانچ ہزار روبل ساڑھے سات سو روپوں کے برابر تھے۔

سکول میں ہمارا لباس خوب گرم تھا۔ گھٹنوں تک لمبے لمبے بوٹ دیئے گئے تھے۔ ترکستان میں بغیر چینی کے چائے پی جاتی لیکن ہمیں کبھی کبھی چینی کی ٹکیاں ملتیں۔ صبح کی چائے میں ہمیں روٹی کے ساتھ لمبے لمبے بیدانہ انگور دیے جاتے۔ ترکستان کے انگور اتنے میٹھے ہیں کہ ہمیں چینی کی ضرورت بالکل پیش نہ آئی۔ اور انگوروں کی مقدار ہماری مانگ کے مطابق ہوتی۔ جتنا کوئی کھا سکتا اتنا ہی اس کو ملتا۔ کھانے کی دیگر اشیاء کوئی خاص اچھی نہیں تھیں لیکن اس وقت یہ بھی غنیمت تھی۔ کیونکہ انقلاب کا سامنا جس ملک کو کرنا پڑتا ہے وہاں یہ اتنا بھی غنیمت گردانا جاتا ہے۔ گوشت اکثر بہت خراب ہوتا۔ کہا جاتا کہ یہ بوڑھے اور کمزور و ناتواں گھوڑے فوج کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں ورنہ ترکستان میں گوشت کا دستیاب ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ترکستان کی اقتصادی حالت

تاشقند کا بازار سرد پڑا تھا۔ آمدن کے تمام وسائل پر حکومت کا قبضہ تھا۔ ساتھ ہی سب کی ضرورتیں پوری کرنا بھی حکومت ہی کی ذمہ داری تھی۔ لیکن چھوٹے دکانداروں کو تجارت کی اجازت مل گئی تھی۔ اس طرح بعض اوقات ہم بھی کسی کو مل لیتے۔ اسی کی برکت سے ہم ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کر لیتے۔ ان لوگوں سے ہمیں آہستہ آہستہ حالات کا صحیح اندازہ ہوتا گیا۔ حکومت کو سب سے بڑی تکلیف اس بات کی تھی کہ کاشت کار حکومت کے ساتھ تعاون پر بالکل آمادہ نہیں تھے۔ حکومت نے تمام ذرائع آمدن یعنی زمین اور کارخانے قومی ملکیت میں لئے تھے۔ کاشت کار زمین کو اپنی جائیداد نہیں جانتے تھے اسی وجہ سے حکومت کے ساتھ تعاون بالکل نہیں کر رہے تھے۔ حکومت کے لئے غلے کا حصول کافی مشکل ہو گیا تھا۔

حکومت نے کافی زمینیں اپنے قبضے میں لے رکھی تھیں۔ خود ہی اس کا انتظام کر رہی تھی۔ لیکن حکومت کی ناکامی کا بالکل صاف پتہ لگ رہا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم پڑتا تھا اور حکومت کی جتنی کمیٹیاں میں نے دیکھیں ان میں مشینی آلات کی کمی تھی۔ بیل دقیانوسی ہل کھینچتے اور کاشت کار اس میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔

تاشقند میں ہم نے کئی کپڑے کے کارخانے بھی دیکھے۔ ایک بھی کارخانے میں مشین موجود نہیں تھی۔ بے شمار کھڈیاں تھیں جن میں لاتعداد جولاہے کام کر رہے تھے۔

ایک دفعہ میں نے دریافت کیا کہ کیا سوویت روس میں مشینی کارخانے بھی ہیں؟ جواب ملا کہ سوویٹ روس میں کارخانے تو موجود ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ اپنے وطن کی ضروریات زندگی بند کر رکھی ہیں اور اندرون وطن کاشت کار تعاون نہیں کر رہے ہیں۔

باہر کی دنیا سے تجارت پر اتنی زبردست پابندی لگی ہوئی تھی کہ ہماری وردیوں کے بٹن بھی گول گول چمڑے کے بنے ہوتے تھے۔ جرنیل سے لے کر سپاہی تک سب نے یہ بٹن پہن رکھے تھے۔ بازار میں دانتوں کا برش ایسا لگتا تھا جس طرح کسی بے ہنر بڑھئی نے بنایا ہو اور جو لغیر زنگ کے بازار میں فروخت ہو رہا ہو۔

ترکستان لینن اکیڈیمی

ڈیڑھ ماہ کی تربیت کے بعد ہمیں لینن اکیڈیمی لے جایا گیا۔ یہ ایک بڑا فوجی مدرسہ ہے اس میں ہر قسم کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہمیں ایک طرف ایک علیحدہ عمارت دی گئی۔ اس میں باقاعدہ سیکھنے کے کمرے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس میں پہلے سے مدرسہ تھا جو ہمارے لئے خالی کیا گیا۔

غالباً جنوری کے آغاز میں ہی ہم یہاں آ گئے اور آنے کے ساتھ ہی تربیت شروع کر دی گئی۔ صبح سویرے ہمیں ایک تاتار افسر جس کو "دون کا افسر" کہا جاتا ہمیں جگایا کرتا۔ اس کی آواز اب تک میرے کانوں

میں گونج رہی ہے۔ صبح سویرے وہ بارک کے اندر داخل ہوتے ہی پکارنے لگتا

"اٹھو رفیق! اٹھو رفیق!"

چائے سے پہلے ہم پریڈ سے فارغ ہو جاتے۔ اور پھر جماعتیں شروع ہو جاتیں۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین پڑھائے جاتے۔ ہر مضمون کے لئے علیحدہ علیحدہ استاد تھا جو وقت مقررہ پر پہنچ جاتا۔

۱۔ ہوا کی حالت اور اس میں جہاز کا اڑانا Air Navigation

۲۔ ہوائی جنگ کا نظریہ Theory of Air War

۳۔ فوٹوگرافی اور ٹوپوگرافی Photography and Topography

۴۔ بندوقوں مشین گنوں وغیرہ کے پرزے علیحدہ علیحدہ کر کے پھر جوڑنا۔

Assembling and Desembling of Arms

۵۔ ہوائی جہاز کے مشین کے پرزے الگ الگ کر کے جوڑنا۔

Assembling and Desembling of Aircraft Machine

۶۔ تقریباً روزمرہ کا یہ معمول تھا کہ دوپہر کے بعد ہوائی میدان جاتے اور وہاں فضائی تربیت حاصل کرتے۔

۷۔ ہماری تربیت انگریزی زبان میں ہوتی۔ جس استاد کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ اس کے ساتھ باقاعدہ ترجمان ہوتا۔

جیسے پہلے لکھ چکا ہوں سخت سردی تھی۔ روزانہ برف پڑتی تھی۔ کمرے سے باہر کام کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لئے تمام قاعدے اکثر کمروں کے اندر ہی سکھائے جاتے۔ تھیوری یعنی کتابی علم پہ زیادہ زور ہوا کرتا۔ اور جب میدان ہوائی جاتے تو وہاں بھی چھت کے نیچے مشین کا کام سکھایا جاتا تھا۔ لینن اکیڈیمی میں سردی کا پورا بندوبست تھا۔ بڑے بڑے ہال تھے۔ جن میں توپیں اور مشین گنیں پڑی ہوئی ہوتی تھیں۔ جب موسم ناسازگار ہوتا تو پھر پڑھائی چھت کے نیچے کی جاتی۔

ہوائی جہاز کے اڑانے کی تربیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

(ا) عملی

(ب) نظری

عملی کام میں مشین کے سکھانے کی مشق ہوائی میدان میں ہوتی۔ ہوائی جہاز کے موٹر وہ حوالے کر دیتے جو ہم پرزے پرزے کر لیتے اور پٹرول سے اس کی صفائی کرتے۔ پھر ان کو یکجا کر دیتے۔ یہ کام کافی سخت تھا اور ہوائی میدان میں ہمارا زیادہ وقت اسی پر صرف ہوتا۔ لیکن جلد ہی رائے کی ہدایت کے بموجب ہمیں اس سے نجات مل گئی۔ اس لئے کہ ہمارے ذمے واپس وطن جانے کا کام بھی تھا۔ اس لحاظ سے ساری توجہ صرف اڑانے پر ہی مرکوز رہی۔

جونز کے کام کا اصلی وقت اب آپہنچا تھا۔ وہ مکینک تھا اور جب ہم اڑان کرتے تو وہ میدان میں تیار کھڑا ہوتا۔ پہلے جہاز کا معائنہ کر لیتا اور اس کے بعد ہمیں اڑنے کی اجازت دیتا۔ اڑان کے لئے ہمارا استاد شولمین تھا۔ ہماری تربیت کے لیے جہاز میں استاد اور شاگرد کے لئے علیحدہ علیحدہ جگہیں تھیں جو کنٹرول استاد کے ہاتھ میں آگے ہوتے وہی کنٹرول پیچھے شاگرد کے ہاتھ میں بھی ہوتے۔ اور کبھی کبھی جب استاد ہمیں اجازت دیتا تو ہم خود بھی جہاز اڑا لیا کرتے تھے۔

چار پانچ مہینے ہم نے استاد کے ساتھ فضائی تربیت حاصل کر لی۔ لیکن بغیر استاد کے کبھی ہوائی جہاز نہیں اڑایا تھا۔ ہم زیادہ خوش قسمت نہیں تھے۔ انگریز اور سوویت یونین نے ایک عہدنامہ مرتب کیا جس کی رو سے انگریز نے از سر نو اپنے تجارتی تعلقات جاری کئے اور سوویت یونین نے ہمارا ہندوستانی فضائی مدرسہ بند کر دیا۔

ایک دن میرے ساتھ ہوا میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہم جب جہاز میں بیٹھے تو کمر ایک بیلٹ کے ساتھ باندھ لیتے۔ اس دن شولمین کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے جہاز روانہ کر دیا۔ میں نے کمر میں بیلٹ نہیں باندھا تھا۔ تاشقند کے اوپر اڑتے رہے اور پھر واپس میدان ہوائی پر پہنچے۔ ایک دم شولمین جہاز کو نیچے لے آیا۔ میں ہوا میں ہی رہ گیا۔ ہاتھوں سے سٹیرنگ کو

مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ زور لگا کر اپنے آپ کو بٹھانے کی کوشش کی۔ استاد کی نظر پھر بھی مجھ پر نہیں پڑی۔ لیکن جہاز اس وقت زمین سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔ جونز جو کہ جہاز کے اترتے وقت ہمیشہ تیار رہتا فوراً دوڑا۔ قریب آکر اپنے آپ کو بھی گالیاں دیں اور مجھے بھی ساتھ ہی ساتھ کہہ رہا تھا کہ تم خوش قسمت ہو جو بچ گئے ہو۔ آج یقیناً تم ہوا باز بن گئے ہو اب آسانی سے نہیں مرو گے۔

اکبر خان غائب ہو گیا

ایک دن اچانک اکبر خان غائب ہو گیا۔ صبح کے وقت ہمارے ساتھ سکول میں موجود تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی اس نے کھایا۔ لیکن دوپہر کے بعد غائب ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے سے پوچھتے "خان کہاں گئے؟" جواب یہی ملتا "مجھے علم نہیں۔ شاید کہیں گیا ہو۔" جب رات ہوئی تو ہمیں بھی شکوک و شبہات نے گھیر لیا۔ جونز سے دریافت کیا "اکبر خان کہاں ہے۔"

جونز نے اپنے دونوں کندھے اچکائے اور حیرانگی کے ساتھ ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھو اکبر سرمایہ دار تھا۔ کہیں پولیس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔"

بہت دیر تک تو جونز نے اپنے آپ پر قابو رکھا اور رات گئے تک حسب معمول ہمارے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا تاہم ہمیں پتہ چل گیا کہ جونز کو علم ہے کہ اکبر خان کہاں ہے۔ اسی لئے ہمارے دل کو قرار آ گیا۔ پرائے وطن میں ساتھیوں کا ایسے غائب ہو جانا ایک آفت سے کم نہیں۔ پھر کافی دنوں بعد ہمیں بھی یقین آیا کہ اکبر خان واپس وطن چلا گیا ہے۔

اس دن جونز گپ میں حد سے گذر گیا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے ہم سے دریافت کیا کہ

"ہندوستانیو! اتنے دور ہندوستان وطن سے تم لوگ کیسے ترکستان آئے ہو۔"

ہم نے جواب دیا۔

"توارش (رفیق)! ہم نے ہجرت کی ہے۔"

"اچھا...! جونز نے لمبی سانس لے کر کہا:

"تم نے کیوں ہجرت کی ہے؟"

ہم نے کہا:

"افغانستان اور انگریزوں کی لڑائی تھی۔ ہم نے اپنا وطن چھوڑا۔ تاکہ انگریز کے خلاف جہاد کر سکیں اور اپنا پیارا وطن آزاد کرا سکیں۔"

"اور پھر افغانستان سے تاشقند کیسے آئے ہو؟" جونز نے پھر دریافت کیا۔

"تعارش! کیا آپ کے علم میں یہ نہیں کہ یونانیوں نے ترکی پر حملہ کر دیا ہے۔"

جب ہم نے دیکھا کہ افغانستان جنگ نہیں کر رہا تو ہم ترکوں کی امداد کے لئے ایشیائے کوچک کی سمت روانہ ہوئے۔"

"اوہو..... یو سولجرز آف گاڈ" (تم لوگ اللہ کے سپاہی) ہم خوش ہو گئے کہ جونز نے ہماری تعریف کر دی لیکن ساتھ ہی جونز نے لاپروائی سے بولا "اینڈ سنز آف بچز" (کتیا کے بچے)

ہم حیران ہو گئے ساتھ ہی اتنی شرمندگی محسوس کی کہ اکبر کو بھول گئے۔ جونز کی گالیاں تو گالیوں کے حساب نہیں ہوتی تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا:

"ڈیم می" (مجھ پر لعنت ہو)

جونز بے غرض۔ محنتی۔ دیانت دار اور خوش اخلاق تھا۔ ہمارے ساتھ اس کی محبت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ایک سال ہم تاشقند میں رہے اور اس ایک سال کے عرصے میں وہ ہم سے بالکل جدا نہیں ہوا۔ اس کو روسی اجنبی لگتے تھے اور روسیوں کے لئے وہ اجنبی تھا۔ جونز کے اخلاق کا اثر ہمارے لئے اردگرد کے ایک باڑھ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو ہم ضرور غلط راستے پر پڑ جاتے۔ لینن اکیڈمی میں لڑکیاں کلرک تھیں۔ وہ جونز کی باتوں کے پیچھے دیوانی تھیں لیکن جونز تو جونز نہیں بس ایک پتھر تھا۔

خوش اخلاق اتنا تھا کہ اکبر کے غائب ہونے سے چند روز پہلے ہر وقت وہ اکبر کو خوش

رکھنے اور ہنسانے کی کوشش کرتا۔ اسی سے ہم نے قیاس لگایا کہ اکبر خان کے وطن واپس جانے کا علم جونز کو تھا۔ ایک دن شام کو کھانے کے بعد جونز اپنے کمرے سے نکل کر ہمارے ہال میں داخل ہوا۔ اندر آتے ہی اس نے ایک سیاسی مقرر کی طرح تقریر شروع کر دی اور ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "توارش (ساتھیو) ہندوستانیو! کیا آپ کو علم ہے کہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص سرمایہ دار ہے۔ کیا آپ کو پسند نہیں کہ اس کا سارا سرمایہ لوٹ لیں"۔ ہم نے نعرے لگانے شروع کیے۔ "جلدی اس کا پتہ بتاؤ۔"

"بیٹھیں! بیٹھیں! فکر نہ کریں۔ یہ دیکھیں!"

جونز کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے اکبر کے سرہانے کے نیچے سے ایک بڑی بوتل نکالی اور کھڑا ہو گیا بوتل پر سے ڈھکنا اتارا اور جو کچھ بوتل میں تھا مٹھی میں انڈیل لیا اور پھر اس نے وہ چیز ہم میں تقسیم کر دی یہ کشمش میوہ تھا جو اکبر نے اپنے حصے سے تھوڑا تھوڑا بچا کر رکھا تھا اور سارا ایک بوتل میں جمع کر رکھا جونز نے اتنے جوش سے وہ میوہ ہم میں تقسیم کیا جس جوش سے بالشویکوں نے سرمایہ داروں کے کارخانے اور جائیدادیں ضبط کیں تھیں۔ کشمش میں ہمارے لئے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن جونز کے جوش نے ہمیں بھی جوش دلا دیا۔ ہم نے یہ ثابت کر دکھایا کہ کس جوش سے مزدوروں اور دہقانوں نے سرمایہ داروں کی جائدادیں ضبط کرنے میں جوش و خروش دکھایا تھا۔ اسی جوش و خروش اور خوشی کے ساتھ ہم نے اکبر کے کشمش کی تقسیم کی۔

اکبر کے غائب ہو جانے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ وہ سب کچھ اکبر کو الوداع کہنے کے لئے کر رہا تھا۔

جونز کی ایک یہودی لڑکی کے ساتھ محبت

جیسے کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے جونز لڑکیوں کی مجلس سے پرہیز کرتا تھا۔ ان کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا۔ ان کو وہ رنگا رنگ تتلیاں پکارتا۔ وہ کہا کرتا:

مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں عورت کے پیچھے پیچھے اُس کا کوٹ تھامے چلوں اور جب اس کا جی چاہے اس کا کوٹ اس کو پہناؤں۔ مجھے ان رنگین تتلیوں سے ہول آتا ہے۔"

دوسری بات یہ کہ جونز یہودیوں کے سخت خلاف تھا۔ لیکن اپنی قسمت کا اسے کیا پتہ تھا کہ اس کو ایک خوبصورت اور حسین یہودن سے محبت ہو جاتی ہے۔ اُف! جونز بے چارے کی حالت قابل دید تھی۔ اس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ جو باتیں اس کو بری لگتیں وہ ہمارے سامنے ہی اس پر عمل پیرا ہو رہا تھا۔ لڑکی کا نام روزنبرگ تھا اور ہم کبھی کبھار دیکھتے کہ جونز خوشی خوشی روزنبرگ کو کوٹ پتلون پہناتا اور اس کے پیچھے چل رہا ہوتا۔

جونز کے نصیب اچھے تھے کہ ہمارے تاشقند کے قیام کے آخری دنوں میں وہ اس لڑکی پر عاشق ہوا۔ ہم تاشقند سے باکو رخصت ہو گئے اور پھر پتہ نہیں چلا کہ جونز اپنی محبت میں کامیاب ہوا یا ناکام۔

میرا ایشیا کے نوجوان کی باکو کانفرنس میں شریک ہونا

۱۹۲۱ء کی فروری میں باکو شہر میں ایشیا کے نوجوانوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ میں معہ مقصود علی جو کہ شاہ جہان پور کا رہنے والا تھا اس میں ہندوستان کے نوجوانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے شامل ہوا۔ سوویت ترکستان سے دو ترک لڑکے ہمارے ساتھ تھے۔ ایک نام کا احمد تھا جو بہت شیریں زبان اور خوش اخلاق لڑکا تھا۔ دوسرا برہان، کم گو لیکن سخت طبیعت۔ ہم چاروں ساتھی پہلے ایم این رائے کے گھر گئے۔ اس نے کانفرنس کی اہمیت اور مقصد پر ہمارے ساتھ آدھ گھنٹہ تک گفتگو کی۔ اس کے بعد اپنی گاڑی پر بٹھا کر ہمیں سٹیشن بھجوا دیا۔

ہم ڈاک گاڑی میں سوار ہو گئے۔ تین دن تین راتیں سفر کرنے کے بعد بحیرہ خضر کے کنارے کراسناوسک نامی بندرگاہ پہنچے۔ تاشقند سے گاڑی نے سمرقند، بخارا، مرو، عشق آباد اور جبل ارارات کے لمبے راستے سے سفر کیا۔ راستے میں میں بیمار پڑ گیا۔ مجھے کراسناوسک کے ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ سارے راستے زمین برف سے اَٹی پڑی تھی۔ کراسناوسک کے گرم اور شیشے کی طرح شفاف ہسپتال اور ہسپتال کے ملنسار اور خلیق ڈاکٹروں اور نرسوں کے محبت بھرے سلوک نے دوسرے دن ہی مجھے سفر کے قابل بنا دیا۔ گاڑی کے تکلیف دہ سفر کے بعد جو آرام مجھے ان دو دنوں ہسپتال میں پہنچا میں اسے کبھی بھی بھول نہیں پاؤں گا۔

کراسناوسک سے ہم بحری جہاز میں بیٹھے اور چوبیس گھنٹوں میں باکو پہنچے۔ بندرگاہ سے ہمیں استقبالیہ

پر مامور لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنی اپنی رہائش گاہ پر پہنچا دیا۔

چارجوئے سے جُدا ہونیوالے ساتھیوں سے دوبارہ ملاقات

کانفرنس کے منعقد ہونے سے ایک دن پہلے میں باکو پہنچا تھا۔ رات کو خوب آرام کیا۔ صبح سویرے ان پرانے ساتھیوں سے جو ہم سے چارجوئے میں علیٰحدہ ہوئے تھے سے دو ساتھی میری ملاقات کو آئے تھے۔ بغیر کسی انتظار کے میں اپنے پرانے ساتھیوں سے تھوڑی ہی دیر میں ان کے کیمپ میں ملاقات کر رہا تھا۔ میں نے ان کو سخت افسردہ اور مغموم پایا۔ ان کی خواہش ترکی جانے کی تھی۔ اسی لئے ان کو اس کیمپ میں ٹھہرایا گیا تھا۔ جس میں سارے سوویت یونین سے ترکی جنگی قیدی جمع کیئے جاتے یہاں پر ان کو اسلحہ دے کر پھر معہ ساز و سامان ترکی بھیج دیا جاتا۔ ساتھی مایوس بیٹھے تھے۔ میرے پہنچتے ہی ان میں جیسے دوبارہ زندگی آگئی۔ میرے اردگرد جمع ہوگئے۔ شروع سے لے کر آخر تک اپنی درد بھری بپتا سنائی۔ وہ لوگ ہر کسی سے گلہ مند تھے۔ یہاں تک کہ ان ترکوں سے بھی جن کیلئے وہ اناطول گئے تھے۔ اور ان ترکوں سے بھی جو انکے ہم سفر تھے حتیٰ کہ باکو کیمپ میں جو ترک ان کے ساتھ تھے ان سے بھی وہ ناراض تھے۔

حاجی معراج الدین نے نہایت ہی درد ناک اور مایوس لہجے میں کہا:

"بھائی ہم نے سب کچھ آزما لیا۔ غلام ہر جگہ غلام ہی ہوتا ہے۔ اس کی ہر جگہ بے عزتی ہوتی ہے اور کوئی بھی اس کو انسان کی نظر سے نہیں دیکھتا۔"

مصطفیٰ کمال پاشا پر بم کا حملہ

ایک دوسرے ساتھی چنگیز نے اپنے سفر کی درد بھری داستان سنائی کہ کس طرح وہ اناطول پہنچے اور پھر واپس آئے۔ یہ مہاجرین چارجوئے سے سیدھے باکو پہنچے تھے اور یہاں سے ترکوں کے توپخانے کے ساتھ پا پیادہ اناطولیہ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

چنگیز بولا:

"قفقاز اور ارض روم کے پہاڑوں میں چلنا افغانستان میں پہاڑوں کے سفر سے کسی طرح بھی کم تر نہیں۔ ہماری راتیں برف میں گذری ہیں۔ لیکن یہ عذاب تو چھوڑو۔ جب وہاں پہنچے تو پتہ ہے ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ ایک ذلیل ہندوستانی غدار وطن انگریزوں کا ایجنٹ جو اپنا نام مصطفےٰ صغیر بتاتا تھا اس ذلیل انسان نے انگریز کی ایما پر ترکوں کے محبوب رہنما مصطفےٰ کمال پاشا کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ یہ بدنصیب انسان ہمارے پہنچنے سے قبل ہی اپنے اعمال اور کردار کی وجہ سے واصل جہنم کر دیا گیا تھا۔ ایسے ہی ایک منحوس وقت میں ہم اناطولیہ پہنچے۔ جب ان کو ہمارے اناطولیہ آنے کا پتہ چلا کہ ہندوستانی آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ترکوں کی امداد کرنا چاہتے تھے تو کہلوا بھیجا کہ ہندوستانیوں کی امداد سے ہماری توبہ۔ وہ ہمیں نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہمیں حکم ملا کہ جس راہ سے آئے ہو اسی راستے سے لوٹ جاؤ۔"

"بھائی یہ تھا ہمارے ہزاروں میل راستہ طے کرنے کا نتیجہ۔ یہ تھا ہماری مصیبتوں کا انجام۔ یقین جانو ہمارے دل بالکل پھٹ گئے۔ فوراً ہی تھکے ماندے جنوری کی سخت سردی میں قفقاز کے برف سے اٹے ہوئے پہاڑی راستے سے واپس آئے۔ افسوس زمانہ اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ مصطفےٰ صغیر اور مہاجرین میں کوئی فرق نہیں کر سکتا ہے۔"

"بس بھائی بس یہی کافی ہے۔" میں نے اسے خواست کی۔ مجھ پر چنگیز کے اس دردناک قصے کا بہت اثر ہوا۔ بہت افسوس ہوا اور دل میں فوراً آیا:

"اے خداوند کریم! کب تک ہم غلام رہیں گے۔ کب تک وطن عزیز پر دکھوں اور مایوسیوں کے بادل چھائے رہیں گے۔ کبھی ہم بھی دنیا کی اور قوموں کی طرح گردن اٹھا کر کھڑے ہو سکیں گے!"

میں بے حال تھا اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ منہ سے ایک آہ نکلی۔

"بھائی ناراض مت ہو۔" حاجی معراج الدین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"حاجی صاحب اب آپ لوگ کیا کریں گے؟" اس پریشانی کی حالت میں میں نے ان سے یہ بھی دریافت کیا۔

مہاجرین کا متفقہ خیال تھا کہ کسی طرح اب ہم وطن عزیز کو واپس ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔" آپ سب کی یہی ایک رائے ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"تو اور کیا کریں۔ بس ہم نے اپنی بساط کے مطابق کر لیا۔ انسان اپنی بساط کے مطابق ہی کرتا ہے۔ اب کہاں جائیں۔ وطن کے علاوہ اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ یقین جانیے افغانستان کی پہاڑیاں یاد آرہی ہیں"۔ چنگیز مسکرایا اور کہنے لگا " ہم نے ایک درخواست آذر بائیجان کی جمہوریہ کے صدر کو دی ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کے پاس تاشقند جانا چاہتے ہیں۔ آپ کوشش کریں کہ ہمیں جلدی اجازت مل جائے اور ساتھ ہی جانے کا بھی بندوبست ہو سکے۔ بھائی! پھر ہم ہوں گے اور ہمارا پرانا راستہ۔ پھر مزار شریف ہوگا۔ خانہ آباد اور کابل اور اپنا پیارا وطن۔"

" بہت اچھا۔ دعا کریں کہ ہم بھی جلد از جلد ہوا بازی کی تربیت پوری کر لیں اور آپ کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی میں بھرپور حصہ لے سکیں۔" مہاجرین نے صدق دل سے " آمین " کہی اور وطن عزیز کی آزادی کے لئے دعا مانگی۔

نوجوانوں کی کانفرنس کے سیکرٹری کی وساطت سے اس دن آذر بائیجان جمہوریہ کے صدر کے ساتھ ملاقات کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ ایک سفید ریش مسلمان ترک تھا اور میری ملاقات آخر کیوں نہ ہوتی۔ سوویت یونین میں ہندوستان کا بڑا نام تھا اور باکو میں میں ہندوستان کے نوجوانوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔

باکو کانفرنس

شام تک بمشکل ساتھیوں کے کام سے فراغت پائی۔ اگلے دن صبح کے دس بجے کانفرنس شروع ہوئی۔ سوویت وطن کے دستور کے مطابق اور بالشویکوں کے اصول کے مطابق پانچ اشخاص ایک صدر کے بجائے صدارت کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کو پریذیڈیم کہا جاتا ہے۔ کانفرنس میں اکادکا لڑکیاں بھی نمائندہ کی حیثیت سے شامل تھیں اور جا بجا لڑکوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں۔ سوویت ایشیا کی تمام جمہوریتوں کے نمائندہ لڑکے لڑکیاں موجود تھے۔ سوویت کے علاوہ کوریا۔ چین۔ عرب۔ ترکی۔ اور مصر کے نمائندے

بھی کانفرنس میں شامل تھے۔

کانفرنس دو دن جاری رہی۔ گرم گرم تقریریں ہوئیں۔ آخر میں ایک تجویز پاس ہوئی جسمیں ایشیا کے تمام نوجوانوں کو دعوت دی گئی۔ کہ یورپی استعمار سے ایشیا کو آزاد کرانے کے لئے جنگ میں بھرپور اور صدق دل سے حصہ لیں۔ ہندوستانی تحریک آزادی سے کانفرنس میں دلچسپی بہت زیادہ دکھائی گئی۔ اکثر مقررین نے ایشیا کی غلامی کی ذمہ دار انگریز شہنشاہیت کو گردانا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کانفرنس کی توجہ بطور خاص ہماری طرف رہی۔

دوسرے دن کانفرنس کے خاتمے پر استقبالیہ کی سیکرٹری رشیدہ خانم جو کہ پریذیڈیم کی رکن بھی تھی، ہمارے پاس آئی اور ہمیں شام کی سیر کی دعوت دی۔ اس کے لیئے موٹر لانچ کے ذریعے بحیرہ خضر میں سیر پسند کی گئی۔ میں نے مقصود کو بتایا وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا رشیدہ خانم خود مدعو کرنے آئی تھی وہ جو ایشیا کے نوجوانوں کی کانفرنس کی ایک رہنما بھی تھی اور حد سے زیادہ حسین اور پھر سب سے بڑھ کر قدرت نے اس کی آواز میں ایسی دل کشی پیدا کی تھی کہ اس کی باتیں بھی جیسے نغمے سنائی دیتے تھے۔

ہم چاروں سیدھے سمندر کی طرف گئے۔ موٹر لانچ تیار کھڑی تھی۔ احمد بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لانچ میں پانچ افراد اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی گورجستان کے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی داغستان کے اور ایک ایرانی تھا۔ لانچ تقریباً آدھ گھنٹے کے آرام دہ سفر کے بعد ایک چھوٹے سے جزیرے میں پہنچی۔ یہ جزیرہ بمشکل ایک ہزار مربع گز ہوگا۔ شاندار طریقے سے بنایا گیا تھا۔ ہمارے گروپ کے چائے پینے کے لئے بہترین جگہ تھی۔ چائے پینے کے بعد لانچ نے ہمیں اردگرد کے چھوٹے چھوٹے جزیروں کے گرد گھمایا۔ اس سیر و تفریح میں جتنی خوشی ملی قلم اس کو نہیں لکھ سکتا۔ ایرانی ادب میں قفقاز کے لوگ پریوں سے متشابہ ہیں۔ پھر ہمارے جیسے مسافروں کے ساتھ قفقاز کا حسن سلوک ہمیں کیسے خوش نہ کرتا۔

اپنی بائیس سالہ عمر میں مجھے پہلی دفعہ پتہ چلا کہ میری آنکھوں میں ایک خاکستری نیلی تھی اور دوسری صاف نیلی۔ رشیدہ خانم نے باتوں باتوں میں میری آنکھوں کا یہ فرق معلوم کر لیا۔ یہ اتنا معمولی فرق تھا کہ نہ مجھے پتہ تھا اور نہ ہی اور کسی نے اب تک بتایا تھا۔

ہمیں خوش رکھنے کے لئے رشیدہ خانم ہم سے ہندوستان کے متعلق باتیں پوچھتی۔ انہی باتوں کے دوران اسے میری آنکھوں کا یہ فرق نظر آیا۔ جتنی بھی اونچی تھی۔ رشیدہ خانم آخر عورت ہی تو تھی چپکے سے اس نے احمد کو کہا کہ اس ہندوستانی توارش کی آنکھوں کو دیکھو۔ احمد نے مجھے بتایا اور ہم تینوں ہنس پڑے۔

باکو شہر

باکو جمہوریہ آذربائیجان کا صدر مقام ہے یہ بحیرہ خضر کے مغربی کنارے آباد ہے۔ شہر کی چوڑائی کم ہے اور پانی کے کنارے میلوں لمبا گیا ہوا ہے۔ قفقاز اور ایران کے درمیان اسی راستے تجارت ہوتی ہے۔ باکو کی شہرت کی اصل وجہ تیل کی پیداوار ہے۔ اس موقعہ پر تو ہم تیل کے کنوئیں نہ دیکھ سکے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب ماسکو سے واطن واپس روانہ ہو رہے تھے تو ریل کی پٹڑی سے بے شمار تیل کے کنوئیں نظر آئے۔ یہ باکو شہر سے باہر میلوں تک پھیلے ہوئے تھے

باکو شہر کی گلیوں میں تیل پڑا تھا۔ سمندر کے اوپر تیل بہہ رہا تھا۔ شہر کا رنگ تیل کے دھوئیں کی وجہ سے زردی مائل ہو چکا تھا۔ تیل کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ تاشقند سے گاڑی پر سفر کے دوران ہر بڑے سٹیشن پر تیل لے جانے والی خاص گاڑیاں نظر آئیں جو تیل لے جا رہی تھیں یا خالی واپس آ رہی تھیں۔ یہی حال ماسکو سے باکو تک بھی ہے۔ سوویت روس اسی تیل پر آباد ہے۔

باکو شہر میں سردیوں میں انگیٹھیوں میں تیل جلتا ہے۔ کارخانے تیل پر چل رہے ہیں۔ کھانا پکانا بھی تیل پر ہی ہو رہا ہے اور باقی ایندھن کی ضرورت نہیں پڑتی۔

قفقاز میں تین جمہوریتیں ہیں۔ گورجستان، آذربائیجان اور آرمنستان آذربائیجان ۴۳ آدھا سوویت روس

کے پاس ہے اور آدھا ایران میں شامل ہے۔ سوویت کا صدر مقام باکو ہے۔ جس کا ذکر میں نے کر دیا ہے۔ جبکہ ایرانی آذربائیجان کا صدر مقام تبریز ہے۔ آذربائیجان کے لوگ ترک ہیں۔ شیعہ مذہب کے پیروکار ہیں زبان ترکی ہے۔ لیکن باکو کے ترکوں کے علاوہ آذربائیجان ترقی کی راہ سے بہت دور ہے۔ باکو یورپ کے بہترین شہروں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس میں بے حساب کارخانے ہیں۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔ لوگ اکثر کالے سوٹ پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سفید کپڑے نہ تو مردوں کے ہیں اور نہ ہی عورتوں کیلئے لوگ تعلیمیافتہ ہیں۔ شہر کی ہر گلی میں ابتدائی سکول ہیں۔ جگہ جگہ بڑے بڑے کالج واقع ہیں۔ باکو میں آذربائیجان کی یونیورسٹی واقع ہے۔

پشاور کے رہنے والے عبدالکریم نامی ایک دوست نے تاشقند کا ایک سکول دکھایا۔ وہ اسی سکول میں زیر تعلیم تھا۔ آذربائیجانی نوجوان ترک اس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سکول کے پرنسپل نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور ہندوستان کی آزادی کے ساتھ اپنی پوری ہمدردی ظاہر کی۔

سوویت کی ناکہ بندی کا اثر

تاشقند میں ہندوستانی ہوائی مدرسہ بند ہو گیا

دس مہینے تک ہم نے تاشقند کے ہوا بازی کے سکول میں تربیت حاصل کی۔ یہ امید رکھے ہوئے تھے۔ کہ جلد ہی اپنی ہوائی تربیت پوری کر لیں گے۔ لیکن غلام جہاں بھی جاتا ہے غلامی کا بُرا اثر سایے کی طرح اس کے پیچھے چل رہا ہوتا ہے۔ ہمارا تو یہ خیال تھا کہ بوقت ضرورت وطن عزیز کے کام آئیں گے لیکن جلد معلوم ہوا کہ انگریزی استعمار کے ہاتھ بہت لمبے ہیں جو دور دور تک پہنچتے ہیں۔ سوویت اور انگریز کے درمیان معاہدہ ہوا کہ روس ترکستان میں موجود ہندوستانی ہوائی مدرسہ بند کر دے گا اور انگریز ناکہ بندی اٹھالے گا اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات پھر سے قائم ہو جائیں گے۔ جس طرح میں نے پہلے ذکر کیا ہے اس وقت جرمنی کے علاوہ دنیا کا کوئی صنعتی ملک بھی سوویت یونین کے ساتھ تجارت نہیں کر رہا تھا۔ جرمنی خود جنگ عظیم کے ہاتھوں چور چور ہو چکا تھا اور روسی جہاز اپنے ڈر کی وجہ سے بندرگاہوں سے دور نہیں جا سکتے

تھے۔ اس ناکہ بندی کا اثر روس پر اتنا سخت تھا کہ سخت سردی میں بھی کپڑا بالکل ناپید تھا۔ روس میں کارخانے نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس لئے چرخے اور جولاہوں سے کام لیا جا رہا تھا۔ بازار میں پرانے کپڑوں کی قیمت بھی حیران کن تھی۔ قمیض کے لئے بٹن نہیں ملتے تھے۔ موچی چمڑے کی گول ٹکیاں بنا کر ان میں دو سوراخ کر لیتے یہی بٹن ہوتے۔

بازار میں دانتوں کا برش نہیں مل رہا تھا۔ بڑھئی لکڑی کے برش بنا رہے تھے۔ بے ڈھنگے انداز سے ان میں بال لگے ہوتے تھے اور بغیر رنگ و پالش کے مہنگے داموں بازار میں فروخت ہو رہے تھے۔ اسی طرح ہر قسم کی لکڑی سے کنگھیاں بازاروں میں اونچے داموں فروخت ہو رہی تھیں۔ چمچے کی جگہ لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے چمچے استعمال ہوتے تھے۔

ورثے میں سوویت کو ایسا وطن ملا تھا جس میں کارخانے بالکل کم تھے۔ حتیٰ کہ میخ بھی نہ ہونے کے برابر تھی اور جوتوں میں لوہے کی میخوں کی بجائے لکڑی سے بنائے ہوئے میخ استعمال کئے جاتے۔

گرم کپڑا چرخے پر کاتا جاتا۔ کوٹ اور پتلون چترالی پٹی کے طرز پر بنے ہوئے کپڑے سے بنتے تھے۔ چرخے پر کاتا ہوا سوت وطن کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ناکافی تھا اس لئے سپاہیوں کے لیے روئی سے بھرے ہوئے کوٹ اور برجس فراہم کئے گئے۔ مختصراً سوویت عوام ناکہ بندی کے ہاتھوں بہت تنگ تھے۔

ایم این رائے نے نعم البدل پیش کیا

"خیر ہے۔ آپ لوگ ماسکو چلے جائیں گے۔ بڑا شہر ہے سارے سوویت کا صدر مقام ہے۔ قابلِ دید جگہ ہے۔ وہاں ایشیا کے لئے ایک بڑی یونیورسٹی قائم کی گئی ہے۔ اس میں آپ لوگ وطن کی آزادی کے لئے سائنٹفک تعلیم حاصل کر لیں گے۔ یونیورسٹی کے اندر ہندوستانی سیکشن میں آپ لوگ داخل ہو جائیں گے۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ اور آسٹریلیا کے بڑے بڑے انقلابی آپ کو تعلیم دیں گے۔ آپ لوگ بھی قابل انقلابی بن جائیں گے۔

ہاں پھر بھی اگر آپ لوگوں میں سے کوئی اپنی ہوا بازی کی تربیت پوری کرنا چاہتا ہے تو ماسکو کے عظیم الشان ہوائی مدرسے میں داخل ہو جائے گا۔"

اس طریقے سے ایم این رائے نے ہمارا دل رکھ لیا۔

تاشقند میں فٹ بال

سردیوں میں تاشقند میں اتنی برف پڑی کہ فٹ بال نہیں کھیلا جا سکتا تھا۔ برف کے پگھلنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فٹ بال ٹیم نے مشق شروع کر دی۔ ہمارا کپتان فقیر شاہ نظیر کوہاٹ کا رہنے والا تھا۔ اور مولانا عبدالرب کے گروپ کا آدمی تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ ہوائی جہازوں کے مدرسہ میں ہمارا ہم جماعت تھا۔ اس نے وطن عزیز ہم سے تھوڑا عرصہ قبل سال ۱۹۱۹ء میں چھوڑا تھا۔ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔

ہماری ٹیم کا فل بیک ہمارا روسی باورچی تھا۔ میری خوش نصیبی تھی کہ دوسرا فل بیک مجھے چنا گیا۔ فارورڈ لائن میں نبی بخش قابل ذکر تھا۔ نبی بخش بنوں کا رہنے والا تھا۔ اس کا ذکر کتاب میں جگہ جگہ ہو چکا ہے۔

کبھی کبھی ہم تاشقند کی مختلف ٹیموں کے ساتھ میچ کھیلا کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی اتنے اعلیٰ درجے کے کھلاڑی نہیں تھے۔ ترک مضبوط ہوتے لیکن ان کا فٹ بال کھیلنا ہم سے بہتر نہیں تھا۔ ٹورنامنٹ میں ہم فائنل تک جا پہنچے۔

فائنل ایک بڑی تقریب تھی۔ آخری میچ کے تماشے کے لیے جمہوریہ ترکستان کا صدر اور چند بڑے فوجی افسر بھی آئے ہوئے تھے۔ باورچی بھی عجیب طبیعت کا انسان تھا۔ جس دن اس کی زیادہ ضرورت ہوتی اسی دن روٹھ جاتا۔ اس دن باورچی صاحب کھیل کے لئے بالکل تیار نہیں ہوئے۔ اس کی جگہ ایک اور روسی لڑکا میرے ساتھ فل بیک لگا۔ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہم نے میچ ایک گول سے جیت لیا۔ اپنی تقریر میں صدر نے ہمارے کھیل کی تعریف کی۔ ترکستان کے اخباروں نے پہلے صفحے پر سرخی کے ساتھ ہمارے میچ جیتنے کی خبر شائع کی۔ تاشقند کے اس میچ کے بعد ہماری ٹیم نے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی۔

ہاں پھر بھی اگر آپ لوگوں میں سے کوئی اپنی ہوا بازی کی تربیت پوری کرنا چاہتا ہے تو ماسکو کے عظیم الشان ہوائی مدرسے میں داخل ہو جائے گا۔"

اس طریقے سے ایم این رائے نے ہمارا دل رکھ لیا۔

تاشقند میں فٹ بال

سردیوں میں تاشقند میں اتنی برف پڑی کہ فٹ بال نہیں کھیلا جا سکتا تھا۔ برف کے پگھلنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فٹ بال ٹیم نے مشق شروع کر دی۔ ہمارا کپتان فقیر شاہ نظیر کوہاٹ کا رہنے والا تھا۔ اور مولانا عبدالرب کے گروپ کا آدمی تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ ہوائی جہازوں کے مدرسہ میں ہمارا ہم جماعت تھا۔ اس نے وطن عزیز ہم سے تھوڑا عرصہ قبل سال ۱۹۱۹ء میں چھوڑا تھا۔ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔

ہماری ٹیم کا فل بیک ہمارا روسی باورچی تھا۔ میری خوش نصیبی تھی کہ دوسرا فل بیک مجھے چنا گیا۔ فارورڈ لائن میں نبی بخش قابل ذکر تھا۔ نبی بخش بنوں کا رہنے والا تھا۔ اس کا ذکر کتاب میں جگہ جگہ ہو چکا ہے۔

کبھی کبھی ہم تاشقند کی مختلف ٹیموں کے ساتھ میچ کھیلا کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی اتنے اعلیٰ درجے کے کھلاڑی نہیں تھے۔ ترک مضبوط ہوتے لیکن ان کا فٹ بال کھیلنا ہم سے بہتر نہیں تھا۔ ٹورنامنٹ میں ہم فائنل تک جا پہنچے۔

فائنل ایک بڑی تقریب تھی۔ آخری میچ کے تماشے کے لیے جمہوریہ ترکستان کا صدر اور چند بڑے فوجی افسر بھی آئے ہوئے تھے۔ باورچی بھی عجیب طبیعت کا انسان تھا۔ جس دن اس کی زیادہ ضرورت ہوتی اسی دن روٹھ جاتا۔ اس دن باورچی صاحب کھیل کے لئے بالکل تیار نہیں ہوئے۔ اس کی جگہ ایک اور روسی لڑکا میرے ساتھ فل بیک لگا۔ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہم نے میچ ایک گول سے جیت لیا۔ اپنی تقریر میں صدر نے ہمارے کھیل کی تعریف کی۔ ترکستان کے اخباروں نے پہلے صفحے پر سرخی کے ساتھ ہمارے میچ جیتنے کی خبر شائع کی۔ تاشقند کے اس میچ کے بعد ہماری ٹیم نے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی۔

تاشقند میں ہماری تفریح

اکثر شام کو ہم سینما یا تھیٹر دیکھنے جاتے۔ ہمارے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ لیکن ٹکٹ پر پیسے لگتے بھی نہیں تھے۔ ٹکٹ ہمیں ہماری باری آنے پر دیئے جاتے۔ سوویت تھیٹر اور سینما پروپیگنڈے کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ لیکن پھر بھی تسکین دل کے لئے اچھی تفریح تھی۔

کبھی کبھی لینن اکیڈیمی میں ڈرامے کھیلے جاتے۔ اکیڈیمی کے اپنے سٹاف میں کافی لوگ تھے۔ وہ اچھے فنکار تھے۔ دفتروں کی کلرک لڑکیاں اکثر اس فن میں ماہر ہوتیں۔ یہ ڈرامے خوب دلچسپ ہوتے اس لئے وقت اچھا گذرتا۔

اکیڈیمی میں کبھی کبھی رقص بھی ہوتا۔ مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر ناچتے۔ ایک دفعہ کسی خوشی کی تقریب میں بورڈ پر نمایاں الفاظ میں رقص کے متعلق لکھا تھا۔ ہماری اکیڈیمی کا تمام سٹاف ایک بڑے ہال میں جمع ہو چکا تھا۔ باری باری جوڑے اٹھتے اور وقت مقررہ تک ناچتے۔ روس میں قفقاز کے ناچ کو خاص طور سے پسند کیا جاتا ہے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی دونوں ایسے طریقے سے ناچتے ہیں کہ اس میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل تو لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ اتفاقیہ طور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں۔ لڑکا لڑکی پر اور لڑکی لڑکے پر عاشق ہو جاتی۔ ناچنے میں ہی ایک دوسرے سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ پھر جدا ہو جاتے ہیں۔ آخر میں پھر مل جاتے ہیں۔ یہ ساری کہانی دیکھنے والا ناچ سے معلوم کر سکتا ہے۔ منہ سے ایک لفظ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کبھی کبھی ایک شخص بھی ناچتا ہے۔ اس ناچ میں ہاتھ کی حرکت کی جگہ پاؤں کی حرکت زیادہ ہوتی ہے۔ روسی یہ ناچ بہت پسند کرتے ہیں اور یہ ان کا خاص ناچ ہے۔

اس رات اس سارے ناچ میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں کوہاٹ کا عبدالکریم بہت اچھا آدمی تھا۔ اس نے داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ ہمارے درمیان بیٹھا تھا۔ ہمارے ہوائی جہازوں کے ایک کپتان نے تازہ تازہ شادی کی ہوئی تھی اس کی بیوی بہت اچھا ناچ رہی تھی۔ ناچ کے آخر میں خاوند کو ہاتھ سے پکڑے وہ ہماری طرف آئی۔ خاوند نے اس کو پکڑ کر آہستہ سے عبدالکریم کی طرف دھکیلا۔ عبدالکریم نے اس

کو اپنی گود میں پکڑ لیا۔ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر خوب ناچے۔ ہم حیران کہ عبدالکریم نے کہاں سے یہ ہنر سیکھا۔ ساتھ ہی خوشی بھی محسوس کی کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اسکے بغیر ناچنے کے فن کو نہیں جانتا تھا۔ حاضرین بہت ہنسے کہ عبدالکریم معہ اتنی بڑی داڑھی کے کپتان کی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ناچا۔ ناچ ہی ناچ میں جب عبدالکریم کی داڑھی اس دلہن کے بدن کو چھوتی تو حاضرین تالیاں بجاتے۔ اپنے فن کی وجہ سے عبدالکریم اکیڈیمی میں ہر دلعزیز شخص بن گیا۔ عبدالکریم جنگ عظیم کے دوران انگریزی فوج کے ہمراہ فرانس گیا تھا اور اس نے یہ ناچ وہاں سیکھا تھا۔

کبھی کبھی خاص موقعوں پر ہم تاشقند کے پرانے قدیم شہر بھی چلے جاتے۔ ایک شام ہمارے ترک دوست ہمیں قدیم شہر لے گئے۔ عید الفطر کا دن گذر چکا تھا۔ رات کو بہت بڑا جشن تھا۔ اردگرد بہت سے لوگ قالینوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں رباب ڈھولکی اور باجے سازندوں کے آگے پڑے ہوئے تھے۔ بہت عرصے بعد ہم نے اپنے وطن جیسے ساز دیکھے۔

ترکی سے ہم ناواقف تھے۔ لیکن کچھ ٹوٹی پھوٹی سیکھ چکے تھے۔ کیونکہ کچھ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی اس میں پائے جاتے تھے اسی لئے کچھ نہ کچھ مطلب اس سے نکال سکتے تھے۔ سازندوں کے آگے ایک شخص ناچ رہا تھا۔ جدید تاشقند اور قدیم تاشقند کے درمیان فاصلہ تو بہت کم ہے لیکن خیالات اور طرز بود و باش میں کتنا فرق ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ جدید تاشقند میں آزادئ نسواں صرف روسیوں تک ہی محدود تھی۔ ترک عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا ناممکن تھا۔ سخت پردہ کرتی تھیں۔ جدید تاشقند میں یہ کوشش جاری تھی کہ ترکوں کو بھی بے پردہ کر دیں۔ سکولوں اور کالجوں میں آہستہ آہستہ یہ تربیت دی جا رہی تھی۔ لیکن ترک اور روسی عورتوں میں اتنا فرق تھا جتنا وطن عزیز میں پشتون اور انگریز عورتوں میں۔ انگریز اور روسی عورت میں فرق کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ لباس اور طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ روسی معاشرہ بہت سی باتوں میں انگریزی معاشرے کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

ترکستان کی آزادی کی سالانہ پریڈ

ترکستان کی آزادی کی سالانہ پریڈ بڑے وسیع پیمانے پر اپریل کے مہینے میں تاشقند کے مرکزی باغ میں منعقد ہونا قرار پائی۔ ترکستان کے سالار عسکر نے سلامی لی۔ سلامی کے دوران جب ہمارا دستہ کمانڈر کے آگے سے گذرنے لگا تو وہ زور سے چلایا۔

" دسدر سویتے توارشی اِندوسکی "

(ہندوستانی ساتھی زندہ باد)

ہم نے فوجی طرز پر سلامی دی۔ اور پھر باغ میں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے بچوں کی ایک فوج آتی دکھائی دی۔ لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل یہ چھ سال سے لے کر تیرہ چودہ سال تک کے ترکستانی بچے تھے۔

وہ ننگے سر تھے پاؤں میں بغیر موزوں کے سفید بوٹ تھے اور بغیر آستینوں کے بنیان اور جانگیے پہنے ہوئے تھے۔ لڑکوں کے بال انگریزی طرز پر بنائے گئے تھے اور لڑکیوں کے بال شانوں پر کاٹے گئے تھے۔ لڑکوں نے جانگیے پہنے ہوئے تھے اور لڑکیوں نے جانگیوں جتنی شکنوں سے بھرپور شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔

"ترکستان کے مستقبل کی امید انہی بچوں سے وابستہ ہے۔" میرے کان میں ایک ترک طالب علم نے سرگوشی کی۔

" دیکھو تو کتنے چست و چالاک ہیں" میں نے جواب دیا " یہ بچے اچھی تربیت حاصل کریں گے۔ سستی ان کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتی۔ یہ چست و چالاک ہیں۔ اور عام ترک بچوں کی طرح چپن بھی نہیں پہنتے جو کہ سستی اور کاہلی کی علامت ہے۔" ترک طالب علم نے مزید کہا۔

میں نے دریافت کیا کہ " ان کو کیا تعلیم دی جا رہی ہے اور یہ کس مدرسے کے طالب علم ہیں؟"

" ان کو کوئی خاص تربیت و تعلیم نہیں دی جا رہی بلکہ یہ ابتدائی تعلیم عام مدرسوں میں ہی پا رہے ہیں۔ استاد ان کی طبیعت اور ذہانت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اور اپنے اپنے شوق اور مزاج کے مطابق مدرسوں کو پھر بھیجے جاتے ہیں۔ جو ڈاکٹری کے لئے موزوں ہیں۔ طب کے مدرسوں کو بھیجے جاتے ہیں۔ جو بچے

انجینئرنگ کے لئے موزوں ہیں۔ وہاں بھیج دیے جاتے ہیں اور جو دفاع کے لئے موزوں ہیں تو ہوائی یا پیادہ فوجی مدرسے کو بھیج دیے جاتے ہیں۔" طالب علم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

ایک دن جونز کی رہنمائی میں ہم "ترکستان فضائی مدرسہ" دیکھنے گئے۔ اس میں سینکڑوں بچے تھے۔ ان کے بڑے اُستاد نے ہمیں بتایا کہ اس میں وہ لڑکے لیئے جاتے ہیں جو ابتدائی مدرسوں سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ ترکستان کے فضائی مدرسہ میں بارہ سال میں ایک آدمی مکمل ہوا باز بنتا ہے۔

"بارہ سال میں آپ لڑکوں کو کیا سیکھاتے ہیں؟" ہم نے ان سے دریافت کیا۔

سرمعلم نے جواب دیا۔

"بارہ سال میں سائنس اور عام لیاقت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آخری چند سالوں کے دوران لڑکا ہوا بازی بھی سیکھ جاتا ہے۔ جو لڑکے ہوا بازی کے لئے موزوں نہیں سمجھے جاتے ان کو اور مدرسوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔"

روس

جون ۱۹۲۱ء میں ہمارا ہندوستانی ہوا بازی کا سکول بند کر دیا گیا اور ہمیں اکیڈیمی کا ایک اور حصہ رہنے کے لئے دیا گیا۔ بڑی مشکل سے بیکاری کا وقت گذار رہے تھے اس لئے اپنے لئے ایک نیا مشغلہ نکالا اور وہ تقریر سیکھنے کا تھا۔ لیکن چند ہی دن بعد اس مشق سے بھی اُکتا گئے اس میں ہماری دلچسپی کم ہونے لگی۔ اِدھر اُدھر پھرنے سے بھی تنگ آ گئے۔ آخر کار دو مہینوں کے انتظار کے بعد ۱۶ اگست کو ماسکو روانہ ہوئے۔ چوتھے دن ماسکو کے ایک بڑے سٹیشن پر اترے۔

لمبا سفر متواتین راتیں راستے میں گذاریں ۔ سفر اتنا دلچسپ تھا کہ ختم ہونے پر ہم افسردہ تھے ہم سترہ اشخاص ایک ڈبے میں سوار تھے۔ تقریباً تیس اور مسافر بھی ہمارے ساتھ سوار تھے۔ ہر ایک شخص کے لئے اپنی جگہ مخصوص تھی۔ نیچے والی نشست رات کو چارپائی کا کام دیتی اور دن کو دو کرسیاں اور ایک میز سی بن جاتی ہمارے ساتھ سفر کے دوران کھانے کے لئے ڈبل روٹی، مکھن، پنیر اور کئی اور چیزیں تھیں۔ چائے کے لئے ہر سٹیشن پر اُبلتا ہوا پانی موجود ہوتا جو بغیر قیمت کے ہر کسی کو مل جاتا۔

روس میں اور چیزوں کی طرح چائے کی بہت کمی تھی۔ ہم اکثر پانی میں سیب کی چائے ڈال دیتے تھے۔ جو دودھ اور چینی کے بغیر پی لیتے۔ ترکستان اور روس میں دودھ اور چینی والی چائے نہیں پی جاتی ہے سارا دن وہ پانی کے بجائے چائے پیتے ہیں۔ ہماری بھی سخت سردی کی وجہ سے یہی عادت بن گئی۔ ہمارے وطن میں چائے میں پتی بہت زیادہ ڈالی جاتی ہے لیکن اس ملک میں ہمارے وطن کی ایک پیالی چائے ان کے لئے سارا دن کافی رہتی ہے۔ روس میں سماوار میں پانی ابل رہا ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی کیتلی میں تھوڑی سی چائے کی پتی ڈالی جاتی ہے۔ اور اوپر سے اس پر ابلتا ہوا پانی ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کیتلی سے پھر پیالی میں تھوڑی تھوڑی کر کے سارا دن بغیر دودھ اور میٹھے کے چائے پیتے رہتے ہیں۔

تاشقند سے جب گاڑی روانہ ہوئی تو اگلا سٹیشن آنے سے پہلے پہلے ہم آپس میں آشنا بن چکے تھے۔ روسی تعارف کے لئے کسی رسومات کا محتاج نہیں۔ پہلے ہی وہ بول پڑتے ہیں:

"رفیق خوش آمدید! سفر لمبا ہے۔ آؤ آپس میں دوست بن جائیں۔" یہ کہہ کر دونوں اشخاص آپس میں مصافحہ کر کے دوست بن جاتے ہیں۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ ہم میں سے ایک دو کو زبردستی شریک کر لیتے تھے۔ وطن میں ہمارا عام خیال ہے کہ تعلیم یافتہ آدمی صرف کھانا کھانے کی دعوت دیتا ہے اور زبردستی کھانے میں شریک کرنا گاؤں والے جاہل آدمیوں کا کام ہے لیکن روس میں تعلیم یافتہ اور بے تعلیم دونوں زبردستی کھانے پر بٹھاتے ہیں۔

تاشقند سے روانہ ہوتے وقت گاڑی بھری تھی۔ فوجی گارڈ بھی حفاظت کے لئے متعین کئے گئے تھے۔ ہر ایک طرف کمانڈنٹ کا کمرہ تھا۔ اسی طرح ہر ایک گاڑی کے لئے ایک منتظم ہوتا جس کو کمانڈنٹ کہہ کر پکارا جاتا۔ ہم بہت جلدی جان گئے کہ باقی مسافروں کا ہمارے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اس لئے ہے کہ سفر بخیر و خوشی ختم ہو جائے۔ سارا دن تاش اور شطرنج کھیلنے میں گذارا۔ رات کھانے کے بعد گاڑی کے ایک سرے سے گانے شروع ہوئے اور کسی کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں سمجھا گیا۔ باپ

بٹیا، ماں، بیٹی غرض وطنی اور مسافر سب باری باری اپنی زبان میں گانا گاتے محفل گرم ہو گئی آخر اس تنگ جگہ میں ناچنا بھی شروع ہو گیا۔

گاڑی میں جس خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اتنی خوشی تو کسی بڑے موقع پر بھی نہیں ہوتی۔ خوبصورت اور حسین دوشیزائیں جن کے ساتھ باہر بات کرنا بھی ناممکن تھا گاڑی میں ہمارے ساتھ بے تکلف ہو گئیں۔ گانے کافی گائے جاتے لیکن وقت پر الگ الگ بات کوئی بھی نہیں تھی۔ کھانے کے وقت ساری گاڑی والے روٹی کھاتے اور کھیل کے وقت سب کھیلتے۔ ماسکو پہنچنے تک ہر رات دیر تک گاڑی میں گانے گائے جاتے اور ناچ ناچا جاتا۔ اگر ہمارے وطن میں کوئی ہر رات یا سفر میں ہر وقت اس قسم کے کام کرتا تو معاشرے میں ضرور بدنام ہو جاتا۔ بدا خلاق جانا جاتا۔ لیکن روس اور صرف روس ہی کیا تمام یورپ میں سفر کے وقت اور گھر میں یہ ایک ضروری مشغلہ جانا جاتا ہے کہ تمام دن محنت و مشقت کے بعد رات کو کچھ نہ کچھ تفریح کا انتظام ہو۔

مصیبتوں سے بھرے سفر میں میں نے بوڑھے آدمی دیکھے ہیں جو دوستوں اور ساتھیوں کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے نخرے کر کے کچھ نہ کچھ تفریح کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ ایسے میں ہر کوئی اپنا یہ فرض سمجھتا ہے کہ سب پر ثابت کر دے کہ وہ ایک خشک انسان نہیں۔ اسی طرح ہر مصیبت سب لوگ ہنسی خوشی جھیل لیتے ہیں۔

ہم اس سفر میں رات دن اس طرح مشغول رہے کہ سٹیشن آتا اور گذر جاتا۔ ہمارا خیال شاذ و نادر ہی کسی سٹیشن کی طرف گیا۔ ویسے بھی ڈاک گاڑی تھی صرف بڑے بڑے سٹیشنوں پر رکتی۔ ہمیں بالکل احساس نہیں ہوا کہ اتنے لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ کسی کسی سٹیشن پر عورتیں چھابڑیوں میں مرغن چیزیں فروخت کرتی نظر آتیں۔ اس کے علاوہ سٹیشنوں پر کھانے کا انتظام کوئی نہیں تھا۔

تاشقند کے بعد قابل ذکر سٹیشن اوبرگ کا تھا۔ یہ ایک بڑا جنکشن تھا۔ اس جگہ سے ریل گاڑیاں سائبیریا۔ ماسکو اور تاشقند کو جاتی ہیں۔ اس سٹیشن کے پہنچنے پر ہم ایشیا سے یورپ میں داخل ہوئے۔ فرق صاف ظاہر تھا۔ ریل گاڑی سے چھوٹے چھوٹے گاؤں نظر آتے ہیں جن میں

ایک ترتیب موجود تھی ۔ ایک قطار میں گھر بنے ہوئے تھے ایشیا کے دیہاتوں میں اس کے برعکس جہاں جس کی جیسی مرضی ہو گھر تعمیر کیا۔ ترتیب کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی گئی ۔

تیسرا قابل ذکر سٹیشن کازان ہے ۔ کازان تاتارستان کا صدر مقام ہے ۔ یہ جگہ یورپی روس تاتاری مسلمان جمہوریتوں کا مرکز ہے ۔ آخر کار چوتھے دن ماسکو نظر آیا ۔ گاڑی کے ساتھیوں سے جدائی کا غم ایک طرف کر کے ہم دل میں خوشی اور فخر دونوں محسوس کر رہے تھے کہ آخر کار ہمیں ماسکو کے عظیم شہر کو دیکھنے کا موقعہ ملا ۔

ماسکو

سٹیشن سے ہمیں موٹروں میں ہوٹل ڈی لکس لے جایا گیا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ہوٹل ماسکو کے بڑے ہوٹلوں میں شمار ہوتا ہے ۔

ماسکو روس کے بادشاہوں کا قدیمی صدر مقام ہے ۔ بالشویکوں کی کامیابی سے پہلے بحر بالٹک کے کنارے واقع پیٹرگراڈ نامی شہر پایۂ تخت بنایا گیا تھا ۔ لیکن بالشویکوں نے پھر ماسکو کو صدر مقام بنایا ۔ اور ان کے لیڈر کریملن کے محلات میں اسی شہر میں رہ رہے تھے ۔ انہوں نے یہ کام دفاعی نقطہ نظر سے بھی کیا ۔ وگرنہ یہ شہر اتنی عظیم الشان سلطنت کے پایۂ تخت کے لئے بالکل موزوں نہیں تھا ۔ گلی کوچے نئے اور جدید شہروں کی طرح وسیع نہیں ۔ چھوٹا سا شہر ہے ۔ مرکزیت کی وجہ سے لوگ زیادہ تعداد میں اس کے گرد جمع ہو گئے ہیں ۔ جگہ بہرحال محفوظ ہے ۔ نزدیکی سمندر بھی یہاں سے تین سو میل دور واقع ہے ۔ پیٹرگراڈ جدید طرز کا شہر ہے لیکن روسی سمندری بیڑہ اس قابل نہیں کہ مغربی طاقتوں کا مقابلہ کر سکے ۔ اسی لئے بالشویکوں نے ماسکو کو وطن کا مرکز بنا لیا ہے ۔

"واستوچنے انیورسیتیت"

مشرقی یونیورسٹی

جلد ہی ہم ڈی لکس ہوٹل سے مشرقی یونیورسٹی کے ہاسٹلوں میں گئے ۔ یہ یونیورسٹی شہر کے مرکز میں

ڈی لکس ہوٹل کے ساتھ پوشکین مرکز کی ایک بڑی عمارت میں قائم کی گئی تھی۔ ہمارے رہنے کی عمارت "یتورکایا الیتہ" (مرکزی کوچے) کے مشرق میں واقع تھی۔ یہ ایک خوبصورت تین منزلہ عمارت تھی۔ ہم تیسری منزل میں رہ رہے تھے۔

جس طرح میں نے اور کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ مغربی ممالک نے سوویت یونین کی ناکہ بندی کی تھی۔ روس میں ہر چیز کی کمی تھی۔ خارجی ممالک کے ساتھ تجارت کی بڑی اشد ضرورت تھی۔ روس ہر وہ قدم بے دریغ اٹھاتا جس میں برطانوی استعمار کی ناراضگی ہوتی اور روس کے آگے اسے سر جھکانا پڑتا۔ ہندوستان تو برطانوی استعمار کی بنیاد تھی۔ ہر وہ بات جو ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف پروپیگنڈا ہوتی برطانیہ کی حکومت کو ناپسند تھی۔ روس اس بات کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ اسی لئے اس کو ہم ہندوستانیوں کی ضرورت تھی۔ ہم اس کو تیار مصالحے کی طرح ہاتھ آئے تھے۔ تاشقند کے ہوا بازی کے مدرسے کو بند کرنے کا سودا برطانیہ کے ساتھ تجارت کی شکل میں بہترین سودا تھا۔ اب ایشیا میں عہد نامہ کی وجہ سے پروپیگنڈا بھی بند ہو گیا لیکن یورپ میں اس قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسی چیز نے ہمیں بھی یورپ کی سیر کرا دی۔ ہم ایشیا سے یورپ آ گئے اور ماسکو کے ایشیائی دار العلوم میں انگریزی سامراج کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ انگریزی استعمار قسم قسم کے طریقوں سے ایشیا اور ہندوستان کو جونکوں کی طرح کھائے جا رہا تھا یہ بات ہمیں مشہور زمانہ انقلابی استاد سکھلا رہے تھے۔

یونیورسٹی میں ہمارے ساتھ ایشیا کی اکثر قومیتوں کے لڑکے لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ترک ایرانی، چینی اور کوریائی ان میں صاف نظر آتے تھے۔ ہر قوم کے لئے تعلیم کا علیحدہ انتظام تھا۔ ہمیں انگریزی میں تعلیم دی جا رہی تھی۔ استاد سب انگریز تھے یا وہ روسی تھے جنہوں نے انگلستان اور امریکہ میں عمر گذاری تھی اور جنہیں انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔ کبھی کبھی ایم این رائے اور ممکرجی بھی ہمیں پڑھاتے۔ نام کو تو ہمیں بے شمار مضمون پڑھائے جا رہے تھے لیکن دراصل سب کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ انگریز سامراج کے خلاف پروپیگنڈے کا ہنر سیکھنا تھا۔

ہمیں روسی زبان بھی سکھائی گئی۔ ہماری اپنی تعداد کافی زیادہ تھی۔ آپس میں ہندوستانی میں بات چیت

کرتے اور پھر ماسکو میں صرف چار مہینے کا قیام ہی رہا اسی لئے روسی زبان نامکمل رہ گئی۔ یونیورسٹی میں سب ملا کر سترہ ہندوستانی تھے۔ شروع میں ہمیں تعلیم حاصل کرنے کا عرصہ دو سال بتایا گیا۔ لیکن پھر دو سال کے عرصے کو گھٹا کر چھ مہینے کیا گیا اور آخر کار چار مہینے بھی مشکل سے پورے ہی کر سکے تھے کہ وطن عزیز کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ بھی ہماری تعلیم کا ایک اہم جزو تھا کہ کبھی کبھی ہم ماسکو شہر کے بڑے بڑے صنعتی اداروں اور کارخانوں کو دیکھنے جایا کرتے۔ روس میں کارخانوں کی کمی تھی لیکن پھر بھی ماسکو میں ہم نے کپڑے۔ ریل کے گاڈر اور پہیے بنانے کے کارخانے دیکھے۔ ایک بجلی گھر بھی دیکھا جو سارے ماسکو کو بجلی فراہم کرتا تھا۔ یہ شہر کے زیر زمین بنا ہوا ہے۔ ایک دفعہ کریملن کے محل کی سیر بھی کی۔ اور وہ کمرہ بھی دیکھا جس میں نپولین سوتا تھا۔ ابھی تک وہ چارپائی معہ بستر کے بطور یادگار پڑی ہوئی ہے۔

ماسکو کی آرٹ گیلری سب سے دلچسپ تھی۔ روسی آرٹسٹوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے فن پارے اس تصویر خانے میں محفوظ پڑے تھے۔

ماسکو کا موسم

ہم سولہ اگست کو ماسکو پہنچے تھے۔ سردی شروع ہو چکی تھی لیکن برف ابھی نہیں پڑی تھی۔ کبھی کبھی ایسی سردی ہوتی اور ایسے بادل آتے کہ برف گرنے کا امکان پیدا ہو جاتا۔ ہم نے ماسکو کی گرمی نہیں دیکھی۔ لیکن اگست کی ٹھنڈک ہمارے وطن کے پوہ و ماگھ کی ٹھنڈک کی طرح تھی۔ پھر جلد ہی ماسکو کے پوہ ماگھ بھی دیکھے۔ راتیں اتنی ٹھنڈی کہ کمرے میں آدمی اگر بغیر آگ کے سو جائے تو صبح منجمد ملے گا۔ اگر ہم جوانی کے شباب میں نہ ہوتے تو ماسکو میں زندگی گذارنی مشکل ہو جاتی۔ ہمارے لباس خوب گرم تھے۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار جب سیر و تفریح کے لئے صاف آسمان میں باہر نکلتے تو سردی سے کپکپانے لگتے۔ پھر صبح کو گرمی پہنچانے کے لئے دوڑ لگاتے۔ ویسے جب ہی خیال آتا کہ اگر سردی کے موسم میں کبھی رات کسی ویرانے میں بسر کرنی پڑے تو کپکپی طاری ہو جاتی۔ لیکن ہم لڑکے تھے۔ دوران سفر روس میں اور قفقاز و ایران میں برف کے درمیان میں ہم حوصلہ نہیں ہارے تھے اور جتنی برف زیادہ پڑتی اتنا ہی ہمارے حوصلے اور امنگیں جوان ہوتیں۔ دل ہی دل میں ایک

قسم کی عظمت اور بڑائی محسوس کرتے۔

ماسکو میں قومی خدمت کا جذبہ

ماسکو میں ہمارا ہاسٹل مرکزی محلے میں بازار کے کنارے تھا۔ ایک اتوار کی صبح جب ہم بیدار ہوئے تو ایک شیریں نغمہ اور بینڈ کی آواز سنائی دی۔ کھڑکیوں سے باہر جھانکا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ جھنڈے ہاتھوں میں تھامے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک منظم جلوس بازار سے گذر رہا ہے۔ ان جھنڈوں اور بینروں پر یہ الفاظ درج تھے۔

"اٹھ اے نوجوان! وطن کو تمہاری خدمت کی ضرورت ہے"

"تباہ حال وطن کو آباد کرو"

"اے نوجوان اٹھ! کہ دشمن تمہارے اردگرد گھیرا باندھے ہوئے ہے"

لڑکے لڑکیاں باہم مل کر جوش و جذبوں سے بھرے ہوئے گیت دلکش آواز میں گا رہے تھے اور جلوس آگے بڑھ رہا تھا۔ ہم بھی جلوس میں شامل ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ماسکو شہر کے ایک ویران اور تباہ شدہ ریلوے سٹیشن پہنچے۔ خانہ جنگی میں یہ سٹیشن تباہ برباد ہو چکا تھا۔ حکومت نے چند خاص اشخاص اس کام پر مقرر کئے تھے وہ رضا کاروں سے کام لے رہے تھے۔ جلوس کے شرکا رسوسو کی ٹولیوں میں بٹ کر کام میں مشغول ہو گئے۔ یہ ایک قابل دید نظارہ تھا۔ باوجود اس کے کہ روس کو قحط سالی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لوگوں کو پیٹ بھر کھانا میسر نہیں تھا جو جذبہ رضا کاروں نے اس وقت دکھایا وہ قابل صفت تھا۔ دوپہر تک ہر چیز الگ الگ کی جا چکی تھی۔ ثابت اینٹیں ایک طرف اور ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے دوسری طرف۔ بیکار چیزیں علیحدہ اور لوہے کا سامان الگ پڑا ہوا تھا۔

اسی طرح قومی تعمیر کے لئے چھٹی کے دن کبھی کبھی مرد و زن اکٹھے کام پر جاتے۔ سب بہت جذبے اور لگن سے کام کرتے۔ اگر یہی کام مزدوروں سے کروایا جاتا تو وقت اور پیسہ دونوں بہت زیادہ لگتا۔ ساری قوم نے مضبوط ارادہ کر رکھا تھا کہ وطن کو آباد کرانا ہے۔ انہوں نے یہ فرض صرف حکومت کا نہیں جانا۔ رضا کار فرصت کے اوقات بغیر اُجرت کے کمر باندھے قومی خدمت کے جذبے تلے کام کرنے کو تیار ملتے۔

سوویت روس میں جسمانی ورزش کی مہم

ورزش مرد اور عورتوں دونوں پر فرض کی گئی تھی۔ یورپی روس میں لوگ زیادہ تر عیسائی مذہب کے پیروکار تھے۔ مسلمان اقلیت میں تھے لیکن ان میں بھی پردے کا رواج نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی تعلیم یافتہ تھے۔ تاتارستان یورپی روس میں ایک علیحدہ جمہوریت ہے۔ جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن پردہ کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ بہ ظاہر عیسائی اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں قوموں کا لباس ایک ہی جیسا ہے۔

سرخ میدان (ریڈ سکوائر) میں پورے سوویت کے سالانہ جشن کے مظاہرے کا حال دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ہمارے وہاں پہنچنے کے دو مہینے بعد یہ مظاہرہ ہوا۔ سب سے پہلے سرخ لشکر کا

مظاہرہ ہوا ان کے بعد سوویت روس کے مختلف جمہوریتوں کے نمائندگان لڑکے اور لڑکیاں آئے۔ ان میں ترکمان، ازبک، قرغز، قزاق، تاتار اور قفقاز کی پریاں قابل ذکر ہیں۔ یہ سب مسلمان تھے۔ ان کی جسمانی ورزش قابل دید تھی۔ سب اپنے اپنے وطن کا روایتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کی صحت کا جسمانی مظاہرہ خاص طور پہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ دس بارہ جمہوریتوں کے لڑکے لڑکیاں اکٹھے قطاروں میں چل رہے تھے۔ آگے لڑکیوں کی قطاریں تھیں اور ان کے پیچھے لڑکوں کے۔ دونوں اتنے چست و چالاک کہ لوگ ان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

ہماری مشرقی یونیورسٹی میں جسمانی صحت کو بہتر بنانے کے لئے خاص توجہ دی جارہی تھی۔

قحط

روس کو بہت سخت قحط کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وجہ غالباً ہی تھی کہ روس کی اقتصادی پالیسی کے ساتھ زمیندار تعاون نہیں کر رہے تھے۔ اسی لئے غلے کی کاشت نہیں ہو رہی تھی۔ باہر کے ملکوں سے اتحادی غلہ نہیں دے رہے تھے۔ اس لئے قحط کا اثر زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ بارش بھی

بالکل نہیں ہوئی تھی۔ برف بھی کم پڑی تھی۔ ہمیں تین دن کا کھانا اکٹھا ہی دیا جا رہا تھا۔ اس سے بمشکل دو دن کا گذارا چل سکتا تھا۔ تیسرے دن ہم بھوکے رہتے لیکن اس کے باوجود ہم مست تھے۔ خوش تھے، بھوک کی کوئی پرواہ نہیں۔ مچھلی کا شوربہ بہت تھا۔ تیسرا دن مچھلی کے شوربے پر گذارا لیتے۔ شوربہ کیا تھا بس ایک بڑی دیگ جو کہ پانی سے بھری ہوتی اور مچھلیاں اس میں سالم پکی ہوئی ہوتیں۔ ماسکو کو اس قحط سالی میں پیٹر گراڈ کی مچھلیوں نے خاصا سہارا دیا۔

سوویت کی نئی اقتصادی پالیسی

سنہ ۱۹۱۷ء کے بعد حکومت نے پیداوار کے تمام ذرائع پر قبضہ جما لیا۔ سب لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کی ذمہ داری بھی اٹھائی لیکن اچانک سنہ ۱۹۲۱ء میں اعلان ہوا کہ ہر آدمی اپنا ذمہ دار خود ہوگا۔ حکومت کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔ اس اعلان سے وطن میں بے کاری پیدا ہوئی اور ساتھ ہی وہ تمام خرابیاں سامنے آئیں جو بے کاری کا خاصہ ہوتی ہیں۔ اس اعلان سے قبل روس میں چکلے (قحبہ خانے) نہیں تھے۔ پیسوں کے عوض کسی کا جسم خریدا نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اپنا جسم بیچتا۔ لیکن اس اعلان کے ساتھ ہی سرِ شام سے جسم بیچنے کا دھندا شروع ہو جاتا اور سرمایہ داری کی لعنت پیدا ہونی شروع ہوئی۔

تمام مہذب دنیا میں بداخلاقی کے مرکز قائم ہیں۔ صرف انگلستان، فرانس، امریکہ اور یورپی ممالک اس لعنت پہ بدنام نہیں۔ بلکہ ایشیائی ملکوں ایران، جاپان اور ہندوستان میں بھی سرِعام عصمت فروشی ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عصمت فروشی عورتیں مستی سے کرتی ہیں لیکن روس کی نئی اقتصادی پالیسی سے یہ واضح ہو گیا کہ بہت سی عورتیں مجبوری سے اپنا جسم بیچتی ہیں۔

نئی اقتصادی پالیسی سے وطن کو بہت سے فائدے بھی پہنچے۔ تجارت از سرِ نو شروع ہو گئی کھانے پینے کی اجناس کی قیمتیں فوراً نیچے اتر آئیں۔ لوگوں نے اپنے اپنے لئے صنعت و حرفت

کے چھوٹے چھوٹے کارخانے بنانے شروع کیے۔ زمینداروں نے کاشت دوبارہ شروع کر دی۔ اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں غلہ منڈیوں میں پہنچ گیا۔

ماسکو میں ہمارے آخری ایام

اپنے ایک ساتھی کی اپنی زبانی ایک بیان کی نقل کو من وعن لکھ رہا ہوں جو پڑھنے والوں کیلئے دلچسپی کا باعث بھی ہوگا اور اس سے ماسکو کے لوگوں اور ہمارے وہاں رہنے پر بھی روشنی پڑے گی

"یونیورسٹی میں ڈرامہ دیکھنا اور ان میں حصہ لینا بھی ہمارے تعلیم کے اہم جزو میں سے ایک تھا۔ ڈرامہ اکثر رات کو ہوتا۔ اس میں لڑکے اور لڑکیاں شریک ہوتیں۔ لیکن ہم لوگ ڈرامے دیکھنے بہت کم جاتے۔ ایک دن ہوٹل ڈی لکس میں جبکہ ہم لوگ ہفتہ وار دعوت کھانے میں مشغول تھے بیگم رائے نے ہمیں سخت طعنہ دیا۔

"تم ہندوستانی لوگ بہت پس ماندہ ہو۔ تمہاری غلامانہ ذہنیت کو یہ آزاد وطن بھی ٹھیک نہ کر سکا۔"

ہم حیران بیگم رائے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ آج اتنی غصہ ہو رہی ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ "یونیورسٹی کی لڑکیوں نے اپنے استادوں اور چانسلر کامریڈ رائے کو شکایت کی ہے کہ ہندوستانی طلبا کی ذہنیت بورژوائی[1] ہے۔ کیونکہ وہ لڑکیوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور ڈرامے دیکھنے بھی نہیں آتے۔"

ہم نے رائے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھا سب ہی شرمندہ ہو گئے۔ ایک ساتھی نے آہستہ سے کہا "ادھو! ہمیں بورژوائی کہا گیا ہے!"

"ہاں بھائی! کیونکہ ہم نے ابھی وہ فرسودہ خیالات ترک نہیں کیے ہیں۔" دوسرے نے جواب دیا۔

---

[1] روس میں بورژوائی گالی سمجھی جاتی ہے۔

آخر میں سب کی نمائندگی کرتے ہوئے میں نے کہا

"کامریڈ بیگم رائے! ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کو ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ آپ ہمیں جانتی ہیں۔ ایک سال سے زیادہ عرصے سے ہم لوگ آپ کے ہمراہ ہیں۔ ہماری ذہنیت بھی آپ کو معلوم ہے جو بالکل بورژوائی اور سرمایہ دارانہ نہیں ہے۔ اگر ہم نے یونیورسٹی میں لڑکیوں سے کوئی بے اعتنائی برتی ہے تو اس کی وجہ صرف مطالعے سے فارغ نہ ہونا ہے۔ یونیورسٹی میں اب ہمارا قیام تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔ اور تو ارش مکرجی اور ہمارے اور پروفیسر سختی سے ہم سے کام مانگیں گے اس وجہ سے ہم لوگ فرصت نہیں پا رہے کہ ڈرامے دیکھنے جا سکیں۔ اسی لئے لڑکیوں کو ہم سے گلہ ہے۔"

اس اثنا میں رائے نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ "ہاں لڑکیوں کے ساتھ علیک سلیک کرنے کی بھی فرصت تم لوگوں کو نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ لوگ بھی اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہہ رہے ہیں اور باقی لوگ آپ کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتے۔ آپ لوگوں کی نشو و نما سرمایہ دارانہ فضا میں ہوئی ہے۔"

"ہاں اور میں نے کب امتحان میں سختی کی ہے۔" مکرجی نے بھی مجھ پر اپنے غصے کا اظہار کیا۔

مسز رائے بہت ہمدرد عورت تھی۔ وہ مسکرا پڑی "بس کریں کامریڈ۔ سلیم ایک اچھا لڑکا ہے۔ (ماسکو میں مجھے سلیم کہہ کر پکارا جاتا۔ اکبر شاہ) یہ سمجھ چکا ہے۔ اب یہ کمی پوری کریں گے اور باقی ساتھیو! یقیناً آپ بھی سمجھ چکے ہوں گے۔ علم صرف کتابیں پڑھ کر حاصل نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے خیالات درست کریں۔ پرانے دقیانوسی اور گرے ہوئے خیالات کو نکال پھینکیں۔ یونیورسٹی سے آپ لوگوں نے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ چاہیے تو یہ کہ آپ لوگ دوسری قومیتوں کے لوگوں کے ساتھ رہنے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں۔ ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کریں۔ ان کی اچھی چیزیں آپ اختیار کر لیں اور اپنی اچھی باتیں انہیں اختیار کرنے دیں۔ دیکھیں اگر آپ واپس ہندوستان یہی خیالات لے کر گئے تو یہ سفر آپ کو اور آپ کے وطن کو کچھ فائدہ نہیں دے گا۔"

ایم این رائے نے بھی بہت کچھ کہا۔ انہوں نے ہمیں تسلی دی اور سمجھایا کہ اگر آپ لوگ عورتوں کی سوسائٹی سے پرہیز کریں گے تو آپ لوگ اپنی قوم پرستی اور حب الوطنی میں خاصی کمی چھوڑیں گے۔ عورتوں اور

مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے سے ہی مستقبل روشن ہو سکتا ہے وگرنہ یاد رکھیں کہ آپ کی قوم تمام عمر جہالت کی تاریکی میں گذارے گی۔

اس کا ہم پر کافی اثر ہوا۔ جب اپنے مسکن پہنچے تو اتفاق کے ساتھ اس پر فیصلہ ہوا کہ ڈرامہ کوئی نہیں چھوڑیں گے اور لڑکیوں کی سوسائٹی سے بھی پرہیز نہیں کریں گے۔

پہلی فرصت میں ہی ہم لوگ رات کو ڈرامہ دیکھنے گئے۔ ہر طرف سے ہم پر نگاہیں مرکوز تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں لڑکے لڑکیوں کے بیچ بیٹھے ہوئے انکی محفل میں کھو چکے تھے۔ آخر ہم کوئی نو وارد تو تھے نہیں۔ آزاد فضا میں ایک سال سے زیادہ گذارا تھا۔ لیکن صاف بات تو یہ تھی کہ وقت کم تھا اور ہمیں یہی فکر لاحق تھی کہ تعلیم سے فارغ ہو کر وطن واپس لوٹیں اور وطن کی آزادی کی تحریک میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

آنیا اسایان

چند دنوں میں ہی میرے تعلقات آرمنستان کے رہنے والی ایک لڑکی سے قائم ہوئے اس کی توجہ بھی میری طرف دن بدن بڑھنے لگی۔ ہم اکثر اپنے دوستوں میں بیٹھے اس طرح گپ شپ لگاتے۔

"یار مجید! تم تو مارگریٹ پر ایسے عاشق ہوئے کہ اب دکھائی بھی نہیں دیتے۔"

"ہاں یار! کیا کہوں۔ لیکن جب تک مارگریٹ کو نہ دیکھوں تو ایک پل قرار نہیں۔ لیکن تم بھی تو اسایان کا ساتھ نہیں چھوڑ رہے۔"

میں ہنس دیا۔ مجید لاہور کا رہنے والا تھا۔ بہت اچھا آدمی تھا۔ اور اس کے ساتھ کبھی کبھی ہم ہنسی مذاق کر لیتے:

"یار لیکن یہ خیال رکھو کہ کہیں پھنس نہ جاؤ۔ وطن کو لوٹنے کے دن ہیں۔ پھر افسردہ ہو گے!"

میں نے ایک دن اسے کہا۔

"نہیں یار! میں بالکل ایسا نہیں۔ لیکن مجھے تمہارا ڈر ہے اپنا ذرا خیال رکھو۔" مجید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ اسی طرح ہنسی مذاق میں وقت گذرتا گیا۔

جیسے جیسے وطن کو لوٹنے کے دن آرہے تھے۔ ایسے میں میری محبت اسایان کے ساتھ بڑھنے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں مجھے احساس ہوا۔ اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا ہو گا؟ اگر وطن واپس جانے کا سوال اٹھا تو کیا کروں گا؟ کیا کہوں گا؟ کہ تیار ہوں یا نہیں۔ جانا ہے یا نہیں جانا۔ اگر بولتا ہوں کہ نہیں جانا تو یار دوست کیا کہیں گے۔ وطن کی کشش بھی زیادہ تھی لیکن اِسایان کی کشش بھی کچھ کم نہیں تھی۔ جلد ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب جانے کا وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔ اس وقت اگر میں اِسایان کے دیدار سے دل کو صبر کی تلقین کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ ممکن نہیں۔ ایسے میں اپنے آپ کو ویسے ہی افسردہ کرنا ٹھیک نہیں۔

اسایان ڈرامے میں ہیروئن کا کردار ادا کرتی ہے

بہت جلد ہی یونیورسٹی کی طرف سے اعلان ہوا کہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا ڈرامہ یونیورسٹی کلب میں کھیلا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی معلوم ہوا کہ اسایان اس ڈرامے میں ہیروئن[1] کا کردار ادا کرے گی۔ میں نے علی الصبح تیاری کر لی اور جلد از جلد ڈرامے والے ہال کی طرف روانگی کا ارادہ کرنے لگا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ سٹیج کے نزدیک بیٹھ جاؤں تاکہ اسایان کو قریب سے دیکھوں۔ جس وقت تیاری میں مصروف تھا چاروں طرف سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔

"سلیم آج کہاں کی تیاری ہے؟"

"کدھر جا رہے ہو؟"

"آج تو سلیم ضرور بالشویکی تھیٹر دیکھنے جائے گا۔" دوسرا ہنستے ہوئے چلایا "آج یونیورسٹی کے ہال میں انقلاب کا ڈرامہ سٹیج کیا جائے گا۔ اور اس میں اسایان حصہ لے رہی ہے۔"

دوستوں سے جان چھڑانا کچھ مشکل ہی لگ رہا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ تقریباً سب ساتھی دل پھینک واقع ہوئے تھے۔ کسی کی معشوق ڈرامے میں کام کر رہی تھی تو کوئی ان کو دیکھنے گئے تھے۔ بہر حال ہر ایک ساتھی خوش تھا اور تھیٹر دیکھنے کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

---

[1] ہیرو یا ہیروئن ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کرنے والے مرد یا عورت کو کہتے ہیں۔

اس دن اسایان بے حد خوبصورت اور دلکش لگ رہی تھی۔ اتنی حسین کہ میرا انقلابی جذبہ بھی خوف کے مارے دل کے کسی کونے میں جا چھپا۔ اس وقت صرف اسایان کی محبت نے ہر طرف سے دل و دماغ کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ سارے کھیل کے دوران میری توجہ ایک لحظہ کے لئے بھی اسایان سے ادھر ادھر نہیں ہوئی۔ اس دن میری محبت کمال کو پہنچ گئی۔ ساری رات اسایان کا ہی خیال دل میں لئے جاگتا رہا۔ اور کیسے اس کا خیال نہ رہتا دیکھو تو اسایان کتنی اچھی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے اس کا ایک اور کیسا رعاشق یونیورسٹی کے کلب ہال میں آیا اور آکر اسایان سے کہنے لگا کہ ایک منٹ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو اس نے اس کو بڑی خوبصورتی سے جواب دیتے ہوئے کہا

"ابھی میرے ساتھ توارش سلیم بیٹھا ہوا ہے۔ ہم باتوں میں مصروف ہیں مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ میں آپ کے ساتھ بات نہیں کر سکتی۔" دیکھو تو کتنی اچھی لڑکی ہے۔

ایک دن یہ بھی ہوا کہ اس کا چھوٹا بھائی یونیورسٹی ہال تشریف لایا اور بڑے خوش کن الفاظ میں کہنے لگا

"توارش سلیم۔ آپا ابھی آنے ہی والی ہے۔ اس نے کہلوایا ہے کہ توارش سلیم کو بتاؤ کہ میں ابھی آئی۔"

آپا کے ساتھ تو میرے تعلقات قائم ہونے کے بعد والے واقعات ایک سینما کے پردہ فلم کی طرح بار بار شروع سے لے کر آخر تک میرے سامنے آتے رہے اور انقلاب والے کھیل کے دوران اس کے کردار نے مجھے مار ہی دیا۔ میں آپا کے خیال میں سرگرداں تھا شام تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے صبح ہو گئی۔ یونیورسٹی گیا۔ استاد نے آکر دنیا جہاں کے انقلابوں پر درس دیئے۔ انگریزی سامراج کی مخالفت کی اور چلا گیا لیکن میں صرف اس کے اندر آنے اور واپس جانے کو ہی سمجھ سکا۔

اب ماسکو کا چیف جسٹس جو کہ ہمارا پروفیسر تھا آیا۔ بہت دل موہ لینے والا آدمی تھا۔ نیچرل سائنس جو کہ اس کا مضمون تھا اس پر باتیں کیں لیکن میرے لئے تو بس آیا اور گیا۔ صرف مکرجی نے مجھے میرے جاگتے ہوئے نیند سے بیدار کیا۔ انہوں نے اپنے مضمون استعماریت کی جگہ مجھے نصیحت شروع کر دی۔

"سلیم! یاد رکھو تم انقلابی ہو۔ اس وقت انقلاب تمہارا یہ امتحان لے رہا ہے۔ کہ تمہیں وطن کے

ساتھ محبت ہے یا نہیں ۔ یاد رکھو دنیا میں انسان ایک وقت میں صرف ایک ہی معشوق کے ساتھ عشق کر سکتا ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم وطن کی آزادی سے محبت رکھتے ہو یا .... یقیناً سمجھ گئے ہو گے۔"

"نوازش مکرجی!" میں نے انہیں جواب دیا "میں انقلابی ہوں ۔ لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ۔ اس کے ساتھ انقلاب کا کیا واسطہ" باقی میں نے خاموشی میں ہی اپنے لئے عافیت جانی ۔ کیونکہ مکرجی ایک بے دھڑک آدمی تھا اور میں گھبرا گیا کہ ایسے نہ ہو سب کچھ صاف کہہ دے ۔

"اچھا ۔ بہت اچھا ! میں کامریڈ منرائے سب سے کچھ کہہ دوں گا۔" مکرجی نے یہ کہا ۔ پھر اپنے مضمون کے متعلق تھوڑی باتیں کیں اور چلے گئے ۔

میری حالت نازک ہو گئی ۔ سبق مجھ سے چھوٹ گیا ۔ ہاسٹل میں پڑا ہوا کھانا پینا بھی چھوڑ دیا ۔ ساتھی سب حیران تھے ۔ چار یوم تک میں نے کوئی بھی چیز حلق سے نہیں اتاری نہ تو کچھ کھایا اور نہ ہی کچھ پیا ۔ دوست ساتھی ساتھ لگے بیٹھے تھے ۔ سب سخت افسردہ تھے ۔ مجید تو سارا دن ہی ساتھ لگا رہا اور ساتھ ہی نصیحتیں کرتا ۔ آہستہ آہستہ مجھے سمجھ آ گئی ۔ اسایان کی یاد سے بے ہوشی کا پردہ ہٹ گیا ۔ وہ بہت زیادہ یاد آئی ۔ یونیورسٹی جائے بغیر دیدار بھی ناممکن تھا ۔ پھر باقاعدگی سے جانا شروع کیا ۔ بیٹھا تو جماعت میں رہتا لیکن خیال کہیں اور رہتا ۔ شام کے انتظار میں دن گذر جاتا ۔ جب کلب جاتا تو وہاں اسایان کو بھی اپنا انتظار کرتے پاتا ۔ اور جب کبھی دیر ہو جاتی تو اس کا بھائی آ کر کہتا کہ بس وہ آیا ہی چاہتی ہے ۔

دن گذر کر رات ہو جاتی اور رات گذر کر دن آ جاتا ۔ ہماری محبت دن بدن زیادہ ہوتی گئی ۔ ایک شام ہم کلب میں بیٹھے ہوئے تھے اور اسایان اور طالبات کے ساتھ جسمانی ورزش میں مصروف تھی ۔ حسب معمول میری آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں ۔ ہمارے ایک ساتھی عبدالقیوم نے آ کر مجھے کہا کہ :

"تمہیں تو اسایان کے سوا کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا ۔"

"یار پھر کیا شرارت کی سوجھی ہے" ۔ میں نے دریافت کیا ۔

"ورزش کے بعد ہر کوئی اپنی قومی نغمے گائے گا۔ پہلے سے خبردار کر رہا ہوں تاکہ ہوشیار ہو جاؤ۔"

"یار یقین جانو مجھے گانے پسند تو ہیں لیکن یاد ایک بھی نہیں۔ ہاں دیکھو جب تم ہو تو پھر میری ضرورت بھی کیا۔ تم ہی کچھ کہہ دو۔" میں نے عبدالقیوم سے درخواست کی۔

"یار .... میں تو پنجابی، اُردو اور یہاں تک کہ ہندکو میں بھی غزل اور رباعیات گالوں گا لیکن تمہیں پشتو کے لئے کہہ رہا ہوں" اس نے جواب دیا۔

"بھائی مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ اگر آتا تو ضرور گا کر سنا دیتا۔"

"مجھے تو اس پر بالکل یقین نہیں۔ تمہاری پارسائی بھی معلوم ہو گئی۔ اسایان نے تو ساری پارسائی تم سے نکال دی۔ تیار رہو، تم نے کچھ کہنا ہی ہے۔ اور میں اسکا ترجمہ میں اپنی طرف سے ہی تمہاری محبت ایک آرمنی لڑکی سے ظاہر کروں گا۔ سادے آدمی! اسایان کتنی خوش ہو جائے گی۔"

اس وقت اسایان بھی پہنچ گئی۔ ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی تعریف کی کہ "تمہاری ورزش بہت اچھی ہے۔ تم بہت حسین لگ رہی ہو۔"

"چپ! تم جھوٹ بول رہے ہو!" مجھے اس نے محبت بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "دیکھو قیوم! یہ سلیم کیا کہہ رہا ہے۔ مجھ میں کونسی جگہ خوبصورت ہے کہ یہ ہر وقت بس میرے حُسن کی ہی تعریف کرتا رہتا ہے۔"

قیوم کو یہ ہنر سب سے زیادہ آتا تھا۔ اس نے اس انداز سے اس سے گفتگو کی کہ وہ بہت خوش ہوئی۔ اتنی تعریف اس نے اسایان کی کی کہ آخر کار اس نے اپنا ہاتھ اس کا منہ بند کرنے کے لئے اسکے منہ پر رکھ دیا۔ اور کہا:

"چپ ہو جاؤ قیوم! تم سے لگتا ہے ابھی آرکینجل لڑکی نے شرارت اور مستی نہیں نکالی تمہاری شادی کے دن اس کو میں نے بتا دیا تھا کہ خیال کرنا قیوم بہت شرارتی ہے۔"

اپنی بیوی کے ذکر سے قیوم نے موضوع بدل لیا اور کہا "دیکھو اسایان آج تمہارے حُسن کی صفت

اس سٹیج سے ایک ایسی زبان میں ہوگی جو تم نے کبھی سُنی بھی نہ ہوگی۔ ساری یونیورسٹی حیران رہ جائے گی جب وہ میری زبانی اس کا ترجمہ سنے گی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا" ایسی کوئی بات نہیں۔ قیوم ویسے ہی شرارت کر رہا ہے۔" اسایان سمجھ گئی۔ شرم سے بس صرف مسکرا کر رہ گئی۔" قیوم کا کام صرف شرارت کرنا ہی ہے" اس نے کہا۔

وقت اسی طرح ہنسی خوشی گذرتا گیا۔ میں کبھی خوش ہوتا اور کبھی فکروں کے سمندر میں ڈوبا رہتا۔ خوشی کیوں نہ ہوتی۔ مجھے یقین تھا کہ اسایان میرے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے ساتھ ہندوستان چلنے کو بھی راضی ہو جائے گی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے سوچتا کہ اسایان کا ہندوستان جانا تو ناممکن ہے اور اگر جانا ممکن بھی ہو تو غلامی ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے فرنگی کب اسایان کو ہندوستان جانے دے گا۔ مجھے یقین تھا کہ میں بھی قید خانے میں ہونگا۔ اور اسایان بھی میرے ساتھ قید خانے میں ہوگی۔ آخر اس بات کا علاج ایسا ہی ممکن ہے کہ میں وطن واپس جانے کا خیال دل سے نکال دوں۔ لیکن یہ کب ہو سکتا تھا کہ مادر وطن تو فرنگی کی غلامی میں رہے اور میں وطن عزیز سے دور یہاں آزادی کی زندگی بسر کروں۔ اسی طرح کبھی کبھی میں جاگتے میں خواب دیکھتا کہ اسایان کے ہمراہ میں گاڑی میں ماسکو تاشقند اور وہاں سے پھر بخارے جا پہنچتا ہوں۔ اس کے بعد وہاں سے بادبانی کشتی کے ذریعے دریائے آمو میں اوپر کی جانب سفر کر رہے ہیں۔ سرائے نظام بیگ کے قریب جب پہنچتے ہیں تو میں اسایان کو ترکمانوں کے ہاتھوں اپنی گرفتاری، پھانسی اور پھر گولی سے اڑا دینے کے حکم کے متعلق سب واقعات بتاتا ہوں۔ اپنے آپ کو ایک دفعہ پھر ترکمانوں کے ہاتھ قید پاتا ہوں۔ اس دفعہ ہم صرف دو ہی ہیں ایک میں اور دوسری اسایان۔ جب ترکمانوں کے ہاتھ مار پڑتی ہے وہ یاد کر کے فوراً جاگ پڑتا ہوں۔ اسی طرح افغانستان میں ہندوکش کے تنگ درّوں کے درمیان اپنے آپ کو اسایان کے ہمراہ ایک ہی گھوڑے پر سوار پاتا ہوں۔ اور بلخ کے حاکم کے حکم کے مطابق شتنواری وارنٹ ہاتھ میں لئے ہمارے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ لیکن ہندوکش کے دامن میں واقع اس پانی کے چھوٹے لیکن تیز و تند نالے میں گرتا ہوں تو فوراً جاگ پڑتا ہوں۔ اچانک غیر اداری طور پر منہ سے نکلتا ہے۔

"میری تو خیر لیکن اسایان ہمراہ ہے"

اسی طرح کبھی کبھی جاگتے میں خواب دیکھتا تھا۔ یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ اسایان کو وطن ہمراہ لے جانا ناممکن ہے پھر جب یہ خیال آتا کہ میں اسایان کے ہمراہ روس رہ جاتا ہوں اور باقی لوگ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں تو فوراً سرہلا کر کہتا

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا"

آہستہ آہستہ مجھے ہوش آتا گیا۔ جب کبھی اس کی محبت غلبہ پالیتی تو بہت افسردہ ہو جاتا۔ دل میں خیال آتا کہ مجھ سے تو سلطان محمد خان بھی بدرجہا بہتر ہے جس کو اس کی معشوق نے اس کے منہ پر واضح الفاظ میں کہا:

"میری ماں نے مجھے بتایا کہ ہندوستان میں شیر اور اژدھے ہیں جو تمہیں کھا جائیں گے اس لئے میں ہندوستان نہیں جا سکتی۔"

میرے سے مجید بھی اچھا تھا جو کہتا کہ میں نے مارگریٹ سے کہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ زیادہ محبت اس لئے نہیں کر سکتا کہ میں ایک انقلابی ہوں اور ایک دن اپنے آپ کو فرنگی کی جیل میں پاؤں گا۔ اگر پھانسی پائی تو بہت خوش قسمت ہونگا۔

آہستہ آہستہ میں اسایان سے پیچھے ہٹنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اسایان سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا نا سمجھی ہے۔ اس لئے کلب سے غیر حاضری بہتر جانتا۔ لیکن اگر شام کو کلب نہیں بھی جاتا تو دن کو پھر سامنا ہو ہی جاتا۔ قریب ہی تو جاعتیں تھیں۔ وہ کچھ نہ کچھ بہانہ بنا کر آجاتی۔ ایک دن میں اپنی جماعت سے باہر کھڑا تھا۔ اسایان میری طرف آئی۔ بہت ہی افسردہ اور غمگین لگ رہی تھی۔

"توارش سلیم کیا یہ سچ ہے کہ تم وطن لوٹ رہے ہو۔ تم تو بالکل مجھے کچھ بتاتے بھی نہیں اور ملنے سے بھی گریز کر رہے ہو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ وطن کو لوٹنا تو بہت ہی بڑی بات ہے۔" میں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا اور بغیر انتظار کیئے اپنے کمرے کے طرف لوٹ گیا۔ میرے ساتھ فکر دامن گیر ہوئی کہ اس کا

تو مجھے بھی کچھ علم نہیں پھر اسایان کو کیسے پتہ لگا لیکن پھر دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ شاید حالات کا اس نے تجزیہ ایسے کیا ہو۔

وطن واپسی کا ارادہ
وطن کو لوٹتا ہوں

۱۹۲۱ء کی سولہ تاریخ تھی جب شام کے وقت مجید نے چپکے سے میرے کان میں کہا کہ ہم چار ساتھیوں کو بیگم رائے نے بلوایا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں سلطان محمد خان۔ فیروز، مجید اور میں ہوٹل ڈی لکس کی طرف گامزن تھے۔

بیگم رائے مسکرا پڑی " میرے بہادر نوجوانوں خوش آمدید! آج میں نے آپ لوگوں کو بہت اہم کام کے لئے بلوایا ہے۔ ایک بہت ہی معزز مہمان بھی آپ کے کھانے میں شریک ہوگا۔ وہ آپ کا ساتھی زینوی لیف ہے۔ پیٹرگراڈ کا حاکم جسے آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

زینوی لیف تھرڈ[۳۵] انٹرنیشنل کا صدر تھا اور سوویت یونین میں لینن کے بعد معزز ترین آدمی جانا جاتا تھا کون ایسا تھا جو اسے نہیں جانتا تھا، بیگم رائے یکدم خاموش ہوگئی۔ پھر ہمیں وہ گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ یکدم پھر ہنس پڑی۔ ہم نے بھی ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور ہنس پڑے ہم جان گئے تھے کہ کوئی بڑا ہی رازدارانہ مسئلہ درپیش تھا۔ ہم کسی معمولی عورت کا سامنا نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ بیگم رائے تو بین الاقوامی شخصیت کی حامل ایم این رائے کی بیوی تھی۔ ساتھ ہی تھرڈ انٹرنیشنل میں ایک اہم عہدے پر فائز تھی۔ یہ اصل میں امریکی تھی اور مشہور انقلابی تھی۔ رائے بھی دنیا کا مشہور انقلابی تھا۔ اسی لئے دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے آزادی کے حصول کی جدوجہد میں شوہر کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اسی مقصد کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ بیگم کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی غیر معمولی اہمیت کی حامل مہم کی بات وہ کر رہی تھی۔

بیگم نے اپنی بات جاری رکھی

"دیکھو ساتھیو! ہم انقلابی ہیں۔ جب تک وطن عزیز آزاد نہیں ہوتا ہم آرام نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہت

مصیبتیں جھیلی ہیں۔ پاپیادہ افغانستان کے دشوار اور اونچے پہاڑوں کو عبور کیا ہے۔ بھوک پیاس کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ترکمانوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں آپ نے جھیلی ہیں وہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں زرین الفاظ سے لکھی جائیں گی۔ آپ نے بار بار موت کا سامنا کیا ہے لیکن پھر بھی زندہ ہیں۔ آپ کی زندگی ہے ہی اسی لئے کہ وطن عزیز کی آزادی کی خاطر اسے قربان کر دیں۔ آپ لوگ نوجوان ہیں۔ وطن کی نگاہیں آپ پر مرکوز ہیں۔ آپ سے اُمیدیں وابستہ ہیں۔ امید ہے آپ لوگ اسے مایوس نہیں کریں گے۔"

"ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہیں۔ ہماری زندگی وطن عزیز کی آزادی کے لئے وقف ہے۔ ہم وطنِ عزیز کی عزت و سربلندی کی خاطر بڑے سے بڑا دکھ جھیلنے کے لئے تیار ہیں۔" ہم نے جواب دیا۔

"دوستو! آپ چاروں کو صبح ماسکو شہر سے نکلنا ہے اور ساتھیوں کو اس بات کا کچھ پتہ نہیں چلنا چاہیئے۔ ہم انہیں پھر کسی وقت اطلاع دے دیں گے۔ تمام ہندوستانی طلبا پیٹر گراڈ کے لئے جائیں گے۔ گاڑی رات کے بارہ بجے ماسکو سے روانہ ہوگی۔ آپ لوگوں کو ریلوے سٹیشن تک ان کے ہمراہ جانا ہوگا۔ گاڑی سے اس طرح پیچھے رہنا ہے کہ آپ کے ساتھیوں کو اس کا علم نہ ہو سکے۔"

ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آپس میں گفتگو کر لی کہ آخر جب ہماری زندگی کا ہی ایک مقصد ہے تو مہم کی مشکل یا آسانی سے پھر ہمیں کیا سروکار۔

زینوی یف کے ساتھ ملاقات

ہم بیگم رائے کے ساتھ بات چیت میں لگے ہوئے تھے۔ شاید مہم کے بارے میں ان سے کچھ سرسری معلومات مہیا ہو سکیتں لیکن ہمارے انقلابی اخلاق نے ہمیں اس سے روکا اور اجازت نہیں دی کہ ہم بیگم رائے سے مہم کے بارے میں کچھ پوچھیں۔ انہوں نے اسے راز ہی رہنے دیا اور ہمارے انقلابی جذبات ابھارنے کے لئے اسی قسم کی گفتگو جاری رکھی تھی اتنے میں ایم این رائے اندر داخل ہوئے۔

"دوستو خوش آمدید! میں امید کرتا ہوں کہ آج کی ملاقات کی اہمیت آپ لوگوں کو میری بیگم نے واضح کر دی ہوگی۔"

رائے بیٹھ گئے۔ بیگم نے ان کے سامنے پھر قربانیوں اور آزادی خواہوں کی گفتگو شروع کر دی لیکن رائے نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

"تم اپنی عادت چھوڑ دو۔ یہ بہادر اور باہمت لوگ ہیں۔ یہ لوگ آزادی کے معنی جانتے ہیں۔ ان کے آباواجداد نے بھی ہر خارجی دشمن کا مقابلہ کیا ہے۔ انگریز دشمنی تو ان کے خمیر میں رچی ہوئی ہے"۔

تھوڑی ہی دیر میں زینوی لیف آپہنچے۔ ان کے ساتھ ہی بورڈین بھی تھے۔ قد کے اونچے مضبوط اور پکی عمر کے اشخاص تھے۔ ہمارے ساتھ انہوں نے مصافحہ کیا۔ ساتھ ہی بولے "ساتھیو! آپ سے مل کر دلی خوشی ہوئی"۔

"ہمیں بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔ ہم نے جواب میں کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ بورڈین تمام کھانے کے دوران ہمارے ساتھ گفتگو میں مشغول رہا اور بار بار ہمیں اور زیادہ کھانے کی ترغیب دلاتا رہا۔

کھانے کے بعد زینوی لیف نے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ لب لباب اس کا یہی تھا کہ غلام قومیں اپنے نوجوانوں کی قربانی دینے سے ہی آزاد ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ہم رخصت ہو گئے۔ حسب معمول صبح اپنی جماعت میں چاروں حاضر تھے۔ استادوں نے اپنے اپنے موضوعات پر تقریریں کیں۔ دوستوں نے ہم میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ دن گذر گیا اور شام ہو گئی۔ تمام ساتھی تفریح کی خوشی میں تھے۔ کوئی بستر باندھ رہا تھا اور کوئی اور سامان تیار کر رہا تھا۔ آخر پیٹر گراڈ کی سیر کرنے جا رہے تھے۔

پیٹر گراڈ کو روانگی

رات کو سب ساتھی ٹرام میں بیٹھے۔ سلطان محمد خان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لگتا تھا جاتے وقت کہیں چھپ گیا ہے۔ سردی شاید اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ فیروز اور مجید ٹرام میں بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی راستے میں ہی کہیں غائب ہو گئے۔ ساتھی شاید اور کچھ سمجھے۔ کسی نے ہنستے ہوئے کہا:

"مارگریٹ تو کہیں نہیں جا رہی تھی۔ پیٹر گراڈ کی سیر کا موقعہ شاید پھر کبھی نہ ملتا۔"

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ان کا خیال اور کہیں نہیں گیا۔ ان کو کسی قسم کا شک و شبہ بھی نہیں ہوا۔

ہم سٹیشن پہنچ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دوستوں نے اپنے اپنے بستر بچھائے۔

"سلیم تم ساتھ بستر کیوں نہیں لائے۔" قیوم نے دریافت کیا۔

"یہ ہے کمبل میرے پاس پڑا ہوا ہے اور پھر بستروں کی کیا کمی ہے۔ پیٹر گراڈ میں بہت۔" میں نے فوراً جواب دیا۔ میں دل میں سخت پریشان تھا۔ دوست سب ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ میرے ساتھ یہ فکر لاحق تھی کہ اگر ٹرام چلی گئی تو پھر سٹیشن پر یہ رات کیسے گذرے گی۔ کوئی بہانہ بنا کر گاڑی سے اترا سٹیشن سے باہر ٹرام ابھی کھڑی تھی۔ دل کو تسلی دے کر پھر گاڑی میں چڑھ گیا تاکہ دوستوں کو کوئی شک نہ ہو۔ وگرنہ یہ ڈر بھی لگا ہوا تھا کہ گاڑی سے اتر کر پیٹر گراڈ چلنے سے انکار نہ کر دیں۔ سلطان محمد خان، فیروز اور مجید کے چھپنے پر بحث مباحثے ہوتے رہے لیکن میں ان کی ہر بات کی پرزور تردید کرتا۔ دل کو بے قراری سی تھی۔ ٹرام کی فکر تھی۔ گاڑی سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔

"سلیم! سلیم! تم بھی نہیں چل رہے ہو۔ دیکھو یار! اگر تم نے بھی نہیں جانا تو ہمیں کیوں اس سخت سردی میں مار رہے ہو۔" قیوم چلایا۔

"کیسی بات کہہ رہے ہو۔ میں کیوں نہیں جاؤں گا۔ یہاں میں آیا کس لئے ہوں۔ ذرا صبر کریں۔ میں دیکھتا ہوں اگر گرم پانی کا کچھ بندوبست کر سکوں تو چائے کا انتظام ہو سکے۔" میں نے قیوم کی توجہ دوسری طرف مبذول کرائی۔ سردی اتنی سخت پڑ رہی تھی کہ ساتھیوں کو گاڑی سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ سردی کے مارے پلیٹ فارم پر کھڑا ہونا میرے لئے کافی مشکل تھا۔ کبھی گاڑی پہ چڑھتا کبھی ٹرام دیکھنے باہر دوڑ لگاتا۔ اس اثنا میں گاڑی چل پڑی۔ ساتھیوں نے آوازیں دیں ..."سلیم چھپ گیا"۔ میں نے پلیٹ فارم سے باہر دوڑ لگائی۔ باہر میدان خالی پڑا تھا۔ نہ تو ٹرام تھا اور نہ ہی اور کچھ۔ بہت سخت ڈر لگا کہ اتنی لمبی اور سرد رات کہاں گذاروں گا۔ یہ سردی تو مجھے سُن کر دے گی۔ مسافر خانہ بھی کوئی معلوم نہیں تھا۔ باہر دوڑ لگائی۔ دور ایک ریڑھا چل رہا تھا۔ اس کی طرف لپکا۔

"تواریش! تواریش! استوایتے!" (دوست! دوست! ذرا ٹھہرو) میں نے آواز دی۔

ریڑھے والے نے گھوڑا روکا۔ لیکن پیچھے مڑ کر بالکل نہیں دیکھا۔ سردی کے مارے پیچھے وہ کب دیکھ سکتا تھا۔ ایک بڑا سا پوستین اوڑھے ہوئے تھا۔ پوستین کو گردن کی طرف اونچا کر کے اس میں اپنے کان اور سر بھی چھپایا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے پوچھا

"تیور سکایا جانا ہے" اور یہ کہتے ہی میں گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

"معافی چاہتا ہوں مجھے تیور سکایا کی طرف نہیں جانا۔" گاڑی والے نے معذرت کی۔

"خیر ہے توارش آپ دنگی (پیسے) کی فکر نہ کریں اور مجھے وہاں پہنچا دیں۔"

ریڑھے والا خاموش ہو گیا اور گھوڑے نے قدم اٹھانا شروع کیے۔ بڑا مضبوط گھوڑا تھا قدرت نے اس کو سردی سے بچاؤ کے لئے بڑے بڑے بال دیے تھے۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ میں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ گرم قمیض۔ قمیض کے نیچے موٹا گرم بنیان، اوپر گرم جرسی جاکٹ، اور جاکٹ کے نیچے چہرے کی طرف سمور تھا۔ جاکٹ کے اوپر لمبا گرم کوٹ پہنے ہوئے تھا گھٹنوں تک چمڑے کے لمبے لمبے بوٹ پہنے ہوئے تھا اور گرم جرابیں بھی پاؤں میں موجود تھے۔ ہاتھوں میں چمڑے کے گرم دستانے پہنے ہوئے تھا سر پہ گرم ٹوپی پہنے ایک کمبل بھی ہمراہ تھا جو اپنے ارد گرد لپیٹ لیا تھا۔ اتنے گرم کپڑوں کے باوجود مجھے سخت سردی لگ رہی تھی۔ ریڑھے والا باتوں میں مصروف تھا۔ میری باتوں سے اس کو لگا کہ مجھے سخت سردی لگی ہے تو مجھے مخاطب کر کے بولا

"توارش! کیا آپ کو بہت سردی لگی ہے؟"

"ہاں دوست! سخت سردی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ سردی کا یہ حال تھا کہ میں ایک پنجے کو پکڑ کر دوسرے پنجے سے دباتا لیکن وہ احساس سے عاری ہو چکے تھے۔ زور بالکل محسوس نہیں کر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جس طرح میں نے پنجوں میں کوئی چیز بھی نہیں پکڑی ہوئی ہاتھ سے اپنے چہرے کو دباتا۔ بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میرے رخسار منہ پر موجود بھی ہیں یا نہیں۔

یہ تو ماسکو کے سولہ دسمبر کی رات کو سردی کا حال تھا۔ جنوری تو اس سے بھی سخت سرد ہوتی ہے۔ تقریباً

دو گھنٹے میں ریڑھے نے مجھے میرے ہاسٹل پہنچایا۔ ہمارے وطن کے بھینسے اور روس کے یہ گھوڑے تیز نہیں چل سکتے۔

کمرے میں جب داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ساتھی سب بیٹھے ہوئے گپ شپ لگا رہے تھے۔

"خوش آمدید! خوش آمدید!" مجید اور فیروز چلائے۔

"شاباش دوستو! دوستی کیا اس طرح ہوتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میاں ہم تو بغیر مارگریٹ کے آخری دیدار کے ماسکو نہیں چھوڑ سکتے۔" مجید بولا۔

"اور بھائی سلطان محمد خان تو یقیناً آپ کے ساتھ سٹیشن پر گئے ہوں گے!" مجید نے مذاق سے کہا اور سلطان محمد خان کی طرف اشارہ کیا جو اپنی چارپائی میں لمبا لمبا لیٹا ہوا تھا۔ یہ بات سن کر اٹھا مسکرایا اور مجھ سے معافی مانگی۔

اگلی صبح ہم موٹر گاڑی میں ماسکو سے باہر ایک خوبصورت مکان میں اترے۔ موٹر سے اپنا مختصر سامان اٹھایا اور گھر میں داخل ہو گئے۔ مکان کرسیوں، صوفوں اور قالینوں سے آراستہ تھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد ایک عورت مسکراتی چائے کا برتن ہاتھ میں لئے اندر آئی۔ اس نے کچھ کہا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن جب اس نے برتن میز پر رکھے تو سلام کیا اور ساتھ ہی سر ہلایا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ عورت روسی نہیں کسی اور وطن کی ہے۔ اس کی زبان ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم نے اس سے روسی زبان بولنے کی کوشش کی لیکن اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"یہ روسکی نے پہ نمایم۔" (روسی بالکل نہیں سمجھتی)

ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھکر مسکرا پڑے۔ انقلابی اس طرح اپنے رازوں کو راز ہی رکھتے ہیں۔

چائے پی اور آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں۔ باتوں ہی باتوں میں مجید نے مجھ پر طنز کیا "سلیم تم نے اسایان کے ساتھ ظلم کیا۔"

"ظلم میں نے کیسے کیا۔ ظلم تو بیگم رائے نے کیا۔ ایک طرف تو اس نے میرے دل میں اسایان

کی محبت جگادی اور دوسری طرف ہمیں آزمائش میں ڈال دیا۔ اس سے ہم انکار نہیں کرتے۔"

"ہم تو مارگریٹ پر عاشق تھے لیکن کل رات اس سے اجازت لے لی" مجید نے جواب دیا۔

"بھائی! میں بھی رات اسایان سے اجازت لے سکتا تھا۔ لیکن سوچ کر ذرا سچ سچ بتاؤ کہ انقلابیوں کے راستے کیا ایسے ہیں جو اپنے معشوقوں کو اپنے راز آشکارا کر سکیں تاکہ ہماری باتیں ہم سے پہلے وہاں پہنچ جایا کریں"۔ مجید سنتے ہی فکروں میں ڈوب گیا۔ "اس کے علاوہ اگر میں بھی آپ لوگوں کی طرح معشوق سے اجازت لینے ساتھیوں سے رہ جاتا پھر وہ کیا پیٹر گراڈ چلتے۔"

فیروز یکدم اس پر برس پڑا اور کہا:

"میں نے بھی مجید کو سمجھایا تھا کہ مارگریٹ کے پاس مت جاؤ۔ اگر انگریزی سفیر کو کسی ذریعہ سے ہمارے ہندوستان جانے کی خبر مل گئی تو پھر ہم کبھی بھی ہندوستان نہیں پہنچ سکیں گے۔"

میں نے دل کا سارا غبار مجید پر ہی ہلکا کیا۔ مزید کہا:

"اور پھر بھی۔ اگر میں تمہاری طرح سوچتا تو بھی اسایان کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چند دن پہلے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان لوٹ رہے ہو تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ تو بھائی تم ذرا سوچو پھر کس طرح میں اس کا سامنا کرتا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میرا تمہارے ساتھ مکمل اتفاق ہے کہ میں نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے ساتھ اس سے اتفاق کرو گے کہ ہم دونوں کے ساتھ بیگم رائے نے ظلم کیا۔ اس نے تو مجھے مار ہی دیا۔ دیکھو! ابھی تک اس ظالم نے ہمیں اتنا بھی نہیں بتایا کہ ہم نے کہاں جانا ہے۔ آخر ہم بھی جذبات رکھتے ہیں انسان ہیں تم یقین کرو مجید! میں تو خودکشی کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ اس زندگی سے تو موت ہی اچھی۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے مجھے اسایان سے کتنی سچی اور پرخلوص محبت ہے۔ اگر اسے پتہ ہوتا کہ ہم چند دن کے مہمان ہیں تو کیوں ہمارے ساتھ دل لگاتی۔ اس کی محبت کے طلب گار نوجوان کتنے بددل اور مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ مجھے اکثر کہتی کہ اول تو تم نے یہاں روس میں ہی رہنا ہے اور اگر اپنے وطن واپس جانا ہی ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔

اب اگر رائے یا اس کی بیوی مجھے وطن جانے کا حکم دیتے ہیں تو دوستو میرا جواب بھی سن لو! میں انہیں صاف کہہ دوں گا کہ میں نے نہیں جانا۔ اور تب ہی جاؤں گا جب اسایاں مجھے معاف کر دے اور جانے کی اجازت دیدے۔"

ہم اسی بحث میں مشغول تھے کہ گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ہمارا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا اور پلک جھپکتے ہی بیگم رائے اندر داخل ہوگئی۔ "گوڈ مارننگ بوائز" (صبح بخیر لڑکو)

"گوڈ مارننگ" ہم نے جواب دیا۔

اندر آتے ہی بیگم نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ ہماری غیر معمولی نقل و حرکت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا

"لڑکو! مادر وطن کو تمہاری قربانی کی ضرورت ہے۔ ہندوستان غلامی کی زندگی گذارتے تھک گیا۔ قوم انگریز کی غلامی سے تنگ آچکی ہے۔ اب اتفاق کے ساتھ آزادی کے لئے آخری جنگ کے لئے تیاری شروع ہوچکی ہے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ موپلا نے جنوبی ہندوستان میں آزادی کی جنگ شروع کردی ہے۔ پشتون تو ہمیشہ ہندوستان کی سرحدوں پر آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پنجاب کا سپاہی اور خصوصاً سکھ انگریز سے عاجز آگئے ہیں مجھے پکا یقین ہے جب عام آدمی حکومت کیخلاف آزادی کا جھنڈا اٹھائے گا تو فوج ساتھ شامل ہو جائے گی۔ لڑکو! کمر باندھ لو تاکہ وطن عزیز کو غلامی سے چھٹکارا ملے۔ آپ لوگوں کو باکو جانا ہے۔ ادھر سے آپ لوگوں کے وطن جانے کا انتظام کیا جائے گا۔ وطن پہنچ کر ہر وقت تیار رہیں۔ مادرِ وطن کی آزادی کی جنگ بہت جلد بہت بڑے پیمانے پر شروع کی جائے گی۔"

بیگم نے مختصر الفاظ میں ہمیں اپنا پروگرام دیا۔ ہم پہلے سمجھ چکے تھے کہ اتنی رازداری محض اس لئے برتی جارہی ہے کہ ہمارے وطن بھیجنے کا پروگرام بن رہا ہے۔ بیگم نے ہمیں یہ اطلاع بھی دی کہ گوہر رحمان ہم سے باکو میں ملے گا۔ گوہر رحمان کو صحت بہتر بنانے کے لئے دو مہینے کے لئے بخارا بھیجا گیا تھا۔

"ہم نے کب روانہ ہونا ہے۔" مجید نے پوچھا۔

"بہت جلد" بیگم نے جواب دیا۔

مجید نے ہنستے ہوئے بیگم کو بتایا کہ سلیم تو وطن جانے سے انکار کر رہا ہے۔

"ھن" بیگم کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے چلائی:

"انقلابی سلیم کی بابت میں کیا سن رہی ہوں۔"

"بیگم مجھے بہت افسوس ہے لیکن آپنے میرے ساتھ بہت برا کیا۔" میں نے اپنی بات شروع کر دی۔ بیگم میری بات سنتی رہی اور اپنی حیرانگی کا اظہار کرتی رہی۔

"دیکھیں ہم تو انقلاب کے نشہ میں مست تھے۔ لڑکیوں کا حسن ہمیں اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہا۔ آپ نے ہم پر یہ ظلم کیا کہ ہمیں نیند سے جیسے جگا یا مجھے اسایان کی محبت کے جال میں پھنسا دیا۔ ابھی یہ مشورہ دے رہی ہو کہ محبت چھوڑ دو۔ مادر وطن کی آزادی کی جنگ شروع ہے تم بھی اس طرف جاؤ۔ سوئے ہوئے جذبات ابھار کر اتنے بڑے کٹھن امتحان میں مجھے ڈال دیا۔"

بیگم ہنس پڑی:

"اوھو! غریب سلیم۔ تم محبت میں اتنے پرخلوص تھے۔ امید ہے کہ آزادی کی لیلیٰ پر اپنے آپ کو قربان کر دو گے۔ اپنی تسلی جمع رکھو۔"

میں خاموش تھا بیگم نے ہلایا جلایا "اٹھو سلیم! کمر باندھو۔ ہمت مت ہارو۔ میرا تو تمہارے متعلق یہ خیال تھا کہ تم ایک باہمت لڑکے ہو۔ یہ تمہیں کیا ہوا؟"

مجھے بیگم رائے کی یہ بات "ہمت نہ ہارو" بہت بری لگی اس لئے فوراً جواب دیتے ہوئے کہا:

"میں بے ہمت نہیں ہوں۔ لیکن بیگم میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک بے گناہ لڑکی کا دل کیوں توڑ رہی ہو۔ کیا یہ آپ ظلم نہیں کر رہیں؟"

بیگم نے میری طرف دیکھا اور ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا

"اچھا سلیم! میں آج سہ پہر کو پھر آؤں گی۔" بیگم چلی گئی۔ ہم چاروں ساتھی خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سلطان محمد خان نے قہر بھرے لہجے میں مجھ سے کہا

"یار اے کے گند مچا دیتا ئے" (یہ کیا گند بنا دیا)

"کیوں" میں نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا "تم تو بے غم ہو"

"او یار... تم بھی اپنے آپ کو انقلابی کہتے ہو۔ میں تو تمہیں انقلابی نہیں سمجھتا۔ ایک لڑکی نے تمہیں ماسکو میں روک لیا۔ انقلاب بس؟"

سلطان محمد خان بھی غصے میں تھا اس لئے میں نے بھی اسے طیش بھرے لہجے میں جواب دیا

"ہرگز نہیں! میں ایک انقلابی ہوں۔ کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ لیکن پھر بھی دیکھو نا!"

"دیکھو دیکھو کیا معنی رکھتے ہیں اور اس میں "پھر دیکھو نا" کس لئے ہے؟ یا تو کہو کہ انقلابی ہوں۔ انقلاب کا عاشق ہوں اور یا صاف کہو کہ انقلابی نہیں ہوں۔ اسایان پر عاشق ہوں۔ معشوق بس ایک ہی ہوتی ہے دو نہیں ہوتیں۔ یا تو کہو کہ انقلاب کا دیوانہ ہوں اور یا کہو کہ ٹھیک ٹھاک ہوں انقلابی نہیں ہوں۔ پھر تمہاری اپنی مرضی ہو گی کہ اسایان کی تابعداری کرتے ہو یا اور کہیں اپنا گھر بناتے ہو۔ پھر ہمارا تم سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہو گا۔" سلطان محمد خان کو خوب طیش آیا۔ مجید اور فیروز نے بھی سلطان کا ساتھ دیا۔ تینوں نے یک زبان ہو کر پوچھا

"تم انقلابی ہو یا نہیں۔"

ہر چند میں نے کوشش کی کہ اپنے دل کا حال سنا سکوں اور اپنی محبت کی موجودگی میں انقلابیت کی تشریح کر سکوں ساتھ ہی ساتھ اپنے سارے اعمال کا ذمہ دار مسز رائے کو گردانوں لیکن ساتھیوں نے نہیں چھوڑا۔ تب ہی ان سے جان چھوٹی جب میں نے علی الاعلان کہا کہ میں انقلابی ہوں اور کسی کی محبت میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

رات کے وقت پیانو۔ باجہ اور ناچ

سارا دن ہم نے مکان کے اندر گذارا۔ ویسے بھی باہر سخت سردی تھی۔ دن رات آگ جلتی رہتی۔ کبھی کبھی ہم کھڑکی سے باہر شیشوں سے باہر جھانکتے۔ برف گرنے کے دلکش منظر دیکھتے تو بے اختیار دل باہر سیر کے لیئے مچلتا۔ لیکن ہم نے باہر نکلنا مناسب نہیں جانا۔

روس میں ہندوستانی نہیں چھپ سکتا۔ صاف ظاہر ہے اس کا رنگ ان سے مختلف ہے۔ یہی ڈر لگا رہتا کہ کوئی دیکھ نہ لے اور دشمن کو کہیں پتہ نہ چل جائے۔ سارے روس اور روسی ترکستان میں انگریز مخبروں کی موجودگی ممکن تھی اور ویسے بھی ہماری نقل و حرکت کی اطلاعات باقاعدہ انگریزی سفیر کے ذریعے ہندوستانی حکومت کو پہنچتی۔ یہ خطرہ ہمارے ساتھ تھا کہ مبادا ہمارے پہنچتے ہی ہم گرفتار نہ کر لیئے جائیں اور اپنے فرائض کی بجا آوری سے رہ جائیں۔

سہ پہر سے ہم بیگم رائے کے منتظر تھے۔ شام ڈھل گئی وہ نہ آئی۔ رات ہوئی وہ نہ آئی۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ابھی گاڑی کا ہارن بجے گا اور بیگم رائے اندر آموجود ہوگی۔ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ ہم نے آواز دی

"مہربانی فرمائیں"

دروازہ کھلا اور تین عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ جب ان کی نظر ہم پر پڑی تو حیران رہ گئیں۔ ہم بھی حیران ہکے بکے کرسیوں میں بیٹھے رہ گئے۔ جلد ہی دونوں فریقوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ انہوں نے کہا:

"ہم معافی چاہتے ہیں"۔

جواباً ہم اپنی جگہوں سے اٹھے اور ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے بیٹھنے کی دعوت دی۔

ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور دو نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ادھیڑ عمر عورت نے جلد ہی اپنے آنے کا سبب بیان کر کے ہمیں اور انتظار کی زحمت سے بچایا۔ وہ بولی

"ہم آپ کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ہمارا گھر آپ کے گھر سے نظر آرہا ہے۔ آپ کے پڑوسی

ہیں۔ آپ کا یہ مکان اکثر ویران رہتا ہے ہم اس وقت روزانہ آتے ہیں اور اس پیانو پر اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ آج آپ کو پوچھے بغیر اندر آ گئے اور آپ کے آرام میں مخل ہوئے۔"

جواب میں ہم نے کہا کہ آپ لوگ چاہتے ہیں تو یہ کمرہ مع اس پیانو کے آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ عورتیں خوش ہو گئیں۔ انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ ایک لڑکی اٹھی اور پیانو بجانا شروع کیا۔

ادھر پیانو کا بجنا شروع ہوا اور ادھر میزبان اندر داخل ہوئیں۔ میزبان کے چہرے سے سخت خفگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ عورتیں جان گئیں کہ میزبان ناخوش ہے۔ میزبان نے ہمیں بہت باتیں سنائیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ عورتوں نے ہم سے درخواست کی کہ اگر ان کی موجودگی سے ہم لوگ ناخوش ہیں تو وہ چلنے کو تیار ہیں۔ لیکن ان کی حیرانگی اور بڑھ گئی جب انہیں پتہ چلا کہ ہم بھی ان کی طرح میزبان کی زبان نہیں سمجھتے پھر بھی ہم نے مہمانوں کو باہر نکالنا نامناسب جانا۔ ہم نے میزبان کو ہاتھوں کے اشارے سے سمجھایا کہ مہمان عورتیں ہماری اجازت سے ہی اندر آئی ہیں لیکن پھر بھی وہ بار بار اندر آ کر ان کی موجودگی پر اپنی خفگی کا اظہار کرتی رہی۔ وہ اپنی زبان میں بار بار کچھ کہتی رہی ہم اتنا تو جان گئے تھے کہ اس کو ان کی موجودگی پر اعتراض ہے

بعد میں جب مہمان چلے گئے تو ہم آپس میں خوب ہنسے۔ کیونکہ اگر میزبان کو اس کا پتہ چلا تو وہ کیا سوچے گی۔ لیکن اچھا ہی ہوا کہ وہ نہیں آئی اور اس طرح مہمانوں کی عزت رہ گئی۔

ہمیں معلوم ہوا کہ ادھیڑ عمر عورت ان دو لڑکیوں کی ماں تھی اور پیانو بجانا بہت اچھا جانتی تھی۔ وہ دونوں بیٹیوں کو پیانو سکھا رہی تھی۔ روس میں بھی یورپ کے اور ملکوں کی طرح ناچنا اور پیانو بجانا عورتوں کے لئے ایک اچھا ہنر سمجھا جاتا ہے۔ ماں بیٹیاں رات گئے تک ناچتی اور پیانو بجاتی رہیں۔ چلتے وقت انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہمیں بتایا کہ میری بیٹیوں کی تربیت مجھ پر فرض ہے۔ بار بار معافی مانگتی ہوئے ہم سے رخصت ہوئیں۔

اسایان کی تصویر

اگلے دن دوپہر کے وقت کافی انتظار کے بعد ہم نے بیگم رائے کی موٹر کے ہارن کی آواز سنی۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"یہ لو سلیم تمہارے دل کی خواہش پوری ہوگئی"۔ بیگم نے مجھے اسایان کی تصویر معہ ایک خط کے دی۔ میرے ساتھی میرے ارد گرد جمع ہوگئے۔ میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ اس نے مجھے مخاطب کرکے لکھا تھا

"پیارے سلیم! بیگم رائے نے مجھے آپ کا پیغام دیا۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم چھ مہینوں کے لئے جا رہے ہو۔ انقلابیوں کی زندگی میں چھ مہینے کوئی خاص وقت نہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم کامیاب و کامران واپس لوٹ آؤ۔ اپنی منزل مقصود کو پہنچنے کے فوراً بعد بیگم کے ذریعے مجھے خط بھیجو۔ میری تصویر سفر میں تمہارا ساتھ دے گی۔ اس کو تسلی دیتے رہو کہ خفا نہ ہونے پائے۔"

مجید نے خط پڑھتے ہی ایک نعرہ لگایا۔

"انقلاب"

سلطان اور فیروز نے جواب دیا۔

"زندہ باد"

بیگم رائے نے فاخرانہ انداز میں مجھے گھورتے ہوئے کہا

"دیکھو سلیم! انقلابی سمجھدار ہوتے ہیں۔ تم بھی سمجھدار ہو۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ چھ مہینے بعد تمہیں واپس بلوالوں گی۔ سمجھ گئے۔"

"سمجھ گیا" میں نے جواب دیا۔

ماسکو سے روانگی

چوتھی رات تاریکی میں ایک بند گاڑی میں ہم چاروں دوستوں کو ماسکو کے ایک سٹیشن لے جایا گیا۔ ایک گاڑی میں سوار ہوئے۔ گاڑی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہو گی۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا:

"عوامی گاڑی"

گاڑی کے آگے اور پیچھے دونوں طرف انجن لگے ہوئے تھے۔ کل ملا کر تین ڈبے تھے۔ یہ سفیروں کے لئے مخصوص تھی۔ عام حالات میں دو ڈبے ہوتے تھے۔ یہ تیسرا ڈبہ ہمارے لئے لگایا گیا تھا۔ گاڑی کے اردگرد فوجی پہرہ لگا ہوا تھا۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد ایک آدمی اندر داخل ہوا اور ہمیں مخاطب کر کے کہنے لگا

"میں آپ کی گاڑی کا کمانڈر ہوں جو بھی کام ہو اس گھنٹی کے بجانے پر حاضر ہوا کروں گا" ہر سٹیشن پر جب گاڑی رکتی تو وہ ہمارے دروازے میں موجود ہوتا۔ چلتی گاڑی میں بھی گھنٹی بجانے پر حاضر ہو جاتا۔ وہ مسافروں کی امداد کے لئے گاڑی میں موجود تھا۔

کھانے پینے کا سامان ماسکو سے ہمارے ہمراہ کر دیا گیا تھا۔ یہ سادہ خوراک تھی۔ پکانا نہیں پڑتا تھا پکی پکائی تیار روٹیاں تھیں۔ یہ روٹی ایک ایک آٹھ سیر بھاری ہوتیں۔ ساتھ پنیر اور مکھن کی ڈلیاں پڑی تھیں مچھلی کے سیاہ انڈے بھی موجود تھے۔ یہ راستے بھر ہماری خوراک رہی۔

ہماری گاڑی میں اندر چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ہر ایک کمرے میں سونے کے لئے تو سپرنگی پلنگ موجود تھے۔ دو کرسیاں اور ایک میز بھی موجود تھی۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بھی قابل دید قالین لٹکے ہوئے تھے۔ اسی کمرے میں غسل خانہ اور پاخانہ بھی موجود تھا۔ اس کی صفائی حیران کن تھی۔ تمام کمروں غسل خانوں اور پاخانوں میں سنگار کی چیزیں موجود تھیں۔ ہم کافی دیر تک ایک کمرے میں بیٹھے رہے اور اپنی اس عزت افزائی کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے۔ آخر تھک ہار کر اپنی اپنی جگہوں پر آرام سے لیٹ گئے۔

خارکوف

تمام رات گاڑی تیز چلتی رہی ۔ بے شمار چھوٹے بڑے سٹیشنوں کو پیچھے چھوڑا ۔ اہم سٹیشن پر رُک جاتی ۔ صبح اٹھ کر جب باہر دیکھا تو تمام جگہوں کو برف سے اٹا پایا۔

دوپہر ہم خارکوف پہنچے ۔ یہ ریل گاڑیوں کا بڑا سٹیشن ہے ۔ گاڑی رُکتے ہی ہم نے دیکھا کہ ہماری گاڑی سے متصل ایک اور گاڑی کھڑی ہے ۔ اس گاڑی میں مشرقی یونیورسٹی کے طلبا ہماری طرف متوجہ تھے ۔ ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہنستے مسکراتے دوڑتے ہوئے ہماری طرف آئے ۔ سب بہت خوش ہوئے تھوڑی دیر تو ہماری گاڑی کی تعریف کرتے رہے کہ یہ "نرودنایا" (عوامی) گاڑی ہے اور اس میں سوویت یونین کے بڑے بڑے رہنما ہی سفر کرسکتے ہیں ۔ باتوں ہی باتوں میں طالب علموں نے ہم سے دریافت کیا:

"کیا آپ ہندوستان جا رہے ہیں ؟"

ہم نے انکار کیا ۔ لیکن ان کو ہمارا انکار کچھ بھایا نہیں ۔ کہنے لگے:

"کتنے خوش قسمت انسان ہیں ۔ اب یہ انقلابی زندگی گذاریں گے ۔ ہماری بدقسمتی سے روس میں انقلاب کا دلچسپ زمانہ ختم ہو گیا ۔"

باتوں کے دوران انہوں نے ہم سے مذاق شروع کیا ۔ ساتھ ہی ہمارے معشوقوں کے حال پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ اکیلے رہ گئے ۔ ہم تردید کرتے رہے کہ ہم نے ہندوستان نہیں جانا صرف باکو تک جانا ہے اور پھر جلد از جلد ماسکو واپس لوٹنا ہے لیکن وہ نہیں مانے ۔ انہیں پکا یقین تھا کہ ہم ہندوستان ہی جا رہے ہیں ۔ ایک لڑکی نے بڑے ڈرامائی انداز میں ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، "اوہو بے چاری اسایان ! تمہیں کیا خبر ! "

"اوہو مارگریٹ بے چاری کس حال میں ہوگی ۔"

ہم نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی اور اس کی تردید کرتے رہے ۔

منزلنی وادی (معدنی پانی)

صبح کے وقت گاڑی منزلنی وادی پہنچی۔ یہ ایک چھوٹا سا جنکشن ہے۔ یہاں سے ایک لائن شمال کی طرف گئی ہے۔ ہمیں مطلع کر دیا گیا کہ یہ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ یہ دوسری طرف جائے گی۔ باکو جانے کے لئے دوسری گاڑی شام کو پہنچے گی۔

ہم گاڑی سے نیچے اترے۔ آرام کرنے کے لئے ہمیں ایک بغیر پہیوں والا ڈبہ دیا گیا۔ سٹیشن چھوٹا تھا اس میں انتظار گاہ موجود نہیں تھی۔ سارا دن انتظار کرنا ہوگا۔ اس اطلاع نے ہمیں افسردہ کر دیا۔ سٹیشن میں بھی دلچسپی کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ ویسے بھی انتظار موت سے کم نہیں۔

ڈبے میں بیٹھ کر اکتا گئے۔ یہ صلاح ہوئی کہ کہیں باہر نکلا جائے۔ سارا دن تنگ آجائیں گے۔ سردی کا کوئی خیال نہیں کیا۔ سٹیشن کے ساتھ واقع ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ سارا ملک ایک سفید میدان کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ مکانوں کے اوپر بھی برف پڑی ہوئی تھی۔ درخت بھی برف سے اٹے پڑے تھے۔ اس وقت برف باری بند تھی۔ دن کی سردی تو انسان کو چلنے پھرنے سے نہیں روکتی ہے لیکن رات کی سردی جانداروں کے لئے تباہی ہوتی ہے۔ سٹیشن سے روانہ ہوتے وقت ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا:

"معافی چاہتا ہوں آپ لوگوں سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ کافی دلچسپ لوگ دکھائی دیتے ہیں۔"

اس بات کے ساتھ ہم عادی ہو چکے تھے۔ روس میں ہمارا رنگ لوگوں کو ہماری طرف متوجہ کرتا۔ ہمیں بھی اس وقت کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔

"پژالستہ" (مہربانی فرمائیں) ہم نے جواب دیا۔

"آپ لوگ کہاں کے رہنے والے ہیں" اس نے سب سے پہلے دریافت کیا۔

"ہم لوگ ترکستان کے رہنے والے ہیں۔ کیا آپ ہمارے ساتھ یہ مہربانی کر سکتے ہیں کہ ہمیں نزدیکی گاؤں کے متعلق بتائیں۔ ہم لوگوں سے یہاں متعارف ہونا چاہتے ہیں۔ ہم ان سے یہاں کے متعلق

معلومات چاہتے ہیں"۔

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی خوشی سے" اس نے جواب دیا۔

وہ ایک دلچسپ آدمی تھا۔ ہمارے ساتھ چل پڑا۔ جب گاؤں پہنچے تو اس سے زیادہ دلچسپ سرگرم لڑکے ہمارے ہر سوال کا جواب دینے کو تیار ملے۔ اس گاؤں کا نام منزلنی وادی تھا۔ اس علاقے میں معدنیات زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی معدنی چشمے بھی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو منزلنی وادی (معدنی پانی) کہا جاتا ہے۔ گاؤں چھوٹا سا تھا۔ نقشے کے مطابق بنایا گیا تھا۔ مکانات زمین سے کافی اونچے چبوتروں پر لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ گلی کوچے کافی چوڑے تھے گاؤں کے درمیان ایک کلب تھا جو ایک بڑے میدان کے درمیان واقع تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں دس پندرہ مرد عورتیں ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ جب ان کو علم ہوا کہ ہم ان کے متعلق جاننا چاہتے ہیں تو فوراً انہوں نے کلب کا دروازہ کھلوایا۔ وہاں ہمیں عزت سے بٹھایا۔ مجمع نے جلدی ایک جلسے کی صورت اختیار کر لی لیکن سامعین کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہ تھی۔

گاؤں چھوٹا سا لیکن خوبصورت تھا۔ اور کیوں خوبصورت نہ ہوتا۔ خوبصورت لوگ ہمیشہ خوبصورت مقاموں پر رہتے ہیں۔ یہ جگہ یورپ اور ایشیا کا سنگم ہے۔ یہاں سے قفقاز کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اگر زمانہ قدیم میں یہ علاقہ پریوں کا دیس کہلاتا جاتا رہا ہے تو بے جا نہیں۔ دور افتادہ روس میں سرخ و سفید رنگ اور نیلی آنکھیں تھیں۔ یہاں قفقاز کے کنارے سرخ و سفید رنگ گندمی رنگ میں بدلتا ہے اور سر کے سرخ بالوں کی جگہ یہاں ہم نے سیاہ زلفیں اور کالی آنکھیں دیکھیں۔ ہمارے رنگ ظاہر کر رہے تھے جیسا کہ ہم دیو ہیں اور ان کی خوبصورتی اور دلکشی کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ پریاں ہیں۔ ہم نے جب ان کو بتایا کہ ہم باکو جا رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ تفلس کے راستے چلے جائیں تاکہ حسن اور خوبصورتی دیکھ سکیں۔ ہم حیران رہ گئے کہ آخر یہ کیسا حسن ہو گا جس کا حسن خود ثنا خواں ہے۔

گاڑی کے کاریڈار میں سونا

رات سے پہلے گاڑی آپہنچی۔ ہمیں اول درجے کی ٹکٹیں دی گئیں۔ ساتھ ہی معذرت کی گئی کہ آپ لوگ ناراض مت ہوں کیونکہ یہ ایک چھوٹا سا سٹیشن ہے اور یہاں کوئی خاص گاڑی نہیں ورنہ وہ خدمت میں پیش کی جاتی۔

ہم گاڑی کے نزدیک ہی ایک طرف کھڑے تھے۔ سٹیشن ماسٹر نے معذرت خواہی کے انداز میں کہا:

"بہتر ہی ہوگا کہ آپ لوگ رات یہاں گذاریں۔ آدھی رات کو دوسری گاڑی آئے گی اس میں کافی جگہ ہوگی۔ وہ عام مسافروں والی گاڑی ہے آپ بہت آرام سے جاسکیں گے۔"

ہم نے سٹیشن ماسٹر کی بات سے اتفاق نہیں کیا آپس میں ایک دوسرے کو مسکراتے ہوئے دیکھا شاید سٹیشن ماسٹر یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم آرام پسند لوگ ہیں۔ ہم درجہ اوّل میں داخل ہوگئے۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو کاریڈار ہی نظر آیا۔ گاڑی کے اندر چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور ہر ایک کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ہر کمرہ ریزرو تھا۔ ہم نے کاریڈار میں کھڑے ہوکر اپنا سامان نیچے رکھ دیا۔

گاڑی چل رہی تھی۔ کاریڈار میں اور کوئی موجود نہیں تھا کافی دیر تک کھڑے رہے۔ اپنی خودداری اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ جوتوں کی جگہ بیٹھ جائیں۔ لیکن جب تھک گئے تو ایک دوسرے پر اعتراض کئے بغیر آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ گئے۔ جب یہ یقین ہوگیا کہ کمروں والے اب باہر نہیں نکلیں گے تو لیٹ گئے۔ نہ ہی ہم نے اپنے کوٹ اتارے اور نہ بلے بوٹ۔ نیند ہر چیز پر غالب آگئی اور ہم سو گئے۔

طہران میں مقیم روسی سفیر کی بیوی سے ملاقات

اس گاڑی میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے روسی سفیر واقع طہران کی بیوی کے لئے مخصوص تھے۔ صبح اٹھنے پر اس نے ہم چار اشخاص کو کاریڈار میں لیٹے ہوئے پایا۔ اس پر اس کو سخت افسوس ہوا۔ ایک کمپارٹمنٹ میں وہ

اور اس کی بیٹی تھی اور دوسرا کمپارٹمنٹ اس کے سامان کے لئے مخصوص تھا۔ فوراً ہی اس نے ہمیں اٹھایا اور اپنے ساتھ بٹھا دیا۔

انقلاب کے بعد یہ ماں بیٹی پہلی دفعہ روس آئی تھیں۔ ماں انگریزی بول لیتی تھی لیکن بیٹی کو تو ایسی انگریزی آتی کہ اس میں اور انگریزوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ سفیر صاحب نے انقلاب سے بہت پہلے روس سے فرار ہو کر انگلستان میں پناہ لی تھی۔

۴۷
باکو پہنچنا

چوتھے دن ہم باکو پہنچے۔ تیل کے کنوئیں اور چشمے ریل کی پٹڑی کے قریب ہی دکھائی دے رہے تھے۔ لوہے کے بڑے بڑے ٹاور حدِ نگاہ تک دکھائی دے رہے تھے۔ یہیں سوویت کی قوت پنہاں تھی۔

پلیٹ فارم پر گاڑی سے اترے۔ ایک آدمی کو گاڑی کے دروازے پر پایا۔ وہ ہمیں لینے آیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا ہم سمجھ گئے کہ ہماری پہچان کوئی مشکل کام نہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ہمارا میزبان ہمیں گاڑی میں بٹھائے باکو شہر کی وسعت بیان کر رہا تھا۔ سہ پہر تھی جو درحقیقت باکو کا ہی خاصا تھی۔ روس میں ہم نے اب تک ایسے خوبصورت اور خوش لباس لوگ نہیں دیکھے تھے۔ خوبصورتی تو اس وجہ سے تھی کہ باکو کوہ قاف کا ہی ایک حصہ ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے مشکل وقت میں یہ لوگ ایسے خوش لباس کیسے رہ سکتے ہیں۔

ہم ایک خوبصورت مکان میں رہائش پذیر ہوئے۔ مکان بڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس میں اور لوگ بھی رہتے تھے لیکن اس وقت ہم اکیلے ہی رہ رہے تھے۔ ہمارا کمرہ خوب آراستہ تھا۔ ہمیں ماسکو کے ڈپلیکس ہوٹل سے بھی بہترین فرنیچر مہیا کیا گیا۔ پلنگوں میں سپرنگ لگے ہوئے تھے۔ قیمتی صوفے اور آرام دہ کرسیاں موجود تھیں۔ قدِ آدم شیشے اور سنگار میز بھی پڑے ہوئے تھے

ہمیں حیرت اس پر ہوئی کہ سوویت یونین میں اتنا تکلف تو ہم نے کہیں نہیں پایا تو پھر باکو میں کیوں

ہم پر یہ التفات ہو رہی ہیں۔ آپس میں گفتگو کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ سوویت یونین میں ہمارے یہ آخری ایام ہیں اسی لئے ہماری اتنی عزت افزائی کی جا رہی ہے۔ تاہم اصلی وجہ بہت جلد سامنے آگئی۔ ایک دن ہمارے کمرے میں ایک شخص داخل ہوا۔ اس نے آنے سے پہلے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم نے اس کو "پژالستہ" بولا۔ وہ اندر آیا۔

اس کے ہاتھوں میں ایک کتاب تھی۔ ہماری میز پر پانی کا ایک خوبصورت شیشے کا جگ پڑا ہوا تھا۔ اس نے کتاب کھولی اور پھر ہمیں کہا:

"ساتھیو! یہ جگ میرا ہے۔"

ہم حیران رہ گئے۔ سوویت یونین میں یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ کوئی آدمی کسی چیز پر اپنی ذاتی ملکیت ظاہر کرے۔ اس لئے اس سے دریافت کیا

"توارش آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ میرا ہے۔ سوویت میں تو ذاتی ملکیت نہیں ہے۔"

وہ مسکرایا۔ کتاب کھولی۔ کتاب میں گھر کے تمام کمروں کے الگ الگ نمبر لکھے ہوئے تھے۔ ہر کمرے کا علیحدہ علیحدہ سامان تھا۔ ہمارے کمرے کے جگ گلاس اس نے ہمیں گنوائے اور اس کے بعد اضافی جگ پر اپنا دعویٰ کیا۔ ہم نے اس سے پھر پوچھا

"توارش! تم کون ہو اور کس طرح ہمارے کمرے کے اضافی سامان کے دعویدار بنتے ہو۔"

"یہ مکان اور یہ سارا فرنیچر میرا تھا" اس نے بتایا۔ "یہ جگ مجھ سے ضبط نہیں کیا گیا اسی لئے اس پر میں اپنا حق جتاتا ہوں اور اس کا دعویدار ہوں۔"

ہم سمجھ گئے۔

"اچھا توارش آپ ہمارے میزبان سے بات کر لیں۔ ہم تو مسافر ہیں۔ آپ کی چیزوں کے ساتھ کوئی غرض نہیں۔ امید ہے آپ ناراض نہ ہوں گے۔"

پھر ہمیں نہیں معلوم جگ کا کیا بنا۔ لیکن جب تک ہم وہاں رہے جگ ہمارے ہی پاس رہا۔

باکو بحیرہ خضر کے کنارے ایک خوبصورت لیکن بڑی بندرگاہ ہے۔ ایران اور قفقاز کے درمیان

تجارت کا مرکز ہے۔ باکو کی عظمت تیل کی وجہ سے ہے۔ شہر پانی کے کنارے بنایا گیا ہے۔ بے شمار چھوٹے بڑے جہاز پانی کے اوپر اِدھر سے اُدھر چل رہے ہوتے ہیں۔ جو شہر کی شان و شوکت میں اضافہ کرتے ہیں۔ چھوٹی موٹر کشتیاں بھی ادھر ادھر بھاگتی نظر آتی ہیں۔

گولایت (سیر)

باکو کی شام بہت پُر رونق ہوتی ہے۔ ہم نے موقعہ سے فائدہ اٹھایا سیر کے لیئے سمندر کے کنارے چلے آئے۔ سمندر کے کنارے بڑی بڑی تفریح گاہیں تھیں اور ان میں بنچ پڑے ہوئے تھے۔ مرد و زن ان بنچوں پر بیٹھتے ہیں۔ اور کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ سینکڑوں مرد عورتیں ایک دوسرے کے پیچھے ایک دائرہ میں چل رہے ہوتے ہیں۔ اکثر مرد عورت ہاتھ میں ہاتھ دیے لیکن کبھی ایک دوسرے کے بغلوں میں بھی ہاتھ دیے چل رہے ہوتے ہیں۔ دائرے میں آرام سے چلتے چلتے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کی بات سننے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس دائرے میں عاشق معشوق کی بغل میں بیوی شوہر کی بغل میں بیٹی باپ کے بغل میں بہن بھائی کے بغل میں ہاتھ دیئے آہستہ آہستہ چل رہے ہوتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی غرض نہیں۔ جس کو کھڑا ہونا ہوتا ہے وہ دائرے سے نکل جاتا ہے۔ اور جب دوبارہ دائرے میں شامل ہوتا ہے تو آرام سے ایک خالی جگہ میں گھس کر پھر وہی باقاعدگی شروع کر دیتا ہے۔ ایسی خاموشی سے وہ دائرے میں دوبارہ گھستا ہے کہ کسی کے کام میں مداخلت نہیں ہوتی۔

ایسے پارک تاشقند شہر کے ہر ایک حصے میں موجود تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ادھر پردہ ہوتا تھا۔ مرد عورتوں سے گھلتے ملتے نہیں۔ باکو میں بھی اکثریت مسلمان ہے۔ لیکن ان میں پردہ نہیں۔ باکو میں ترک، عیسائی اور مسلمان رہتے ہیں۔ لباس اور شکلوں سے عیسائی مسلمان کے درمیان فرق کرنا ہمارے لئے ناممکن تھا۔

میں پہلے بھی ایک دفعہ باکو آچکا تھا۔ پہلے ہی میں نے ذکر کیا ہے کہ حکومت کے کارندوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ باکو میں یہ فرق بالکل محسوس نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو شاید

ہم جیسے اجنبیوں کو بالکل پتہ نہیں چلتا۔

باکو میں بھی اور شہروں کی طرح تھیٹر، سینما اور تفریح گاہیں ہیں۔ ہر ایک آدمی شام کو کام سے فارغ ہو کر ان تفریح گاہوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہاں رات گئے تک وہ مشغول ہوتا ہے۔

ماسکو میں شہر کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک شہر کے وسط میں ایک میدان ہے۔ شام کو وہاں میلے کا سماں رہتا ہے۔ ایک کونے میں کوئی شخص قدیم یونانیوں کے لباس میں بیٹھا رباب بجا رہا ہوتا ہے۔ دوسرے کونے میں عرب لباس میں ملبوس کوئی شخص بانسری بجا رہا ہوتا ہے لوگ بنچوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ کہیں ایک مداری اپنے رنگا رنگ کرتبوں سے تماش بینوں کو خوش کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح باکو میں بھی لوگ اس قسم کی زندگی گذارتے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد تمام لوگ سینما اور تھیٹر دیکھتے ہیں۔ سرکس بھی شہر میں دلچسپی کا ایک ذریعہ موجود ہے۔

روٹی

باکو کی روٹی بہت مزیدار ہوتی ہے۔ تقریباً ایک سیر آٹے سے ایک روٹی بنتی ہے اور مزے کی بات یہ کہ تندور پر پکائی جاتی ہے۔

وطن عزیز میں ہم نے خیبر میں تندور کی بڑی بڑی روٹیاں دیکھی اور کھائی ہیں۔ بہت عمدہ طریقے سے پکی ہوئی ہوتی ہیں جو سیر آٹے سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ باکو کے بازار میں بکنے والی تندوری روٹیاں قابل دید تھیں۔ تاشقند کی روٹیاں بھی اچھی ہیں۔ بس پشاوری تندور کی روٹی جیسے ہوتی ہے۔ کابل، بخارا اور تاشقند میں بھی اسی طرح روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔

روس میں تو سولہ پونڈ یعنی آٹھ سیر کی ایک ڈبل روٹی ہوتی ہے۔ ایران میں توے پر روٹی پکائی جاتی ہے۔ ہم نے کہیں تندور کی روٹی نہیں دیکھی۔ توے کی روٹیاں ہمارے وطن کے توبے کی روٹیوں کی طرح پتلی لیکن ذرا لمبی ہوتی ہیں۔ یہ روٹیاں بھی سیر آٹے سے کم کی نہیں ہوتیں۔ نرم بھی کافی ہوتی ہیں۔ روٹی کے علاوہ باکو میں تو کاری [illegible]

باکو میں ہمارا قیام بہت کم رہا۔ کل دو مہینے گذارے جو اچھے گذارے۔ وطن عزیز جانے کے لئے ہمیں خرچہ مل گیا تھا۔ حکومت کے دیے ہوئے زاد راہ کے علاوہ ہم نے راستے کے خرچے سے بھی پیسے خرچ کرنا شروع کئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم جلد ہی رخصت ہو جائیں گے اسی لئے پیسے فراخدلی سے خرچ کر رہے تھے۔ ہم پانچ دوستوں کو بارہ سو ڈالر جس کے تین ہزار روپے بنتے تھے دے دیے گے۔ چھ چھ سو روپے ہر ایک شخص کے حصے میں آئے۔ رقم قلیل تھی اور وطن دور تھا۔ لیکن ہم نے دو سال بغیر پیسوں کے گذارے تھے اس لئے پیسوں کو کچھ اہمیت نہ دی۔

عورتوں کا پردے کے خلاف احتجاج

ایک دن شام کے وقت ہم میزبان کے ہمراہ سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارا یہ میزبان تفلس کا رہنے والا ترکی زبان بولتا تھا لیکن فارسی اور روسی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ سامنے سے عورتوں کا ایک جلوس آتا دکھائی دیا۔ ہمارے قریب ہی جلسہ گاہ تھی۔ وہاں ایک زبردست ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ تاشقند میں ایک سال گذارنے کی وجہ سے ہم لوگ بھی تھوڑی بہت ترکی جان گئے تھے۔ میزبان تقریر کا ترجمہ ساتھ ساتھ کرتا رہا۔ دو تین تقریریں ہوئیں۔ سب کا مدعا ایک ہی تھا۔ پردے کی مخالفت ہو رہی تھی۔ ہر مقرر مسلمان ممالک کی پس ماندگی کی وجہ پردہ ہی بیان کر رہا تھا۔ آخر میں پردے کے مجسمے کو نذر آتش کیا گیا اور ہنسی خوشی جلسہ اختتام کو پہنچا۔

باکو سے راستہ ملنا دشوار ہو گیا

باکو پہنچنے کے چند دن بعد گوہر رحمان بھی ترکستان سے وہاں پہنچ گیا۔ اس کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ وطن واپسی کا راستہ دشوار گذار تھا۔ لیکن پرانے ساتھی ایک دوسرے سے حوصلہ بڑھانے میں معاون و مددگار تھے۔ ویسے بھی ہمیں یہی سختیاں پسند تھیں۔ جب ذرا بھی آرام ملتا تو اکتا جاتے۔ ہمارا تو خیال تھا کہ جلد ہی روانہ ہو جائیں گے لیکن چند دنوں میں ہی معلوم ہو گیا کہ افغانستان کے

سفر نے ہمارے افغانستان سے گذرنے پر پابندی لگادی ہے۔ جب معلوم ہوا کہ ہمارا واپسی کا راستہ افغانستان سے ہوگا تو ہمارا قیمتی افغانستان دیکھنے کے پروگرام بن رہے تھے۔ واپسی کا راستہ ہم نے باکو سے مرو، کشک، ہرات قندھار، غزنی، کابل اور جلال آباد پسند کیا۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوگیا کہ وہ طالب علم جنہوں نے ماسکو یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ افغانستان کی حکومت قطعاً انہیں اپنے علاقے سے گذرنے کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔

دوسرا راستہ ایران کا تھا۔ وہاں کے سفر نے بھی ہمیں پاسپورٹ دینے سے انکار کیا۔ اب وطن لوٹنے کا کوئی بھی ایسا راستہ نہ رہا جہاں سے ہم کھلے بندوں سفر کرسکتے لیکن خفیہ راستے تو ہمارے لئے ہر وقت کھلے تھے۔ اتنا تو ہم سمجھ گئے کہ ہم پانچ آدمی اکٹھے سفر نہیں کرسکیں گے۔

اب ہمارے لئے دو راستے چنے گئے ایک تو باکو سے عشق آباد۔ مشہد اور مشہد سے سیستان کے راستے زرداب اور کوئٹہ بلوچستان یا مشہد سے ہرات، قندھار کے راستے ہندوستان۔ یہ بھی طے پایا گیا کہ ایک دفعہ مشہد پہنچ جائیں تو پھر وہاں ہر ایک اپنی مرضی کا مالک ہوگا۔ یہ راستہ نسبتاً آسان تھا۔ دوسرا راستہ مشکل اور نامانوس تھا۔ باکو سے تفلس، ارمنستان، تبریز اور بغداد سے ہندوستان جاتا تھا۔ ہم دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی میں مجید، فیروز اور سلطان محمد خان جبکہ دوسرے میں گوہر رحمٰن اور میں تھے۔ مجید، فیروز اور سلطان محمد خان فوراً عشق آباد کے لئے روانہ ہوگئے تاکہ وہاں سے مشہد کو جا سکیں۔ یہ راستہ صاف تھا۔ میں اور گوہر ابھی باکو میں ہی تھے کہ تینوں ساتھی واپس آگئے۔ معلوم ہوا کہ مجید اور فیروز کے صندوق سے کسی نے نقدی چرالی ہے۔ ہمیں بہت افسوس ہوا مجید کو خوب ملامت کی گئی۔ ویسے تو مجید بہت قابل آدمی تھا لیکن رقم سنبھالنے میں نااہل ثابت ہوا۔ ہم حیران سخت مشکل سے دوچار تھے۔ اس اثناء میں ذکریا آگیا۔ ذکریا نے ہمیں تو نہیں بتایا لیکن معلوم ہوا کہ ہمارے باکو کے قیام سے رفیق رائے بہت ناراض ہے۔ ذکریا کو اس نے بھیجا کہ جلدی ہمارے وہاں سے جانے کا بندوبست کرے۔

باکو سے تفلس

ذکریا ایک پنجابی انقلابی تھا۔ جنگ عظیم اول کے دوران لاہور میڈیکل کالج سے چند طلباء وطن عزیز کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے افغانستان چلے گئے تھے۔ ذکریا ان میں سے ایک تھا۔ باکو میں چھ سات سال بعد اب ذکریا ایک قابل اعتماد آدمی بن چکا تھا۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ دو چار دنوں کے اندر اندر ذکریا نے ہمارے جانے کا بندوبست کر لیا۔ پہلی بار ہمیں معلوم ہوا کہ ہم نے تفلس، آرمنستان، تبریز اور بغداد کے راستے ہندوستان پہنچنا ہے۔

"ساتھیو! آپ کا سفر خاصا دلچسپ رہے گا۔ آپ لوگوں نے قفقاز سے بغیر راہداری ایران میں داخل ہونا ہے اپنے لئے خود بغداد جلد پہنچنے کے راستہ تلاش کرو گے۔" یہ ذکریا کے ہمارے الوداعی الفاظ تھے۔

"ڈیلی گیتسکی واگون"

نمائندگان کی گاڑی

رات کی گاڑی سے میں اور گوہر تفلس روانہ ہو گئے۔ ماسکو کی سردی سے تو بچ نکلے تھے۔ لیکن قفقاز کی سردی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ہم نے بستر بچھائے جوتوں اور کوٹ سمیت اس داخل ہوئے۔ لیکن سردی کہہ رہی تھی کہ آج نہیں تو پھر کب اور سردی کیوں نہ اتنی سخت ہوتی۔ تیسرے درجے کی لمبی گاڑی جس میں شیشے نہیں تھے اور برفانی ہوا کسی آندھی کی طرح اندر آ رہی تھی۔ خدا اس ہوا سے ہر کسی کو محفوظ رکھے۔

ہمارے ڈبے میں صرف ایک اور مسافر تھا۔ جب گاڑی تھوڑی چلی تو اس نے اٹھ کر ناچنا شروع کیا۔ گاڑی میں اندھیرا تھا۔ ہمیں ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا۔ مسافر ناچنے کے ساتھ ساتھ روسی زبان میں گانے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ڈیلی گیتسکی واگون، ڈیلی گیتسکی واگون۔

"اِتہ دیلی گیتسکی واگون۔ گک کراسیو دیلی گیتسکی واگون"

پہلے تو ہمارے پلے کچھ نہ پڑا۔ لیکن جب ذرا غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ وہ سردی سے مجبور ہو کر اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لئے ناچ رہا ہے اور ساتھ موقعے کی مناسبت سے ایک شعر کہہ رہا تھا جس کا مطلب یہ ہے:

"نمائندگان کی گاڑی ہے۔ نمائندگان کی گاڑی ہے۔

یہ نمائندگان کی گاڑی کتنی خوبصورت نمائندگان کی گاڑی ہے۔"

اس آدمی کو حکومت باکو سے تفلس نمائندہ کے طور پر بھیج رہی تھی۔ حالات اتنے خراب تھے کہ سخت سردی کے ان دنوں میں یہ ایسی گاڑی سے جا رہا تھا جس کے شیشے بھی صحیح سلامت نہ تھے۔ سرد ہوا آندھی کی طرح گاڑی کے اندر چل رہی تھی۔ ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ ہر سٹیشن پر رکتی۔ رفتار بھی اس کی بہت سست تھی۔ نمائندہ نے ہمیں بتایا کہ حال ہی میں تفلس اور باکو کے درمیان گاڑی چلنا شروع ہوئی ہے۔ اسی لئے کھڑکیاں بغیر شیشے کی ٹوٹی ہوئی تھیں۔

ساری رات ہم تینوں نے پلک نہیں جھپکی۔ قفقاز کی سردی بستروں سے قابو نہیں ہوتی ہے۔ صرف آگ ہی اس کا علاج ہے۔ آگ تو ایک طرف ریل کے محکمے کا یہ حال تھا کہ کھڑکیوں میں شیشے کی جگہ لکڑی کے تختے بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ ہماری تو جوانی دیوانی تھی۔ نہ ہی سردی کا کچھ اثر پڑتا اور نہ گرمی کا احساس ہوتا نہ بہار دیکھتے نہ میدان۔ انقلاب کا ایسا نشہ تھا کہ ہر چیز میں ایک لطف اور کیف سا محسوس ہو رہا تھا۔

تفلس

صبح تقریباً دس بجے تفلس شہر پہنچے۔ باکو کے مہماندار کے رشتہ داروں کے ہاں گئے۔ تعارفی خط انہیں دکھا دیا۔ مالک مکان اس مہماندار کا سسر تھا۔ اس نے ہماری کافی عزت مدارات کی۔

تھوڑی ہی دیر میں ٹرام میں بیٹھ کر جواز حاصل کرنے بین الریاستی دفتر گئے۔ دوسرے دن جواز حاصل کر لیا۔

تفلس میں نیا نیا انقلاب آیا تھا۔ بغیر اجازت کے کوئی بھی ریاست گرجستان سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ تفلس قفقاز کا مرکز ہے۔ ایرانیوں کا کوہ قاف ہے۔ پریوں کا دیس ہے۔

قفقاز میں تین جمہوریتیں ہیں۔ ایک آذر بائیجان جس کا صدر مقام باکو ہے اور دوسری گورجستان جس کا

صدر مقام تفلس ہے۔ تیسری جمہوریت آرمنستان کی ہے جس کا صدر مقام اروان کہلاتا ہے لیکن قفقاز کا مرکز تفلس ہے یہ شہر اپنے مکینوں کی طرح خوبصورت ہے۔ ایک تنگ لیکن اونچے درّے میں واقع ہے۔ اطراف پہاڑوں کے دامن میں گھرے ہوتے ہیں۔ بازار میں کھڑا شخص بخوبی سارے تفلس کا نظارہ کر سکتا تھا۔

جس طرح ہم نے سنا تھا تفلس کے باشندوں کو اس سے زیادہ حسین پایا۔ منزلنی کے لوگوں کی باتیں صحیح تھیں۔ یورپ کا حسن ان کے آگے ہیچ تھا۔ گندمی رنگ جب سفیدی مائل ہو جائے۔ سیاہ آنکھیں جن کو پشتو کے ادیبوں نے بھرے ہوئے پستولوں سے تشبیہہ دی ہے اور لمبی کالی زلفیں جن کو سانپوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ اونچے قد سرو قدم ہم نے تفلس میں ہی دیکھے۔ ماسکو صحیح معنوں میں اس کی تعریفیں کر رہا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے باشندوں کا کوئی قصور نہیں جوان کو دیکھنے اتنی لمبی مسافتیں طے کرتے ہیں۔ ایرانیوں نے کچھ دیکھ کر ہی انہیں پریوں سے تشبیہہ دی ہے۔ ان کے مقابلے میں خود کو دیو کہلوایا ہے۔ تفلس کے حُسن کی تعریف لکھنے میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ صرف "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" ہی کہا جا سکتا ہے۔ صبح کا ناشتہ ہم نے ایک ہوٹل میں کیا۔ چائے دینے والی اتنی جادو اثر تھی کہ گو ہر رحمٰن جو ہم سب میں کم کھانے والا مشہور تھا نے ایک ٹرے پیٹریاں کھا لیں اور پھر لڑکی سے اور کی فرمائش کرتا رہا تاکہ خوراک کا عرصہ ذرا لمبا ہو جائے۔

"میاں صاحب کیا زندگی ہے۔ بس یہ خواب کل ختم ہو جائے گا اور ہم تفلس سے چل پڑیں گے کیا بغیر ہمارے انقلاب ہنداد ھورا رہ جائے گا"؟ گو ہر رحمٰن کہنے لگا۔ اس پر شاید کچھ زیادہ ہی اثر ہو گیا تھا۔

چھ مہینے قبل تک گورجستان میں مانشویکی جمہوریت تھی جو بحیرہ اسود کے کنارے باطوم تک پھیل چکی تھی۔ لیکن جب ایک سمت آذربائیجان تک اور دوسری سمت سے آرمنستان تک انقلاب بالشویکی آیا تو مانشویکوں کے پاؤں پھسل گئے۔ انقلاب برپا ہونے سے قبل ہی سفید پوش منشویک مال و دولت سمیٹ کر ملک کو خیرباد کہہ امریکی جہازوں میں چلے گئے۔ یوں بغیر خون بہائے انقلاب ہوا۔ سفید پوشوں کی موقعہ شناسی کی بدولت شہر صاف ستھرا سرخ پوشوں کے ہاتھ آیا۔ نئی اقتصادی پالیسی کے تحت تجارت بھی شروع ہو گئی اور چھوٹی دکانیں اور ہوٹلیں کھول گئیں۔

ا روان

تیسرے دن ہم دونوں ساتھی تفلس کے خوبصورت ریلوے سٹیشن پہنچے اور وہاں سے گاڑی میں بیٹھے دس گھنٹے میں ارمنستان کے صدر مقام ا روان پہنچے ۔ یہ گاڑی بھی "ڈیلی گینکی واگون" جیسی ہی تھی ۔تاہم شیشوں کی جگہ لکڑی کے تختے لگائے گئے تھے ۔ گاڑی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ۔ سانس لینا دوبھر ہو چکا تھا ۔ پڑھنے والا اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس میں کتنے لوگوں کو سمویا گیا تھا ۔ باہر برفانی ہوا اپنے پورے زور و شور سے چل رہی تھی لیکن رش کی وجہ سے اندر سانس لینا مشکل ہو گیا تھا ۔ کبھی کبھی جب باہر جھانکنے کا موقعہ ملتا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اتنی زیادہ برف میں گاڑی اپنے لئے راستہ کیسے نکال لیتی ہے ۔ ریل گاڑی کی پٹڑی کے دونوں اطراف میں جنگلہ بنا ہوا تھا جو برف کو تیز ہوا کی وجہ سے پٹڑی تک لانے میں رکاوٹ کام دے رہا تھا ۔ ویسے بھی پنڈلیوں تک برف ریل پٹڑی پر جمی ہوئی تھی اور اوپر سے اور پڑ رہی تھی ۔

رات گئے ا روان پہنچے ۔ ایک ترکی ہوٹل شب بسری کے لئے چنا گیا ۔ ہوٹل کا مالک بہت اچھا آدمی تھا ۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ مسافر ہیں ۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہماری طرف آیا اور ہمارے سامنے جلدی سے کھانا رکھا ۔ ایک بڑی خالی پلیٹ لے آیا اور ایک دیگچی معہ بڑے چمچ کے لا کر ہمارے آگے کر دیا ۔ پہلی دفعہ سوویت روس میں ہم چمچوں کے بغیر کھانے بیٹھے اور اپنے وطن کی طرح ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر کھانے شروع کئے ۔ پہلے پہل تو شرم کے مارے کھانا نہیں کھایا گیا لیکن مالک زود فہم تھا فوراً اس نے روٹی کے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر پلیٹ میں ڈالے اور اوپر سے شوربہ اور گوشت کی بوٹیاں ڈال دیں ۔ میں نے یہ جب دیکھا تو فوراً بسم اللہ پڑھ کر اس پر ٹوٹ پڑا ۔

"پشتون بھی اسی طرح کھاتے ہیں ۔ شاباش کھاؤ بھائی" میں نے گوہر کو اشارہ کیا ۔ لیکن گوہر کو شاید یہ طریقہ اچھا نہیں لگا کیونکہ اس نے انگلیوں کے سرے پر سے ایک ایک نوالہ اٹھا کر کھانا شروع کر دیا ۔ ہوٹل کے مالک نے ہاتھوں کے اشارے سے اور کچھ اپنی زبان میں میرے کھانے کے طریقے کو سراہا ۔

اگلی صبح شہر دیکھنے نکلے ۔ زیادہ وسیع نہیں تھا ۔ چوتھا حصہ تباہ و برباد ہو چکا تھا ۔ مشہور ترکی

جرنیل انور پاشا[۴۸] کے بھائی نوری پاشا نے انقلاب روس کے دوران ارض روم سے اس راستے باکو پر حملہ کیا تھا اور قبضہ بھی کر لیا تھا۔ راستے میں آنے والے شہر ریلوے سٹیشن وغیرہ جنگ کی وجہ سے برباد ہو چکے تھے۔ آرمنستان تباہ حال ہو چکا تھا۔ ایک اور وجہ اس تباہی و بربادی کی یہ بھی تھی کہ ترک اور آرمنی زمانہ قدیم سے ایک دوسرے کی مخالفت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اسی لئے ان لوگوں نے نوری پاشا کی مخالفت کی اور وطن تباہ و برباد ہو گیا۔

آرمنستان میں قحط

آرمنستان میں بدحالی تھی۔ لوگ بھوکے تھے جب بھی کسی کو موقعہ ملتا دوسرے کے ہاتھوں سے روٹی چھین لیتا تھا۔ گوہر نے ایک دکان سے روٹی خریدی۔ دکاندار نے خبردار بھی کیا لیکن وہ اپنی روٹی کو بچا نہیں سکا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے پہلے اس کو کوئی لے اڑا۔

ان دنوں سخت قحط تھا۔ امریکہ کی انجمن امداد قحط زدگان جن کا دفتر اروان میں تھا۔ پورے زور و شور سے امدادی کاموں میں مصروف تھی۔ آٹا تقسیم کرتے لیکن امداد کافی نہیں تھی۔ لوگ بھوکے تھے چہروں پر رونق بالکل نہیں تھی۔ گالوں کی سرخی پر زردی غالب تھی۔ ان لوگوں کی بدحالی دیکھ کر مجھے بہت ہی افسوس ہوا۔ میں نے روس میں بھی قحط دیکھا تھا لیکن وہاں حالات حکومت کے قابو میں تھے۔ قحط کی ایسی خوفناک شکل میں نے زندگی میں پہلی بار یہاں دیکھی۔

باکو میں ہم نے ڈالروں کو تبدیل کر کے لیرے (ترکی اشرفی) لئے تھے۔ اور پھر ان لیروں کی مدد سے بیس لاکھ مرکزی روبل لئے تھے۔ یہ مرکزی روبل سارے سوویت روس میں چل سکتے تھے تمام جمہوریتوں کی طرح آرمنستان بھی اپنی کرنسی چلا رہا تھا۔ ایک مرکزی روبل بیس آرمنی روبلوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگ بے حد دولت مند تھے۔ ویسے تو ہم دونوں کے پاس کل ملا کر چار پانچ سو ڈالر ہی تھے لیکن جب ترکی لیروں میں کرنسی بدلی تو پھر ہماری حالت اچھی ہو گئی۔ جب وہ ترکی لیرے مرکزی روبل میں تبدیل کئے تو ہمیں بے حد فائدہ پہنچا۔ آرمنستان کی تو بات ہی کیا۔ جہاں ہمیں ایک لاکھ مرکزی روبلوں

کے بدلے بیس لاکھ آرمنی روبل دیے گئے۔

ادھر ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ڈالروں کے بدلے ترکی اشرفی اور ترکی اشرفیوں کے بدلے مرکزی روبل ہم نے باکو کے چور بازار میں خریدے تھے۔ ترکی اشرفیاں تو ہم نے برجس میں سی لی تھیں جبکہ سوویت کاغذی روبل ہم نے روزمرہ کے خرچے کے لئے جیبوں میں رکھ لئے تھے۔

انقلابی ریل گاڑی

ہمارے پاس نقبشند تک کے لئے گاڑی کا ٹکٹ تھا۔ کسی وجہ سے اروان میں سے گاڑی ہمیں اگلے دن کی دوپہر تک کے لئے تاخیر ہوگئی۔ ہمیں اروان کی سیر کا خوب موقعہ ملا۔

دوپہر ڈھلے ہم روانہ ہوئے۔ سخت سردی تھی۔ برف پڑ رہی تھی۔ ہماری گاڑی میں اتنے لوگ داخل ہوئے کہ کھڑے ہوئے آدمی کے لئے بیٹھنا ناممکن ہوگیا اور بیٹھے ہوئے کے لئے کھڑا ہونا ناممکن ہوگیا۔ ہمیں باکو کی بغیر شیشوں والی گاڑی کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔

راستے میں ہم سے کسی نے پوچھا کون ہو۔ ہمارا جواب تیار تھا کہ ہم امریکہ کے "انجمن امداد قحط زدگان" کے اراکین ہیں۔ قریب بیٹھا ہوا ایک نوجوان فوراً بول پڑا کہ یہ امریکی نہیں بلکہ کسی انگریزی مقبوضات کے باشندے ہیں۔ یہ بات ہمیں بری لگی۔ کیوں کہ جس بات کو ہم پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے وہ اس نے ظاہر کر دی۔

تمام رات گاڑی سست رفتاری سے چلتی رہی۔ کسی کسی سٹیشن پر تو گھنٹوں کھڑی رہتی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انقلاب کے بعد اس راستے یہ پہلی گاڑی چل رہی تھی۔ اور آہستہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ انجن اس کا بہت پرانا ہو چکا تھا چھوٹا بھی تھا۔ کبھی کبھی ایسے سٹیشن آتے جن کا اور سٹیشنوں کے ساتھ تار کا رابطہ منقطع ہوتا۔ بعض اوقات بیابانوں میں گاڑی رکنے کا اشارہ ہوتا۔ گاڑی رک جاتی۔ مزدور جو گاڑی میں ہی سفر کر رہے تھے اتر پڑتے راستہ صاف کرتے اور گاڑی پھر روانہ ہو جاتی۔

انجن کے ڈرائیور کو رشوت

دوسرے دن ہماری گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی۔ ہم نیچے اتر کر سٹیشن سے باہر واقع ایک کچی دکان پر گئے اور وہاں ناشتہ کیا۔ سٹیشن کی عظیم الشان انتظار گاہ (جو شاید ایک وقت میں ہو) اور باقی عمارتیں مسمار تھیں۔ پوچھنے پر وہی پرانا جواب ملا۔

سہ پہر گئے گاڑی میں جنبش پیدا ہوئی۔ ہم اوپر چڑھ گئے۔ آدھی گاڑی جس میں ہمارا ڈبہ بھی شامل تھا کھڑا رہا اور باقی ڈبے جُدا ہو کر انجن کے ساتھ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ سٹیشن میں ایک ہلچل پیدا ہوئی۔ رُکے ہوئے ڈبوں سے لوگوں نے چلتے ہوئے ڈبوں میں یلغار کر دی۔ ہم بھی اپنی بساط کے مطابق دوڑے لیکن اوپر چڑھنے میں ناکام رہے۔ مایوس اور حیران اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔

ہمارا سفر طویل تھا۔ ایک دن چھوڑ کر اگلے دن والی گاڑی میں بیٹھ جاتے لیکن ایک تو سٹیشن پر ویسے بھی کوئی جگہ نہیں تھی اور پھر اتنے زیادہ لوگوں میں ہمارا کیا حشر ہوتا۔ ہم ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ انجن کے ساتھ چند آدمیوں کو کھڑا پایا جو ڈرائیور کے ساتھ باتیں کر رہے تھے ہم بھی وہاں پہنچے۔ گوہر نے پلک جھپکتے میں جیب سے دو لاکھ مرکزی روبل نکالے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے اجازت لی۔ جیب ہاتھ میں دو لاکھ مرکزی روبل دیکھے تو انجن کے ڈرائیور کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی ہی رہ گئیں۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا

"پژالستا تواریشی" (دوستو! مہربانی فرمائیں)۔

ہاتھ کے اشارے سے اس نے ہمیں اوپر چڑھنے کو کہا۔ پھر ہمیں بہت عزت و احترام کے ساتھ آگ کے قریب جگہ دی تاکہ ہمیں سردی نہ لگنے پائے۔ ڈرائیور کے ہاتھ چالیس لاکھ آرمنی روبل (دو لاکھ مرکزی روبل چالیس لاکھ آرمنی روبل کے برابر ہوتے تھے) آئے وہ تو خوشی سے اپنے جامے میں نہیں سما رہا تھا۔

گاڑی روانہ ہوئی۔ اندازاً ایک گھنٹہ چلی ہوگی کہ بدقسمتی سے آگ بجھ گئی۔ یہ گاڑی تیل کے ذریعے چلتی تھی۔ اب تیل کو آگ لگانے کے لئے ایک پرانے کپڑے کی ضرورت تھی۔ ڈرائیور نے پاس سوئے

دوسرے ساتھی سے کپڑا مانگا۔ اس کی جب آنکھ کھلی اور ہم پر نظر پڑی تو غصہ سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا
"تم لوگ یہاں کیسے آئے ہو۔ جلدی بھاگو ورنہ نیچے گراتا ہوں"۔
ہمارے دوست نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا:
"فکر نہ کرو تمہارا حصہ بھی موجود ہے"
تب ہی کہیں جاکر اس کی حرص کی آگ ٹھنڈی ہوئی۔ اتنی دیر تک گاڑی بھی ہوئی آگ کے ساتھ ہی چلتی رہی۔ یہ سن کر اس نے تسلی کے ساتھ ایک پرانا کپڑا نکال کر اسے تیل میں بھگویا پھر جلی ہوئی تیلی سے اس کو آگ لگائی اور انجن میں پھینک دیا جس سے آگ دوبارہ روشن ہوئی۔

نقشبند اور جلاوطن ایرانی انقلابی کمیٹی

اگلے دن رات گئے ہم نقشبند پہنچے۔ رات ایک ہوٹل میں بسر کی۔ ہم ہمراہ ایرانی جلاوطن انقلابی کمیٹی کے نام ایک خط لائے تھے تاکہ وہ ایران کو عبور کرنے میں ہماری مدد کریں۔
کمیٹی کے صدر اور ناظم کے ساتھ ہماری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے جب خط پڑھا تو بتانے لگے کہ ان دنوں آذربائیجان کے راستے سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ قبائل آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایران کی مرکزی حکومت کمزور ہے امن قائم کرنے میں ناکام رہی ہے ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔
اگرچہ ہم نے صدر اور ناظم کو ہر چند سمجھایا کہ ہمیں خطرات کی پرواہ نہیں اور ویسے بھی ہمارے لئے کوئی دوسری راہ نہیں رہی۔ کوئی ملک ہمیں راستہ دینے پر راضی نہیں لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔
ناظم محمد رضا نے اپنا سینہ تھپتھپاتے ہوئے کہا
"میں تم لوگوں کو طہران کے راستے بغیر پاسپورٹ کے لے جاؤں گا۔ طہران سے سیدھا کوئٹہ بلوچستان پہنچاؤں گا۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔"
ہم نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر باکو میں ذمہ دار افراد نے اس کا ایران سے ہمارے ساتھ گذرنا پسند نہیں کیا تو ہم اس کی واپسی کے خرچ کے ذمہ دار ہونگے۔

واپس باکو

ہماری خوش قسمتی سے ضلع نقشبند کا سوویت حاکم باکو جا رہا تھا۔ کمیٹی کے ناظم نے اس کو ہمارا احوال سُنایا۔ وہ خوشی سے ہمیں اپنے ڈبے میں جگہ دینے پر راضی ہوا۔

واپسی کے سفر میں بھی انقلاب کا اثر نمایاں تھا۔ مسافروں کی گاڑی کے ساتھ مال گاڑی کا ایک ڈبہ باندھا گیا اس میں ہم نے بستر بچھائے۔ چھ مسافر تھے۔ دو ایرانی دو ہم اور حاکم صاحب معہ اپنی بیگم کے۔

مجھے اپنا چار جوئے سے بخارا تک کا پہلا سفر یاد آیا۔ وہ دن بخارا میں انقلاب کے ابتدائی ایام تھے اور یہ دن قفقاز کے انقلاب کے اولین ایام ہیں۔ مال گاڑی میں سفر کرنے سے آدمی کو یہی احساس ہوتا ہے جیسے وہ عملی طور سے انقلاب میں حصہ لے رہا ہو۔ ہمارا سفر بھی کچھ عجیب و غریب تھا۔ کبھی تو بہت آن بان کے ساتھ اونچے درجے میں سفر کرتے اور کبھی مال گاڑی میں بھی جگہ مل جاتی تو غنیمت سمجھتے۔ اس گاڑی کی شان و شوکت سفیروں کے گاڑی سے ہرگز کم نہیں تھی۔ ہم چھ مسافروں کے لئے پورا ڈبہ مخصوص کر لیا گیا تھا۔ ہم نے بستر بچھائے۔ بڑے بڑے اسٹیشنوں پر ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہ سب عزت حاکم صاحب کی وجہ سے تھی لیکن محمد رضا ایسے اکڑ کر چلتا جیسے یہ سب اس کو دی جا رہی ہے۔

شراب کا نشہ اور انقلاب ایران زندہ باد

آرمنستان انگوروں کی شراب کے لیئے مشہور ہے یہ شراب جو کے شراب سے بھی سستی پڑتی تھی۔ محمد رضا اور محمد وافر نے ہم دونوں سے صدر صاحب اور ناظم کی غیر موجودگی میں کچھ رقم کا مطالبہ کیا۔ حاکم کے سامنے خرچ مانگنا ان کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہم نے بھی علی الحساب ایک بھاری رقم ان کو پیش کی۔ ہم یہی سوچ رہے تھے کہ یہ لوگ مناسب رقم لے کر باقی ہمیں لوٹا دیں گے۔ لیکن محمد رضا نے ساری رقم جیب میں ڈال دی۔ ہم یہ سوچ کر خاموش رہے کہ مسافروں کا مال جان کر بے جا رقم ضائع نہیں کریں گے۔

پیسے لینے کے فوراً بعد محمد رضا ایک سٹیشن پر گاڑی سے اترا۔ وہ شراب کی ایک بڑی کیتلی اور چار بوتل لے آیا۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ ان کو ناکافی جان کر اور چار بھری بوتلیں لے آیا۔ ہماری حیرت

دیکھ کر محمد رضا میرے پاس آیا اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا

"یہاں شراب سستی ہے۔ ان باتوں کا مجھے تجربہ ہے۔ اسی لئے تو سارے راستے کی فکر کر رہا ہوں۔"

ہم سمجھ گئے کہ انگور کی یہ سرخ شراب ہمارے خون کی بنی ہوئی ہے۔ لیکن کچھ کہہ نہیں سکتے تھے اور نہ کچھ کہنا مناسب تھا۔

ہمیں حیرت یہ بھی تھی کہ تمام سوویت میں آرمنستان میں کیسے شراب آزادی سے سرعام بک رہی ہے لیکن اس بات کو سوچنے کی ہمت نہیں پڑی۔ کیوں کہ اپنے پیسوں کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمارا راستہ طویل ہے۔ اگر محمد رضا کا کوئٹہ اور بلوچستان تک خرچے کا یہی حال رہا تو پھر ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔ میں اور میرے ساتھی کا ان ایرانیوں سے دل برگشتہ ہونا لازمی چیز تھی۔

شراب نوشی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ پیالیاں بھری گئیں۔ ہمیں بھی پیش کش کی گئی لیکن ہم نے نہ پینے کی معافی مانگی ہمارے انکار کی جیسے انہیں کوئی پرواہ ہی نہیں۔ پیالیاں ہاتھوں میں اٹھائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرادیں۔

ایرانی کمیٹی کے ناظم کا تو کام بس صرف پینا ہی تھا جبکہ صدر محمد دافر اپنی پیالی حاکم کی پیالی کے ساتھ لگا کر آواز لگاتا

"انقلاب ایران زندہ باد"

حاکم جواب دیتا:

"انقلاب روس زندہ باد"

دونوں ساتھی ایک ہی سانس میں سارا پیالہ پی جاتے۔ ناظم محمد رضا اپنا یہ فرض سمجھے ہوئے تھا کہ پیالی خالی نہ رہ جائے۔ پلک جھپکتے ہی بھر دیتا۔ اور پھر ایران اور روس کے انقلاب زندہ باد کی آوازیں آتیں۔ گاڑی چل رہی ہے۔ باہر برف گر رہی ہے۔ اندر شراب کی بوتلیں خالی ہو رہی ہیں۔ انقلاب زندہ باد سے آہستہ آہستہ اور موضوعات زیر بحث آتے گئے۔ کوئی بات تو جلد ختم ہو جاتی اور کوئی کوئی طویل ہو جاتی۔ حتی کہ باتوں میں ربط نہیں رہا۔ ناظم صاحب محمد رضا ایک خرانٹ شرابی تھا۔ باتیں کم کر رہا تھا اور

پیالیاں زیادہ خالی کر رہا تھا۔ لیکن صدر صاحب محمد وافر اور حاکم صاحب کی باتیں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو بات کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ محمد وافر نے قے کر دی۔ لیکن پھر بھی دور چلتا رہا۔ باتوں ہی باتوں میں حاکم نے اپنے سسر کی گفتگو چھیڑ دی۔ اس کو یہ گلہ تھا کہ اس کی بیوی کی قدر نہیں کی گئی۔ ایرانی صدر محمد وافر تمام سوویت یونین کے صدر لینن سے سخت ناراض تھا کہ اس نے گیلان کا انقلاب واپس کیوں لیا۔ اور شاہ ایران کے ساتھ کیوں سمجھوتہ کیا۔ دونوں نے اتنی بکواس کی کہ حاکم کی بیوی جواب تک خاموش لیٹی ہوئی تھی آپے سے باہر ہو گئی۔ اور تینوں شرابیوں کو ملامت کرنے لگی:

"تم لوگ اپنے آپ کو انقلابی کہتے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ تم نے تو ذلیل سے ذلیل شرابیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔"

اس نے شوہر کو خوب کوسا کہ:

"اگر تم پھر ان بدمعاش ایرانیوں کی محفل میں بیٹھے تو تمہارے ساتھ سمجھ لوں گی۔"

نہ تو حاکم اور نہ ہی ایرانیوں میں جواب دینے کی ہمت تھی۔ چپکے بیٹھے رہے۔ ان میں سے کسی کی آواز بالکل نہیں نکل رہی تھی۔

پھر تفلس

واپسی والی گاڑی پہلے والی سے بہت تیز رفتار تھی۔ بغیر کسی خاص واقعے کے ہم تفلس پہنچ گئے۔ یہاں بھی ایرانیوں نے ہماری ناتجربہ کاری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ محمد رضا ہم سے رقم اینٹھتا رہا اور بالکل اسے یہ خیال تک بھی نہیں آیا کہ غریب الدیار مسافروں کو کیوں لوٹتا ہے۔ تفلس میں ہم نے صرف ایک دن گذارا، چار آدمیوں کے صرف کھانے کا خرچہ دو ترکی لیرے تھا۔ بھنے ہوئے مرغ ہمارے حلق سے نہیں اتر رہے تھے اور محمد رضا اس حالت میں بھی کہتا:

"معاف بکنید۔ مایک شراب مے خوریم"

اور یہ کہکر دو تین بوتلیں پی لیتا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ایرانی بالکل ہی پچے ہیں۔ بالکل تہی دست ہیں بس

تاک میں تھے کہ کب کوئی آکر ان کے آگے پھنسے۔ ہماری دولت بڑی بے دردی سے لٹا رہے تھے۔

پھر باکو

اگر محمد رضا کے ساتھ ہم ایران کے راستے روانہ ہونے کا پروگرام بناتے تو مجھے پورا یقین تھا کہ ہم ایک شہر سے دوسرے شہر نہ پہنچ پاتے۔ ہم ان سے بالکل اکتا چکے تھے۔ حاکم تو تفلس میں رہ گیا تھا لیکن ہم انہیں جواب نہیں دے سکتے تھے یہی وجہ تھی کہ باکو تک ہم چاروں ساتھ گئے

ایرانیوں کو ہم نے بتایا کہ باکو میں ہماری جگہ ہے لیکن ان کو یہ پسند نہیں آیا اور ہمیں ایک ہوٹل لے گئے باکو میں ہمت کر کے ہم نے خرچہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ سادہ کھانا کھایا۔ رات گذاری۔ صبح ہوٹل کا بل ادا کر دیا اور گوہر ایک اشرفی بدلانے چور بازار گئے۔ میں نے نوٹ اپنی باہر والی جیب میں ڈالے۔ ہوٹل واپس آئے۔ بل ادا کرنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو خالی پایا۔ کوئی میری جیب سے تمام رقم لے اڑا تھا۔ میں نے گوہر کی طرف دیکھا اور مسکرا پڑا۔ ہوٹل والا یکدم بول اٹھا۔

"کسی نے جیب کاٹی ہے ؟"

اس واقعے کے بعد جلد از جلد ہم پرانی جگہ پر آ گئے۔ میزبان ہمیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ ہم نے تمام قصہ بیان کیا۔ ابھی ایرانیوں کی فضول خرچی کا ذکر باقی تھا کہ وہ فوراً بول اٹھا کہ "یہ ایرانی بدمعاش ہیں۔ آپ کی کوئی چیز تو نہیں چرائی"۔ ہم نے ان کی فضول خرچی اور شراب نوشی کی تمام داستان سنا ڈالی۔ وہ بہت ناراض ہوا۔ اور ساتھ ہی اسے افسوس بھی ہوا۔ اس نے فوراً ایرانیوں کے پاس اپنا آدمی بھیجا (جو بیچ سڑک پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے) کہ فوراً بھاگو ورنہ پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔

مجید اور اس کے ساتھی بھی واپس آ گئے

دو دن بعد مجید، فیروز اور سلطان بھی واپس آ گئے۔ ہم حیران ہوئے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے۔ مجید بولا:

"میں نے فیروز کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پیسے نیچے جیب میں رکھا کرے۔ لیکن یہ پیسے سوٹ کیس میں رکھتا۔ عشق آباد میں جہاں ہم لوگوں نے پڑاؤ کیا تھا ایک نوکر ہر وقت دیکھتا کہ پیسے سارے سوٹ کیس میں پڑے ہوئے ہیں۔ موقع پاکر وہ رقم نکال کر لے گیا۔ ہم نے اس پر دعویٰ کیا۔ اس کی تلاشی ہوئی لیکن ہمارے ہاتھ کچھ نہ آیا کیونکہ وہ ہوشیار ہوگیا تھا۔"

"کیا آپ کی ساری رقم گئی"، میں نے دریافت کیا۔

"نہیں یار صرف فیروز کے پاس جو رقم خرچے کے لئے رکھوائی تھی وہ گئی"۔ مجید نے جواب دیا۔

"وہ تو معمولی رقم ہوگی پھر" میں نے پھر کہا۔

سلطان درمیان میں چلاتا ہوا کود پڑا، "یہ تمام غلطی مجید ہی کی ہے۔ میں نے تو اپنا حصہ الگ کرکے اپنی شلوار کے نیفے میں سی لیا ہے۔ مجید کو میں کہتا رہا کہ فیروز لڑکا ہے اس کے پاس زیادہ رقم مت چھوڑو۔ خرچ کے لئے بھی کوئی اتنی رقم باہر چھوڑتا ہے۔"

"آخر گئی بھی کتنی رقم ہے۔ آپ لوگ بہت افسردہ دکھائی دے رہے ہیں۔" میں نے ان سے بار بار دریافت کیا۔

"کتنی رقم گئی بس ہم ختم ہی ہو گئے۔ آگے قدم اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ تینوں کا خرچہ پورا نہیں ہوتا تھا اور ایک آدمی کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔" مجید مایوس لہجے میں بولا۔

"یار وعجب انصاف ہے کہ اتنا بھی نہیں بتلاتے کہ کتنی رقم سوٹ کیس سے نکالی گئی ہے"، میں نے غصے میں پوچھا۔

مجید کو اب ذرا ہوش آیا۔ فوراً اس نے بتادیا کہ ایک آدمی کا حصہ چرا لیا گیا ہے۔

میرا یہ مطلب تھا کہ اگر رقم تھوڑی ہو تو باقی سب ساتھی اپنے اپنے حصے سے کچھ رقم نکال کر پانچویں دوست کے لئے خرچے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ لیکن میزبان نے یہ پسند نہیں کیا۔ اس نے ہمیں تسلی دی کہ رقم کا انتظام ہو جائے گا آپ لوگ فکر نہ کریں۔

مجید نے جب ہماری ایرانی کمیٹی والی داستان سنی تو ہنس پڑا اور اس کو پھر تسلی ہوئی۔ یہ تو انسانی

فطرت ہے کہ جب ایک انسان کو نقصان پہنچتا ہے اور اس وقت اس کو پتہ چلتا ہے کہ اور کسی کو بھی اسی طرح نقصان پہنچ گیا تو پھر اس کا غم کم ہو جاتا ہے۔ ہم پانچوں ساتھی دل بہلانے کے لئے باکو کے ایک اعلیٰ اوپیرا گئے۔ روسی میں یوسف اور زلیخا کی داستان محبت بیان ہو رہی تھی۔ کھیل ختم ہونے کے بعد مجید بے اختیار بول اٹھا:

"مجھے تو کھیل سے زیادہ کھیل کا وقفہ پسند تھا۔ جب روشنی ہوتی تو اپنے گرداگرد پریاں نظر آتیں پھر جب اندھیرا چھا جاتا تو کوئی نظر نہیں آتا۔"

"اچھا اگر تمہیں پسند ہو تو تمہیں ان پریوں کے پاس ہی چھوڑ دیں۔"

گوہر نے مذاقاً پوچھا۔ اسی طرح ہنسی مذاق کرتے اپنے دل بہلاتے رہے۔

سلیمان ذکریا

باکو میں ہمارے دن پورے ہونے کو تھے کہ سلیمان ذکریا ماسکو سے آ گئے۔ ذکریا ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے شروع ہونے پر اور طالب علموں کے ہمراہ لاہور میڈیکل کالج سے افغانستان گیا تھا۔ یہ انقلابی یورپ اور ایشیا میں جگہ جگہ وطن عزیز کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے مصروف عمل تھے۔ ذکریا مخلص انقلابی تھا۔ اور رائے کا معتمد تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ رائے سخت ناراض ہے اور کہتا ہے کہ ان لوگوں میں اتنی بھی جرأت نہیں کہ ان کو ایران اور افغانستان جیسے ملکوں نے روک رکھا ہے۔

"آپ لوگ ہمیں صرف اجازت دیں کہ ہم آپ کے حکم کا انتظار نہ کریں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی ایسی کونسی طاقت ہے جو ہمارے آگے ٹھہرتی ہے"، ہم نے جواب دیا۔

دو تین دن کے اندر ذکریا نے میرے اور گوہر رحمن کے لئے پاسپورٹوں کا انتظام کیا۔ ہمیں اس نے انزلی، طہران کے راستہ وطن رخصت کیا۔ فیروز کو واپس ماسکو ساتھ لے گیا۔ مجید اور سلطان مزید احکامات کے لئے باکو میں ٹھہرے رہے۔

ایک سال بعد ہم سب ساتھیوں کی پہلی ملاقات پشاور جیل میں ہوئی۔ مجید، فیروز اور سدا ۱۱۱ ۸ھ ساتھیوں کے پامیر کے راستے چترال آئے اور وہاں گرفتار کئے گئے۔ وہاں سے پھر مقدمہ چلانے کے لئے انہیں پشاور جیل لایا گیا۔

ایران

۵۰ بندر انزلی

"ریوچی" کی رفتار کم ہوگئی۔ کوئی چلایا "انزلی، انزلی" ہم دونوں اٹھ بیٹھے۔ عرشے پر کھڑے ہوگئے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب چیزیں رہ گئیں تھیں۔

"تم تو افسردہ ہوگئے ہو۔ کیا وجہ ہے" گوہر رحمٰن نے دریافت کیا۔

"مجھے کسی کی یاد آگئی" میں نے جواب دیا۔

"کس کی"

"تم اس کو نہیں جانتے۔ جو اس کے جاننے والے تھے وہ تو باکو میں ہی رہ گئے۔ ان کے ساتھ اس کی باتیں کر کے دل کو تسلی ہوتی تھی" میں نے جواب دیا۔

میں نے جیب سے تصویر نکال کر اسے گھور گھور کر دیکھا۔ گوہر نے میرے ہاتھ سے تصویر لے کر اسے غور سے دیکھا

"اسے تو میں نے دیکھا ہے۔ کیا یہ یونیورسٹی میں نہیں پڑھتی تھی۔" میں خاموش ہی رہا۔

گوہر یونیورسٹی میں چند دن گذارنے کے بعد خرابی صحت کی بنا پر نسبتاً گرم جگہ بخارا لے جایا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے میری اور اسایان کی محبت کے بارے میں علم نہیں تھا۔

جہاز آہستہ آہستہ بندرگاہ کے قریب ہوتا ہوا لکڑی کے چبوترے کے ساتھ ٹھہر گیا۔

"آج کیا تاریخ ہے؟ مجھے یہ یاد رکھنا ہے" گوہر نے پوچھا۔

"آج ۲ مارچ ۱۹۲۲ء ہے" میں نے اسے بتا دیا۔

میں اور رفیق گوہر دونوں انزلی کی سفید عمارتوں کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"اینہ ہمہ دو" دو سپاہی یہ کہتے ہوئے ہماری طرف بڑھے دونوں نے سفید قراقلی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔

"بیاکہ بر ویم" دونوں ہمیں بندرگاہ کے قریب واقع ایک مہمانخانے لے گئے۔ ہمیں وہاں بٹھا دیا گیا۔ ہم نے ان سے اپنے روکنے کا سبب پوچھا۔ جواب ملا۔

"حاکم بندر آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

ہم سمجھ گئے کہ ہمارے آنے کی خبر ہم سے پہلے پہنچ گئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بیٹھے تھے۔ کہ افسر نمودار ہوا۔ سبز قراقلی سر پر رکھے چھوٹا سا کوٹ معہ برجس اور پاؤں میں لمبے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ پہنچتے ہی گوہر رحمٰن کو مخاطب کر کے کہنے لگا

"تم تو ہندی ہو۔ لیکن یہ روسی کہاں جا رہا ہے۔"

گوہر عادت کے مطابق مسکرایا اور کہنے لگا:

"میں ہندی نہیں ہوں۔ بلکہ میں افغان ہوں۔"

اس نے دوسری کوئی بات نہیں کی مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا:

"تم اسے ساتھ لے کر آئے ہو اور پھر وطن واپس جاؤ گے۔"

میں جواب دینے کی تیاری ابھی کر ہی رہا تھا کہ اس نے پاسپورٹ طلب کیے۔ خوب اچھی طرح سے ان کا معائنہ کیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر بولا:

"خوب بہ ہر جائے کہ مے خواہید بروید بہ ماچہ"

میں نے اسے کہا:

"دیکھو! ہمارے پاسپورٹ آپ نے دیکھ لئے۔ ہم دونوں افغان ہیں۔ طہران کے راستے کابل جا رہے ہیں۔"

حاکم معہ سپاہیوں کے لوٹ گیا۔ ہمیں چھوڑ دیا گیا۔ ہم دونوں کو فکر ہوئی کہ اب کیا کریں۔ گوہر میری

ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا

"دیکھا تم نے۔"

"کیا" میں نے دریافت کیا۔

"بیگم تمباکوف اپنے بچوں کے ہمراہ سمندر کے کنارے بیٹھی ہوئی ہے۔"

گوہر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ہم بیگم تمباکوف کی طرف گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ فوراً اٹھی ہمارے ساتھ مصافحہ کیا۔ بیٹے اور بیٹیاں بھی بہت خوش ہوئے۔ سب باری باری گلے ملے۔

بیگم تمباکوف نے اپنے اوپر بیتی ہوئی تمام سختیاں بیان کیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا:

"تمباکوف طہران کے سفارت خانے میں ہے۔ اس نے ہمیں بلوایا ہے۔ لیکن مجھے اس پر حیرت ہے نہ تو خود آیا ہے اور نہ ہی کسی کو بھیجا ہے۔ ہمیں بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔"

ہم دونوں نے اپنی خدمات ان کو پیش کیں اور کہا:

"ہمارے ہوتے ہوئے اور کسی کی کیا ضرورت ہے۔ ہم آپ کے لئے سب انتظامات کر سکتے ہیں۔"

بیگم نے ایک بار پھر ہمارا شکریہ ادا کیا۔

ہم بیگم کو معہ اس کے بچوں کے پیرس ہوٹل (HOTEL DE PARIS) لے گئے اور جب ان کو آرام بہم پہنچایا تو پھر وہاں سے رخصت ہوئے۔ اس نے کہا کہ میں آگے قدم تب ہی اٹھاؤں گی جب تمباکوف ہمیں لینے موٹر بھیجے۔ ہم نے انہیں تسلی دی کہ طہران پہنچنے پر ہم تمباکوف سے ضرور ملیں گے اور آپ کے متعلق تفصیلاً ان کو بتا دیں گے۔

انزلی شہر بندرگاہ سے کافی فاصلے پر ہے۔ ہم کشتی میں سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچتے ہی دوپہر کا کھانا کھانے ایک ہوٹل گئے۔ اندر جا کر ایک میز پر بیٹھے۔ ایک بیرہ آیا اور ہم سے پوچھنے لگا:

"آغا چہ مے خواہید۔ پلاؤ یا چلاؤ ؟" زندگی بھر ہم نے یہ آخری نام نہیں سنا تھا اس لئے حکم دیا "چلاؤ"

بیرہ خشک سادہ بغیر گھی والے چاول لے آیا۔ ساتھ میں مکھن بھی تھا۔ گوشت کی بوٹیاں ہمراہ تھیں۔ میز مغربی طرز کا سجا ہوا تھا۔ چھری کانٹے بھی ساتھ ہی لے آیا۔ خوراک مشرقی تھی لیکن طرز اور صفائی مغربی۔ سمندر کا کنارہ تھا اس لئے خوب لطف اندوز ہوئے۔

سارا دن شہر میں گھومتے رہے۔ شہر چھوٹا تھا۔ سوائے ہوٹلوں کے اور کوئی اچھی عمارت نہیں تھی۔ ایک جگہ حسنؑ حسینؑ کی یاد تازہ کی جا رہی تھی۔ ہم بھی جا کر دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں۔ پردہ تو کر رہی تھیں۔ برقعے نہیں اوڑھے ہوئے تھیں۔ کالی چادروں سے بدن چھپایا ہوا تھا اور چہروں کے آگے جالی آویزاں تھی۔ ایک آدھی جو زیادہ خوبصورت اور حسین تھی اس نے اپنے چہرے کی جالی استری کی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ اس سے صاف نظر آتا تھا لیکن اکثریت ان میں پردے والوں کی تھی۔

ایرانی پولیس اور فوج کے لباس میں صرف ٹوپی کا فرق تھا۔ پولیس کی ٹوپی سفید قراقلی کی بنی ہوئی تھی جبکہ فوجیوں کی کالی ہوتی تھی۔

سوویت اور ایران کے درمیان زیادہ تر تجارت اسی راستے ہوتی تھی۔ اسی لئے انزلی کا مستقبل تابناک دکھائی دے رہا تھا۔

جواز

ہمیں پتہ چلا باہر سے آنے والوں کے لئے انزلی سے باہر جانے کے لئے اجازت نامے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک فٹن والا ہمارے ہمراہ جواز کے دفتر تک گیا۔ اس نے ہمیں بتا دیا تھا کہ جواز کے حاصل کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن ہمیں سخت فکر تھی اور دل میں ویسے بھی شک تھا کہ حاکم بندر کی اس بات کا کہ "بہ ہر جائے کہ مے خواہید بروید بما چہ؟" کے کیا

معنی ہو سکتے تھے۔ میں نے اور گوہر نے اس مسئلہ پر خوب سوچا پھر بھی ڈر لگا ہوا تھا۔ ہمارا پاسپورٹ صحیح تھا لیکن طہران تک کا تھا۔ اسی لئے حاکم نے ہمیں نہیں پکڑا اس وقت تو چھوڑ دیا شاید اب طہران سے آگے جاکر پکڑ لے۔ فٹن والا ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا "ہر روز مسافروں کا میں ضامن بنتا ہوں اور انہیں جواز دلواتا ہوں۔"

"اور یہ رہا دفتر" فٹن والا زور سے چلایا۔ ہم صدر دروازے سے داخل ہوئے۔ چپڑاسی نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ اجازت دے دی گئی۔ آگے پھر ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی نگاہ حاکم پر پڑی۔

"بخیر آمدید" بات کرنے میں اس نے پہل کی "میرا تو خیال تھا کہ تم لوگ بغیر جواز کے نکل جاؤ گے"۔ وہ ہنستا ہوا بولا۔

میں نے بھی دروازے میں قدم رکھتے ہی "السلام علیکم" کہا۔ حاکم کا "بخیر آمدید" اور میرا سلام دونوں بیک وقت ہی منہ سے نکلے۔ میں اور میرے ساتھی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا پڑے۔ کیونکہ پھر اس کے ہاتھوں میں پڑ گئے۔

حاکم بندر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آگے ایک میز پڑی ہوئی تھی۔ ہم دائیں طرف کی کرسیوں میں بیٹھ گئے۔ ہم سے پہلے چار اور مسافر بھی بیٹھے ہوئے تھے جو ایرانی لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کوئی معزز آدمی لگ رہا تھا۔ فر کا بڑا سا کوٹ پہنے ہوئے فر ہی کی قیمتی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ حاکم گفتگو کے وقت اس کو "آغائے کلان تجار" کے نام سے پکارتا تھا۔ باتوں سے وہ ایک چالاک آدمی لگتا تھا۔

حاکم نے ہم سے ہمارے پاسپورٹ لے لئے اور اس کے آگے رکھ دیے۔ اس نے اپنا بڑا سا سر ہلایا اور منہ سے چند الفاظ نکالے

"آغا غنہ از قوم دلیر اند۔ ہیچ چیز در راہ شان مانع تواں نمے شود۔" "کیا کہتا ہے؟" گوہر نے پوچھا۔

"بکواس کرتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"آپ کا کوئی ضامن ہے"۔ حاکم نے ہم سے پوچھا۔

"ہاں صاحب"۔ اس کے ساتھ ہی میں فوراً باہر نکلا اور فٹن والے کو ساتھ اندر لایا۔

"تو کے بی" حاکم اس پر چلایا۔

"درشکہ دان" فٹن والے نے جواب دیا۔

"برو ترا کے آوردہ"۔ حاکم نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا اور غصّے سے ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ "باید آدم معتبر بیارید"

"صاحب! ہم تو مسافر ہیں۔ اب معتبر آدمی کہاں سے لائیں؟"

آغائے کلان تجار سے ہم بہت خوفزدہ تھے۔ میرا تو خیال تھا کہ یہ ضرور ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا لیکن ہمارے برعکس اس کے اس نے حاکمانہ انداز میں ہماری سفارش شروع کی

"یہ مسافر ہیں۔ غریب الدیار ہیں۔ اب معتبر ضامن کہاں سے پیدا کریں؟" حاکم مان گیا۔ جواز ہمیں مل گیا۔ ہم دفتر سے نکلے اور اڈے کی طرف نکلے وہاں جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ آغائے کلان تجار بھی اڈے میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔

ہم نے انہیں پیش کش کی کہ ہما را فٹن ان کی خدمت میں حاضر ہے لیکن اس نے ہماری درخواست نامنظور کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایک کمزور آدمی ہوں۔ بغیر افتو موبیل (موٹر کار) کے نہیں جاسکتا"

گیلان

رشت ۵۱ :

دوپہر ڈھلے رشت کے ارادے سے فٹن میں بیٹھے۔ تقریباً دس میل کا فاصلہ تھا۔

سڑک پکّی تھی۔ انزلی صوبہ گیلان کی ایک بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ رشت اس کا صدر مقام ہے۔ انزلی سے رشت تک کا علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ اس علاقے میں چاول بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ شمالی ایران میں ان چاولوں کے بغیر مہمان نوازی اچھی نہیں سمجھی جاتی۔

تھوڑی ہی دیر میں رشت پہنچے۔ اسلامیہ ہوٹل میں اترے۔ ہم ابھی پوری طرح سستانے بھی نہ پائے تھے کہ آغا کلان تجار ایک اور شخص کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ "آشنا بشوید بہ سکرتر کمونست پارٹی رشت۔ ھر کارکہ مے خواھید بہ ایں کس بفرمایید"۔ آغا کلان تجار کچھ یوں مخاطب ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا

"رفقاء! تسلی رکھیں۔ میں بھی رفیق ہوں۔ میرا بیٹا آذربائیجان سوویت کی طرف سے ماسکو میں سفیر ہے۔"

ہمارا جواب سوائے مسکراتے کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ میں نے کہا:

"آغائے کلان تجار! ہم مسافر ہیں۔ کمیونسٹ یا غیر کمیونسٹ پارٹیوں سے ہمیں کیا"

رشت ایک چھوٹا سا معمولی قسم کا شہر ہے۔ صرف چند ہوٹل نئے ہیں۔ باقی پرانا شہر ہے۔ طہران کی طرف سے ایک حاکم یہاں قیام پذیر ہوتا ہے۔ ہمارے وطن کی طرح یہاں بھی صفائی غیر ضروری جانی جاتی ہے۔ ہم بازار گئے تاکہ ٹوپیوں کے لئے قراقلی خرید سکیں۔ لیکن جہاں بھی گئے اور قراقلی کا دریافت کیا۔ دکاندار فوراً ہم سے پوچھتا:

"تم لوگوں کے پاس کتنا قراقل ہے اور کس نرخ سے دو گے"۔ ہر چند ہم نے بار بار کہا کہ ہم مسافر لوگ ہیں سوداگری سے کوئی غرض نہیں۔ اپنے لئے ٹوپی بنوانی ہے لیکن کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا اس لئے بغیر قراقل خریدے واپس لوٹے۔

مرزا کوچک خان اور سالار رضا خان

رشت میں مجھے اور کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آئی سوائے چند سپاہیوں کے۔ ان کی

وردیاں مجھے عام ایرانی سپاہیوں سے مختلف نظر آئیں۔ ان کے متعلق دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں ہوٹل کے ناظم نے ایک سرد آہ بھری اور پھر یہ قصہ سنایا:

"بھائی! بہت افسوس کی بات ہے کہ تم نے مرزا کوچک خان[۵۲] کا نام نہیں سنا۔ اس کی دلیری سے بھی واقف نہیں ہو۔ مرزا کوچک کربلائے معلیٰ میں مجاور تھا۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ ایران کا بلاوا آیا ہے کہ آؤ اور مجھے اندرونی اور بیرونی خائنوں سے نجات دلاؤ۔ صبح اٹھتے ہی کوچک خان نے طہران کے لئے کمر باندھی اور وہاں پہنچ گیا۔ ان دنوں شہنشاہ ایران محمد علی قاجار فرانس میں عیاشی میں مشغول تھا۔ کرنیل تقی خان نے گیلان میں مرکز سے بغاوت کی تھی۔ خراسان اور آذربائیجان پر برائے نام مرکز کا کنٹرول تھا۔ شاہی افواج تقی خان کو کچلنے کے لئے روانہ ہونے والی تھیں۔ مرزا کوچک خان نے چند تقریریں کیں۔ اور چند ہی دنوں میں ایک گروہ جمع کر لیا۔ وہ گیلان پہ حملہ آور ہوا۔ ساتھ ہی اس نے تقی خان کو خبر بھیجی کہ مرکز سے فرمانبرداری کا اعلان کر دے۔" ناظم نے اپنی تقریر جاری رکھی

"طہران بھی باقی ایران سے بہتر حالت میں ہرگز نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی قابل سردار تھا۔ اور نہ ہی عام شہری آبادی میں کچھ اخلاقی جرأت رہ گئی تھی۔ شہر میں جان و مال محفوظ نہیں تھی۔ تجارت تقریباً بند ہو چکی تھی۔ روٹی دن بدن مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ کوچک خان کے اعلان پر ایک بیداری کی لہر اٹھی۔ ایک ٹوٹا پھوٹا لشکر کوچک خان کی امداد کے لئے روانہ ہوا۔ اس لشکر میں ایک ہیرا تھا جس نے اپنی چمک دمک دکھانی شروع کر دی۔ رضا خان[۵۳] سربازوں (سپاہیوں) کے ایک گروہ کا سردار بنایا گیا۔"

طہران میں ہمیں سلطان (کپتان) محمد علی خان نے بھی رضا خان کی پچھلی زندگی کے بارے میں بتایا۔ رضا خان جنوب مغربی ایران کے پہلوی قبیلے کے ایک زمیندار کا لڑکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ناخواندہ تھا۔ فوج میں سپاہی بھرتی ہوا۔ ترقی کر کے افسر بنا۔ حتیٰ کہ مملکت ایران کا سپہ سالار بنا۔

ناظم نے اپنا بیان دوبارہ جاری کیا

"کوچک خان کی کامیابی کے وقت ایران کی بدقسمتی سے جنوب کی جانب سے انگریزوں نے چڑھائی کردی۔ ان کے ہمراہ بے شمار اجرتی ہندوستانی لشکر تھا جو مشہد[۵۴] سے طہران اور تبریز تک کے سارے علاقے پر چھا گیا۔ کوچک خان نے اس دشمن کے خلاف علم اٹھایا لیکن طہران کو نہ بچا سکا اور گیلان کے کوہ البرز کو لوٹ گیا۔"

"انگریزوں کی یہ پیش قدمی بالشویک روس کے خلاف[۵۵] تھی۔ انگریز بحیرہ اسود سے باکو اور بخارا سے دریائے آمو تک قابض ہو گیا۔ منشویک دن بدن پیچھے ہٹتے گئے۔ اور انگریز نے بھی یہی مناسب جانا کہ ایران لوٹ آئیں۔"

"ایران پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ کوچک خان گیلان کی پہاڑیوں میں ایک غضب ناک شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ اس تاک میں تھا کہ کب موقعہ ملے اور میں دشمن پر جا پڑوں۔ بالشویک انزلی کے راہ ایران میں داخل ہوتے۔ انگریز آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا گیا۔ یہاں تک کہ قزوین[۵۶] انگریز اور روس کے درمیان سرحد بن گئی۔"

یہاں پہنچ کر ہوٹل کا ناظم خاموش ہو گیا۔ میں نے دریافت کیا "اچھا مگر کوچک خان کا کیا بنا؟"

ناظم نے پھر بیان شروع کیا

"جلد ہی انگریزوں اور بالشویکوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ فریقین نے ایران خالی کیا۔ کوچک نے ایران میں جمہوریت کا اعلان کیا۔ اس وقت رضا خان سالار جنگ تھا۔ وہ کوچک خان کے خلاف گیلان کی سمت روانہ ہوا۔ رضا خان نے اپنی تربیت یافتہ اور خوشحال فوج کے ذریعے کوچک خان کو شکست دی۔ کوچک خان اپنے چند وفادار ہمراہیوں کے ساتھ کوہ البرز پر چڑھ گیا۔ جہاں وہ سردی سے ٹھٹھر گیا۔"

"کوچک خان کی وفات کو کتنا عرصہ ہوا"۔ میں نے دریافت کیا

"اس کی موت کی خبر کل ہی پہنچی ہے" ناظم نے جواب دیا۔

چند دن بعد جب ہم طہران پہنچے تو خبر ملی کہ کوچک خان کے مردہ جسم کو البرز کی اونچی چوٹیوں سے

اتارا گیا۔ عوام ماتم کر رہے تھے۔

کوہ البرز کی برف میں ہمارا پڑاؤ

رشت سے دوپہر ایک موٹر کرایہ پر لے کر دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ ہمارے علاوہ ایک طہرانی دوائی فروش بھی ہمارا ہمسفر بنا۔ گاڑی کا ڈرائیور ایک خوبصورت آرمنی لڑکا تھا۔ شام ہم کوہ البرز پہنچے۔ چڑھائی پر چڑھنا شروع کیا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ راستہ بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہماری گاڑی سڑک سے ایک طرف پھسل کر الٹنے کے قریب ہو گئی۔ اگر خدانخواستہ الٹتی تو ایک گہری کھائی میں ہم لوگ پڑے ہوتے اور نام و نشان تک بھی کسی کو نہ ملتا۔

قریب ہی ایک قہوہ خانہ تھا۔ رات اس میں بسر کی۔ ساری رات آگ جلاتے رہے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو سردی سے ٹھٹھر جاتے۔ مارچ کا مہینہ تھا اور برف پڑنے کی باتیں ہو رہی تھیں

اگلی صبح قہوہ خانے سے روانہ ہوئے۔ سڑک آہستہ آہستہ پہاڑ کی چوٹی تک گئی ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہاڑ کے کنارے کنارے میلوں تک ہماری گاڑی دوڑتی رہی۔ نیچے ایک عمودی ڈھلوان تھی لیکن دل کو تسلی دونوں طرف کی مضبوط دیواروں نے دی ہوئی تھی۔ ان پر اتنا اعتماد تھا کہ ہمیں نیچے نہیں گرنے دیں گی۔

راستے میں رودبار میں ناشتہ کیا۔ مکھن پنیر اور انڈے خوب سستے تھے اور بار سے جب آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ راستے کی حفاظت کی خاطر متعین راستے کے ایک سپاہی کو اس کا افسر چابک سے مار رہا ہے۔ ہمارے سامنے اس نے سپاہی سے بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی واپس لی۔ اور اس کو ایک اونٹ پر سوار کر دیا۔ ہمارے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس سرباز نے راستے کی حفاظت کی بجائے مسافروں پر ڈاکہ ڈالا۔

بین الاقوامی اجتماع

شام تک کوہ البرز میں سفر کرتے رہے۔ شام کو ایک قہوہ خانے پہنچے اور وہاں شب بسر کی۔ یہ قہوہ خانہ رودبار کے قہوہ خانے سے بہتر تھا۔ مسافروں کے لئے دو تین کمروں کا انتظام تھا۔ اور ان کے لئے طعام کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔

صبح جب اٹھے تو پہاڑ برف سے ڈھکا پایا۔ نرم نرم برف گرتے دیکھی۔ ہم نے اپنی گاڑی کے پاس دو تین اور گاڑیوں کو موجود پایا۔ ایک گاڑی میں روسی آذربائیجان کی جمہوریت کا تجارتی نمائندہ تھا۔ وہ انزلی کے مچھلیوں کے ٹھیکے کی بات حکومت ایران کے ساتھ کرنے طہران جا رہا تھا۔ عجیب بوڑھا آدمی تھا۔ ہر وقت زبان پر "چورت زنائیت"، "خویا زنائیت" (شیطان کو ہی پتہ ہو گا) جاری رہتا تھا

دوسری گاڑی میں ایک تاتار نائب سفیر طہران سفر کر رہا تھا۔ وہ ایک سنجیدہ اور کم گو آدمی تھا۔ اس کی یہی کوشش تھی کہ خود اور دوسرے ساتھیوں کو خوش رکھے۔ تیسری گاڑی میں ہمارا دوست آغائے کلان تجار بھی پہنچ گیا تھا۔ آغا بہت غرور میں تھا۔ لمبا قد اور کافی مضبوط آدمی تھا۔ سمور کا لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ خود پسندی دور سے نمایاں تھی۔ جب وہ گفتگو کرتا تو اپنی تھوڑی کو سینے کے ساتھ لگا لیتا۔ آنکھیں پوری کھول دیتا، پیشانی پر سلوٹیں لے آتا اور بڑے بڑے اور لمبے الفاظ باری باری منہ سے نکالتا۔

دوسری گاڑی میں ایک بینکر (صراف) تھا۔ یہ بھاری بدن کا آدمی خوش خلقی میں کسی سے کم نہیں تھا۔ شرمیلا لیکن تفریح پسند تھا۔ اس کے ساتھ طہران کا ایک انگریزی مختار رہتا۔

برف اتنی پڑ چکی تھی کہ ہر چیز ہموار نظر آتی تھی۔ ہم لوگ رکنے کو بالکل تیار نہیں تھے۔ گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے چلنے کو تیار ہو گئیں۔ ہماری گاڑی سب سے آگے ہوتی۔ ابھی تھوڑا ہی سفر کیا تھا کہ پہیے دھنس گئے۔ ہمارے پیچھے اور گاڑیوں کا بھی یہی حال تھا۔ ہر ایک گاڑی جو بھی ہمت کر کے روانہ ہونے کی کوشش کرتی سٹارٹ ہو کر قسم قسم کی آوازیں نکال کر فوراً خاموش ہو جاتی۔

ہر ایک نے اپنی سی بہترین کوشش کی لیکن آگے جانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ سڑک بالکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ واپس قہوہ خانہ میں سب اکٹھے ہو گئے۔ پھر باتوں کا سلسلہ جاری

ہو گیا۔

اپنی اپنی زبان میں گانے

رنگا رنگ گپ شروع ہو گئی۔ یورپ کے لوگوں کا ہمیشہ یہی دستور رہا ہے کہ جب ایسے حالات میں گھر جاتے ہیں تو ہر ایک خوش رہنے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر کوئی کوئی گپ شپ مار رہا تھا لیکن میر اور گوہر کا کام صرف ہنسنا ہی تھا۔ کیونکہ روسی زبان میں گذارا تو کر لیتے تھے لیکن محفل کا ساتھ دینا مشکل تھا۔ فارسی اگرچہ میں خوب بول لیتا تھا لیکن وہ تو تب ہی ممکن تھا جبکہ سامعین صرف ایرانی ہوتے۔ حاضرین سب ترکی جاننے والے تھے۔ اس لئے یا تو ترکی زبان میں بولتے تھے اور یا روسی زبان میں گپ شپ لگاتے رہتے۔ ہم دونوں بھی ترکی اور روسی زبانوں کا مزہ لیتے رہے۔ جب ہمارے بولنے کی باری آتی تو ہم انہیں بتاتے کہ ہم افغان ہیں۔ ہماری زبان آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اور ہم پھر کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ تاتار نے میر مجلس کی ذمہ داری سنبھالی اور حکم دیا کہ ہر کسی کو اپنی اپنی زبان میں گانا سنانا ہو گا۔

سب سے پہلے تاتار نے اپنی زبان میں میٹھی غزل سنائی۔ اس کے بعد اس کے روسی سیکرٹری کا نمبر آیا جس نے روسی میں گانا سنایا۔ پھر ادھیڑ عمر کے تجارتی نمائندے نے خود کو کچھ کہنے کے لئے تیار کیا۔ منہ میں دانت نہیں تھے۔ لیکن کوشش اس کی یہی رہی کہ سُر میں شعر سنائے۔ ہمیں اس پر خوب ہنسی آئی۔ لیکن ہنسی کے ساتھ ساتھ اس کے گانے کی داد بھی دینی پڑی۔ بوڑھے نے لمبی کہانی شروع کی تھی کسی جلالت مآب محبوبہ کی داستان لگ رہی تھی۔ جب داستان ختم ہوئی تو سب نے تالیاں بجا بجا کر داد دی۔ بوڑھا ایک زندہ دل آدمی تھا اس نے خوشی کے اظہار میں اپنے آپ کو ایسی نارواگالیاں دیں کہ سب بہت ہنسے۔

آغائے کلان تجار اور بقیہ ایرانیوں نے بھی اپنے اپنے نمبر گذارے۔ جب ہمارا نمبر آیا تو ہم بولے کہ ہمارے گانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ ہماری زبان تو کوئی سمجھتا نہیں۔ تاتار جلدی بول اٹھا "آپ کی زبان کافی دلچسپ ہو گی۔"

گوہر نے ایک اردو غزل سنائی۔ تاتار نے اسے خوب داد دی۔ "یہ تو بالکل ترکی اور تاتاری کی طرح ہے" وہ بولا۔

جب گوہر نے اس کا مطلب بتایا تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کونسی زبان ہے۔

"یہ افغانی ہے۔" گوہر بولا۔

میرا نمبر آیا۔ میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ اُردو کی کوئی غزل وغیرہ سنادوں لیکن شعر اس وقت یاد نہیں آ رہے تھے۔ ابتدا ہی سے جب حاضرین ایک دوسرے پر ہنسنے لگے تھے۔ میری یہی کوشش تھی کہ کچھ یاد آجائے لیکن ناکامی ہوئی۔ بغیر گانوں کے کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔

"نوچیو۔ بتیا تواریش" (تم دوست کیا سناؤ گے؟) تاتار نے میری طرف رُخ کیا۔

دل کو ہمت دلائی۔ ہاتھ کان پر رکھ کر یہ ٹپہ سنایا:

؎ پہ مسافرو بادان مہ کڑے

یوہ مسافر وی یل دکورہ لرے وینہ!

(مسافروں پر بارش کبھی نہ برسانا۔ ایک تو مسافری میں ہوتے ہیں۔ دوسرا اپنے گھروں سے دور ہیں)

سب مسکرا پڑے۔ اسی اُمید میں تھے کہ اس کے بعد بھی کچھ سنائے گا۔ جب میں نے ان کو کہا کہ یہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے تو سب چلا اٹھے

"یہ کافی نہیں ہے اور بھی سناؤ"

دوبارہ کان پر ہاتھ رکھ کر بولا

"پہ مسافرئ را سرہ نہ تلے!

اوس م دکڈو خوانتہ مہ راخہ چہ مرمہ"

(مسافری پر تو میرے ساتھ چلنے کو تیار نہیں تھے اب کیوں میرے قافلے کے پاس آرہے ہو)

یہ ٹپہ میں نے پورے جوش و خروش سے سنایا۔ سب بیٹ یکڑ کر ہنس رہے تھے۔

تجارتی نمائندے نے کافی کوشش کی لیکن خاموش نہیں رہ سکا اور آخر چلا ہی اٹھا

"اے تہ گگوی چورت یازیق" (یہ کن شیطانوں کی زبان ہے)۔

مجھے پتہ تھا کہ یہ سب اور گانے کی فرمائش کریں گے تو کوچیوں کے لہجے میں بار بار یہی ایک فقرہ دہرائے جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گوہر رحمان کے بھی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ گوہر درویش ہری پور کا رہنے والا تھا۔ پشتو اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ اسی لئے پشتو کے گانے سنتے وقت اور لوگوں کی طرح وہ بھی حیران تھا۔ جب سب لوگ ہنس رہے تھے تو گوہر چلا اٹھا

"میاں کمال کرتے ہو"

مجھ سے بھی مطالبہ کیا گیا کہ اب اس کے معنی بھی بتاؤ۔ میں نے ان ٹپوں کا پس منظر بیان کیا کہ کوچی (پاوندے) سردیوں میں افغانستان سے ہندوستان کوچ کرتے ہیں۔ ایک کوچی اپنی معشوق سے کہتا ہے کہ میرے ساتھ ہندوستان چلو۔ وہ نہیں جاتی۔ جب وہ واپس ہندوستان سے آتا ہے تو اس کی معشوق آجاتی ہے اور اپنی محبت کا اظہار دوبارہ کرتی ہے۔ اس پر وہ اس کو کہتا ہے کہ

پہ مسافرئی را سرہ نہ تلے

اوس م دگڈو خواتہ مہ راحۂ چہ مرمہ۔

ناچ

تاتار نے اٹھ کر تقریر شروع کر دی

"بھائیو! ہم سب مسافر ہیں اور اس بیابان میں پڑے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کہ کب ہمارا راستہ کھلتا ہے۔ برف اتنی پڑ رہی ہے کہ اس میں گاڑی نہیں چل سکتی۔ ہم لوگ اکتا جائیں گے۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ وقت گذاری کے لئے اپنے آپ کو مصروف رکھا جائے۔ میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ باری باری سب ناچیں۔ ہر ایک اپنا قومی ناچ ناچے گا۔"

یہ کہتے ہی خود میدان میں کود پڑا۔ ہم سب پیچھے ہٹے۔ میدان خالی کر دیا گیا۔ تاتار نے ناچنا

شروع کیا۔ جس طرح اس کا گانا ایشیائی تھا اسی طرح ناچ پر بھی ایشیائی رنگ غالب تھا۔
تاتار کے بعد تجارتی نمائندہ اٹھا۔ بوڑھے نے ناچتے ناچتے اپنے آپ کو ہلکان کر دیا۔ سب نے تالیاں بجا بجا کر اس حوصلہ افزائی کی۔

گوہر نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ چلو اٹھ کر خٹک بنگڑہ[۵۹] ڈالتے ہیں۔ ہم دونوں اٹھے۔ بنگڑہ ڈالا۔ خود بھی لطف اندوز ہوئے اور حاضرین کو بھی خوش کر دیا۔ سب نے ہماری بہت تعریف کی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ پلاؤ آ گیا۔ روس میں چاول کم پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کی خوراک عموماً گندم ہے۔ لیکن ایران میں عام لوگوں کی خوراک پلاؤ ہے۔ قہوہ خانے میں تو صرف پلاؤ ہی پایا جاتا تھا۔ اطراف سے اور چیزوں کا آنا موقوف ہو چکا تھا۔ ساتھ چمچ موجود نہیں تھے۔ تاتار کے سیکرٹری نے چائے کا خالی پرچ اٹھایا۔ دھونے کے بعد اس پر چاول کھانے شروع ہے۔ پرچ سے وہ چمچے کا کام لے رہا تھا۔ ہم اور ایرانی فائدہ میں رہے۔ ہاتھ دھو کر آتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور ہاتھوں سے چاول کھانا شروع کیا۔ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ دن رات برف پڑ رہی تھی۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ کمروں میں آگ متواتر ہی جلائی جا رہی تھی۔ ہم سب زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ویسے بھی ایران میں زمین پر لیٹنے کا رواج ہے۔ سردی اگرچہ کافی زیادہ تھی لیکن پھر بھی جنوری کے مہینے والی سردی نہیں تھی۔

بیگم تمباکوف بھی ہمارے پیچھے پہنچ گئیں

تیسرے دن جبکہ ہم اسی طرح بھری محفل میں بیٹھے ہوئے تھے تاتار نے قریب آ کر پوچھا:

"تم بیگم تمباکوف کو جانتے ہو۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں بلا رہی ہے۔"

میں باہر نکلا۔ قریب ہی کے ایک کمرے میں بیگم تمباکوف کا قیام تھا۔

"زورا سوتیے توارش" (السلام علیکم) بیگم نے فوراً اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ بیٹے اور بیٹیاں۔ جو

قالین پر گرم کمرے کے اندر لیٹے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔

"اب آپ کو تمباکوف سے شکایت نہیں ہوگی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا

"تمباکوف میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ آپ لوگوں کے انزلی سے روانہ ہونے کے بعد اس نے طہران سے ہمارے لئے موٹر بھیجی۔" بیگم بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

ساتھ ہی مجھ سے دریافت کیا:

"توارش سلیم! آپ لوگوں کے وطن جانے کا راستہ آسان ہے یا دشوار"

"آسان تو نہیں تھا۔" میں نے سر ہلایا۔ "ہمارے ساتھ طہران تک کے پاسپورٹ تھے۔ ہم افغان سفارت خانے کے ملازمین کی حیثیت سے سفر کر رہے تھے۔ طہران میں افغانی سفارت خانے کو تو ہم اپنے پاسپورٹ دکھا نہیں سکتے تھے اور پھر آگے کا تو ہمیں بالکل علم نہیں تھا کہ ہمارا کیا حال ہو گا۔ کس طریقے سے اور کون سے راستے سے اپنا سفر جاری رکھ سکیں گے۔ راستے میں اور خصوصاً جنوبی ایران میں انگریزوں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ اسی لئے ہم کو آبادی سے دور ہی رہنا پڑے گا۔"

"دیکھو توارش سلیم!" بیگم نے پرخلوص لہجے میں کہا "طہران کے سفارت خانے میں تم ضرور مجھ سے ملو۔ تسلی رکھیں۔ میں کوشش کروں گی کہ راستے میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے اور بخیر و عافیت وطن پہنچ سکیں۔"

"بیگم تمباکوف" میں بولا "ہمیشہ آپ اور آپ کے شوہر نے میری اور میرے ساتھیوں کی مدد کی ہے۔ ہم تو مسافر ہیں اور آپ ہی کے آسرے پر ہیں۔"

تمباکوف کی چھوٹی بیٹی جس نے ہماری باتوں پر کان لگائے ہوئے تھے ماں کو مخاطب کر کے بول پڑی

"اگر میرے بابا نے ان کے ساتھ امداد نہیں کی تو میں ضرور ان سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

بیگم ہنس دیں۔ اس نے بیٹی کو تسلی دی کہ ان کی امداد ضرور کی جائے گی۔

گوہر کو میں نے خوش خبری سنائی کہ بیگم تمباکوف بھی آ پہنچی اور ہمارے ساتھ اس کا رویہ بہت

اچھا ہے وہ یقین دلا رہی ہے کہ تمباکوف آپ کی ضرور مدد کرے گا۔ گوہر بہت خوش ہوا۔ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے خوشی سے کہا

"طہران میں ہمیں پشتی چاہیئے تاکہ ہم اپنے لئے آگے کا راستہ بنا سکیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

موٹریں آگے نہیں جا سکتیں

قہوہ خانے میں بھی اکتا گئے۔ آغائے کلان تجار مزید ٹھہرنے کو بالکل راضی نہیں ہو رہا تھا۔ ہم تو پہلے سے تیار تھے۔ کوہ البرز کی چوٹی پر پہنچے۔ تھوڑی ہی دیر میں پڑاؤ تک جا پہنچے۔ البرز کی چوٹی سے سڑک قزوین کی طرف مڑتی تھی۔ دریا پر لوہے کا ایک مضبوط پل تھا جس کے ٹکڑے اب دریا میں پڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور جنوبی حصے پر لکڑی کا پل باندھ دیا گیا تھا۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پل کو انگریزوں اور بالشویکوں کی لڑائی کے دوران گرایا گیا ہے۔

ہماری گاڑیاں پڑاؤ سے ایک میل آگے نکل گئیں۔ راستے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کوشش کی کہ برف کو اِدھر اُدھر کر کے کوئی صورت آگے نکلنے کی نکالی جائے لیکن ڈرائیوروں نے خبردار کیا کہ کہیں گاڑیوں سمیت برف میں دھنس نہ جائیں۔

گھوڑوں کی سواری

آغائے کلان تجار نے پڑاؤ کے مہتمم کو بلوایا۔ رعب دار لہجے میں اس کو گھوڑوں کا بندوبست کرنے کو کہا۔ مہتمم نے حکم کی تعمیل کی۔ جلدی سے گھوڑے نکال لایا لیکن سب بغیر زین کے تھے۔ آغا اس پر کافی بگڑا لیکن مہتمم نے یہ عذر پیش کیا کہ "آغا یہ ڈاک گاڑی کے گھوڑے ہیں۔ ہمارے پاس زین موجود نہیں۔"

آغا ناراض ہو گیا۔ لیکن اس کے بغیر چارہ بھی کوئی نہیں۔ بغیر زین کے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ بغیر زین کی سواری کافی مشکل تھی۔ آہستہ آہستہ اترنے لگے۔ پانچ چھ میل بمشکل چلے ہوں گے کہ شام ہو گئی۔ گھوڑے واپس

بھیجے اور ایک گاؤں میں رات گذارنے ٹھہر گئے۔
آغائے کلان تجار لوگوں سے ایسے پیش آرہا تھا جیسے وہ اس علاقے کا حاکم ہو۔

ایرانی کرسی کے نیچے رات

ہم گاؤں کے سردار کے ہاں ٹھہرے۔ وہ ہمیں کمرے میں لے گیا۔ یہ کمرہ ہمارے گاؤں کے زمینداروں کے کمروں کی طرح کافی نیچے تھا۔ اور مٹی سے بنا ہوا تھا۔ کمرے کے درمیان انگیٹھی کے لئے جگہ تھی۔ اس جگہ پر ایک چھوٹا سا میز پڑا ہوا تھا۔ میز کے اوپر ایک لمبی لیکن چوڑی رضائی پڑی ہوئی تھی۔ ہم لوگ آگ جلانے کی جگہ کے ارد گرد بیٹھے۔ اپنے پاؤں رضائی کے اندر کر لیئے۔ رضائی میں بھاپ بند ہو گئی تھی جس کا اندازہ ہمیں اپنے پاؤں اندر ڈھانپتے ہی ہوا۔ پاؤں گرم کیا ہوئے کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ آغائے کلان زور زور سے بول رہا تھا۔ خوب چہک رہا تھا۔ دو تین آدمیوں کی جگہ اس نے اکیلے گھیری ہوئی تھی۔

قزوین میں آغائے کلان کی گرفتاری

صبح جب اٹھے تو میزبان نے انڈوں اور مکھن سے تواضع کی۔ خوراک کا انتظام آغائے کلان تجار کے ہاتھ میں تھا اس لئے بہترین تھا۔

ہمارے لئے گھوڑے تلاش کئے گئے جو مل نہ سکے۔ پالان پڑے ہوئے گدھے حاضر کئے گئے۔ آغا ایک مضبوط گدھے پر سوار ہو گیا۔ ایک دبلا پتلا گدھا میری قسمت میں بھی آیا۔ آغا آگے آگے اور ہم سب ان کے پیچھے گدھوں پر سوار یہ چھوٹا سا قافلہ روانہ ہو گیا۔ زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ آغا نے گدھے کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور گدھے سے اتر کر پیدل چلنے لگا۔

دوپہر کے قریب ہم گدھوں پر سوار قزوین کے شمالی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ دروازے میں ایک سپاہی کھڑا تھا۔ وہ ہم سب کو کوتوالی لے گیا۔ معمولی سی پوچھ گچھ کے بعد آغائے کلان تجار کو حراست میں لے لیا گیا اور ہمیں جانے کی اجازت مل گئی۔ آغائے کلان تجار نے

نے موقع پر موجود پولیس افسر کو بہت برا بھلا کہا

"میرا بیٹا آذربائیجان کی طرف سے سفیر ہے۔ میں دیکھوں گا اور آپ کو یہ بتادوں گا کہ کلان تجار کی بے عزتی کوئی معمولی بات نہیں۔"

تب کہیں جاکر مجھے یقین آیا کہ آغا کلان تجار ہمارے لئے دل میں کینہ نہیں رکھتا تھا۔

تجارتی سفیر ہندوستانیوں کو شیطان کے نام سے یاد کرتا ہے

میں اور گوہر موٹر کے انتظار میں قزوین میں واقع ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔

اگلے دن تجارتی سفیر بھی اسی ہوٹل پہنچ گیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ قزوین پر انگریزی فوج کا قبضہ رہ چکا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے کچھ ہی دن قبل انگریزی فوج نے قزوین پر اپنا قبضہ ختم کیا تھا۔ ہمارے کمرے میں اور ہوٹل میں ہندوستانی فوجیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک صبح انگیٹھی کے پاس ہم تینوں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ اچانک سفیر صاحب کی نظر ان تصویروں پر پڑی۔ قہر آلود لہجے میں فوراً بول پڑا

"توارئیشی! اے تا کوئی چورتی" (دوستو! یہ کون شیطان ہیں)

"نز نائم" (ہمیں معلوم نہیں) ہم نے جواب دیا۔

"بیرہ! یہ کن کی تصویریں ہیں؟"

"یہ ہندوستانی سپاہی ہیں۔" بیرے نے جواب دیا۔

سفیر ہمیں مخاطب کر کے کہنے لگا:

"دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ کوئی شیطان ہی ہیں۔ دیکھو توارئیشی یہ کیسے بھیڑ بکریوں کی مانند لوگ ہیں۔ تین سو ملین لوگوں پر چند لاکھ انگریز حکومت کر رہے ہیں۔"

"اچھا ... ہے" میں نے اس کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور مزید پوچھا

"یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ آزادی کی خاطر کچھ بھی نہیں کر رہے؟"

"توارش تم نے تو ہند دیکھا ہے یہ کس طرح کا وطن ہے" میں نے پھر پوچھا۔
"وطن تو اچھا ہے لیکن لوگ وہاں کے بے کار ہیں" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

قزوین میں افلاس

قزوین شہر ایران کے ان شہروں میں گنا جاتا ہے جو جدید وقت کے تقاضوں کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ عمارتیں پختہ ہیں۔ گلیاں کوچے کافی چوڑے ہیں۔ وسطی کوچہ تو بہت کھلا اور وسیع ہے۔ وسیع مکانات علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے ہیں۔

زندگی میں پہلی بار میں نے اتنی افلاس، بھوک اور غربت دیکھی۔ افغانستان بخارا، ترکستان، روس اور قفقاز میں مجھے گداگر اور فقیر نظر نہیں آئے تھے۔ قزوین میں میں نے فقیروں کو دیکھا جو برف میں پڑے ٹھٹھر رہے تھے۔ اب بھی مجھے جب وہ منظر یاد آتا ہے ایک تو قزوین کی بے ترس برف اور برفانی ہوائیں اور اوپر سے ان کی حالت، تو لرز جاتا ہوں۔ مجھے دنیا کے مہذب ہونے کا دعویٰ بالکل باطل دکھائی دیتا ہے۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ ہمدردی دنیا میں مفقود ہے۔ کسی نے بھلا ہی کہا ہے کہ دنیا میں جینا بس اپنے لئے ہی ہے۔ میں نے سوویت یونین میں یہ حال نہیں دیکھا تھا۔ ایسا پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اس لئے دل بہت افسردہ ہوا۔

قزوین میں دو دن گذارنے کے بعد گوہر طہران روانہ ہوا اور میں موٹر سے سامان نکالنے کے لئے وہیں قزوین میں ٹھہر گیا۔ ہوٹل کے کمرے میں اکیلا بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ اس لئے شہر کی گلی گلی گھوما۔ اہم اور غیر اہم سب جگہیں دیکھ لیں۔ حسن، خوبصورتی، بھوک اور افلاس ساتھ ساتھ رہ رہے تھے۔

طہران

چوتھے دن میں بھی طہران پہنچا۔ قزوین دروازے سے اندر داخل ہوا اور سیدھا سوویت سفارت خانے گیا۔ تمباکوف مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے بیگم تمباکوف کے ساتھ مدد کرنے

پر میرا بہت شکریہ ادا کیا۔ تمباکوف انگریزی زبان پر عبور رکھتا تھا۔ اس نے کافی وقت انگلستان، امریکہ اور ہندوستان میں گذارا تھا۔ رات سفارت خانے میں ہی گذاری۔ تمباکوف نے باتوں ہی باتوں میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ سفارت خانے میں میرا رہنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی لئے گوہر کی رہائش کا بھی اور ایک جگہ بندوبست کرلیا گیا تھا۔ اگلے دن عبدالکریم نامی ایک شخص کے مکان میں گوہر سے ملا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے پاسپورٹ ضائع کر دیئے مبادا ہمارے پاس سے وہ اگر نکل آتے تو ان میں افغانی رعایا بیان کئے گئے تھے۔ اور اگر طہران میں واقع افغان کونسل خانے کو اس بات کا پتہ چلتا یا ایرانی حکومت ہمیں گرفتار کرتی اور ساتھ ہمارے پاسپورٹ پکڑے جاتے تو اس سے بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ اسی لئے ہم نے وہ ضائع کر دیے۔

ہم دونوں آغا کریم کے گھر رہ رہے تھے۔ طہران میں ہم نے دو مہینے گذارے۔ ۱۵ مارچ ۱۹۲۲ء کو طہران پہنچا تھا اور مئی کی ۱۶ تاریخ کو طہران سے رخصت ہوا۔

طہران میں ضروریات زندگی مہنگی تھیں۔ لوگوں کے رہنے کا معیار اونچا تھا۔ ایک متوسط درجے کے آدمی کے بود و باش کا خرچہ تقریباً اسی تومان ماہانہ تھا۔ جس سے ہمارے وطن کے تین سو روپے بنتے تھے۔ ہم غریب الوطن مسافر طہران جیسی جنت نشان جگہ کیسے رہ سکتے تھے۔ اس کا صرف ایک جواب ہے۔ یہی جواب میرے تمام سفر کی تشریح کرتا ہے۔ اسلامیہ کالج پشاور سے روانہ ہوتے وقت میرے پاس صرف انتیس روپے تھے۔ لیکن قسمت کے کھیل کو دیکھئے کہ کتنی سیر و تفریح اس نے ہمیں کرائی۔ ماسکو سے روانگی کے وقت ہمیں بہت کم رقم دی گئی تھی جس سے ہم بمشکل شیراز یا یوشہر تک پہنچ سکتے تھے۔ ہماری قسمت اتنی بے کار نہیں تھی جس طرح لگ رہی تھی اسی طرح یہ ناقابل یقین سفر ہم نے طے کرلیا۔ تکلیف اور آرام، عزت اور بے عزتی نے جگہ جگہ، وقت بے وقت ہمارا استقبال کیا۔ اگر ترکمانوں نے ہمارے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔ تو ترمذ اور کرکی میں ہماری عزت افزائی بھی ہوئی تھی۔ اگر قفقاز میں حالات مایوس کن ہو گئے تھے تو طہران میں تو حالات اُمید افزا تھے۔

ہمارے کھانے کا انتظام کریم آغا کے ذمے تھا۔ اپنی جیب سے صرف جیب خرچ ہی نکالتے

تھے۔لیکن یہ بھی اتنا زیادہ ہوتا کہ وقت بہ وقت ہم اپنے برجس کے بخیے ادھیڑنے پر مجبور ہو جاتے اور اس سے ایک سرخ رنگ کا ترکی پونڈ نکال لیتے۔ لیکن ہر ایک پونڈ جو ہم نکالتے اس سے ہماری ہمت جواب دینے لگتی اور اس کے خرچ کرنے پر اپنے وطن سے دوری کا احساس اور زیادہ بڑھنے لگتا۔

قدیم طہران کے ساتھ ساتھ شامران کے پہاڑ کے ساتھ ساتھ نیا طہران واقع ہے۔ دن بدن شہر اس طرف پھیل رہا ہے۔ شہر کی آبادی فصیل ــــ جو طوائف الملوکی کی نشانی ہے' سے باہر نکل رہی ہے جگہ جگہ فصیل کی بنیاد نئے شہر کے عین وسط میں دکھائی دیتی ہے۔ تمام مملکتوں کے سفرا جدید شہر میں رہ رہے ہیں۔ مشہور سفارت خانے روس اور انگریز کے ہیں جو علیحدہ علیحدہ چھوٹے شہر دکھائی دیتے ہیں۔ ان سفارت خانوں میں چھوٹی چھوٹی فوج رہتی ہے۔ ہر ایک میں وائرلیس سٹیشن بھی موجود ہے۔ دونوں سفرا شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں اپنے شان و شوکت سے اپنے اپنے وطن کی عزت ایران کی حکومت اور لوگوں کے دلوں میں بڑھا رہے ہیں۔

آغا سالار رضا خان اور سیاست ایران

پہلے بیان ہو چکا ہے آغا سالار رضا خان ایک کاشت کار کا بیٹا تھا۔ اپنی لیاقت سے ترقی کر کے ایرانی فوجوں کا سالار بنا۔ تعلیم تو اس کی کوئی نہیں لیکن طہران میں موجود دنیا کے سیاسی نمائندگان اس کی حکمت عملی کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔

ایران ایک غریب و نادار ملک ہے۔ امن و امان بالکل نہیں۔ حکومت عوام سے مالیہ تک نہیں وصول کر سکتی۔ فوج اور پولیس کے خرچ کے لئے رقم کی ضرورت ہے۔ عصر حاضر میں ایران بہترین فوج رکھتا ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ خرچہ کہاں سے آئے۔ آغائے سالار اپنی حکمت عملی سے یہ خرچہ کبھی روس سے اور کبھی انگریز سے پورا کر رہا ہے۔ کبھی ایک قریب ہو جاتا ہے تو کبھی دوسرے کے پاس جاتا ہے لیکن اپنے آپ کو کسی کے زیر اثر نہیں لاتا۔ اس میں اس کی کامیابی ہے۔

روسی سفیر کیطرف سے آغا سالار کو دعوت

سنہ ۱۹۲۱ء میں روس میں قحط سالی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ قحط سالی کے دور ہونے کی خوشی میں طہران میں روسی سفارت خانے کی طرف سے ایک جشن منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر آغا سالار رضا خان کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ دوست ممالک کے سفیر اور حکومت ایران کے بڑے افسران کو بھی دعوت نامے دیئے گئے۔ ہمارے دوست تمباکوف نے ہمیں بھی بلوایا۔ ہمیں ایسی جگہ بٹھا دیا گیا جہاں سے معزز مہمان قریب سے نظر آسکیں۔

ہم رات کی تاریکی میں وہاں گئے۔ خوشی کا سماں تھا۔ روس سے ناچنے والی اور گانے والی لڑکیاں اس موقع پر خاص طور سے منگوائی گئی تھیں۔ تیاری ہو چکی تھی بس انتظار آغا سالار کے تشریف لانے کا تھا۔ ایران کا سالار پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ روس کا وزیر مختار اور سفیر بھی تھا۔ رضا خان کو دیکھنے کا پہلا موقعہ ہاتھ آیا۔ گندمی رنگ، چھ فٹ سے نکلتا ہوا اونچا قد ایک مضبوط شخص تھا۔ تقریباً چالیس پینتالیس سال کے پیٹے میں تھا۔ خاکی فوجی وردی پہنے ہوئے تھا۔ برجس اور گھٹنوں تک لمبے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔

یورپین اور ایشیائی لڑکیوں نے خوب ناچ ناچا۔ کمال کی موسیقی سنوائی گئی۔ ڈرامے بھی ہوئے رات گئے محفل برخاست ہوئی۔

شاہی خاندان صرف نام تک ہی محدود تھا۔ اصل قوت سالار رضا خان کے ہاتھ میں تھی۔

ایران کی تباہی کے اسباب

ایران کو اس تنزل اور پستی سے نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس بدقسمت وطن کی بدنصیبی کو اتنی جلدی دور نہیں کیا جا سکتا۔ پچھلی صدی سے شاہان ایران بہت نالائق چلے آرہے ہیں سامراجی ڈاکوؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے رضا خان کو بہت عرصہ کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ایران نے تیس چالیس سال سے مختلف اقتصادی اور سیاسی مراعات روس اور انگریز کو دے رکھی ہیں۔ روس کو اس نے انزلی سے طہران تک تار برقی اور ٹیلی فون اور جلفے سے تبریز تک ریل، تار، سڑک اور ٹیلیفون اور اسی طرح مشہد تک شمالی ایران کے ہر ایک شہر میں روسی بینک موجود ہے۔

تیل کا ٹھیکہ سو سال تک ایک انگریز کمپنی کو دیا گیا تھا۔ اصفہان سے طہران تک سڑک، تار برقی اور ٹیلی فون ایک اور انگریز کمپنی کے پاس تھا۔

جنوبی ایران پر انگریز فوجی قابض تھے۔ حکومت برائے نام ایرانی حکومت کی تھی۔ لیکن انگریز ساؤتھ پرشین رائفلز کے ذریعے جنوبی ایران پر قابض تھے۔ طہران سے بوشہر تک اور جنوبی ایران میں انگریزوں کے بینک تھے۔ ایران [illegible] گلہے لگا ہے ان بینکوں سے قرضہ لے کر کبھی ایک طرف کا اور کبھی دوسری طرف کا مالیہ بطور ضمانت دیتا ہے۔ روسی اور انگریزی سرمایہ داری اور سامراجی مظالم کے لئے مسٹر شسٹر کی کتاب "THE STRANGLING OF PERSIA" پڑھنی چاہیئے۔ یہی دونوں قومیں ایران کی تباہی کی ذمہ دار ہیں۔

پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہو گا کہ آج کل دنیا میں بینک کی کیا اہمیت ہے اور دنیا کی سیاست میں اس کا کیا درجہ ہے۔ وہ زمانہ بیت گیا،

(ہندوستان کی قسمت میں ابھی یہ بدنصیبی ہے) جب ایک قوم دوسری قوم پر حکومت کرتی تھی۔ اب تو سرمایہ دار اقوام دوسرے ممالک کی دولت اور محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں اور اسے لوٹتی ہیں۔

ایران کی خوش قسمتی تھی کہ زار روس کے ساتھ روسی سرمایہ دار بھی مٹی میں مل گئے۔ بالشویکی حکومت نے ایران کو سب قرضے اور مراعات معاف کر دیے۔ ساتھ ہی اعلان کیا کہ یہ سب مراعات اور قرضے ایرانی قوم کا خون پسینہ ہے جو ہم ایران کو واپس کرتے ہیں۔ آج کل شمالی ایران میں تمام روسی مراعاتی بینک، ٹیلی فون، تار برقی، سڑک اور ریل وغیرہ پر ایران کا قبضہ ہے۔ وسطی اور جنوبی ایران اسی طرح انگریزی سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یقیناً آغا سالار رضا خان کی حکمت عملی ہی اس کو ان سے نجات دلائے گی لیکن اس میں ابھی وقت لگے گا۔

ہمارے ان دو مہینوں کے قیام کے دوران آذربائیجان (ایران) اور خراسان (مشہد) کی بغاوتیں فرو کر لی گئیں۔ مرکز کا کنٹرول و نظم و ضبط ان دو صوبوں میں قائم ہو گیا۔ اس کی وجہ سے آغا سالار رضا خان بہت ہر دلعزیز ہوا۔ اس کے ہاتھ مزید مضبوط ہوئے۔ طہران کا تمام تجارت پیشہ اور تعلیم یافتہ طبقہ اس کی پشت پر کھڑا ہے۔

طہرانی معاشرہ

تحریک نسواں

میں اور گوہر جب رشت سے روانہ ہوئے تو ساتھ میں ایک طہرانی نوجوان ڈاکٹر بھی ہمسفر ہو گیا۔ موٹر کا مالک بھی ایک نوجوان ارمنی ہی تھا۔ دونوں نے ہمارے خیالات جاننے میں دلچسپی ظاہر کی۔ وہ ہر وقت ہم سے کہتے:

"مالشما خیلے العنت داریم"

ہمارا آپس میں اچھا تعلق قائم ہو گیا۔ آپس میں ایک قسم کی بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ وہ بعض اوقات طہران کی حسین اور نوجوان لڑکیوں کی بات چھیڑ دیتے۔ ان کے لباسوں کی تعریف کرتے اور کہتے کہ شہر کے وسط میں واقع توپخانہ میدان میں شام کی تفریح کو لڑکیاں آتی ہیں۔ یہ لڑکیاں تعلیمیافتہ ہیں۔ میوزک سمجھتی ہیں اور ستار کی تو ماہر ہیں۔

ڈاکٹر نے جب بھی محبت کا ذکر چھیڑا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ ہمارے متعلق معلومات کرے۔ مزید بے تکلف ہونے کے لئے کہتا

"کیا لطف ہے آدمی اپنی محبوبہ کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیے ایک باغ میں ہوا خوری کرے۔" پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر کہتا

"آپ لوگوں نے تو خوب سیریں کی ہوں گی۔ روس میں تو آزادی ہے۔"

ہم جواب دیتے۔

"آپ خوب باتیں کر لیتے ہیں۔ ہم تو مسافر ہیں۔ باکو میں بھی مسافر تھے۔ واقعی اس جگہ کے لوگ اچھی زندگی گذار رہے ہیں لیکن مسافر تو مسافر ہی ہوتا ہے اور ان خوشیوں سے محروم ہی رہتا ہے۔"

"ارمنی اکثر ڈاکٹر کے ساتھ بحث شروع کرتا:

"تمہارے مذہب میں یہ بات مجھے ذرا بھی نہیں بھائی کہ خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی مخلوق (صنف نازک) کو گھروں میں قید رکھتے ہو۔ جب گھروں سے باہر بھی نکلتی ہیں تو ایسی سیاہ چادریں اوڑھی ہوتی ہیں جس میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

ڈاکٹر اور آرمنی اس بحث کے دوران فوراً ہماری طرف رُخ کر لیتے اور کہتے:

"آپ لوگوں کے ملک میں پردے کا رواج ہے۔"

ہم اثبات میں جواب دے دیتے۔

میں اور گوہر عورتوں کی آزادی کی سخت مخالفت کرتے اور اپنے وطن میں پردے کی حمایت کرتے۔

ڈاکٹر ناراض ہو کر بولتا:

"پچاس سال قبل ہمارے طہران کی بھی یہی حالت تھی۔"

آخر ہم جان گئے کہ ڈاکٹر خطرناک آدمی نہیں صرف لڑکیوں کا ذکر اسے خوش رکھتا ہے۔

ڈاکٹر کے ساتھ ہمارا تعلق بہت بڑھ گیا۔ طہران جا کر پھر اکثر اس کی دکان پر جانا رہتا۔ وہ دلچسپ باتیں سناتا رہتا۔

جو بھی طہران کا حال جاننا چاہے تو اس کے لئے صرف اخبار کافی نہیں۔ اس کو چاہیے کہ قہوہ خانے ضرور جائے اور چائے پینے کے دوران ہر قسم کی باتیں سنا کرے۔ بازار میں بھی کسی ڈاکٹر اور یا اور کسی دکان میں اٹھے بیٹھے۔ اور سہ پہر کو ضرور توپخانہ میدان یا خیابان لالہ زار جایا کرے۔

طہران پہنچنے کے پہلے دن ہی مجھے محسوس ہوا کہ اگرچہ طہران میں عورتیں پردہ تو کرتی ہیں لیکن ان کا یہ پردہ برائے نام ہی ہوتا ہے۔ انزلی، رشت اور قزوین میں پردہ ہے۔ لیکن طہران میں گھر کا سارا سودا سلف عورتیں ہی خریدتی ہیں۔ کالی چادریں اوڑھے ہوتی ہیں جو ان کی آدھی پنڈلیوں تک آویزاں ہوتی ہے۔

چادر کے نیچے یورپین لباس پہنا ہوتا ہے۔ اونچی ایڑیوں کے جوتے پہنے ہوتے ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ قانون کی زد سے بچنے کے لئے انہوں نے ایک پردہ بنا تو لیا ہے جو پردے کے ساتھ ساتھ فیشن کا کام بھی دیتا ہے۔

عورتوں کے لئے ایران میں چہرے پر نقاب ڈالنا ضروری ہے۔ طہران کی خواتین نے حتی الوسع کوشش کی کہ اس سے ان کی جان چھوٹ جائے۔ لیکن ان کو اس میں ناکامی ہوئی تو آخر کسی ہوشیار عورت نے یہ چیز ایجاد کر لی۔ ایک بالشت لمبی اور ایک بالشت چوڑی جالی کو سخت استری کر کے پیشانی کے اوپر چادر کے کنڈوں کے ساتھ لگا لیتی ہے جس سے یہ جالی سیدھی رہتی ہے اور عورت کا چہرہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کی گردن صاف نظر آتی ہے۔ یہی نقاب اس کے لئے یورپین ہیٹ کے چھجے کا کام دیتا ہے۔ طہران میں جب فرنگیوں کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے ایران کی عورتوں کی عقلمندی کی بے اختیار داد دی کہ کیسے انہوں نے قانون سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ اچھی چیز ایجاد کی۔

طہران میں تعلیم یافتہ عورتوں کی شرح سو میں سے نوے کے قریب ہے۔

خواتین کا جلوس اور اقتصادی مطالبات

طہران کی خواتین یورپی خواتین کی طرح تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے اکثر نے یورپ اور خصوصاً فرانس میں تعلیم پائی ہے۔ طہران ایران کا صدر مقام ہے۔ سارے ایران پر حکومت کر رہا ہے۔ اسی لئے معیار زندگی بھی بلند ہے۔ نئے زمانے کی روشنی سے مستفید ہوتی ہیں۔ ایک طرح سے

یہ خوش قسمت بھی ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی انہیں حاصل ہیں۔ دوسری طرف معیارِ زندگی بھی اونچا ہے۔ اسی لئے اخراجات بھی زیادہ ہیں۔ انہوں نے اپنی یہ مصیبت جان لی۔ ایک دن ہزاروں کی تعداد میں عورتیں طہران کے خواتین کلب میں جمع ہوگئیں۔ انہوں نے ایک متفقہ تجویز پاس کی جس کا متن کچھ یوں ہے۔

"خواتین ہر ملک کی آدھی قوت ہوتی ہیں۔ خواتین کو بے کار رکھنا قومی نقصان ہے۔ ہر مہذب قوم کی آج کل یہی کوشش ہے۔ کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح قومی آمدن کے وسیلوں کو بروئے کار لاسکیں جس سے قوم کے آمدن میں اضافہ ہوگا۔"

"تمام ایران اور خصوصاً طہران میں عورتوں کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے کندھوں پر ایک اضافی بار ہیں۔ جس عورت کا والد یا خاوند یہ بار سہنے کی قوت و طاقت نہیں رکھتا تو اس عورت کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔"

"طہران ایران کا مرکز ہے۔ یہاں کی خواتین اچھی تعلیم یافتہ ہیں۔ ان پر ایسی پابندیاں عائد کرنا جو ان کو اقتصادی طور پر تباہ کریں ان پر بھی ظلم ہے اور قومی زندگی کی بھی تباہی ہے۔" (اس لئے)

"ہم طہران کی عورتیں حکومت سے مطالبہ کرتی ہیں کہ

(۱) عورتوں کے لئے حکومت کی ملازمتوں کے دروازے کھولے جائیں۔

(۲) عورتوں کو اجازت دی جائے کہ وہ تجارت کرسکیں۔

(۳) عورتوں پر جبری پردہ نہ عائد کیا جائے۔ کیونکہ جبری پردے والی خواتین نہ تو قوم کی خدمت کرسکتی ہیں نہ ہی اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو پالنے کے لئے کہیں ہاتھ پیر مار سکتی ہیں۔"

ڈاکٹر نے علی الصبح آکر ہمیں یہ خبر سنائی اور جلد ہی ہمیں "حقیقت"، "ایران"، اور "ستارہ ایران" نامی اخباروں کے ذریعے پتہ چلا کہ دس بجے صبح عورتوں کا جلوس نکلے گا جو وزیر داخلہ کے دفتر جائے گا۔ "ایران" نامی اخبار نے تو عورتوں کے مطالبات پر خاموشی اختیار کی تھی جبکہ بقیہ ایرانی پریس نے ان کے مطالبات کی پرزور تائید کی تھی۔ جلوس خواتین کے کلب سے شروع ہوا اور جنوب کی جانب سے

خیابان لالہ زار میں داخل ہوا۔ تمام ٹریفک بند ہوگئی۔ تانگوں، موٹروں اور ٹراموں کی آمدورفت بند ہوگئی۔ بڑی تعداد میں ایرانی پولیس فٹ پاتھ اور ریل کی پٹڑی پر جمع ہوگئی۔ بے شمار تماش بین بھی پولیس کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ جلوس آہستہ آہستہ آتا دکھائی دیا۔ آٹھ آٹھ عورتوں کی قطاریں ایک دوسرے کے پیچھے چل رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی نقابیں الٹائی ہوئی تھیں۔ طہران کی خوبصورتی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ سیاہ ریشمی چادروں میں گلاب کی طرح خوبصورت چہرے پورے رعب و دبدبے کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر جگہ جگہ بیرونی سفارت کار چپ سادھ کر کھڑے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے شہنشاہ احمد شاہ کجر کلاہ کے سلام کے لئے لوگ حاضر ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ فینگی جلوس کی اہمیت اور طاقت کو سمجھتے تھے۔ کیونکہ انگلستان کی عورتوں نے بھی آزادی کے لئے بھرپور جدوجہد کی تھی۔ ہر کسی کو پتہ تھا کہ ایرانی عورتیں بھی آزادی چاہتی ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

طہران کے حاکموں میں ان کے والدین اور بھائی شامل تھے۔ کوئی طاقت ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ عورتوں کے جلوس کے شروع میں مختلف صوبوں کے گورنروں اور کمانڈروں کی بہنیں، بیٹیاں چل رہی تھیں جن سے طہران بخوبی واقف تھا۔ اسی لئے ہر ایک کا سر تسلیم خم تھا۔ جلوس گذر گیا۔ پھر بھی کافی دیر تک جلوس کا رعب طاری رہا۔ دیکھنے والے حیرت زدہ کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم ڈاکٹر کی دکان میں جمع ہوگئے۔ عورتوں کے مطالبات کی مخالفت کسی کی زبان پر نہیں آرہی تھی۔ ہم ابھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک معمر آغا جس کے بال کوہ البرز پر پڑی ہوئی برف کی مانند سفید تھے، داخل ہو کر کہنے لگا:

"جلوس بطرف ادارہ شیخ الاسلام رفتہ"

(جلوس شیخ الاسلام کے دفتر کی طرف چلا گیا)

ہم اپنے گھر لوٹ آئے یہ سوچ کر کہ دوپہر کے کھانے کے بعد پھر ڈاکٹر کی دکان پر چلیں گے۔ راستے میں پارلیمان کی عمارت کے آگے کافی لوگ جمع تھے۔ ایک بڑے سے درخت کی طرف سب متوجہ تھے۔

تقریر تو سنائی دے رہی تھی لیکن مقرر نظر نہیں آرہا تھا۔ تھوڑا غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مقرر صاحب درخت میں کھڑے تقریر کر رہے ہیں۔ وہ عورتوں کے مطالبات کے حق میں بول رہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ درخت اس لئے پسند کیا گیا کہ یہ اسمبلی کے عین سامنے تھا اور یہاں سے پارلیمان کے اراکین (وکلائے ملت) ان مطالبات کو سُن سکتے تھے۔

ہم وہاں سے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ تھوڑا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ پیچھے سے آوازیں سنیں۔

"برادر فتح! برادر علی!" (یہ ہمارے شمالی ایران کے نام تھے)

آوازیں ہمارے پیچھے ڈاکٹر کا نوکر لگا رہا تھا۔ ہم رک گئے۔ اس سے دریافت کیا:

"خیر باشد"

وہ بولا: "آغائے دکتر ذکر خیر شمایاں مے کند" ہم لوٹ آئے۔ ڈاکٹر اکیلا تھا اور غصے میں لگ رہا تھا۔

"بھائیو! اللہ نے خیر کی۔" ڈاکٹر جلدی سے پریشانی کی حالت میں سرگوشیوں کے انداز میں بولا کہ بہت سی خانمیں پستولیں اور بم ساتھ لائیں تھیں۔ وزیر داخلہ نے اپنے حُسن سلوک سے جلوس کو بہت عزت احترام کے ساتھ تسلی بخش انداز میں سمجھایا اور ان سے وعدہ کیا کہ اگر شیخ الاسلام نے اجازت دی تو آپ کے مطالبات پر ہمدردانہ غور و فکر ہو گا۔ وزیر صاحب کی درخواست پر جلوس منتشر ہو گیا اور پانچ نمائندگان پر مشتمل ایک وفد شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

شیخ الاسلام کا جواب

شیخ الاسلام ایک قابل شخص تھا۔ اس نے کافی دیر تک وفد کے اراکین کو باتوں میں مشغول رکھا اور جب سمجھ گیا کہ اب جلوس کے اراکین واپس اپنے گھروں کو پہنچ گئے ہوں گے تو آخر میں ان سے کہا:

"دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ بارھواں امام پیدا کرے۔"

خواتین کی اس تحریک کا اس دن یہ نتیجہ نکلا۔ بعد میں حکومت نے اس تحریک کو خاموش کرانے کے لئے قسم قسم کے احکامات جاری کیئے۔ ایرانی پریس نے وزیر داخلہ اور شیخ الاسلام پر خاصی تنقید کیا۔

متعہ یا صیغہ

ایران میں ایک اور لعنتی رسم کی وجہ سے دن بدن عورتیں اخلاقی ذلت کی پستیوں میں گر رہی ہیں۔ ایک شخص ایک عورت کے ساتھ موقتی نکاح کر سکتا ہے۔ ایک رات دن، ایک مہینے سے لے کر سالوں تک موقتی نکاح کیا جا سکتا ہے۔

شاید اس نکاح کا فلسفہ یہ ہو کہ مسافروں کو زنا کی لعنت سے بچا سکیں لیکن اسکا نتیجہ اتنا نقصان دہ نکلا کہ ساری ایرانی قوم دنیا کی نظروں میں بدنام ہو گئی۔

موجودہ زمانے کی بد اخلاقی کا علاج متعہ نہیں۔ زمانہ بدل گیا۔ حالات بدل گئے۔ آدمی کی زندگی اور اخلاق کا دارومدار اقتصادی بنیادوں پر ہے جب تک ایک قوم کی اقتصادی حالات ناگفتہ بہ ہو۔ تو بد اخلاقی سے نہیں بچ سکتی۔ ایران کی اقتصادی حالت بدترین تھی اسی لئے اس میں بد اخلاقی بہت زیادہ ہے۔ متعہ بذات خود بھی بد اخلاقی کی بنیاد ہے۔ طہران ایران کا صدر مقام ہے۔ قرب وجوار کے دولت مند سوداگر بھری ہوئی جیبوں کے ہمراہ یہاں آتے ہیں طہران ایران کا پیرس جانا جاتا ہے۔ حاجت مند خواتین اپنی عصمت کا سودا پیسوں پر کرتی ہیں۔ اگر کوئی گناہ سے ڈرتا ہے تو پھر متعہ کا طریقہ اپناتا ہے۔

متعہ کے ہاتھوں تباہ شدہ بہت سی عورتیں طہران میں موجود ہیں۔ ان کی ساری زندگی کی بسر اوقات متعہ پر ہوتی ہے۔ متعہ کی شکار عورت کو کوئی بھی شریف آدمی زندگی بھر اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح لازمی طور سے ان عورتوں کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔

جب باہر سے آنے والے مسافر ایران میں بد اخلاقی کی یہ حد دیکھتے ہیں تو وہ سارے ایران کو بُرا کہتے ہیں۔ متعہ دراصل ایک قانونی ڈاکہ ہے۔ دن دھاڑے ایک بدصورت ڈاکو ایک حسین ماہ جبین کو پیسوں کی بدولت لوٹ لیتا ہے خود وہ ڈاکو تو ڈاکہ ڈال کر چلا جاتا ہے اور اس ماہ جبین

کو ساری عمر ذلت کی زندگی گذارتے چھوڑ دیتا ہے ۔ ایک طرف تو ایران پر خدا کا فضل ہے وطن بے حد خوبصورت ہے دوسری طرف ایسے ڈاکو اور لٹیرے دن دھاڑے ایران کو لوٹتے رہتے ہیں ۔

ایران میں شہری آزادی

جس طرح پہلے بیان کر چکا ہوں ایران کا تاج شہنشاہیت برائے نام احمد شاہ قاجار کے سر پر رکھا ہوا تھا بادشاہی درحقیقت آغائے سالار کر رہا تھا ۔ تمام اختیار اس کے ہاتھ میں تھا ۔ ایران میں نمائندہ حکومت ۱۹۱۲ء سے قائم ہو گئی تھی لیکن قوت کا اصل سرچشمہ رضا خان ہی ہے ۔ جب چاہے وہ وزارت توڑ سکتا ہے ۔ فوج اور پولیس دونوں آغائے سالار کے ماتحت ہیں ۔ دونوں محکموں کے اراکین اس سے بہت خوش ہیں ۔

پھر بھی جہاں تک وزارت کے کام کا تعلق ہے تھوڑی بہت شہری آزادی تو موجود ہی ہے ۔ لیکن جب وزارت مستعفی ہوتی ہے تو طہران میں مارشل لاء نافذ ہو جاتا ہے ۔ اخباروں کی اشاعت بند ہو جاتی ہے ۔ قوم پرست انتہا پسند روپوش ہو جاتے ہیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ رات کے بارہ بجے کابینہ مستعفی ہوئی ۔ ہم آغا کے مکان میں سوئے ہوئے تھے ۔ ہمیں جگایا گیا اور راتوں رات ایک اور محفوظ جگہ منتقل کیا گیا ۔ آغا کریم مارشل لاء سے سخت خوفزدہ رہتا ۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے مکان پر کوئی حملہ نہ کر دے ۔

ہم بھی خوفزدہ تھے ۔ ہماری گرفتاری ہمارے لئے مصیبت کا باعث ہوتی کیونکہ نہ تو کسی ذریعے پھر ضمانت کروا سکتے تھے اور نہ ہی ہماری رہائی کے لئے کوئی کوشش کرتا ۔ اگر ہم بتا دیتے کہ ہم ہندوستانی ہیں تو ہمیں تو رہائی مل جاتی لیکن اس سے انگریزی سفیر کی نظروں میں آتے اور اپنے وطن عزیز میں محفوظ طریقے سے داخل ہونا پھر ناممکن ہو جاتا ۔

ہم نے طہران میں دو مہینے گذارے ۔ دو دفعہ ہم نے کابینہ کو مستعفی ہوتے دیکھا ۔ دوسری مرتبہ آغا کریم سہ پہر کو گھر کے اندر داخل ہوئے ۔ سگار منہ میں دبائے انہوں نے ہمیں فوراً وہاں سے

منتقل ہونے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سلطان محمد علی خان کی جگہ محفوظ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ رضا خان سے لوگ بہت خوش تھے۔ کیونکہ اس نے شمالی ایران میں امن قائم کیا تھا اور اس سے اُمید تو یہی تھی کہ وہ سارے ایران میں امن قائم کر لیتا۔

سلطان محمد علی خان

ایران میں فوجی کپتان کو سلطان کہتے ہیں۔ محمد علی طہران میں شہر کی خاص محافظ فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز تھا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہلواتا تھا۔

محمد علی دراصل ذات کا مرہٹہ ہندو تھا۔ پونا شہر کے ایک سکول میں ڈرل ماسٹر تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے شروع ہونے کے ساتھ ہی ہندوستانی انقلابیوں کے ہمراہ وطن عزیز سے ہجرت کی۔

محمد علی اور اس کے ساتھی کسی طریقے سے بغداد پہنچے۔ وہاں سے انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے جنوبی ایران آئے۔ اس وقت انگریز جنوبی ایران پر قابض ہونا چاہتے تھے تاکہ کوئٹہ اور بصرہ کو ملا سکیں۔ جنوبی ایران کے لوگوں نے اس جارحیت کا اچھی طرح سے مقابلہ کیا۔ قبیلے کے سرداروں کی غداری اور رشوت خوری کی وجہ سے لشکر کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے میزبان نے اس وقت سے آغا پہ سلار رضا خان سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔

پہلے جیسے بیان ہو چکا ہے سلطان محمد علی خان طہران کی محافظ فوج میں کپتان تھا۔ ایک رات مجھے اور گوہر دونوں کو گشت پر اپنے ہمراہ لے گیا۔ وہ پہرے داروں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر جگہ جہاں وہ جاتا اس کو سلامی دی جاتی۔ ایک جگہ ایک سپاہی کو سوتے پایا۔ فوراً اسی وقت اس کو محبوس کر لیا اور اس کے افسر کو صبح پیشی دینے کے لئے کہا۔

سلطان محمد علی خان نے ہمیں ایران کے انگریزی استعمار کی بہت سی داستانیں سنائیں۔ ان بہت سی داستانوں میں سے یہ ایک خارجی ممالک میں آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی داستان جو نمونے کے طور پر لکھی جا رہی ہے شاید کسی کے کام آسکے کچھ یوں ہے۔

صوفی صاحب

ایک ہندوستانی جو سلطان محمد علی خان کے شانہ بشانہ انگریزی فوج سے لڑا صوفی صاحب تھا۔ یہ نوجوان بھی ہندو تھا۔ وہ اس بات کو سمجھے ہوئے تھا کہ انگریزی استعمار کا ہر جگہ مقابلہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے اس کا ہندوستان میں مقابلہ ہو رہا ہو۔ ایرانی مجاہدین اس سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اس کو صوفی صاحب کہہ کر پکارتے۔

انگریزی فوج نے جنوبی ایران کی ایک لڑائی میں صوفی صاحب کو پکڑ لیا۔ اس کو پھانسی کا حکم سنا دیا گیا۔ جنوبی ایران میں ایک ماتم برپا ہو گیا۔ لوگ صوفی کے غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ صوفی صاحب ہندی ہے اور اس نے صرف اور صرف ایران کی آزادی کی خاطر اپنی جان کی قربانی دی ہے۔

عوام صبح سویرے میدان کے قریب جمع ہو گئے اور صوفی کی پھانسی کی سزا پر سخت غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ ہندوستانی فوجیں پھانسی کے میدان کے ارد گرد سنگینیں تانے تیار کھڑی تھیں تاکہ اپنے ایک ہم وطن کی جان لے سکیں۔ صوفی کا گناہ یہی تھا کہ اس نے ہندوستان کے دشمن سے جنگ کی تھی۔ شیراز میں مرد و زن سینہ کوبی کر رہے تھے اور صوفی کی پھانسی کی سزا کا سن کر رنج و غم غصہ ظاہر کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب جاری تھے۔ آخری دیدار کے لئے تمام لوگ افسردہ کھڑے تھے۔ اتنے میں یہ خبر آ پہنچی کہ صوفی کی جان تن سے نکل گئی۔ لوگ حیران رہ گئے صوفی کی شہادت سے لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی۔ شیراز میں صوفی کے مزار کی پوری قدر ہے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ اپنے وطن میں سرے سے لوگ اس کو پہچانتے ہی نہیں۔

سلطان محمد علی خان ایرانی مجاہدین کے ہمراہ شیراز سے اصفہان (۱۷۲۰) کی طرف پسپا ہو گیا۔ اصفہان کے گرد و نواح میں ایرانی مجاہدین نے انگریزوں کا سخت مقابلہ کیا۔ لیکن ایرانیوں کی طاقت ختم ہو گئی اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ انگریزی فوج سیدھی طہران پہنچی۔ وہاں سے اس انگریزی فوج کے ساتھ مل گئی جو بغداد سے طہران اور پھر وہاں سے قزوین تک گئی تھی۔

اب ھندوستانی انقلابیوں کے لئے ایران غیر محفوظ تھا۔ محمد علی کے علاوہ باقی سب ایران سے نکل گئے۔ آغائے سالار کی دوستی نے محمد علی کو ایران میں ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ کوچک خان جو ایک موقع پر ایرانی حکومت کی حمایت میں باغیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہوا تھا اور ایک غیر آباد علاقے میں پڑا ہوا تھا۔ وہاں اس نے سپہ سالار سے محمد علی کی سفارش کچھ اس طرح کی تھی

"اس محمد علی ہندی کو اپنے ساتھ رکھو۔ یہ بہت بہادر اور باہمت انسان ہے۔ تمہارے کام آئے گا۔"

۔ یہی وجہ تھی کہ رضا خان نے محمد علی کو طہرانی فوج کا کمانڈر لگایا تھا۔ اور یہی محمد علی کی طاقت کا اصلی راز تھا۔

ہم ہمیشہ نازک وقت میں محمد علی کے گھر پناہ لیتے۔ سلطان کی بیوی ایرانی تھی۔ ہندوستانیوں سے وہ بہت انس و محبت رکھتی تھی۔ ہماری میزبانی کرکے وہ بہت مسرور ہوتی۔ ایک دو دن میں کابینہ کی تشکیل ہوگئی۔ اور ہمیں پھر طہران میں گھومنے پھرنے کی آزادی مل گئی۔

ایران کی فوج

رضا خان سے قبل ایرانی فوج کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے آتے ہی ایرانی فوج کو منظم کیا۔ طہران میں ایک فوجی سکول قائم کیا۔ یہی وہ سکول تھا جو ایرانی فوج کو افسران مہیا کرتا تھا۔ رضا خان کی قابلیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے سکول اور فوج میں ایک بھی فرنگی افسر نہیں رکھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے روس اور انگریز کو کسی شکوے شکایت کا موقعہ ہاتھ آنے نہیں دیا۔ ایرانی فوج کا اسلحہ قابلِ تعریف نہیں تھا۔ بندوقیں یا تو انگریزی ساخت کی ہوتیں اور یا روس کی بنی ہوتی تھیں۔ ایران میں بندوق سازی نہیں ہوتی تھی۔

ایرانی فوج کے ساتھ دوسرا اسلحہ مشین گن اور توپیں تھیں۔ مشین گن اور توپیں بھی بیرونی ملکوں کی بنی ہوتی تھیں۔ لیکن بہت محدود تعداد میں تھیں۔ جب لشکر جنگ کے لئے روانہ ہوتا

اس دن ہم خیابان لالہ زار میں کھڑے تھے۔ سب سے پہلے فوجی درسگاہ کے نوجوان لڑکے سیاہ فوجی لباس میں اور سر پر لوہے اور فولاد کے خود ایستادہ کئے گذرے۔ ان کے بعد پیادہ فوج کے سپاہی گذرے۔ ان کے بعد ایرانی توپخانے کا نمبر آیا۔ فٹ پاتھ پر ہمارے ساتھ ہی کھڑے ایک بوڑھے آرمنی پر بہت زیادہ اثر ہوا اور ہمیں بتلانے لگا کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی منظم فوج نہیں دیکھی ہے۔ ہم نے اس مظاہرے سے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ بڑے ایران کے پایہ تخت جشن نوروز کے دن اتنی قلیل فوج اور چند توپیں گھوڑوں اور اونٹوں پر باندھی ہوئی کوئی خاص بات ہمارے نزدیک نہیں تھی۔ لیکن ایک چیز جس سے ہم بھی بے اثر نہیں رہ سکے وہ یہ کہ ایران اب ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ ایران نے منتشر ہونے سے بچنے کی نشانیاں دکھانی شروع کر دیں۔ ایران میں خارجی سازشوں سے طوائف الملوکی پیدا ہو چکی تھی لیکن دشمن کا دل جلد ہی مارے صدمے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ جب وہ ایران کو متحد دیکھے گا۔ یہ نئی منظم فوج جلد ہی بغاوتوں کی بیخ کنی کرے گی اور ایران ایک آزاد اور مضبوط ملک بن جائے گا۔

ایران کی بری افواج کا ذکر تو کچھ نہ کچھ میں نے بیان کر دیا ہے۔ ہوائی اور سمندری طاقت تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ بحیرہ خضر میں ایک بھی ایرانی جہاز موجود نہیں تھا۔ باوجود اتنی زیادہ اہمیت کے خلیج فارس میں بھی ایک ایرانی جہاز موجود نہ تھا۔ خلیج فارس کے ایک کنارے ایرانی سمندر ہے۔ اگر کبھی یہ آبادی کے قابل ہوا اور ایک سمندری بیڑہ کبھی رکھ سکا تو جنوب کی سمت ایک دشمن بھی ایران پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ خلیج فارس کے دہانے جزیرہ ہرمز واقع ہے۔ جو کہ ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں پر اگر چند جدید قسم کی توپیں رکھی جائیں تو ایک جہاز بھی خلیج فارس سے گذر کر ایران نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ایران نے ابھی تو صرف سانس ہی لی ہے۔ اٹھنے کے قابل نہیں بنا تو وہ بحیرہ ہرمز یا خلیج فارس کی کیا فکر کرے گا۔

ایران کی صنعتی ترقی

ایران میں قابل ذکر کوئی صنعت بھی نہیں ہے۔ سب سے بڑی صنعت جو کہ زمانہ قدیم سے ایران کے نام کے ساتھ مشہور رہی ہے وہ قالین بافی کی ہے۔ یہ قالین بافی کی صنعت بھی بدامنی کی وجہ سے روبہ

اس دن ہم خیابان لالہ زار میں کھڑے تھے۔ سب سے پہلے فوجی درسگاہ کے نوجوان لڑکے سیاہ فوجی لباس میں اور سر پر لوہے اور فولاد کے خود ایستادہ کئے گذرے۔ ان کے بعد پیادہ فوج کے سپاہی گذرے۔ ان کے بعد ایرانی توپخانے کا نمبر آیا۔ فٹ پاتھ پر ہمارے ساتھ ہی کھڑے ایک بوڑھے آرمنی پر بہت زیادہ اثر ہوا اور ہمیں بتلانے لگا کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی منظم فوج نہیں دیکھی ہے۔ ہم نے اس مظاہرے سے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ بڑے ایران کے پایہ تخت جشن نوروز کے دن اتنی قلیل فوج اور چند توپیں گھوڑوں اور اونٹوں پر باندھی ہوئی کوئی خاص بات ہمارے نزدیک نہیں تھی۔ لیکن ایک چیز جس سے ہم بھی بے اثر نہیں رہ سکے وہ یہ کہ ایران اب ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ ایران نے منتشر ہونے سے بچنے کی نشانیاں دکھانی شروع کر دیں۔ ایران میں خارجی سازشوں سے طوائف الملوکی پیدا ہو چکی تھی لیکن دشمن کا دل جلد ہی مارے صدمے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ جب وہ ایران کو متحد دیکھے گا۔ یہ نئی منظم فوج جلد ہی بغاوتوں کی بیخ کنی کرے گی اور ایران ایک آزاد اور مضبوط ملک بن جائے گا۔

ایران کی بری افواج کا ذکر تو کچھ نہ کچھ میں نے بیان کر دیا ہے۔ ہوائی اور سمندری طاقت تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ بحیرہ خضر میں ایک بھی ایرانی جہاز موجود نہیں تھا۔ باوجود اتنی زیادہ اہمیت کے خلیج فارس میں بھی ایک ایرانی جہاز موجود نہ تھا۔ خلیج فارس کے ایک کنارے ایرانی سمندر ہے۔ اگر کبھی یہ آبادی کے قابل ہوا اور ایک سمندری بیڑہ کبھی رکھ سکا تو جنوب کی سمت ایک دشمن بھی ایران پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ خلیج فارس کے دہانے جزیرہ ہرمز واقع ہے۔ جو کہ ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں پر اگر چند جدید قسم کی توپیں رکھی جائیں تو ایک جہاز بھی خلیج فارس سے گذر کر ایران نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ایران نے ابھی تو صرف سانس ہی لی ہے۔ اٹھنے کے قابل نہیں بنا تو وہ بحیرہ ہرمز یا خلیج فارس کی کیا فکر کرے گا۔

ایران کی صنعتی ترقی

ایران میں قابل ذکر کوئی صنعت بھی نہیں ہے۔ سب سے بڑی صنعت جو کہ زمانہ قدیم سے ایران کے نام کے ساتھ مشہور رہی ہے وہ قالین بافی کی ہے۔ یہ قالین بافی کی صنعت بھی بدامنی کی وجہ سے روبہ

تنزل ہے۔ قالین تو ایران میں بن جاتا ہے لیکن راستے پُرخطر ہیں۔ قافلے چلنے مشکل ہیں اس لئے اپنی جگہ پڑا رہتا ہے۔ بیرونی ملکوں کو برآمد نہیں کیا جاسکتا۔ قالین بافی کی صنعت کی ترقی کا دارومدار برآمد پر ہی ہے اور وہ برآمد بدامنی کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر ہے۔

دوسری قابل ذکر صنعت گھر کے بنے ہوئے کھدر کی ہے۔ ایران کو ہندوستان سے سوتی رخت آتا ہے۔ اسی لئے ایرانی جولاہے بیکار بیٹھے ہوئے تھے۔ ہندوستانی کپڑے کی مشینوں کے ساتھ جولاہوں کی کھڈیاں کہاں مقابلہ کرسکتی تھیں۔ معدنی پیداوار ایران میں تمام دنیا سے بیش بہا ہے۔ مٹی کا تیل قدرت کی طرف سے ایران کو عطیہ ہے۔ لیکن انگریزی سامراج نے اسے غصب کیا ہے۔

تعلیم

تمام ایران میں صرف طہران میں تعلیم کا معیار اونچا ہے۔ طہران یونیورسٹی صرف طہران تک ہی محدود ہے۔ طہران سے باہر کے حالات نہ تو تجارت کے لئے اور نہ ہی تعلیم کے لئے مناسب ہیں۔ طہران حکومت کا صدر مقام ہے۔ اس لئے لوگ زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ بھی اسی لئے زیادہ تعداد میں ہیں۔ مرد و زن ایک جیسے تعلیم یافتہ ہیں۔ طبی اور انجینئری کالج طہران میں موجود ہیں۔ ان میں تربیت دینے والے یورپ کے تعلیم یافتہ ایرانی ہیں۔

تھیٹر اور سینما

طہران کے علاوہ ایران میں سینما تھیٹر وغیرہ بالکل نہیں۔ طہران میں بھی سینما اور تھیٹر وغیرہ نیم سرکاری ادارے ہیں۔ اگر حکومت کو ضرورت ہے تو تھیٹر اور سینما موجود ہے ورنہ نہیں۔ طہران کے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع باکو میں کوچے کوچے سینما اور تھیٹر ہیں لیکن طہران میں فرق حیران کن ہے۔

خیابان لالہ زار میں گرانڈ ہوٹل کے نیچے بازار کے دونوں اطراف میں ایک دوسرے کے بالکل سامنے دو سینما ہال ہیں۔ یہ دونوں فوج کے لئے مخصوص ہیں۔ ایک دوست کی مدد سے ہم دونوں نے کیڈٹوں کے ساتھ ایک دفعہ سینما دیکھا۔ نپولین کے حملہ اور اس کی واپسی دکھا رہے تھے۔ ایک بار بالمقابل ہال میں ایرانی ڈرامہ "کاوہ" بھی دیکھا جس میں ظالم بادشاہ کے برخلاف لوگوں کی بغاوت دکھائی گئی تھی۔

قہوہ خانہ

طہران میں قہوہ خانوں میں عام لوگ ہی آتے ہیں۔ وہاں آکر قہوہ چائے پی جاتی ہے۔ ایران میں ہم نے اپنے دو مہینوں کے قیام کے دوران کافی قہوہ خانوں میں چائے پی۔ عجیب چائے ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی شیشے کی پیالیاں ہوتی ہیں، نہ تو اس میں دودھ ہوتا ہے اور نہ ہی شکر ڈالی جاتی ہے۔ لوگ اس کو بڑے شوق سے محفل کے دوران پیتے ہیں۔

ان قہوہ خانوں میں گپ زیادہ ماری جاتی ہے۔ طہرانی دربار کے روسا، امیر اور وزیر معہ اپنے معاملات ذکرِ محفل بنتے ہیں۔ حکومت ایران کی خارجہ پالیسی اور تعلقات بھی زیرِ بحث لائے جاتے ہیں۔ بہت سی باتیں تو ماننے جاننے کے قابل نہیں ہوتیں لیکن لوگ ان کو شوق سے سنتے ہیں۔ ان قہوہ خانوں میں بڑے افسران اور اُونچے اور دولت مند لوگ نہیں آتے۔

طہران سے روانگی

ہمارا طہران میں مکمل قیام کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ اوّل تو ہماری گرفتاری کا خطرہ تھا اور دوسرا ہماری جیب ہمیں وہاں مزید رُکنے کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔

طہران میں تو باقاعدہ حکومت تھی۔ اگر کسی کو ہم پر ذرا بھی شک ہوتا تو گرفتاری لازمی تھی۔ طہران میں ہندوستانی بھی تھے۔ ہمارے بارے میں انگریزی سفارت کو خبر پہنچنے کا خطرہ بھی تھا۔ ایک دن ہم توپخانہ میدان میں ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خوب خوش و خرم تھے اور یہ بھول چکے تھے کہ ہمیں چوری چھپے رہنا چاہیئے کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارا ایک ساتھی ہندوستانی مہاجر جو ترکی میں اور ترکمانوں کی قید کے دوران ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اور پھر ترکمانوں کی قید کے دوران گم ہوگیا تھا۔ ہمارے ساتھ ہی پیٹھ موڑے کھڑا ہے۔ گوہر نے بغل میں کہنی مار کر مجھے اشارہ دیا۔ مہاجر کے دیکھنے سے جان نکل گئی۔ کیونکہ وہ چند ہندوستانی ڈرائیوروں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ ہم وہاں سے سرپٹ دوڑے اور یوں جان بچائی۔

ایک دفعہ ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں "بچہ" نوکر لڑکا آہستہ آہستہ کچھ کہہ کر غرا رہا تھا۔ ہم نے دریافت کیا کہ کیوں کیا وجہ ہے؟ "بچہ" اسی طرح غراتا رہا اور آہستہ سے بولا "نجس ہندی"۔

ہمارے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ہمیں کہہ رہا ہے۔ لیکن جب مڑ کر دیکھا تو ایک پنجابی سوار کو جو انگریزی سفارت خانے میں ملازم تھا کو اونچا شملہ پہنے دیکھا۔ شاید "بچہ" کا روئے سخن اس طرف تھا۔ اس نے میری اور گوہر کی تمام گفتگو سن لی تھی۔ لیکن جب ہماری نظر اس پنجابی پر پڑی تو جلدی سے پیسے ادا کر کے وہاں سے فوراً نکل بھاگے۔

ہم جلد از جلد طہران چھوڑنا چاہتے تھے اور اگر اس طرح کرتے تو فائدے میں رہتے لیکن تمباکوف نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ جلد از جلد شیراز بطور کونسل جائے گا اور ہمیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اس میں ہمیں دو فائدے نظر آئے ایک تو بغیر خرچے کے شیراز تک پہنچ جاتے اور دوسرا راستے میں کوئی پاسپورٹ وغیرہ کے متعلق بھی نہیں پوچھ سکتا۔

اسی طرح آج اور کل میں ہم نے طہران میں دو مہینے گزارے۔ تمباکوف ہمارا مالی فائدہ دیکھ رہا تھا اور ان دو مہینوں کے دوران ہمارے سو تومان خرچ ہو گئے تھے۔ کھانا ہمیں آغا عبدالکریم کی طرف سے ملتا تھا۔ مکان

کا کرایہ ہم ادا نہیں کر رہے تھے تو پھر کیسے ہمارا اتنا مالی نقصان ہوا؟ یہ سب طہران کی ہوشربا گرانی کا ہی نتیجہ تھا۔ سو تومان تقریباً سو ڈالر بنتے تھے۔ لیکن ہم دل ہی دل میں اس کے خرچ کرنے پر افسوس کر رہے تھے۔ طہران ہم دوبارہ پھر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے بھی خوب سیر و تفریح کی۔ کبھی شہر کے گرد و نواح میں بھی پھر لیتے ایک بار شاہ عبدالعظیم کی زیارت بھی کی۔ کئی بار شمران کی سیر کی۔

مئی ۱۹۲۲ء کی سولہ تاریخ تھی جب میں تمباکوف کے ہمراہ طہران سے رخصت ہوا۔ ہر چند میں نے گوہر کے لئے تمباکوف سے بہت اصرار کیا لیکن وہ اس کو لے جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گوہر کے رنگ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے۔ میری کونسل گری کی بدنامی ہو گی۔ آخر گوہر رحمان نے خود ہی کہا کہ وہ ڈاک گاڑی میں شیراز تک جائے گا۔ ڈاک گاڑی کو چھ گھوڑے کھینچتے تھے جو دن رات چلتے تھے میں تمباکوف کے ساتھ موٹر میں روانہ ہوا۔

تمباکوف کی پارٹی میں تین موٹریں تھیں۔ ایک گاڑی جو تمباکوف نے اپنے لئے خریدی تھی اس میں تمباکوف اس کی بیوی اور چھوٹے بچے سفر کر رہے تھے۔ دوسری گاڑی میں تمباکوف کے دو بڑے بیٹے آغا عبدالکریم جو کہ تمباکوف کا سیاسی سکریٹری تھا اور ایک اور شخص تھا۔ تیسری گاڑی میں تمباکوف کے ذاتی ملازمین اور میں تھا۔ تمباکوف ملازموں کے سامنے میرے ساتھ آزادانہ گفتگو نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ ان کے سامنے مجھے "شوفر" کہہ کر پکارتا۔ شوفر یورپ میں ڈرائیور کو کہتے ہیں۔

تمباکوف ملازمین کے سامنے مجھ سے ایسے ہی لہجے میں گفتگو کرتا جیسے ملازموں کے ساتھ مالکوں کا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ان کے سامنے وہ میری دلجوئی ان الفاظ میں کرتا۔

"توارش لیتش (لتویا کے رہنے والوں کو لیتش کہا جاتا ہے) آپ کو بہت تکلیف ہے۔ آپ سرد علاقے کے رہنے والے ہیں اور ایران ایک گرم ملک ہے۔ لیکن افسردہ نہ ہوں آپ شیراز میں آرام سے رہیں گے۔"

ایسی باتیں تمباکوف میرے ساتھ تب ہی کرتا جب اسے پتہ چلتا کہ میں ملازمین کے ہاتھوں سخت تنگ آ چکا ہوں۔ کبھی کبھی تمباکوف اپنے ساتھ کھانے پر بٹھا دیتا۔ میں اسے دبے لفظوں میں کہہ دیتا کہ یہ مناسب نہیں لیکن وہ اصرار کرتا تو مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا ہی پڑتا۔ تمباکوف یہ چاہتا تھا کہ اس کے اور ڈرائیور مجھے تنگ نہ کریں۔ وہ میرے ساتھ حسد کرنے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تو ناواقف اجنبی ہے اگر تنگ کریں گے تو بھاگ جائے گا۔ نوکری کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گا۔ اس کی جگہ ہم لے لیں گے۔ جب کبھی موقع میسر آتا تو تمباکوف اور میں مل کر ہنس لیتے۔ تمباکوف کہتا:

"افسوس میرے ذہن میں ڈرائیوروں کے حسد کا خیال نہیں آیا تھا۔ وگرنہ میں ہرگز تمہارا پیشہ ڈرائیوری سے منسوب نہ کرتا۔ اَب تو مَیں کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں۔"

"اَب میں شوفر ہی ہوں" میں بھی مسکرا کر جواب دے دیتا۔

قم (۶۳)

شام کو ہم قم پہنچے۔ طہران سے قم تک راستہ خشک ہے۔ اور کوئی خاص واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ علی الصبح ہم قم کی زیارت کے لئے گئے۔ ایک بڑا عالی شان گنبد بنا ہوا ہے۔ اسلامی دنیا میں یہ ولی اللہ بہت مشہور ہے۔ کچھ عرصہ قبل قم شہر بہت اچھی حالت میں تھا۔ اب تو ایک غلیظ قصبہ ہے۔ لوگ یہاں کے بدحال ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک ڈھکا ہوا بازار ہے جہاں دھوپ کا گذر نہیں۔ قم قالین کی صنعت کے لئے مشہور ہے۔

اصفہان

طہران سے اصفہان تک کا راستہ بھی خشک ہے۔ اکثر سطح مرتفع ہے۔ جگہ جگہ چشمے اور کاریز یں بہہ

رہے ہیں۔ لیکن اس سے بہت کم زمین سیراب ہوتی ہے۔

ہم اٹھارہ مئی ۱۹۲۲ء کو اصفہان پہنچے۔ وہاں جا کر روسی سفارت خانے میں اترے۔ اصفہان میں ہم نے چار دن گزارے۔ اصفہان میں تمباکوف نے مجھے اپنے ساتھ سفارت خانے میں رکھا۔ میں نے ہر چند اس کو کہا کہ اور ملازمین اور ڈرائیوروں کے ساتھ ہی ٹھیک ہوں۔ لیکن وہ نہ مانا۔ اس کو یہ پسند نہیں تھا کہ میں پھر ڈرائیوروں اور نوکروں کے ہاتھوں مزید تکلیف سہوں۔ قم اور اصفہان کے درمیان اس نے آہستہ آہستہ ڈرائیوروں کو ذہن نشین کرا دیا کہ لیتیش ڈرائیور میرا مہمان ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اصفہان پہنچنے سے قبل ڈرائیوروں نے میرے ساتھ رویہ بدلا۔ ہم کھانا سفیر کے ہمراہ ایک ہی میز پر کھاتے اس کھانے کی میں جتنی بھی تعریف کروں تو وہ کم ہو گی۔ تمباکوف ایک بہت اچھا انسان تھا پہلے دن ہی کھانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا

"دیکھو نا تو ارش! تاشقند اور ماسکو میں کسی کو بھی ایسا کھانا میسر نہیں۔"

مجھے تمباکوف کی تاشقند کی زندگی یاد آ گئی۔ وہ اپنے بال بچوں کے ہمراہ ایم این رائے کے مکان کے ایک کمرے میں فرش پر رہ رہا تھا۔ تمباکوف کے مقابلے میں ہم ہندوستانی اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ دفتر خارجہ میں اس کو ملازمت مل گئی۔ اب تاشقند سے دور ایران میں وہ مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔ پھر بھی تمباکوف اور اس کی بیوی بہت شریف اور ملنسار تھے۔ اگر تمباکوف اور اس کی بیوی کی ہمارے ساتھ پرانی واقفیت نہ ہوتی تو ایران میں میرا اور گوہر کا بہت ہی برا حال ہوتا۔ انہوں نے اس پرانی واقفیت کا خاصا خیال رکھا۔

اصفہان میں تمباکوف نے مجھ سے معافی مانگی لیکن جب میں نے اسے تسلی دی کہ تکالیف تو انقلابی کی زندگی کو آسان بناتی ہیں تو پھر کہیں جا کر اس کو تسلی ہوئی۔

چار پانچ دن میں اصفہان میں خوب گھوما پھرا۔ ایران کے قدیم بادشاہوں اور خصوصاً خاندان عباسیہ کے بادشاہوں کی یادگاریں دیکھیں۔

اصفہان ایران کے بالکل درمیان واقع ہے۔ زمانہ قدیم میں اصفہان ہمیشہ ہی صدر مقام رہا ہے۔ تھوڑے عرصے سے طہران پایہ تخت بنا ہے۔ اصفہان ایک قدیم شہر ہے۔ تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز بھی ہے۔ اصفہان

کے گرد و نواح خوب زرخیز ہیں۔ آب پاشی کاریزوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ جن میں کہیں کہیں چھوٹی نہروں جتنا پانی ہوتا ہے۔

ایمپیریل بینک آف پرشیا۔ اصفہان

طہران سے میں اپنے ہمراہ چند ایرانی نوٹ اصفہان لایا تھا۔ دکاندار اسے قبول نہیں کر رہے تھے مجھے کہا گیا کہ بینک میں ان کو تبدیل کروں۔ بینک میں مجھ سے ہر تومان کے بدلے ایک قران لیا گیا اور اس کے بدلے میں نئے نوٹ دیئے گئے جن پر تحریر تھا

"ایمپیریل بینک آف پرشیا۔ اصفہان"

پرانے نوٹوں پر اصفہان کی جگہ طہران لکھا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ ایران کے ہر ایک صوبے میں ایمپیریل بنک کی شاخ موجود ہے۔ یہ شاخیں اپنے اپنے صوبوں کے لئے نوٹ جاری کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ ایک صوبے کا نوٹ دوسرے صوبے میں نہیں چلتا۔ بینک اپنا کمیشن لے لیتا ہے اور بدلے میں اپنے صوبے کا نوٹ دے دیتا ہے۔

ایران اپنے نوٹ جاری نہیں کر سکتا۔ صرف ایمپیریل بینک آف پرشیا نوٹ جاری کرنے کا حق رکھتا ہے ایران کی تمام تجارت بیرونی ممالک کے ساتھ اسی بینک کی وساطت سے ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے ایران کے اقتصادی ذرائع انگریزی ایمپیریل بینک آف پرشیا کے ہاتھ میں ہیں۔

تہران اور اصفہان کے درمیان اقتصادی لوٹ کا ایک اور طریقہ بھی میری نظروں میں آیا۔ طہران اور قم کے درمیان جگہ جگہ ایک بیرونی کمپنی کا محصول چونگی مقرر ہے۔ ان کمپنیوں کو سڑک اجارہ کے طور پر دی گئی تھی جتنے بھی تجارتی مال، موٹریں یا گاڑیاں اس سڑک سے گزرتیں تو ان کو محصول ادا کرنا پڑتا۔ آگے چل کر پتہ چلا کہ اس طرح تمام بڑی بندرگاہوں کا محصول بھی فرنگیوں کے ہاتھ رہن ہے۔

جنوبی ایران میں تیل کا ٹھیکہ بھی انگریزی کمپنی کے پاس ہے۔ ان مراعات کو محفوظ رکھنے کی خاطر انگریزوں نے جنوبی ایران میں ایک فوج پولیس کے جامے میں ٹھہرائی ہوئی تھی۔ ان کو مزید مضبوط رکھنے کی خاطر ایرانی مجلس کے چند اراکین کو بھی خفیہ طور سے باتنخواہ رکھا ہوا تھا۔ تاہم اس قسم کے اراکین ایران میں صاف

آشکارا تھے۔ ان کو انگریز کا "حامی" کہا جاتا تھا۔ اور جو اراکین روس کی حمایت کرتے ان کو روس کا طرفدار کہا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں انقلاب روس کی بدولت روس کا یہ طبقہ ختم ہو چکا تھا۔ اور یہ بدنامی صرف انگریز دوستوں کے حصے میں آ رہی تھی۔

اصفہان میں سب سے بڑا کوچہ چہار باغ ہے۔ طہران میں اتنا کشادہ کوچہ نہیں ہے۔ یہ کوچہ تاشقند کے مرکزی کوچے جتنا وسیع ہے۔ کوچے کے درمیان پکی سڑک ہے۔ اس پر گاڑیاں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ سڑک کے مشرقی طرف سراسر تیس فٹ چوڑا پارک ہے۔ سڑک اور پارک کے دونوں اطراف پیدل چلنے والوں کے لئے راستہ ہے۔ مغربی سرے پر پھر سراسر باغ ہے۔ اس سے آگے دکانیں ہیں۔ جنوبی سمت بھی دکانیں ہیں اخباروں کے دفتر بھی اسی طرف ہیں۔ اصفہان ایک قدیم شہر ہے لیکن صفائی صرف چہار باغ میں ہے باقی شہر میں صفائی کا خاطر خواہ انتظام نہیں۔

شراب خوری

تمام ایران میں شراب عام طور سے پی جاتی ہے۔ شہروں اور دیہاتوں میں شراب بنتی ہے اور پی جاتی ہے۔ اصفہان کے قریب جلفہ نامی گاؤں ہے۔ اس میں اکثر آرمنی عیسائی رہتے ہیں۔ شراب فروشی ان کا کاروبار ہے۔ تاہم ایرانی مسلمان بھی شراب سازی، فروشی اور نوشی میں آرمنی سے کسی طرح کم تر نہیں۔

ہمارا طہرانی میزبان آغائے عبدالکریم بھی ہمارا ہم سفر تھا۔ وہ تمباکو کا ایرانی سیکرٹری تھا۔ اصفہان سے رخصت ہوتے وقت وہ جلفہ گیا اور کافی خریداری کی۔ یہ نوجوان دن رات شراب کے نشے میں مدہوش رہتا۔

ایران میں شراب دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو عرق جو چھوٹی بوتلوں میں فروخت ہوتی ہے اور بہت تیز ہوتی ہے۔ آغائے عبدالکریم یہی پیا کرتا تھا اور سرخ آنکھیں لئے اِدھر اُدھر گھوما کرتا تھا۔ دوئم عام شراب ہے جو ایران کے لوگ انگوروں سے بناتے ہیں۔ انگوروں کو خراب کر کے ان کو نچوڑ لیتے ہیں اور پھر اسکو بڑی بڑی بوتلوں میں فروخت کرتے ہیں۔ یہی وہ شراب تھی جو ایرانی انقلابی حضرات اور تاشقند کے صدر صاحب نے واپسی پر گاڑی میں ہمارے پیسوں سے نوش کی تھی۔

ہر وطن میں شراب خوری موجود ہے۔ دولت کے ساتھ عیاشی آتی ہے۔ شراب خوری عیاشی کا ضروری جزو ہے۔ اکثر علاقوں میں شراب خوری شہروں تک ہی محدود ہے لیکن ایران کے دیہات بھی اس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

شراب خوری یورپ میں بھی عام ہے۔ لیکن اس نے ان کے ذہنوں پر اتنا قبضہ نہیں کیا ہے۔ ایران ایک زوال پذیر ملک ہے۔ اس وطن کے بڑوں کا ذہن اور ضمیر دونوں شراب کے چنگل میں گرفتار ہیں ۔ ایرانی شرابیوں نے اپنے وطن کو یورپ کی شرابوں کے عوض بیچ دیا ہے۔ انہوں نے ایران کو بھلا دیا ہے۔ اُن کے لئے ایران ایک بے قیمت چیز ہے۔ ایران کی نئی نسل کو جدوجہد کرنی پڑے گی تب ہی اس قابل ہو سکیں گے کہ خارجی اور داخلی دشمنوں سے وطن کا دفاع کر سکیں۔

پڑھنے والے اپنے ہاں بھی یہ خرابی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے اکثر روسا بھی خارجی حکمرانوں کی ہر اچھے بُرے میں ساتھ دیتے ہیں۔ ان کو اس بات پر شرم بھی نہیں آتی کہ آزادی پسندوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ سب سے بُری بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو برحق سمجھتے ہیں۔ پشتون بڑے بوڑھے شراب خوری کی لعنت سے تو بچے ہوئے ہیں پھر بھی اپنی بڑائی اور بزرگی انگریزی سامراج کی مدد سے جتانا چاہتے ہیں۔

ایران کے معززین نے بھی رضا خان کی آمد سے پیشتر کئی مرتبہ ایران غیروں کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ وہ بھی ہمارے وطن فروشوں کی طرح سودے کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے انہوں نے ایران بہت سستا بیچا۔ ایک بڑا بنگلہ ہمراہ بڑا باغ، ماہ جبین اور شراب۔ جب یہ چیزیں ان کو حاصل ہو جاتیں تو وطن کی قیمت ان کے نزدیک اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

اصفہان سے روانگی اور لیٹروں سے مقابلہ

پانچویں دن ہم اصفہان سے روانہ ہوئے۔ سفیر اور اس کے بال بچوں کے علاوہ اس کا روسی ڈرائیور جو کہ ایک سپاہی تھا۔ آغا عبدالکریم، دو اور ڈرائیور اور میں اس ٹولی میں شامل تھے۔ اصفہان سے تقریباً پچاس میل کا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ اگلی دونوں گاڑیاں رُک گئیں۔ تمباکوف کا محافظ روسی سپاہی معہ

اپنی سات ایم ایم روسی رائفل کے گاڑی سے اترا۔ وہ سڑک کے بائیں طرف چلا۔ تمباکوف کا اپنا روسی ڈرائیور بھی ایک تندرست و توانا آدمی تھا۔ وہ بھی گاڑی سے اترا۔ ہاتھ میں اپنا بڑا پستول لئے محافظ سپاہی سے چند قدم پیچھے وہ بھی اسی سمت روانہ ہوا۔ شاہی راستے کے سرے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس پہ ایک برج بنا ہوا تھا۔ برج سے نیچے سڑک کے کنارے تقریباً پچاس قدم دور ایک آدمی کا صرف سر کندوں سے نظر آرہا تھا اس کے ہاتھ میں بندوق تھی جس کا رخ وہ ہماری طرف کئے ہوئے تھا۔ سپاہی اور ڈرائیور دونوں اس کے اِدھر اُدھر کھڑے ہو گئے اور اس کا نشانہ باندھ لیا۔ برج سے بھی آٹھ دس بندوقیں نکلتی دکھائی دیں۔ انہوں نے ہمیں للکارا کہ ہلنا نہیں۔ برج سے دو آدمی بندوقیں ہاتھ میں لئے نیچے اترے ہمارے نزدیک آئے اور فارسی میں کہنے لگے

"ما بہ فیرنگی کار نداریم۔ راہ خود بگیرید" (ہمیں فیرنگیوں سے کوئی غرض نہیں۔ اپنا راستہ پکڑو)

سرکاری چوکی پر لیٹروں کا قبضہ تھا۔ یہ لیٹرے ارد گرد کی پہاڑیوں سے اترے تھے۔ وہ لوگ آنے والے قافلے کے منتظر تھے۔ پھر آگے چل کر پتہ چلا کہ انہوں نے قافلے والوں سے ایک بھاری رقم ہتھیالی۔ پھر کہیں جا کر ان کو آگے جانے دیا۔ اصفہان کی حکومت کی کمزوری ہی تھی جو اصفہان کے اتنے قریب قافلے لوٹے جا رہے تھے۔ سپہ سالار رضا خان کے نئے لشکر کا انتظار تھا۔ حالات افسوسناک تھے۔ رضا خان کے نام سے لوگ امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ ہمیں بھی یہ یقین تھا کہ جلد از جلد ان لٹیروں کا خاتمہ کر لیا جائے گا۔ کیونکہ رضا خان ہر قیمت پر امن چاہتا ہے۔

یزدجرد (گرد) (۶۴)

سفیر نے قافلے کو روانہ ہونے کا اشارہ کیا۔ اصفہان سے آگے سڑک نہیں تھی۔ اترائی، چڑھائی، کھائیاں، نالے، میدان اور ڈھلوان ہی ہماری سڑک تھی۔ سارے دن میں مشکل سے ڈیڑھ سو میل کا ناصلہ طے کیا ہو گا۔ شام کو تھکے ماندے سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی آبادی میں رات آئی۔ چارپائی میسر نہ آسکی سفیر صاحب نے بھی زمین پر ہی رات گذاری۔ انڈوں اور چوزوں کی بہتات تھی۔ کھانا پیٹ بھر کر ملا اور

پھر سو گئے۔ ہم لوگ پوری طرح مسلح تھے۔ باری باری پہرہ دیتے رہے حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔

دوپہر سے پہلے یزدجرد پہنچے۔ یہ ایک پرانا قصبہ ہے۔ قدیم زمانہ میں ایران کا پایہ تخت تھا۔ لیکن اب یوں دکھائی دے رہا ہے جیسے چڑیوں نے گھونسلے بنائے ہیں۔

مَیں نے ساؤتھ پرشین رائفلز کا ذکر پہلے بھی کیا ہے۔ انگریزوں نے بوشہر سے یزدجرد تک سڑک بنائی ہے۔ وہ روسی انگریزی عہدنامے کے تحت ایران سے نکلے تھے لیکن سڑک ان کی رہ گئی تھی۔ ہم یزدجرد میں نہیں ٹھہرے۔ یزدجرد کی چڑھائی چڑھنے میں مقامی لوگوں نے ہماری کافی مدد کی۔ سفیر نے ان لوگوں کی تصاویر اتاریں اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ سفیر کے محافظ سپاہی کی خوبصورت اور دلکش جوانی کی لوگ چپکے چپکے فارسی زبان میں تعریفیں کرتے رہے۔ بیس سال کی عمر میں خدا تعالیٰ نے اس کو مضبوط اور دلکش جوانی عطا کی تھی۔

طہران سے شیراز تک کی سڑک

یزدجرد سے شیراز تک سڑک اچھی ہے۔ موٹر کے لئے بنی ہے۔ لیکن طہران سے یزدجرد تک والی سڑک موٹر کے لائق نہیں۔ تمباکوف طہران میں موٹر خریدنا چاہتا تھا۔ موٹر کی قیمت زیادہ تھی۔ اور راستہ خراب تھا۔ اسی لئے اس نے نہیں خریدی۔ اس طویل اور دشوار سفر سے نئی گاڑی بھی پرانی ہو جاتی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ طہران سے شیراز تک کے کرایہ پر نئی گاڑی مل سکتی ہے تو اس نے ایک گاڑی تو کرایہ پر لی جبکہ ایک استعمال شدہ گاڑی خرید لی۔

ہمارا یہ اندازہ تھا کہ طہران سے ہم اوسطاً بارہ میل فی گھنٹہ رفتار سے جا سکتے ہیں۔ یزدجرد کے نزدیک والی چڑھائی پر لوگوں نے ہمارے ساتھ کافی مدد کی۔ اس وقت یہ منظر دیکھ کر مجھے وطن عزیز یاد آیا۔ جب فیرنگی کی گاڑی کہیں پھنس جاتی تو مقامی لوگ جمع ہو کر اس کی گاڑی نکالتے اور فیرنگی کمر پر ہاتھ باندھے انہیں دیکھتا رہتا۔ ایسے وقت میں مَیں بہت کڑھتا۔ میرے ذہن میں یہاں بھی یہ سوال آیا کہ ایران تو آزاد بھی ہے پھر یہاں کے لوگ کیوں فیرنگیوں کی اتنی خوشامد کرتے ہیں۔ اس کا جواب دینا مشکل تھا۔ ایرانی بظاہر تو آزاد تھے لیکن

فرنگی نے ان کے ذہنوں کو غلام بنایا تھا۔ انگریز نے فوج کے بل ہم پر حکمرانی کی۔ لیکن ایران میں اس نے ایسے حربے اختیار کئے جو بظاہر ہمیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

راستے کی خرابی اور دشوار گذاری کا اس سے بآسانی پتہ لگ سکتا ہے کہ طہران سے شیراز تک ہمیں دوسری کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔ آنا جانا پا پیادہ یا خچروں اور اونٹوں کے ذریعے ہوتا۔ تاہم طہران سے شیراز تک کا راستہ اچھا ہے اسی لئے موٹر کی آمد و رفت ممکن تھی۔

انزلی سے طہران تک سڑک بھی اچھی ہے۔ اس پر عام گاڑیاں چلتی نظر آتی ہیں۔ پختہ سڑک ہے ایران کی شمالی سڑکیں زار روس نے بنوائی تھیں اور جنوبی سڑکیں انگریز نے بنوائی تھیں۔ جنوبی راستوں پر انگریز کی آمد و رفت بغداد، ہمدان اور طہران کی راہ پر تھی۔ بندر لبوشہر سے شیراز کے راستے یزدجرد تک انگریزوں نے ساؤتھ پرشین رائفلز کے لئے کچی سڑک بنوائی تھی۔

ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل انگریزوں اور بالشویکی روس کے درمیان معاہدہ ہو چکا تھا۔ دونوں طاقتوں نے ایران سے اپنی فوجیں واپس بلوالیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ یزدجرد اور بندر لبوشہر کے درمیان والا راستہ بغیر مرمت پڑا ہوا تھا۔ شیراز اور بوشہر کے درمیان تو گاڑی چل ہی نہیں سکتی تھی اس کی مرمت کون کرواتا ایران میں حکومت تو برائے نام ہی تھی۔ اور وہ بھی بڑے بڑے شہروں تک ہی محدود تھی۔ شیراز سے بوشہر تک کا میرا سفر ان حالات اور سڑک پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔

شیراز

مئی کی چھبیس تاریخ تھی جب ہم شیراز پہنچے۔ میں اور نمباکوف کا سیکرٹری آغائے عبدالکریم شہر سے کچھ دور قافلے سے جدا ہوئے اور دوسری طرف سے شہر میں داخل ہوئے۔ نمباکوف اپنے عملے سمیت روسی سفارتخانے گیا۔ کریم نے مجھے ایک چھوٹے سے گارے کے بنے ہوئے مکان میں ٹھہرایا۔ ایران میں عام آدمی زمین میں بیٹھتے اور سوتے ہیں۔ اس مکان میں صرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا وہ بھی کھڑکیوں اور روشندانوں کے بغیر میرے لئے وہاں ایک چھوٹا سا ہاتھ کا بنا ہوا دیسی قالین بچھایا گیا تھا۔ اس پر میں بیٹھ گیا۔ ایسے پرخطر سفر میں

اگر کوئی محفوظ جگہ دیکھنا چاہے تو اس سے بہترین پناہ گاہ کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے مکان کو دیکھتے ہی میں بہت خوش ہوا۔ آغائے عبدالکریم چلا گیا اور میں وہیں ٹھہر گیا۔ میں نے صحن کا دروازہ اندر کی طرف سے بند کر لیا۔ اور قالین پر لیٹ گیا۔ جب اپنے اردگرد دیکھا تو چاروں طرف دیوار پر تازہ بلغم پڑے نظر آئے۔ اس سے طبیعت بہت خراب ہوئی۔ الٹیاں ہوئیں۔ پھر آنکھیں بند کیں لیٹ گیا اور اس بلغم کا خیال ذہن سے نکالنا چاہا لیکن ناکامی ہوئی۔ کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر صحن میں دھوپ تھی سایہ کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا بس صرف یہی ایک کمرہ تھا۔ نہ ہی صحن میں کوئی درخت تھا۔ جس کے نیچے میں گزارا کر سکتا۔ دھوپ میں بیٹھنا گوارا کیا۔ جب دھوپ کی تمازت سے تنگ آجاتا تو ادھر اُدھر پھرنا شروع کر لیتا۔ کہیں پھرتا کہیں رُکتا۔ کبھی ایک جگہ بیٹھتا اور کبھی دوسری جگہ۔ مئی کے مہینے کے آخری ایام تھے۔ گرمی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ مشکل سے ایک گھنٹہ ہی گزر پایا تھا کہ پھر کمرے میں داخل ہوا۔ آنکھیں بند کیں قالین پر لیٹ گیا۔ سہ پہر کو آغائے عبدالکریم آیا۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر افسوس کا اظہار کیا۔ جلد ہی باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں ہی ایک ایرانی ڈاکٹر کے گھر میرے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ دوائی پلوائی اور پھر میرے اوپر رہنے کا بندوبست کیا۔ رات تک مجھے اکیلا چھوڑا۔ رات کو آغائے عبدالکریم اور ڈاکٹر دونوں آئے۔ میری طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ رات وہیں گزاری۔ اور دوسرے دن کی شام کو اور کہیں لے جایا گیا یہ مختصر لیکن صاف ستھری جگہ تھی۔ دن رات کوئی نظر نہیں آیا۔ آغائے عبدالکریم رات کے کھانے کے بعد روزانہ آتا اور مجھے ساتھ لے کر نزدیک ہی خیابان خان خانان میں گھماتا پھراتا۔ یہ ایک نئی سڑک تھی۔ اس لئے دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ اس جگہ پھرنے سے میری طبیعت بہت خوش ہو جاتی۔

دو چار دن کے بعد وہاں میں تنہائی سے اکتا گیا۔ مجھے طہران اور وہاں گھومنے پھرنے کی آزادی یاد آتی۔ وہاں کا خیابان لالہ زار اور توپخانہ میدان یاد آیا۔ کبھی کبھی آغائے عبدالکریم سے پوچھتا کہ شیراز کی آبادی کتنی ہے؟ یہاں کا بازار کیسا ہے؟ ساتھ ہی میں کہتا:

"یہ بہت عجیب سی بات نہیں ہوگی کہ میں نے شیراز کے تاریخی شہر میں اتنا قیام کیا اور اسے دیکھے بغیر ہی یہاں سے چلا جاؤں۔"

آغائے عبدالکریم مسکراتے ہوئے جواب دیتا:

"تم انقلابی ہو۔ سیاح تو نہیں۔"

ان باتوں کے اگلے دن ہی چائے پینے کے بعد ایک لڑکا آیا۔ اس وقت میں معمول کے مطابق تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آکر کہا کہ آغائے عبدالکریم نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کو شیراز کی سیر کرانی ہے تھوڑی دیر میں ہم حافظ کی قبر کے سبزہ زار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دن جمعہ تھا شیراز میں جمعہ کی جمع کو حافظ کی قبر پر میلہ لگتا ہے۔ قبر کے ارد گرد بڑا سبزہ زار ہے۔ اس میں اچھے اور خوش نما پھول ہیں۔ جگہ بہ جگہ درخت لگے ہوئے ہیں۔ درختوں کے سایوں میں دوست اور ہمدم بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ چائے کا دور چلتا ہے میں اور ایرانی لڑکا بھی ایک طرف ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ لڑکا آہستہ آہستہ بے تکلف ہو رہا تھا۔

"دل چاہے تو عرق بھی موجود ہے۔" وہ بولا۔

"شکر" میں نے جواب دیا۔ "مجھے چائے ہی پسند ہے۔" دس گیارہ بجے تک وہاں بیٹھے رہے۔ آہستہ آہستہ میلہ ختم ہو گیا۔ ہم بھی واپس اپنی جگہ آ گئے۔

رات گئے تمباکوف نے مجھے بلوایا۔ کھانے کے بعد جب تنہائی ہوئی تو اس نے مجھے مطلع کیا کہ چند دن بعد قافلے کے ہمراہ تم نے بوشہر کے بندرگاہ جانا ہے۔

"عزیز (گوہر) ابھی نہیں پہنچا ہے؟" میں نے پوچھا

"تمہارا اور عزیز دونوں کا ایک ساتھ جانا اچھا نہیں ہے۔ تمہیں آگے جانا ہے۔ جبکہ عزیز تمہارے پیچھے پیچھے ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔

شیراز میں میرا قیام دس دن رہا۔ اس دوران تمباکوف نے مجھے دو تین دفعہ رات کو اپنے ہاں طلب کیا۔ جب بھی میری اس سے ملاقات ہوتی تو میری تکلیف پر وہ افسوس کا اظہار کرتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ ایران میں موجود تھا۔ انزلی میں ہم نے اس کی بیوی اور بچوں کی تھوڑی سی خدمت کی تھی۔ اس کی بیوی نے طہران میں ہماری موجودگی میں اس سے ہماری پُرزور سفارش کی جیسے ہم نے اس کی کوئی خاص

خدمت کی ہے۔

یہ بھی ہماری خوش نصیبی ہی تھی کہ تمباکوف کے ساتھ تاشقند میں ہماری واقفیت ہو چکی تھی۔ اس نے ہندوستانیوں کے ساتھ چند دن گزارے تھے۔ تمباکوف جب تاشقند آیا تو وہاں اس کو رہنے کی جگہ نہیں ملی۔ رائے کے مکان کے ایک کمرے میں چند دن معہ بال بچوں کے گزارے۔ یہ ان ہی دنوں کی برکت تھی کہ اس کی ہمارے ساتھ واقفیت پیدا ہو گئی تھی۔

اگر ایران میں تمباکوف نہ ہوتا تو ہماری حالت خراب ہوتی۔ معلوم نہیں اگر وہ شیراز میں سفیر مقرر نہ ہوتا تو کس طرح ہم وطن پہنچنے میں کامیاب ہوتے۔ ہمارے ایک دوست محمد شفیق کو افغانستان کی حکومت نے وہاں سے نکالا۔ اسے مجبور کیا گیا کہ کابل سے ہرات تک کا سفر پا پیادہ طے کرے۔ وہ اس دشوار سفر، بھوک اور پیاس سے اتنا تنگ آ گیا کہ اپنے آپ کو سیستان میں انگریزی سفارت کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گیا۔ شفیق سیستان سے بطور قیدی کوئٹے کے راستے پشاور لایا گیا اور وہاں تین سال قید کیا گیا۔ شفیق تو سستا چھوٹا۔ مجھے ایسے انقلابیوں کے متعلق بھی معلوم ہے جو اپنے وطن سے دور تنگ ہو کر خودکشی کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور انگریزی استعمار کے ہاتھوں آغائے صوفی کی طرح کے بہت سے ہم وطن سولی پر بھی چڑھے ہیں۔ ہر انقلابی کی سب سے بڑی خوشی اپنے محبوب وطن کی آزادی کی خاطر قربان ہونا ہی ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ بہت سے آزادی کی شمع کے پتنگ غیر ممالک میں اس شمع پر جل کر قربان ہو گئے۔ وہ لوگ آزادی کی تاریخ لکھتے وقت گمنام ہی رہ جائیں گے اور ان کی ارواح ہر سال جشن آزادی کے موقع پر یتیموں کی طرح حسرت و یاس کی تصویریں بنی کھڑی ہوں گی۔

شیراز سے بوشہر تک

خچر والے موٹر ڈرائیوروں سے کم نہیں۔ دسویں روز میں نے جانے کی تیاری مکمل کر لی۔ اس اثنا میں عبدالکریم نے گوہر کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ گوہر نے طہران تک ڈاک گاڑی میں دن رات سفر کیا اور اکیسویں دن یہاں پہنچا۔ ڈاک گاڑی کو مضبوط گھوڑے کھینچتے ہیں اور ہر پڑاؤ پر گھوڑے بدلائے جاتے ہیں۔ ایران میں

سرحد کے بعد آمد و رفت کا اہم اور بہتر ذریعہ یہی گاڑی ہے۔ دن کو دھوپ کی گرمی اور شب بیداری سے گوہر کا رنگ مرجھا گیا تھا۔ گوہر کو ایک اچھا میزبان معہ پڑاؤ مل گیا تھا۔ اس کا میزبان ایک بڑا سوداگر تھا۔ اس کے عقلے کا کام یہ تھا کہ تھکانے بلے سفر کے بعد گوہر کو آرام کی بہت سخت ضرورت تھی۔ آرام کا وہ مستحق بھی تھا۔ مجھے آغائے عبدالکریم وہاں لے گیا تاکہ میں آگے نامعلوم منزل پر جانے سے پہلے رخصت تو لے سکوں۔

قافلے کے روانہ ہونے سے تھوڑی دیر پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں خچروں والے کے لباس میں اس کے پاس گیا۔ میں نے بارہ آنے والی ایک سیاہ کھلے پائنچوں والی شلوار پہن رکھی تھی اور ایک باریک سستے کپڑے کی عبا پہنے ہوئے تھا۔ داڑھی بڑھائی تھی اور ایرانی دیہات کی کالی ٹوپی بھی سر پر رکھے ہوئے تھا۔ گھر کے بنے ہوئے تاروں والے بوٹ بھی پاؤں میں پہنے ہوئے تھا۔ اس عجیب ہیئت کذائی میں میں اپنے ساتھی سے رخصت لینے جب اس کے پاس پہنچا تو وہ خوش ہوا۔ مسکراتے ہوئے بولا

"بھائی! تم تو پکے ایرانی خچر والے ہو گئے ہو۔ کوئی پہچان نہیں پائے گا۔"

جس طرح بیان کر چکا ہوں گوہر ایک سوداگر کے ہاں ٹھہرا تھا۔ ایک پوری طرح آراستہ کمرے میں صوفہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے صوفے پر میں بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ میرے دریافت کرنے پر گوہر نے بتایا کہ کرائے کی عمارت ہے۔ سوداگر ہزاروں تومان کما رہا ہے۔

"اچھا ہی ہے جو تمہیں نہیں جانتا" میں نے کہا۔

وہ فوراً بولا "نہیں! رفیق ہے" مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے ساتھی کو آرامدہ جگہ مل گئی ہے۔ اس کے بعد میں نے ان سے رخصت لے لی۔

سہ پہر کو ہمارا قافلہ شیراز سے روانہ ہوا۔ میں ایک مضبوط یابو پر سوار تھا۔ شیراز میں میں نے ایک خورجین خریدی تھی وہ نیچے پڑی ہوئی تھی۔ شاہی راستے کے دونوں طرف انگور کے باغات تھے جو تیز ہوا میں لہلہا رہے تھے۔ انگور کے پودوں کو چھوٹے چھوٹے چھپروں پر پھیلا دیا گیا تھا۔ نظارہ قابلِ دید تھا۔

شیراز سے دو میل باہر پہلی سرائے ہے۔ شیراز کا قافلہ اس سرائے سے روانہ ہونا تھا۔ میری سواری کے لئے مضبوط اور چوڑا یابو تھا۔ میرے لئے اسپر پالان ڈالا گیا تھا۔ چوڑے پالان کا فائدہ چند دن بعد رات

کے سفر میں سامنے آیا۔

جس کسی نے بھی وسط ایشیا اور ایران میں قافلوں کے ہمراہ سفر کیا ہے ان کو معلوم ہی ہوگا کہ پانی اور کھانے پکانے کے برتن ساتھ لے جانا چاہیں۔ عبدالکریم نے میرے لئے کوئی ایسا بندوبست نہیں کیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس کا اس طرف کوئی خیال ہی نہیں گیا اور اس کی بڑی وجہ ایک یہ تھی کہ خچر والے سب اس کے ہم وطن تھے اور اس نے مجھے ان کے حوالے کیا تھا۔ لیکن خچر والے کی کیا تعریف کروں۔ بس ڈرائیور طبقے کو دیکھئے بالکل اسی طرح کے ہیں۔

علی الصبح قافلے نے کوچ کیا۔ قافلہ حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ہر ایک حصے کا ایک امیر تھا۔ اور سب قافلے کا ایک سالار تھا۔ میری خوش قسمتی تھی یا بدنصیبی کہ قافلے کے سالار والے حصے میں آیا۔ وہ خوبصورت مضبوط اونچے قد والا آدمی تھا۔ چوڑی چھاتی رکھتا تھا۔ سخت زندگی، تمام عمر سفر اور جنوبی ایران کی گرمی نے اس کا رنگ جھلسا دیا تھا۔ بے تعلیم تھا لیکن گفتگو ایسی کرتا جیسے شیراز کا حاکم ہو۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ آغا نے مجھے اس کے حوالے کیا تھا لیکن اس کا حوالے کرنا میرے لئے اچھا ثابت نہیں ہوا۔ صبح سویرے ہی ایک چاروادار (ایران میں خچر والے کو چاروادار کہتے ہیں) نے آکر مجھے لات مارتے ہوئے کہا

"اٹھ کر اپنے خچر پر پالان ڈالو۔"

میں فوراً اٹھ گیا۔ خچر پر اپنے پالان ڈال کر اس پر خورجین کو پھیلایا۔ اور سرائے سے باہر کھڑا ہو گیا۔ قافلہ آہستہ آہستہ تیار ہو کر سرائے سے باہر نکلا۔ روشنی پھیلی اور قافلہ تیار ہو گیا۔ لیکن رکا رہا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ کیا وجہ ہے؟ اتنے میں سرائے سے چار ایرانی باوردی سرباز نکلے۔ باتیں سب کے سامنے ہی ہو رہی تھیں۔ سپاہی کازرون تک قافلے والوں کو بحفاظت پہنچانے کے پچاس تومان مانگ رہے تھے۔ قافلے والے تیس سے زیادہ دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ آخر قافلے نے کوچ کیا۔ ایران میں حکومت صرف شہروں تک ہی محدود ہے۔ شاہراہیں غیر محفوظ ہیں۔ اسی لئے حفاظت کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

راستہ خشک اور بنجر تھا۔ پانی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ گرمی بھی قابلِ برداشت تھی۔ گذارا ہو رہا تھا اس لئے میں نے کسی سے پانی نہیں مانگا۔ ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ اگر کسی سے مانگتا بھی تو ملنا نہیں تھا۔ سہ پہر

کو دوسرے پڑاؤ پہنچے۔ بغیر دودھ والی کڑوی چائے اور روٹی بک رہی تھی۔ شکر ادا کیا کہ روٹی کے لئے کسی چار دیدار کا محتاج نہیں رہا۔

اگلی صبح ابھی تھوڑا ہی راستہ طے کرنے پائے تھے پڑاؤ ابھی نظروں کے سامنے ہی تھا اتنے میں قافلے پر فائروں کی آوازیں سنائی دیں۔ پڑاؤ سے آگے ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ ہم اس کے کنارے ٹھہر گئے نزدیکی ایک گاؤں سے سواروں کی آوازیں سنائی دیں وہ چوروں کا پیچھا کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد چوروں کے کچھ سامان سمیت وہ سوار واپس آتے دکھائی دیئے۔ چوروں کے پاس گھوڑے تھے اس لئے وہ دیہاتی سواروں سے بچ کر نکل گئے۔

ہمارے سالار قافلہ کے دل میں ڈر پیدا ہوا اس نے فوراً حکم دیا کہ قافلہ اکٹھا سفر کرے۔ بارکہ وہ خچروں کے ارد گرد نوجوان چلنا شروع ہوئے۔ سالار آگے آگے چل رہا تھا۔ چہل دختر کی پہاڑی کے آگے ڈاکے کا ڈر تھا ہر وقت یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارا لوٹا جانا یقینی ہے۔ میرے یابو کا مالک میرے پیچھے چل رہا اور لمحہ بہ لمحہ کہہ رہا تھا کہ ہم سخت خوف و بے یقینی کی حالت میں ہیں۔ میں بھی اس کے ساتھ اس کی باتیں کر رہا تھا جیسے قافلے کے لٹنے کا مجھے بھی بڑا افسوس ہوگا۔ دل ہی دل میں اس تجربے کے لئے بے قراری تھی۔ شنیوارلیوں کی سختی کے ہاتھوں آدھی رات تک آگ بجھاتے رہے۔ ترکمانوں کی قید میں بھی رہے تھے اور پھانسی پانے کا انتظار بھی کیا تھا۔ اگر ایران کی شاہراہ پر لوٹے جاتے تو یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ چہل دختر کے پہاڑ کے دامن میں جا کر قریب کے ایک گاؤں میں قیام کیا۔ دودھ، دہی اور انڈوں کی فراوانی تھی۔

اگلے دن سویرے پھر نکل پڑے۔ چہل دختر تین ہزار فٹ اونچی پہاڑی ہے۔ وطن عزیز کی مالاکنڈ کی چوٹی اس سے کچھ زیادہ اونچی نہیں ہوگی۔ انگریزوں نے اپنے قبضے کے دوران اس چوٹی پر سے سڑک گزار دی ہے۔ اس سڑک کو وہ شیراز سے بوشہر تک لے گئے ہیں۔ اب یہ راستہ بارشوں کی وجہ سے جگہ جگہ سے خراب ہو گیا تھا۔ اسی لئے ہم قافلے والوں کے قدیم راستے سے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔ سویرے سورج نکلتے وقت ہم پڑاؤ سے روانہ ہوئے تھے اور شام دوسری طرف واقع پڑاؤ کی جانب اتر گئے تھے۔

لیکن قافلے کا سالار پہاڑ کے نیچے واقع پڑاؤ تک پہنچنے پر مصر تھا۔

دن زیادہ گرم نہیں تھا۔ لیکن ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے میرے چہرے کی کھال پھٹ چکی تھی ہاتھوں کی طرف جب نگاہ پڑی تو ان کا بھی یہی حال تھا۔ دھوپ کی گرمی سے زخم اور زیادہ تکلیف دیتے تھے۔

کازرون

اندھیرا ڈھلنے سے کچھ قبل ہم کازرون پہنچ گئے۔ یہ شیراز اور لوبشہر کے درمیان ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ مکانات کچے بنے ہوئے ہیں۔ بازار کی دکانیں چھپروں کی ہیں۔ مسافروں کی ضرورت کی تمام اشیاء عام قیمت پر مہیا ہیں۔ تجربے نے مجھے سکھایا کہ پانی کے لئے مشکیزہ اور تین چار وقت کے لئے کھانا ضرور ساتھ لینا چاہیئے۔ تو وہاں یہ چیزیں خرید لیں۔

کازرون سے سفر کا وقت تبدیل ہو گیا۔ دن آرام کے لئے چنا گیا اور رات سفر کے لئے۔ چند حاجی صاحبان بھی ہمارے ہم سفر تھے۔ محمد اکبر نامی ایک حاجی سے میری اچھی خاصی واقفیت پیدا ہو گئی میں دل ہی دل میں فخر محسوس کر رہا تھا کہ تین مہینوں میں پورا ایرانی بن گیا ہوں۔ ایرانیوں کے درمیان رہ رہا ہوں اور مجھے نہیں پہچان پاتے۔ کازرون سے باہر کھجوروں کے ایک باغ میں قافلہ ٹھہرا۔ درختوں کے نیچے ہم ستانے لیٹے۔ بزرگ محمد اکبر نے مجھ سے دریافت کیا

"برادر یوسف۔ تو از کجائی"

اس سوال کے سنتے ہی میں فوراً چونک پڑا کہ کیا وجہ ہے اس کی۔

"از تبریز" جواب میرے پاس تیار تھا۔

"تو چیستی" اس نے آگے دریافت کیا۔

"مومن" مختصر جواب دیا۔

بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"تم سرے سے ایرانی ہی نہیں ہو۔ معلوم ہوتا ہے مومن بھی نہیں ہو"

میں نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا:

"ہماری زبان ترکی ہے۔ تبریز میں ترکی بولی جاتی ہے۔ اس لئے تم کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔"

میں نے اس وقت تو یہ بات ہنستے ہوئے ٹال دی اور فوراً موضوع گفتگو بدل دیا تاکہ حاجی کا خیال اس نازک موضوع کی طرف پھر نہ جا سکے۔

سالار قافلہ کے افسری خیمے میں مہمان بنا

کازرون تک قافلے میں ایک سائل کی حیثیت سے رہا۔ شیراز سے لوشہر تک میرا کرایہ صرف ڈھائی تومان (ساڑھے سات روپے) ادا کیا گیا تھا۔ دس دن کا راستہ تھا۔ یابو کے مالک نے سالار قافلہ کی خاطر اتنا کم کرایہ لینا گوارا کیا تھا۔ ہر طرف سے مجھ پر لعن طعن کی بارش ہو رہی تھی۔ کئی دفعہ دل میں خیال آیا کہ یابو کے مالک کو کچھ انعام دوں تاکہ اس کا رویہ میرے ساتھ کچھ سدھر جائے لیکن پھر یہ ڈر دل میں پیدا ہوا کہ مبادا پہچان لیا جاؤں۔ خرچہ بھی میرے ساتھ ویسے بھی کم تھا۔ میری کل پونجی پانچ پونڈ کا انگلستانی نوٹ، ایک ترکی اشرفی اور تین چار ایرانی تومان تھے۔ میری منزل مقصود ہندوستان تھا۔ لوشہر سے کراچی تک کا سمندری راستہ بھی دوران سفر شامل تھا۔ نوٹ اور اشرفی میں نے شلوار کے نیفے میں سی لی تھی اور تومان ساتھ بٹوے میں رکھ لئے تھے۔ بٹوہ چادر سے بنائی ہوئی کمر بند میں اڑسا تھا۔ چادر کمر کے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ رات کے سفر کے دوران یابو پر الٹا لیٹ جاتا اور پاؤں لٹکتے رہتے۔ ہاتھوں سے پالان کو پکڑے ہوئے ہوتا۔ ساری رات چلنے میں گزار دی۔ صبح جب یابو سے نیچے اترا اور ناشتے کے لئے کمر بند کی طرف ہاتھ لے گیا تو بٹوہ ندارد۔ لاچار ہو گیا اور کوئی علاج تو تھا ہی نہ اور یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کہیں پونڈ کا دکھانا تباہی کا باعث میرے لئے نہ بن جائے۔ اس لئے دل مضبوط کر کے سالارِ قافلہ کے خیمے میں گھس گیا۔ خیمے میں سالار کے اردگرد چند آدمی قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بغیر اور کوئی گفتگو کئے فوراً بول اٹھا:

"مہربانی کر کے اشرفی کے لوٹے پیسے دے دیں۔"

سالار کچھ دیر تو خاموش بیٹھا رہا اور پھر بولا:

"جتنے تومان بھی چاہئیں مجھ سے لے لو۔ میرا مال آپ کا ہی ہے۔ آپ میرے بھائی ہیں۔"

سالار قافلہ سے دو تومان لے کر باہر نکلا۔ تھوڑی دیر بعد سردار کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ مجھے فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا کہے گا۔ قافلہ کے اندر تو سالار کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ ہر ایک آدمی اس کے رعب و دبدبے سے لرزتا تھا۔

خیمے کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا گیا۔ دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ سالار نے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ بیابان اور ویرانے میں ایرانی پلاؤ کھانے کو ملا۔ لیکن نوالہ حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ یہی فکر لاحق تھی کہ ایسا نہ ہو یہ نوالہ موت کی طرف پہلا قدم ہو۔ کھانے اور قہوہ کے بعد سردار میری طرف متوجہ ہوا:

"بھائی! اس خیمے کو تم اپنا جانو۔ مجھے امید ہے کہ میرا یہ غریب دسترخوان آپ بندر تک اپنا خیال کریں گے۔"

میرا جواب فوری اور مختصر تھا:

"تشکر۔ میں خدمت میں حاضر رہوں گا۔"

اگلے دن ہم چھٹے سرائے پہنچے۔ راستے میں میرے لئے خچر پر ایک مشکیزے کا بندوبست کیا گیا تھا سالار کے حکم سے خچر میرے یابو کے نزدیک ہی ہانکی جا رہی تھی تاکہ مجھے پانی کی تکلیف نہ ہو۔ میرے یابو کے پالان پر ایک نرم قالین بچھا دیا گیا تھا۔ سب قافلے میں مشہور ہوا کہ سالار مجھ پر بطور خاص مہربان ہے میری عزت افزائی اور بڑھ گئی۔ قافلے کے کوچ کے وقت دوسرا آدمی میرے لئے یابو پر پالان ڈالتا۔ دل میں حیران ہوتا کہ اس بے بنیاد عزت کی وجہ آخر کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا لیکن جلد ہی خیال آتا کہ اس ڈرامے میں میرا کوئی اختیار نہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے ویسے بھی ہو گا۔

ساتواں پڑاؤ: "از چشمانت معلوم مے شود کہ نجس ہستی"

بڑی عزت و احترام کے ساتھ صبح ساتویں پڑاؤ پہنچے۔ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ہوا کی تبدیلی کے

باعث چہرے اور ہاتھ کی کھال پھٹ چکی تھی۔ سالار کے خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ ہنسی مذاق میں مشغول تھا اور حاضرین سب یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ اس سے ہوشیار اور ہنسانے والے اور کوئی نہیں زیادہ ہنسی سے ہونٹوں کی پھٹی ہوئی جگہوں سے خون رسنے لگا۔ سالار نے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"برادر یوسف طہارت بکنید"

مَیں خیمے سے نکل آیا۔ کوزہ سے ہونٹوں اور چہرے کو صاف کیا اور پھر دوبارہ چل کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

سالار کا رنگ یکدم تبدیل ہو گیا۔ خاموش ہو گیا۔ کبھی ایک کی طرف دیکھتا اور کبھی دوسرے کو دیکھتا۔ ساری محفل بدمزہ ہو گئی۔ میں حیران تھا کہ آخر ہوا کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سالار نے درج ذیل سوال پوچھ کر میری حیرانگی میں مزید اضافہ کیا

"یوسف راست بگو تو مومن ہستی"

"الحمدللہ" فوراً مَیں نے جواب دیا۔

"پھر کیوں آپ نے طہارت نہیں کی" اس نے مزید دریافت کیا۔

"طہارت اور کیسے ہوتی ہے" مَیں نے غصے میں جواب دیا۔

سردار نے مجھے طہارت کا مسئلہ سمجھانا شروع کیا۔ جب کبھی مومن کے بدن سے خون نکلے تو اس کو چاہیئے کہ اس جگہ کو دھو لے۔ دھونے کے بعد خشک کرے۔ اسی طرح تین دفعہ دھونے کے بعد تین مرتبہ ہی خشک کرے۔ تب کہیں جا کر وہ صاف ہو سکے گا۔ سالار جب مجھے یہ سکھا رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ بچپن میں ہمیں بھی یہی سکھایا گیا تھا۔ لیکن اس جگہ یہ اقبال کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔ وقت بڑا نازک تھا۔ مَیں نے سالار کو جواب دیا کہ ہم تو تبرز میں اسی طرح کرتے ہیں جو مَیں نے کیا باقی فارس میں آپ لوگوں کی اپنی مرضی ہے جو کچھ جی میں آئے کریں۔ سالار کو صرف اس جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔ بے اختیار بول پڑا

"برادر یوسف آپ کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ نجس ہو۔ اگر تم مومن ہو تو کلمہ سناؤ"

ارد گرد اور خیموں والے بیٹھے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ دوسرے خیمے سے ایک اور نے زور سے آواز لگائی:

" حالاکہ پیر شد مومن نتوانی کرد" (اب یہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس سے مومن نہیں بنا سکو گے) ۔

اتنے میں سالار نے دوبارہ کہا:

" اچھا اگر تم مومن ہو تو کلمہ سناؤ۔"

مجھے موقعہ ملا۔ زور سے چلّا اٹھا

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط لا الہ الّا اللہ محمد رسول اللہ ط علی ولی اللہ"

کلمے کے آخری حصے پر بہت زیادہ زور دیا۔ دل ہی دل میں ہنسی بھی آ رہی تھی لیکن ہنس کہاں سکتا تھا۔

ایک طرف سے آواز بلند ہوئی "مومن است" مومن ہے یعنی شیعہ ہے۔ دوسری طرف سے آواز آئی" رحمت بہ پیروان علی۔ لعنت بہ پیروان عمر" لعنت کی آواز میں میری آواز سب سے بلند تھی۔ سارے کیمپ سے عمر کے پیروکاروں پر لعنت اور علی کے پیروکاروں پر رحمت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں جب ذرا سرد ہوئی تو فکر ہوا کہ یہاں سے بھاگنا چاہیئے۔ اس دفعہ تو بچ گئے۔ اگر ان لوگوں کے درمیان دوسری کوئی غلطی ہوئی تو پھر کیا کرو گے؟ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اٹھا اور خورجین کو کندھے پہ رکھے خیمے سے باہر آیا۔ سالار نے معافی مانگتے ہوئے کہا

" بنشین برادر۔ تو مومن ہستی۔ ما غلط شدیم" (بیٹھو بھائی! تم مومن ہو۔ ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی) ۔

لیکن مجھے یہی بہتر لگا کہ ایسی محفل سے دور ہونا ہی بہتر ہے کہیں پھر کوئی غلطی کر بیٹھوں۔ قافلے کے سالار کے خیمے سے دس بیس قدم دور اپنا بستر بچھا لیا اور وہاں ٹیک لگا لی۔ سہ پہر کی نماز کا وقت تھا۔ مزید گفتگو سے بچنے کے لئے شیعوں کی طرح نماز پڑھنی شروع کر دی۔ ایک کپڑے میں خاک باندھ لی اور زمین پر اس جگہ اس کو رکھ لیا جہاں سجدے کے وقت میری پیشانی لگنی تھی۔ ہاتھوں کو لٹکائے رکھا۔ قافلہ سالار اور دوسرے معززین قافلہ میری اس حرکت کو دیکھ رہے تھے۔

پھر وہی پرانی حالت آ گئی۔ یا بو پر خود اپنے لئے پالان رکھتا۔ مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا ساتھ رکھتا۔ خاموشی سے سفر جاری رکھتا۔ دن بدن خلیج فارس کے کنارے کے قریب آ رہے تھے گرمی میں اضافہ

ہو رہا تھا۔ وطن خشک تھا۔ کھجوروں کے درخت جا بجا کھڑے تھے۔ دن کو زبردست گرمی پڑتی۔ کھجور کے درختوں کی چھاؤں میں قافلہ پڑا رہتا۔ نام ہی کو چھاؤں ہوتی۔ دھوپ ہی میں پڑے رہتے۔ دن کو بھی بے آرام رہتے اور رات کو پھر سفر ہوتا۔ کھجور بہت سستی ملتی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے میں نے چند پیسوں کی کھجوریں لیں۔ تین دن تک روٹی کے ساتھ بھی کھاتا رہا۔ بغیر روٹی کے بھی کھاتا رہا اور جو بچ گئیں ان کو پھینک دیا۔

برازون

شوکت عثمانی درویش کے لباس میں ملا

اگلی صبح ہم برازون پہنچے۔ سرائے کے باہر پالان اتار دیئے۔ برازون بھی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے تفریح اور خرید و فروخت کے لئے قصبے کی طرف روانہ ہوا۔ سرائے سے جب باہر نکلا تو کچھ آوازیں سنیں بوشہر کی سمت سے ایک قافلہ آیا۔ میں اس قافلے کو دیکھنے کھڑا ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرا ایک پرانا ساتھی شوکت عثمانی جو مجھ سے تاشقند میں جدا ہوا تھا تین قدم کے فاصلے پر میرے پاس سے گزر رہا ہے۔ سر کے بال بڑھے ہوئے ایک ایرانی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں پھٹے پرانے جوتے تھے۔ ایک پرانی گدڑی پہنے ہوئے تھا۔ کندھوں پر ایک بوری لئے ہوئے تھا۔ جب اس سے آنکھیں ملیں تو ششدر رہ گیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ شوکت اس لباس میں نظر آئے گا۔ وہ بھی حیران لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ آخر اس نے مجھے آنکھ ماری۔ وہ آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے سرائے میں داخل ہوئے۔ چار نوعمر لڑکے بھی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ان کو کوئی خاص تماشہ ہی دکھ رہا تھا۔ خچر کا مالک بھی آ گیا۔ شوکت نے بوریا بچھایا اور اس پر بیٹھ گیا۔ بچے اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

"السلام علیکم!" میں نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آغا بیائید۔ بنشید" اس نے جواب دیا۔

شوکت عثمانی نے اپنے آپ کو ایک درویش بنایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا "آغا سید! از کجا آمدید" (شاہ صاحب کہاں سے آپ کا آنا ہوا)۔

"بوشہر سے" جواب ملا۔

شوکت نے خچر والے کو رخصت کیا۔ خچر والا دست بدستہ اس کے سامنے کھڑا رہا۔ تاکہ اگر کوئی ضرورت ہو تو وہ پوری کر سکے۔ شوکت ہوشیار آدمی تھا۔ اپنے آپ کو۔ سید بنوالیا تھا۔ اسی لئے اس درویشی کے لباس میں بھی خچر والا اس کی عزت کر رہا تھا۔ لڑکوں کا بھی شوق دیدار پورا ہوا۔ ان کو بھی حیلے بہانے سے رخصت کیا گیا۔ اس کے بعد مختصراً ایک دوسرے کو حال احوال سنایا۔ شوکت تازہ تازہ ہندوستان سے ایران پہنچا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جہاز میں سوار ہونے کی کامیابی کا دارومدار اپنی عقل پر ہے پاسپورٹ پیدا کرنا ناممکن ہے۔

شوکت کو گوہر کی شیراز میں موجودگی پر بہت خوشی ہوئی۔ خوش ہونے میں وہ حق بجانب تھا۔ ہم نے اکبر کے قافلے میں جلال آباد سے افغانستان کے دشوار گزار اور لمبے راستوں پر کٹھن وقت ایک ساتھ گذارا تھا۔ ترکمانوں کی سختیاں ہم نے اکٹھی جھیلی تھیں۔ نہ صرف سخت دنوں میں ساتھ تھے بلکہ تاشقند کے اچھے وقت میں بھی ساتھ ہی رہے تھے۔ تاشقند میں ہمارے سامنے ہی شوکت عثمانی کو اڈلیسہ سینی ٹوریم بحالی صحت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اسی لئے اس کو برازون کی سرائے میں پاکر سخت حیرت ہوئی۔

شیخ محمدی

اگلی صبح ہم نے شیخ محمدی میں پڑاؤ کیا۔ میں سرائے کے اندر داخل ہو گیا۔ ویران پڑا ہوا تھا۔ قافلے اور سالار قافلہ سے مجھے ویسے ہی چڑ سی ہو گئی تھی۔ اس لئے سرائے کے اندر آرام سے لیٹ گیا۔ دس بجے کا وقت تھا جب بندوق کے فائر کی آواز سے نیند سے بیدار ہوا۔ میں نے دیکھا کہ سرائے کے اندر ایک معزز آدمی (ہمارے وطن کے خانزادہ کی طرح) بندوق ہاتھ میں لئے معہ ایک نوکر کے سرائے میں پھر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر میری طرف آیا اور پوچھنے لگا کہ تم کون ہو۔ میں نے جواب میں کہا کہ مسافر ہوں

اس نے پھر پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ طہران سے بوشہر جا رہا ہوں۔ وہ ہنس دیا اور سرائے کے باہر چلا گیا۔

سہ پہر کو جب میں جانے کی تیاری کر رہا تھا تو ایک شخص سرائے میں داخل ہوا اور حاکمانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا

"اٹھو تمہیں شیخ یاد کر رہا ہے۔"

مجھے معلوم ہوا کہ شیخ کا حکم بے چون و چرا مان لینا چاہیئے۔ فوراً اٹھا۔ خورجین ساتھ لے لی اور نزدیکی شیخ محمدی نامی گاؤں کے ایک بڑے گھر میں داخل ہوئے۔ شہروں کی طرح مکان کے درمیان ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ اردگرد کمرے بنے ہوئے تھے۔ شیخ میرے استقبال کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا۔ دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ میرے سارے کپڑے پھٹے پرانے تھے۔ ہاتھ اور چہرہ پھٹ چکے تھے دس دن سے غسل نہیں کیا تھا۔ گرمی کا موسم، میلے کپڑے، پسینے کی بدبو۔ لیکن باوجود اس کے میری اتنی عزت افزائی ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ صحن میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ شیخ نے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ پھر اس نے چائے پلوائی اور اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا:

"کہاں سے آنا ہوا۔" میں نے جواب دیا "طہران سے"

"کیا وجہ ہے کہ کونسل بوشہر میں سب کے سامنے نہیں آیا۔" شیخ نے دریافت کیا۔

میں سمجھ گیا۔ مسکرا دیا اور اس سے پوچھا:

"کیسی کونسل"۔

شیخ ہنس دیا اور کہنے لگا:

"حکومت شوروی نے ایران کو بچالیا۔" شیخ اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش ہو گیا۔ ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگا

"اے بھائی! میرا دل ابھی جل رہا ہے۔ میں تمہیں کون کون سا قصہ سناؤں گا۔ ہمارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی۔ جس وقت انگریزی استعمار کی فوجوں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم تین چار قبیلوں نے خوب مقابلہ کیا

میرا دادا جس کی نوّے سال عمر تھی اور میرا والد معہ اپنے بیس بیٹوں، نواسوں اور بھتیجوں کے وقتاً فوقتاً وطن عزیز کو بچانے کی خاطر شہید ہو گئے ہیں۔ اب میں صرف چند بھائیوں اور چچازاد بھائیوں کے ساتھ رہ گیا ہوں۔ دل میں بس یہی ارمان ہے کہ دادا اور باپ اور صوفی آغا کا انتقام لے سکوں۔"

شیخ خاموش ہو گیا۔ کسی فکر میں ڈوب گیا۔ میں بھی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ کن انکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ شیخ کے اس بڑے گھر میں اس وقت بھی اندازاً پچاس کے قریب مسلح نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ بے شک شیخ محمد ایک بڑا آدمی تھا۔ میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ شیخ کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ مجھے وہ سوویت روس کا فرستادہ سمجھا تھا۔

"اچھا تو بوشہر سے کب واپسی ہو گی۔" شیخ نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

"واپس کیا کروں گا۔ سنا ہے بوشہر میں مزدوری کافی ہے۔ خیال تو بس یہی ہے کہ وہاں پڑا رہوں" میں نے جواب میں کہا۔

"کبھی تو وطن اپنے لوٹ کر جانا ہے۔" شیخ نے پھر دریافت کیا۔

"وطن میں میرا کوئی نہیں ہے۔ جس جگہ میرا گزارا ہو وہیں رہ لوں گا۔ وہی وطن ہے۔" میں نے ابھی یہ جواب دیا ہی تھا کہ سالار قافلہ آپہنچا۔ اس نے قافلے کے کوچ کی اجازت طلب کی۔ میں بھی فوراً کھڑا ہو گیا مبادا قافلے سے نہ رہ جاؤں۔

"بیٹھیے! بیٹھیے!" شیخ نے مجھے اشارہ کیا۔ اور بے پرواہی سے بولا:

"قافلہ کھڑا رہے۔"

میں فوراً بیٹھ گیا۔ شیخ کی قوت کا اندازہ ہو گیا۔ ہمارے وطن کی ریل گاڑی کا رکنا اور ایران میں قافلہ رکنا ایک جیسی اہمیت رکھتا ہے۔ اس اثنا میں کھانا آپہنچا۔ قافلہ سالار فرش سے چند قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سلام کیا اور دیسی قالین پر عام آدمیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دسترخوان پر صرف میں اور شیخ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت مجھ میں منوں طاقت و توانائی آ رہی تھی۔

شیخ آہستہ آہستہ گفتگو کر رہا تھا۔ اور میں پوری استقامت سے ہاں نہیں، ہیں جواب دے رہا تھا۔

شوکت عثمانی کا ذکر بھی اس نے کیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور آہستگی سے "تشکر" کیا۔ اس سب بات چیت کے دوران قصداً میں نے ایک بات ایسی کی کہ اس کی غلط فہمی اور بھی زیادہ ہو جائے تاکہ میں اس سے فائدہ اٹھا سکوں۔ میرا خیال ہے اس کے علاوہ بھی شیخ کا میری بابت خیال یقین کی حد تک پہنچ چکا تھا۔

کھانے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک شیخ نے باتیں کیں۔ اس نے مجھے دل کی گہرائی سے دعوت دی کہ میں رات اس کے ساتھ گزاروں اور ساتھ ہی کہا صبح کو وہ ہی مجھے بوشہر پہنچا دے گا۔ بوشہر چل کر مجھے اندازہ ہوا کہ شیخ کی یہ دعوت مان لینی چاہیئے تھی۔ لیکن اس وقت میں نے رخصت لینا مناسب جانا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ قافلے کی روانگی میں دیر ہو رہی ہے۔

شیخ میرے ہمراہ قافلے تک مجھے رخصت کرنے خود ساتھ آیا۔ اس نے مجھے کافی عزت و احترام سے رخصت کیا۔ مجھے قافلے کے سالار کی فکر کھائے جا رہی تھی پتہ نہیں اس کا سلوک میرے ساتھ اب کیا ہو گا۔ بوشہر میں قیام کے فکر نے مجھے سالار قافلہ کا محتاج بنائے رکھا۔ میں نے کھڑے ہو کر چاروں طرف اپنے یابو کے لئے نظر دوڑائی جو نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس اثنا میں ایک بہترین زین کیا ہوا گھوڑا میرے آگے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ایک نوجوان رکاب تھامے مجھے سوار ہونے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں بے جھجک اس پر سوار ہو گیا۔ نوجوان آگے آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے قافلے سے ایک طرف ہو کر جا رہے تھے۔

آدھی رات تک تو گھوڑے پر سفر کرنے کے قابل تھا لیکن آدھی رات کے بعد زین پر سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ بار بار گھوڑے سے گر جاتا۔ صبح تک کبھی گھوڑے پر سوار اور کبھی پیدل چلتا رہا۔ اس وقت مجھے اپنے پیارے یابو کی قدر معلوم ہوئی۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ خلیج فارس کا پانی نظر آنے لگا۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ ڈرائیوروں اور خچر والوں سے نجات مل گئی۔ میل ڈیڑھ میل تک پانی کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ بوشہر سامنے نظر آ رہا تھا۔ شیخ محمد کے خادم نے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔ وہ مجھے قافلے سے علیحدہ ایک طرف لے گیا۔ میں دل ہی دل میں سمجھ گیا لیکن خاموش رہا۔

بوشہر

دس دن تک ایک مکان میں بند بیٹھا رہا

ہم دوسرے راستے سے بوشہر میں داخل ہوئے۔ تنگ تنگ کوچے تھے ان میں چل نکلے۔ میں نے ہمراہی سے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے کہاں جانا ہے کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ میری حفاظت کا سامان ہی کر رہا ہوگا۔

ایک سابق پولیس افسر کے گھر میں پناہ لی

چند کوچوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک مکان کے آگے کھڑے ہوگئے۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اندر داخل ہوئے۔ دو منزلہ مکان تھا اور ایرانی طرز پر چاروں طرف کمرے تھے۔

دروازہ کھولنے والے نے گھوڑا سنبھال لیا۔ ہم دوسری منزل کو گئے۔ گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بالاخانے میں داخل ہوتے ہی آنکھیں ایک معمر سفید ریش آدمی سے چار ہوئیں۔ چہرے اور پیشانی پر بڑھاپے کی سلوٹیں تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے اس نے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے صرف کہا "بفرمائید" اور پھر لکھنے میں مشغول ہوگیا۔

میں اور شیخ کا آدمی دونوں بیٹھ گئے۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ کمرے میں اور کوئی آسائش کی چیز نہیں تھی۔ ایران میں صرف قالین سے گھر کے مالک کے معیار کا پتہ لگانا کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ ہم تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے اور پھر میزبان نے ان کاغذوں سے سر اٹھایا اور اسی تیزی سے مجھے کہا:

"بخیر آمدید"

"بخیر باشید" میں نے سر ہلایا

"سید نظر تاں آمد" اس نے دریافت کیا۔

"نمے دانش" میں نے جواب دیا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ سر ہلایا۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے شیخ کے آدمی سے کہا کہ پائے کا بندوبست کر لو۔ مجھے اس نے فارسی کا ایک ناول دیا تاکہ اپنے آپ کو مصروف رکھ سکوں۔

تیسرے دن شیخ آگیا۔ بات چیت ہو رہی تھی۔ شیخ نے باتوں ہی باتوں میں میزبان سے کہا کہ لگتا ہے کونسل نہیں آیا۔ یہ شخص ادھر خفیہ طور پر کام کرے گا۔

میری نظر اپنے لباس پر پڑی۔ بیس دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کی طرف ہاتھ گیا۔ دل ہی دل میں خوب ہنسی آئی کہ عجیب کونسل ہوں۔

"خوب" میزبان میری طرف متوجہ ہوا۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کونسل کیوں نہیں پہنچا۔ ہم کافی وقت سے اس کے انتظار میں ہیں۔

"کونسل کیست نمے دانش" (کونسل کیا چیز ہے میں نہیں جانتا) میں نے جواب دیا۔ خود کو ناسمجھ ہی ظاہر کر رہا تھا۔ ان سے ایسی طرز میں گفتگو کرنے لگا جیسے میرے خیال میں کونسل کسی کا نام ہے۔ شیخ نے وہاں دو دن قیام کیا وقتاً فوقتاً وہ مجھ سے بوشہر کے قیام اور میرے وطن کے متعلق خیالات کا اظہار کرتا۔ جب تک مجھ سے کچھ پوچھا نہ جاتا میں خاموش ہی رہتا جب کچھ پوچھا جاتا تو میں بتاتا کہ میں ہندوستانی ہوں۔ روس میں کچھ وقت گذارا ہے۔ اب واپس وطن لوٹ رہا ہوں۔ وہ ہنس پڑتے۔ لگتا تھا وہ میری بات کو مذاق جان رہے تھے۔

میری گرفتاری

دس دن گزر گئے۔ صرف غسل کرنے میں نیچے اترتا باقی تمام وقت اپنی جگہ پڑا رہتا۔ جب اکتا جاتا تو اپنے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا۔ جلال الدین (یہ میرے میزبان کا نام تھا) سے جب بھی اپنے پاسپورٹ کے متعلق پوچھتا تو وہ ناک پر عینک جماتے ہوئے کہتا کہ کوشش کر رہا ہوں۔

گیارہویں دن جلال الدین لرزتا کانپتا گرتا پڑتا گھر میں داخل ہوا۔ صحن سے ہی اس نے مجھے پکارا

میں جلدی سے نیچے اترا۔ اس نے نوکر کی طرف اشارہ کیا اور مجھے کہا:

"پیش برو" (اس کے پیچھے جاؤ) میں سمجھ گیا کہ کوئی بات ہوگئی ہے۔ صورت حال نازک تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میری خورجین سنبھال کر رکھے۔ آغا نے اپنا ہاتھ زور سے ماتھے پر مارا اور چھت کی طرف دوڑا۔ ہم باہر بھاگے۔ ایک تنگ سے کوچے میں جا نکلے۔ پچاس قدم آگے یہ کوچہ بازار میں جا نکلا۔ خادم میرے سے دس قدم آگے چل رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پولیس سامنے آگئی۔ گارڈ سے آگے ایک آدمی سفید کپڑوں میں ملبوس تھا اس نے نعرہ لگایا:

"یہ اس کا نوکر ہے۔"

گارڈ نے نوکر کو گھیر لیا۔ مجھے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ گرفتاری یقینی ہوگئی۔ قریب ہی دو فقیر بیٹھے ہوئے "برائے علی" "برائے حسین" کی صدائیں لگا رہے تھے۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا کپڑے ویسے بھی بہت خراب تھے لیکن فقیر نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس وقت کرتا بھی کیا۔ سر کو گھٹنوں میں دبائے ایک ہاتھ پھیلائے وہاں بیٹھا رہا۔ پولیس میرے پاس سے گزر گئی اور وہ روسیاہ مخبر بھی۔ جلدی سے اس جگہ سے اٹھا لیکن حیران و پریشان کہ جاؤں کہاں؟۔ بازار کی طرف سے ایک اور کوچے میں داخل ہوا۔

اتنے میں ایک مسجد نظر آئی۔ فوراً اس میں داخل ہو گیا اس سے بہترین پناہ گاہ اور کون سی ہو سکتی تھی۔ کچھ دیر ہی بیٹھا تھا کہ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ ایران میں اکثر نمازیں میں نے شیعوں کے طریقے کے مطابق ادا کی ہیں۔ وہ رومال جس میں میں نے خاک باندھی ہوئی تھی وہیں رہ گیا تھا اور کوئی چارہ نہ رہا تو قمیص سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس میں خاک باندھی اور اپنے آگے رکھ دی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ خاک کسی مقدس مقام کی ہوتی لیکن میری مشکل تو اس سے بھی حل ہو سکتی تھی۔ اسی طرح عصر اور مغرب کی نمازیں بھی ادا کیں۔ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ کسی نے خیرات کی تھی اس لئے پیٹ بھر کر کھانا میسر آیا۔ اتنا زیادہ کھایا کہ

کہ اگلی شام تک بخوبی اس سے گزارا ہو سکتا تھا۔ ایک طرف ٹیک لگالی۔ سوچا تھا کہ عشا کی نماز کے بعد ہی نماز والی دری پر سو جاؤں گا لیکن اس وقت ناقابل برداشت صدمہ پہنچا جب مجھے وہاں سے بھی تشریف لے جانے کو کہا گیا۔

بازار بند تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرف جاؤں۔ آخر ایک دوکان کے تختے پہ سو گیا۔ آنکھیں موند لیں لیکن نیند کہاں آرہی تھی۔ رنگا رنگ قصے دل میں آتے۔ فکر یہی دامنگیر تھی کہ کس طرح صبح جلال کے گھر پہنچوں گا اور وہاں کی خبر لوں گا۔ اتنے میں کسی نے ریڑھ کی ہڈی میں ایک لات ماری۔ سیدھا بیٹھ گیا۔ چار پولیس کے سپاہیوں کو سرہانے کھڑا پایا۔ تھوڑی ہی دیر میں حوالات میں موجود آوارہ گردوں کی ایک ٹولی کی قسم قسم کی باتیں سن رہا تھا۔ آوارہ گردوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔

تیسرے روز صبح دو اشخاص بہترین لباس میں ملبوس میری کوٹھڑی کے آگے رکے۔ انہوں نے تھوڑی دیر داروغہ کے ساتھ گفتگو کی۔ دو گھنٹے بعد مجھے اپنے دوستوں سے جدا کر لیا گیا۔ ایک علیحدہ تنگ کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ یاروں کی محفل چھوٹ گئی۔ وہاں مجھے پوری آزادی حاصل تھی۔ وہ لوگ میرے لہجے کی پرواہ نہیں کر رہے تھے۔ ان کی محفل میں کوئی قید نہیں تھی۔ نہ یہ ڈر تھا کہ پہچان لیا جاؤں گا۔ علیحدہ کوٹھڑی میں تنہا تین چار دن گزارے۔ دن بدن میرے افسوس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ان باتوں کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

اگلے دن صبح سویرے وہ مخبر جس کی اطلاع پر جلال کا نوکر بازار میں گرفتار ہوا تھا میرے "کمرے" میں نازل ہوا۔

"السلام علیکم آغائے طہرانی!" اس نے مجھے سلام کیا۔

مجھے اس اچانک سلام نے حیران کر دیا۔ خاموش ہی رہا۔ اس مخبر کی زبانی پتہ چلا کہ آغا جلال الدین نے شیراز کی حکومت کو عریضہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پولیس نے بلا کسی وجہ اس کے مکان کی تلاشی

لی اور اس کے نوکر کو گرفتار کیا ہے۔

حوالات سے فرار

دن گزرتے رہے اور میرے غم میں اضافہ ہوتا گیا۔ روزانہ مجھے یہی فکر دامنگیر رہتی کہ میں شاید ایرانی حکومت کا قیدی نہیں ہوں اس لئے اب میری رہائی ناممکن ہے۔ مجھے بندر انزلی کے افسر کی وہ بات یاد آگئی کہ "جہاں جانا ہے جاؤ ہمیں کیا"۔

ایرانی حکومت ہندوستانیوں کے اس جذبے سے تو واقف تھی کہ ان لوگوں کا ایران کی آزادی میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں۔ بلکہ ان کا مقصد صرف انگریزی استعمار سے نجات حاصل کرنا ہے۔ مجھے یقین آ گیا کہ میں انگریزی کونسل کے اشارے پر قید ہوا ہوں۔ اس بات سے میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ ہندوستان مجھے پابہ جولان لے جایا جائے گا۔ ہندوستان پہنچنے کے خیال نے مجھے گرفتار رہنے پر بھی آمادہ کر لیا۔ حوالات میں میری آٹھویں شب تھی جب ایک آواز سنائی دی۔

"یوسف! یوسف!"

شیراز سے بوشہر تک میرا نام یوسف تھا۔ جو ہر وقت یاد رہتا لیکن اب مصیبت کی ان گھڑیوں نے مجھے میرا نام بھی بھلا دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو فکر نہیں کیا لیکن اچانک مجھے اپنا نام یاد آگیا اور فوراً اٹھ بیٹھا۔ جنگلے کے ساتھ کوئی کھڑا مجھے پکار رہا تھا۔ پھر بھی خاموش رہا کہ دیکھوں اگر یوسف اور کسی کا نام ہے تو جواب دے گا لیکن بار بار میرا نام پکارا جا رہا تھا۔ نزدیک جا کر اس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ ساتھ ہی جنگلے کے نزدیک گیا تاکہ اس کو پہچان سکوں۔ آدمی بیٹھ گیا اور مجھے نزدیک آنے کو کہا۔ میں حیران تھا کہ آدھی شب کو حوالات کون آ گیا۔

"دیکھو یوسف! زیادہ باتوں کا وقت نہیں۔ اپنے آپ کو تیار رکھو۔ جب بھی یہ جنگلہ کھلے گا فوراً

باہر آجاؤ۔ جو آدمی تمہیں نکالے گا اس کے پیچھے روانہ ہو جاؤ۔ دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی کھڑی ہو گی اس پر فوراً چڑھ جاؤ۔ دیوار کی دوسری طرف دو گھوڑے موجود ہوں گے ان میں سے ایک گھوڑے پر ایک آدمی سوار ہو گا۔ بغیر اس سے پوچھے دوسرے گھوڑے پر تم سوار ہو جاؤ۔ وہ سوار جس طرف بھی جائے گا اس کے پیچھے گھوڑا دوڑائے جانا۔"

ان ہدایات کے ختم ہوتے ہی وہ آدمی اٹھا۔ میں نے اُسے پکارا کہ ایک اور بات دریافت کرنی ہے لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

ساری رات پلک نہیں جھپکی۔ میں جانتا تھا کہ پہلے تو حوالات میں کچھ نہ کچھ پیش آئے گا۔ اگر یہاں نہیں بھی ہوا تو آدھی رات کو شہر میں گھوڑوں پر بھاگنا ضرور کچھ نہ کچھ مصیبت سر پر لائے گا۔ دل میں خیالات کا ایک تسلسل بنایا۔ خیال ہی خیال میں اپنے آپ کو دوبارہ بندی خانے میں پایا۔ حوالات شہر کے وسط میں ہے آدھی رات کو گھوڑوں پر سوار بھاگنا۔۔۔۔ کیا شہر کی پولیس مردہ ہو گی؟ دوسری دفعہ پھر میری گرفتاری یقینی تھی۔ اور تباہی سے بھرپور۔ اگر دوبارہ گرفتار ہوتا تو وطن عزیز کو جانا پھر ناممکن تھا۔ ایران میں تو قید کی کوئی مدت ہو گی یا اسی طرح بے میعاد کے پڑا رہوں گا۔ بوشہر کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت بہت افسوس ہوا کہ آزاد ہو کر بھی انگریزوں کے پنجے سے نکلنا ناممکن ہے اور آزاد وطن ایران میں بھی آرام نہیں ملا۔

صبح ہوئی اس کے بعد ایک طویل دن گزر گیا۔ ساری رات جاگتا رہا۔ سنتری صاحب باہر گزرتا تو فوراً اُٹھ جاتا کہ بس دروازہ کھلا ہی چاہتا ہے۔ اسی طرح انتظار بھری وہ شب بھی گزر گئی۔ پھر صبح ہو گئی۔ دل میں شک پیدا ہوا کہ شاید خواب میں سب کچھ دیکھا ہے۔ تمام دن کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ مایوس ہوا۔ شام ڈھلے سو گیا۔ دو راتیں جاگ کر گزاری تھیں اس لئے خوب نیند آئی۔ آدھی رات کو کسی نے ہلایا۔ سیدھا بیٹھ گیا، دروازہ کھل گیا تھا لیکن مجھے بالکل پتہ نہیں لگا تھا۔ وہ شخص آگے آگے ہیں اس کے پیچھے۔ جب سیڑھی کے پاس پہنچے

تو وہ رُک گیا اور مجھے کہنے لگا

"چڑھو"

اس کے منہ سے ان الفاظ کا ادا ہونا تھا اور میرا اوپر پہنچنا تھا۔ دوسری طرف نیچے اترنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔ تھوڑا رُک گیا کہ اب کیا کروں۔ اتنے میں ایک فائر ہوا اور گولی میرے سر کے نزدیک سے گزر گئی۔ آنکھیں بند کر کے نیچے چھلانگ لگا دی۔ دیوار گو اونچی تھی لیکن اپنے آپ کو صحیح سلامت پایا۔

اٹھتے ہی ایک آدمی نے میرے کندھوں پر خاکی رنگ کا فوجی کوٹ ڈالا اور پھر پلک جھپکتے ہی ہم دونوں گھوڑے سرپٹ دوڑا رہے تھے۔ ہم نے بمشکل گھوڑے دو سو قدم دوڑائے ہوں گے کہ اچانک کسی نے کریہہ آواز نکالی۔ میرے ساتھی نے فوراً اپنا گھوڑا روک لیا اور مجھے بھی رُکنے کو کہا۔ بندوق ہاتھ میں لئے ایک پولیس کا سپاہی ہمارے آگے کھڑا تھا۔ اس کی دوبارہ آواز مجھے بالکل صاف سنائی دی

"کیستی"؟ (کون ہو)

میرے ساتھی نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سیدھا سپاہی کے پاس پہنچا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے رعب ناک لہجے میں اس سے پوچھا

"گولی کس نے چلائی"؟

سپاہی نے جلدی سے میرے ساتھی کو سلام کیا۔ اس نے گارڈ کو باہر آنے کا اشارہ کیا لیکن ساتھی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ سپاہی اور گارڈ اپنی جگہ ہی رہ گئے۔ ہم نے پھر گھوڑے سرپٹ دوڑانے شروع کئے۔ ایک بڑے بازار میں جا نکلے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دس بارہ سوار آگے راستے میں آ گئے۔ میرا ساتھی فوراً آگے بڑھا اور ان سے پوچھنے میں پہل کی۔ انہوں نے اسے سلام کیا۔ پھر میرا ساتھی آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ ہمارے پیچھے وہ سب سوار گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ مجھے فکر تھی کہ اب کیا ہو گا۔ لیکن ساتھی گھوڑا بے پرواہی سے دوڑا رہا تھا۔ شاندار افسر تھا۔ چھاتی نکالے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے منہ پھیر کر گھوڑا روک لیا۔ سوار اس کے آگے ایک قطار میں گھڑے ہو گئے۔ ساتھی نے فوجی اصطلاح میں ان کو کوئی حکم دیا۔ آدھے سوار ایک طرف اور آدھے سوار دوسری طرف تنگ بازاروں میں گھس گئے۔ وہ آگے

تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ میں نے اپنی جگہ پہچان لی۔ اس وقت اردلی کی جگہ میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور اپنے ساتھی کو بھی میں نے پہچان لیا وہ پولیس کا کوئی اعلےٰ افسر ہی تھا۔

اب ہم آرام سے چل رہے تھے۔ جیل خانے سے بجنے والی خطرے کی گھنٹی کی آوازیں یہاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ سارے شہر کی پولیس کے آرام میں خلل پڑا۔ لیکن چور کے دل میں اب کوئی خوف نہیں تھا۔ گرفتار کرنے والا ہی اس کا نجات دہندہ بن چکا تھا آگے بڑھ کر شہر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ دونوں گھوڑوں سے اُترے۔ حسب معمول آواز آئی۔ ساتھی نے جواب دیا۔ اپنا گھوڑا میرے حوالے کیا اور خود ان کے پاس چلا گیا۔ میں نے دونوں گھوڑے پکڑ لئے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اردلی نہیں ہوں۔ وہ فوراً ایک دوسرے آدمی کے ہمراہ نیچے اُترا۔ اس دوسرے آنے والے شخص نے دروازہ کھولا آنکھ جھپکتے ہی سپاہی تیار تھے۔ وہ ساتھی کے حکم کے مطابق ہمارے ساتھ روانہ ہوئے۔ ہم شہر سے کوئی آدھ میل ہی گئے ہوں گے جب ساتھی رُک گیا۔ گھوڑے سے اُتر پڑا۔ میں نے فوراً بڑھ کر گھوڑے کو سنبھالا۔ ساتھی نے سپاہیوں سے کچھ سرگوشیاں کیں اور مجھے حکم دیا کہ اپنی جگہ کھڑا رہوں۔

ساتھی آگے سپاہی اس کے پیچھے پیچھے سڑک کے ایک طرف دوڑ پڑے۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ میرا ساتھی دوبارہ جلد ہی پہنچ جائے گا میں اسی انتظار میں تھا کہ اتنے میں اپنے قریب کے ایک درخت میں کچھ حرکت سی محسوس کی۔ میں لرز گیا۔ ٹہنیاں ہل رہی تھیں، کیا دیکھتا ہوں کہ درخت سے ایک آدمی اُترا، یہ کیا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ حوالات سے تو نکل بھاگا لیکن چوروں کے ہاتھ پڑ گیا۔ دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ جب تک جان ہے گھوڑوں کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ آدمی درخت کے تنے کے پیچھے چل کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ اس نے مجھے پکارنا شروع کر دیا۔

"یوسف! یوسف! این سوبیا"

ایک دم میں نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ ساتھی نے خوب انتظام کیا تھا۔ اس شخص نے دونوں گھوڑے پکڑ لئے اور وہ خاکی کوٹ بھی مجھ سے لیا۔ اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے ایک سمت اشارہ کیا اور کہا کہ اس طرف جاؤ۔ جو کوئی تمہارا نام لے کر تمہیں پکارے اس کے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ نیا رہبر ہاتھ آگیا۔ صبح سویرے ایک گاؤں پہنچے۔ گاؤں کے باہر شیخ محمد کھڑے تھے۔ ایک دم مجھ سے بغل گیر ہوئے۔

"ہماری تو مارے شرم کے ناک کٹ گئی تھی۔ دنیا کے آگے شرمندہ ہو چکے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضل کر دیا۔"

میں نے فوراً جواب دیا۔

"میری وجہ سے آپ لوگوں کو بہت زحمت اٹھانی پڑی۔ اس کی معافی چاہتا ہوں۔"

"بہ بخشید آغا" شیخ نے معافی مانگنے کے لہجے میں کہا۔ شیخ ایک مخلص آدمی تھا۔ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ ہم جلدی سے گاؤں میں داخل ہو گئے۔

نیا گھر مجھے بہت پسند آیا۔ ایک باغ کے ایک کونے میں گارے کا بنا ہوا ایک کمرہ تھا۔ اس کے چاروں طرف شہتوت کے بڑے بڑے درخت تھے۔ مجھ سے قبل اس کمرے میں ایک دہقان رہائش پذیر تھا۔ اس کی بیوی نے صرف ایک ہفتہ قبل اس کی لپائی کی تھی۔ وہ دونوں بڑی مشکلوں سے یہ کمرہ چھوڑنے پر راضی ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں صرف پانچ گھر تھے۔ یہاں رہتے ہوئے مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ دہقان سب اپنے اپنے کاموں میں جُتے ہوئے تھے۔ میری طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ ان کے لئے ایرانی اور ایک اجنبی برابر تھے۔

ایک شب میرے دوست جلال آغا اور شیخ ایک اور ایرانی کے ہمراہ آئے۔ نئے ایرانی نے روسی میں مجھے مخاطب ہو کر کہا۔

"دُوبرے وُچرم گوسپدین" (شام بخیر)

میں سمجھ گیا کہ نووارد روسی زبان جانتا ہے۔ شیخ زور سے ہنسا۔

جلال حسبِ معمول فکروں میں ڈوبا ہوا تھا۔

"دُبرے وچرم تواریش" (دوست آپ کو بھی)۔ میں نے اسے جواب دیا۔ مزید اس پر رعب ڈالنے کے لئے میں نے روسی ہی میں کہا

"سپس ورُسیا گواریت" "تو ارش" ای نہ گویید" (روس میں اب لوگ صاحب کی جگہ "رفیق" کامریڈ بولتے ہیں)

وہ شخص خاموش ہو کر شیخ کی طرف دیکھنے لگا۔ شیخ اس کی طرف دیکھ کر سر ہلانے لگا۔ یہ نیا ایرانی زار کے زمانے میں بوشہر کے روسی کونسل میں کلرک تھا۔ کوشش کر کے اس نے روسی زبان سیکھ لی تھی۔ مجھے جب پتہ چلا کہ کلرک روسی جانتا ہے تو اس کے ساتھ میں نے روسی زبان میں کم گفتگو کی۔ اس کے پوچھنے پر جواب میں فارسی زبان ہی میں دیتا۔ شیخ مجھے بار بار کہتا کہ روسی زبان میں گفتگو کرو کیونکہ یہ زبان میری پسندیدہ ہے تو اس لئے میں کبھی کبھی روسی بھی بولتا تھا۔

اگرچہ جب بھی شیخ نے یا جلال نے مجھ سے میرے وطن کے متعلق دریافت کیا ان کو میں نے صحیح اتا پتا دیا لیکن وہ نہیں مان رہے تھے۔ مجھے اس پر خوشی تھی۔ اس غلط فہمی میں مجھے فائدہ تھا۔ کلرک نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم ساز و سامان کے ساتھ کیوں نہیں آئے۔ میں نے اسے جواب دیا کہ مجھے ہندوستان جانا ہے۔ ہم آزاد نہیں ہیں۔ اس لئے ساز و سامان یا کھلے پھرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

خلیج فارس

بوشہر سے وطن تک

میں نے بوشہر میں ایک مہینہ گزارا۔ میرے ساتھی کبھی کبھی مجھ کو مشورہ دیتے کہ مکہ مدینہ حج کے بہانے جانا آسان ہے۔ وہاں سے پھر ہندوستانی حاجیوں کے ہمراہ ہندوستان پہنچ سکتے ہو۔ ہر روز جب میرے دوست مجھے ملنے آتے تو ان کی زبانی اور کوششوں سے پاسپورٹ کے حصول میں مشکلات کا پتہ چلتا اور ساتھ ہی ویزے کے حصول کے لئے مشکلات کا بھی بتلاتے۔ وجہ اس کی بظاہر تو یہی تھی کہ بوشہر کی انگریزی کونسل میں ان کی جان پہچان نہیں تھی۔ میں آہستہ آہستہ مایوس ہوتا جا رہا تھا کبھی کبھی تو دل میں خیال آتا کہ بوشہر سے کوئٹہ، بلوچستان کے لئے روانہ ہو جاؤں۔ ایران میں اب میری کافی واقفیت ہو چکی تھی اور یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں تھا کہ میں پا پیادہ وطن عزیز کے لئے روانہ ہو جاؤں ہم تو قفقاز سے ایران کے راستے بغداد تک پیدل جانے کی تیاری کر رہے تھے لیکن ایرانی بدرگے نے مایوس کر دیا تھا۔ اب تو ساتھ معاونوں کی بھی ضرورت نہیں۔ ایران میں پیدل سفر کرنا آسان تھا! ایران کے لوگ اچھے ہیں۔ غریب، مسافر اور فقیر کو اخلاص سے کھانا دیتے ہیں۔ اول تو میرے ساتھ زادِ راہ موجود تھا۔ اگر نہ بھی ہوتا پھر بھی کوئی مشکل نہ تھی۔ میں اس کے لئے بھی تیار تھا کہ راستے میں لُٹ بھی جاؤں لیکن وطن پہنچوں۔ مزدوری کر کے آدمی اس کرایہ پہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہ پہنچے اور اگر مزدوری نہ بھی کرتا تو ہمارے وطن کی طرح اگر آدمی نماز پڑھ کر مسجد میں بیٹھا رہے تو مسافر کو کھانا بغیر کہے مسجد میں مل جاتا ہے۔ لیکن ایک چیز میرے راستے کی بندش کا باعث بنی ہوئی تھی اور وہ تھی جان سے پیاری آنیا آسایان کی وہ تصویر جو کہ اگر تمام ایران میں کہیں میرے ساتھ پکڑی جاتی تو پھر میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا کیا حشر ہوتا۔

اسی طرح سمندری راستہ میں بھی میرے لئے کافی مشکلات تھیں۔

آخر ایک دن کلرک ہنسی خوشی سے میرے گھر میں داخل ہوا۔

"مبارک ہو! مبارک! کام ہوگیا" اس نے مجھے خوش خبری سنائی۔ پھر اس نے ایک کاغذ دکھلایا۔ اور ساتھ ہی کہا کہ پاسپورٹ تو نہیں ملا البتہ بمبئی جانے کا جواز مل گیا۔

میں نے جلدی جلدی جواز پڑھا۔ اور خوب دل کھول کر ہنسا۔ کلرک بھی میری ہنسی میں میرے ساتھ شریک ہوا۔ پھر شرمندہ ہوا۔ اس نے دونوں شانے اُچکائے اور کہا کہ بھائی آخر میں کرتا بھی کیا۔ یہ بھی بڑی مشکل سے ملا۔ جہاز میں آپ کو سوار کرالوں گا باقی آگے آپ جانیں اور آپ کا نصیب۔

یہ جواز بوشہر کے ایک بڑھئی نے حاصل کیا تھا۔ اس پر تصویر کی ضرورت نہیں تھی۔ اس میں حلیہ البتہ درج تھا۔ بڑھئی کا رنگ گندمی لکھا ہوا تھا۔ سیاہ آنکھیں اور بلند قد، تینوں باتیں اس طرح تھیں کہ پاسپورٹ دیکھنے والے حاکم فوراً مجھے پکڑ لیتے کہ جعلی پاسپورٹ پر سفر کر رہا ہے۔

کئی مرتبہ آغا سے میں نے اپنی خورجین مانگی تھی۔ خورجین میں آنیا کی تصویر تھی۔ اسی لئے میں اس کے لئے پریشان تھا۔ روانہ ہونے سے چند دن پہلے شیخ اور جلال آغا میری خورجین میرے پاس لے آئے۔ اس سے پہلے تو وہ ہر وقت مجھ سے ہی مذاق کیا کرتے تھے کہ تمہیں روس کی دوشیزائیں بہت یاد آتی ہیں۔ وہاں تو پردہ نہیں ہے اور لڑکیاں بھی خوبصورت ہیں۔ ان علاقوں میں رہتے ہوئے ہمیشہ تمہیں افسوس رہے گا۔

اب تو کلرک اور شیخ کا یقین اور بھی پکا ہوگیا کہ میں روس کا رہنے والا ہی ہوں اور ہندوستان کسی خاص مہم کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ آنے سے پہلے مجھے زور دار الفاظ میں کہا:

"رفیق! ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ اس کا خیال رکھو کہ کہیں اور کسی راستے روس نہ لوٹو۔ اور راستے اچھے نہیں ہیں۔ تم پھر ضرور اپنی حکومت (روسی حکومت) پر زور ڈالو گے کہ بوشہر میں ایک کونسل خانہ کھول دے۔" میں مسکرا دیتا اور بات اِدھر اُدھر کر دیتا۔

جہاز میں سوار ہوتا ہوں

ایک ماہ بعد ایک اندھیری شام کو مجھے بندرگاہ پہنچایا گیا۔ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہو کر جہاز جو کہ کنارے سے کافی دُور تھا تک پہنچایا گیا۔ کشتی جہاز کے ساتھ روک دی گئی۔ میں سیڑھی کے ذریعے اوپر پہنچا۔ عرشے (DECK) پر بیٹھ گیا۔ تیسرے درجے کا مسافر تھا۔ بمبئی تک تیس روپے کرایہ دیا تھا۔ کنارے پر پانی بہت کم تھا جہاز اس لئے سمندر کے وسط میں کھڑا کیا گیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے آرام سے سو گیا۔

ایران کو چھوڑنے کا افسوس ہوا

صبح اُٹھا جہاز چل رہا تھا۔ ایران کا کنارہ دُور نظر آ رہا تھا۔ چھوڑنے پر افسوس ہوا۔ ایرانی مہذب اور شائستہ لوگ تھے۔ سخت بات کو بھی بڑے شائستہ الفاظ میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ آدمی بالکل ناراض نہیں ہوتا۔ انسان کو وہ محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جو شخص ایران میں وقت گزار لیتا ہے اور پھر اس کو چھوڑنے پر اس کا دل افسردہ اور غمگین نہ ہو تو وہ شخص بڑا سنگدل ہوگا۔ میں ایران کے لئے کیوں افسردہ نہ ہوتا۔ مجھ پر اس نے اتنا احسان کیا تھا۔ مجھے پناہ دی تھی، امداد مہیا کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کہ مجھ پر اس کا اعتراض بھی تھا۔ لیکن یہ بات کہ "بہ ہر جائے کہ مے روید، بر وید، بماچہ" کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کتنے اونچے خیالات کا نتیجہ تھا۔ ان کو پتہ تھا کہ ایران کے ساتھ ہمارا کوئی جھگڑا نہیں اس لئے بے وجہ تکلیف وہ ہمیں نہیں دینا چاہتے تھے۔

اور پھر طہران کے دو مہینے میں کیسے بھلا سکتا ہوں؟ خیابان لالہ زار اور توپخانہ میدان مجھے کیسے بھول سکتا ہے؟ آخر میں شیراز اور شیراز کی وہ جمعہ کے دن والی صبح کو حافظ کے مزار پر لگا ہوا میلہ پھولوں کا وطن رہ گیا۔ انزلی سے بوشہر تک بہار تھی۔ میرا دل ان کو بے اختیار دعائیں دے رہا تھا۔ اللہ ان کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ سعدی اور حافظ ایران کے ساتھ ہی اچھے لگتے ہیں۔ شیراز اسی لئے تو اب تک ان کی قدر

کر رہا ہے۔ آغا عبدالکریم کے کہنے کے مطابق:

ایران ایک دن جنت ہوگا　　لیکن افسوس کہ ہم نہیں ہوں گے
ہر وقت بہار کا سماں ہوگا　　لیکن افسوس ہم نہ ہوں گے

ان خیالات میں ڈوبے ہوئے اچانک نظر اوپر پڑی۔ اوپر میرے سر پر "یونین جیک" لہرا رہا تھا۔ ساتھ ہی جہاز کا نام ایس۔ ایس بنکورہ بھی لکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ جہاز کے قرب وجوار میں خوبصورت مچھلیوں کا رقص جاری تھا۔ جہاز کی طرف اس طرح بھاگتے ہوئی آتیں جیسے ان کو کسی نے دعوت دی ہے لیکن جلد ہی حقیقت جان کر واپس لوٹ جاتیں۔

جہاز کے عرشے پر

جہاز کے عرشے پر میرے عجیب وغریب یار تھے۔ ہندوستانی، بغداد سے ہندوستان، ایرانی بندر عباس اور عرب مسقط تک میرے ہم سفر تھے۔ ان سب میں گوا کے چند لوگ بھی تھے جو سرکس میں کام کرتے تھے۔ یہ سرکس بغداد سے ہندوستان جا رہا تھا اور 'روسی سرکس' کے نام سے مشہور تھا۔ سرکس میں چند روسی بھی موجود تھے۔ مجھے اس کا پتہ نہیں چلا کہ سرکس کی ملکیت یہ تھے یا سرکس ان کی ملکیت تھی۔ وہ بھی دن کو عرشے پر بیٹھے ہوتے، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ کرسیوں پر بیٹھے ہوتے اور ہم سے دور روسی زبان میں آپس میں گفتگو کرتے۔ بہت دنوں بعد میں نے روسی زبان سُنی۔ وہ لوگ ایک آٹھ سال کی چھوٹی بچی کو سرکس کے لئے تربیت دے رہے تھے۔

ہم بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کون ہو۔ میں نے جواب دیا کہ میں تبریز کا رہنے والا ہوں۔ اس نے بغیر روک ٹوک کے فوراً کہا کہ تم ہندوستانی ہو۔ میں حیران ہوا لیکن اپنی حیرانگی ہنسی میں ٹال دی۔ گفتگو دوسری طرف لے گیا۔ سارے سفر میں پہلا شخص تھا جس نے مجھے پہچانا۔

درجہ دوم کا ٹکٹ

دوسرے دن ایس ایس بنکورہ، بندر عباس پہنچا۔ میرے لئے عرشہ بہتر تھا، وہاں کسی سے جان پہچان کا سوال ہی نہیں تھا۔ مجھے چکر آ رہے تھے۔ ہندوستانی ہوٹل سے اچار، چاول اور دال کھائی ترش خوراک کے لئے دل کر رہا تھا۔ لیکن پھر وہی پیٹ بھر کر کھانا جی خراب ہونے کا سبب بنا۔ بندر عباس میں فیصلہ کیا کہ مزید اپنے آپ کو عرشے پر ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ جیب میں پچاس روپے موجود تھے۔ ہندوستان پہنچ سکتا تھا۔ جہاز کے کپتان کے پاس گیا۔ اس وقت میں نے کمر چادر سے باندھی ہوئی تھی، لمبی گھٹنوں تک قمیص پہنے ہوئے، ایک ماہ سے زیادہ کی داڑھی بڑھائے ہوئے سر کے بال تازہ تازہ مونڈھے ہوئے تھے۔ ایک سفید ہلکی کم قیمت ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ کپتان کے ساتھ تین اور فرنگی کھڑے تھے۔ میں نے فارسی زبان میں اس سے درجہ دوئم کا ٹکٹ مانگا، پتہ نہیں وہ سمجھا بھی یا نہیں، لیکن انگریزی میں جواب دیتے ہوئے کہا

"بٹلر کے پاس جاؤ"

بٹلر ایک ہندوستانی تھا۔ میرے پاس ہندوستانی سکے تھے جو کمر میں اڑسے ہوئے تھے۔ سب کھول دیئے۔ اس نے ساتھیوں کو مسکراتے ہوئے کہا "دیکھو! دیکھو"۔

میرے پاس بمبئی کا تیسرے درجے کا ٹکٹ تو تھا ہی پھر بھی اس نے کراچی تک کے لئے درجہ دوئم کے چھیاسٹھ روپے لئے۔ اس میں میرے کھانے اور چائے کا خرچہ بھی شامل تھا۔

جہاز کا سیکنڈ کلاس

میرے ساتھ ایک خادم روانہ ہوا۔ وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ اس میں چار جگہیں تھیں دو نیچے اور دو اوپر۔ نیچے والی جگہوں میں ایک ہندوستانی اور ایک فرنگی موجود تھا۔ اوپر والی جگہوں میں سے اس نے مجھے ایک دے دی۔

جلد ہی مجھے پتہ چلا کہ میرے دونوں ساتھی انجنیئر ہیں۔ بغداد میں کام کرتے تھے۔ واپس کلکتے جا رہے تھے۔ فرنگی باشندہ تو آئرلینڈ کا تھا لیکن اس کا گھر کلکتے میں تھا۔ اس کا باپ وہیں رہتا تھا۔ ہندوستانی عیسائی تھا۔

میرے کمرے کے ساتھ ہی ایک اور کمرے میں ایک معمر عرب اور دو نوعمر نوجوان تھے۔ دوپہر کے کھانے کے لئے ہمیں بلوایا گیا تھا۔ میرے ساتھ میز پر عرب لڑکے اور وہ بزرگ بیٹھا۔ باقی ساری میز پر ہندوستانی تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سرکس کمپنی کے اونچے پائے کے ملازمین ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمارے آگے سوپ (شوربہ) کی پلیٹیں رکھی گئیں جو ہم نے مزے مزے سے چمچوں کے ذریعے پی۔ مشکل تب آن پڑی جب ہمارے آگے گوشت رکھا گیا اور ساتھ اس کے چھری کانٹے بھی رکھے گئے۔ میز پر بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے علاوہ ملازمین کی توجہ بھی ہماری طرف تھی۔ ہمارے لباس اور وضع قطع سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہم یورپی طرز پر کھانے سے نابلد ہیں۔ عرب لڑکے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میز پر بیٹھے اس طرح کھانے والے ماہرین حضرات کی نگاہیں ہم پر مرکوز تھیں اور ساتھ ہی وہ ہم پر آوازے کس رہے تھے۔ عرب نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کے طریقے پر کھانے سے ناواقف ہیں۔ اس نے کہا کہ ان کی بات بالکل صحیح ہے۔ پھر اس نے مجھ سے اُس طرح کھانے کا طریقہ معلوم کرنا چاہا۔ میں نے ان کو کہا کہ آپ لوگ میری طرف دیکھیں جیسے میں کھاتا ہوں اسی طرح میری پیروی کریں۔ یہ کہتے ہی میں نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں اٹھا لیا اور ایشیائی طریقے سے اس کو کھانا شروع کیا۔ عرب کے لئے آسانی ہو گئی۔ ہم نے پیٹ بھر کر خوب کھانا کھایا۔ آہستہ آہستہ ہم (میں اور عرب) باقی ہندوستانیوں کے ساتھ گھُل مل گئے۔ وہ کبھی کبھی ہمیں چھُری کانٹے کا استعمال سکھاتے۔ وہ لوگ اس پر حیران تھے کہ میں نے وہ طریقہ بغیر کسی تکلیف کے سیکھ لیا۔ لیکن کھانا اپنے طریقے سے ہی کھاتا۔ میرے عرب دوست اس بات سے بڑے خوش تھے۔

کبھی کبھی میرے کمرے کا ملازم بھی مجھے سمجھاتا کہ اور لوگوں کی طرح میں بھی سوٹ، بوٹ اور

ٹائی پہنوں اور اپنی داڑھی منڈاؤں۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے سمجھایا

"تم ایک امیر آدمی ہو، تمہیں چاہیئے کہ جنٹلمینوں کی طرح رہو!"

آئرش اور ہندوستانی انجنیئر کی بھی یہی کوشش تھی اور ہر وقت سمجھاتے کہ میں یورپی لباس پہنوں۔ ملازمین اور انجنیئر مجھ پر کسی شیخ (جو اس علاقے کے دولت مند آدمی کو کہتے ہیں) کا گمان کر رہے تھے۔

میرے ساتھیوں کی آپس میں جنگ

جہاز کو بوشہر سے چلتے ہوئے خلیج فارس میں چوتھا دن تھا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا اور خشکی کا کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔ سویرے کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میری طبیعت بھی جہاز کے ساتھ واقف ہو چکی تھی۔ سمندر بھی پُرسکون تھا اور جہاز بھی آرام سے چل رہا تھا میرے ساتھی میرے ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے تھے جس میں زیادہ فارسی ہوتی اور کم انگریزی ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی میں سمجھ سکتا ہوں اور بول نہیں سکتا۔ گپ شپ ہماری جاری رہتی۔

میرے دونوں ساتھیوں بنگالی اور انگریز کی آپس میں نہیں لگتی تھی۔ کبھی کبھی دونوں میرے ساتھ ایک دوسرے کی غیبت کرتے تھے۔ ہر روز کسی نہ کسی معاملے میں ان کی بحث گرم ہو جاتی۔ بحث کے دوران وہ میری طرف دیکھتے اور میں اثبات میں دونوں کو سر ہلاتا۔

ایک دن کسی بات پر دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ میں ان کے ذاتی معاملے میں دخل نہ دینا چاہتا تھا۔ اتنے میں فرنگی نے اس کو وہ سنائیں جو ہمیشہ وہ بنگالی کی پیٹھ پیچھے میرے ساتھ کیا کرتا تھا۔

"بھنگی! تم اور تمہارا سارا خاندان بھنگیوں کا ہے۔ ہمارے ہی چندوں پر ہمارے مشنریوں نے تمہیں کیا سبق نہیں سکھایا ہے۔ اب تم میرے سامنے ایسی باتیں کرتے ہو!"

میں اپنی جگہ ہی پڑا ہوا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کب بحث ختم ہو گی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں

کہ بنگالی نے انگریز کو اوپر اٹھا کر اس کی نشست پر پٹخ دیا۔ اور اپنے گھٹنے اس کی چھاتی میں گاڑ دیئے۔ میں نے اپنی سیٹ سے چھلانگ لگائی تاکہ دونوں کے درمیان صلح کرا سکوں لیکن میری حیرانگی کی حد نہ رہی جب انگریز نے نیچے سے ہاتھ نکال کر مجھے ان الفاظ کے ساتھ ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

You are not to interfere

(تم درمیان میں نہ آؤ)

پھر بھی میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور بنگالی کو اس کے اوپر سے اٹھا دیا۔ فرنگی نے نیچے پڑے پڑے اپنا چاقو نکال لیا۔ اور پھر بنگالی کو مارنے کا ارادہ کیا۔ بنگالی مضبوط اور بہادر آدمی تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور ساتھ ہی اسے للکارا کہ آؤ۔ فرنگی سُست پڑ گیا۔ بنگالی نے اس سے چاقو لے لیا۔ اسے نیچے گرا کر اس پر مُکّوں کی ایسی بارش کر دی کہ میرا دل پسیج گیا۔ غصّے میں مجھے بالکل خیال ہی نہیں رہا کہ میں نے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ بنگالی پر انگریزی زبان کے الفاظ میں برس پڑا۔

Are you not ashamed of yourself by
beating a fallen foe so mercilessly

(کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ گرے ہوئے دشمن کو ایسی بے رحمی سے پیٹ رہے ہو۔)

میرے ان الفاظ میں جیسے کوئی پوشیدہ طاقت تھی، دونوں لوٹ کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے مجھے محسوس ہوا جیسے مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر پھر کوئی فریق اب اعتراض کرے کہ کیوں تم نے مداخلت کی ہے۔

اس کے بعد میں نے ان میں بہت تبدیلی محسوس کی۔ دونوں بہت اچھے دوست بنے۔ انگریز اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا۔ میں حیران تھا کہ اتنے اعلےٰ تعلیم یافتہ آدمی کو بھی جسمانی سزا کی ضرورت تھی۔

مسقط

ساتویں دن ہم مسقط کی بندرگاہ پہنچے۔ بوشہر اور بندر عباس سے زمین بالکل الگ تھی۔ پانی

کی ایک بڑی نہر پہاڑ میں سمندر کی جانب سے نیم دائرے کی شکل میں اندر گئی ہے۔ اندر پھر ایک بڑے گول تالاب (جھیل) میں جہاز کنارے پر جاکر کھڑا ہو گیا۔ پہاڑ کے اوپر بیرک بنے ہوئے ہیں اور کنارے پر خوب صورت عمارتیں تعمیر ہیں۔

مسقط ہے تو ایشیا میں لیکن فرنگی کے مقبوضات میں آتا ہے اس لئے خوب صورت تعمیر کیا گیا ہے۔ جہاز ایک گھنٹہ کھڑا رہا۔ میں نے قریبی ساحل کو دیکھا۔ چھ ڈبے مسقطی حلوہ کے خریدے۔ جہاز پر واپس لوٹ آیا۔ کیلے اور سنگترے کی بہتات تھی۔ سستے داموں ہر جگہ بک رہے تھے۔

بحیرہ عرب

بلوچستان کا ساحل

مسقط سے آگے ہم پھر پھیلے ہوئے سمندر میں آئے۔ آٹھ دن تک پانی پُرسکون تھا، نویں دن بحیرہ عرب کے پانی میں پہاڑ جیسی لہریں اٹھنی شروع ہوئیں۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا تھا۔ ملازم آجاتا اور افسردہ کھڑا رہتا۔ چائے۔ روٹی کا کہہ دیتا اور جس طرح آتا اسی طرح واپس چلا جاتا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی و فارسی میں میرا حوصلہ بڑھاتا۔ لیکن میری حالت خراب ہی تھی اور اپنی جگہ سے ہلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ ایک منٹ کے لئے تو میں اپنی جگہ ٹھیک رہتا اور دوسرے ہی لمحے میرا سر نیچے اور پاؤں اوپر ہو جاتے۔ جہاز جب کسی لہر پر چڑھتا یوں لگتا جیسے کسی پہاڑ پر چڑھ رہا ہے اور جس وقت لہر سے نیچے اُترتا تو یوں لگتا جیسے کسی پہاڑ سے نیچے اُتر رہا ہے۔ ساری ساری رات اُلٹیاں ہوتیں اور طبیعت خراب رہتی۔ بلوچستان کے ساحل کے ساتھ ہی ایک بندر تھا جہاں جہاز سارا دن کھڑا رہا۔ بے حساب مچھلیاں جہاز میں لائی گئیں۔ جہاز کے رُکنے سے تھوڑا آرام ملا اور طبیعت میں کچھ بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔

اپنا وطن

کراچی کی بندرگاہ

میں کیسے بچ نکلتا ہوں:

بوشہر سے دسویں دن جولائی ۱۹۲۲ء کی تیس تاریخ کو میں کراچی پہنچا۔ ایس۔ ایس بنکورہ بڑی آن بان کے ساتھ آہستہ آہستہ کراچی کے بندر میں داخل ہوا۔ کنارے پہنچنے کے ساتھ ہی سواریاں سیڑھیوں کے پاس جمع ہوگئیں۔

ایک قُلی نے مجھ سے دریافت کیا "سامان ہے؟"

میں نے فوراً خورجین اس کے سر پر رکھی۔ وہ آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے۔ سیڑھیوں کے کونے کے ساتھ ہی ایک انگریز افسر کھڑا ایک شخص کا پاسپورٹ دیکھ رہا تھا۔ قُلی اور میں اس کے پاس سے ہو کر گزرے۔ افسر پاسپورٹ دیکھ رہا تھا اور ادھر میرا دل کانپ رہا تھا کہ اب پکڑا ہی گیا۔ اتنے میں قُلی نے مجھ سے پوچھا "جاؤں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ آگے آگے میں اس کے پیچھے سیڑھیوں سے اُتر گئے اور آہستہ آہستہ بندرگاہ سے باہر آئے۔ تلاشی کے افسر کے آگے میرا سامان پیش ہوا۔ چند ہی لمحوں میں میں ایک فٹن میں بیٹھا شہر کی طرف روانہ تھا۔ ایک دفعہ پھر میرے میلے کپڑے میرے کام آئے۔ بوشہر کے بعد میں نے کپڑے نہیں دھوئے تھے۔ دس دن کے میلے تھے۔ دو دن سے میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا۔ میری حالت اتنی خراب تھی کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے پاسپورٹ افسر نے مجھ میں اور قُلیوں میں کوئی فرق ہی نہیں محسوس کیا۔ میرے پاس بمبئی کا تیسرے درجے کا ٹکٹ تھا اور کراچی کے درجہ دوم کا۔ بڑا نازک موقع تھا۔ میں نے خود سے یہی کہا تھا کہ اگر پکڑا گیا تو پھر کہوں گا کہ کراچی سے چند ضروری چیزیں خریدنی تھیں اور پھر واپس ہونا تھا۔ راہداری کا تو میں نے خیال ہی چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب اس کے دیکھنے سے میری گرفتاری یقینی تھی۔ آنکھیں بند کر کے سوچتا ہوا نکلا کہ اگر بچ نکلا تو خیر ورنہ زیادہ سے زیادہ گرفتار ہی کر لیا جاؤں گا

گا۔ بندرگاہ کے احاطے سے نکلتے ہی میں نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ اس راہداری کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا تھا تاکہ سفر کا کوئی تحریری ثبوت میرے پاس سے نہ ملے۔

افغانستان کے ایک ہزارہ باشندے نے پہچان لیا

سہ پہر کا وقت تھا فٹن والا ایک مسافر خانے لے گیا۔ اوپر کی منزل میں ایک کمرہ مجھے دیا گیا جلد ہی پتہ چلا کہ مسافر خانہ خیراتی تھا اس کا کوئی کرایہ وغیرہ نہیں تھا۔ دوسرے ساتھ والے کمرے میں افغانستان کا ایک ہزارہ (باشندہ) بھی رہائش پذیر تھا۔ پہنچتے ہی اس نے مجھ سے میرے وطن کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے جواب میں کہا کہ ایرانی ہوں۔ وہ یہ بات نہیں مانا اور طنزیہ لہجے میں کہنے لگا

"چھوڑو! ایرانی نہیں ہو بلکہ افغان ہو۔ جھوٹ بول رہے ہو"

اس کے اچانک سوال نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔ اسی لئے غلطی ہوئی ورنہ اس کو تو کہنا چاہیئے تھا کہ میں پشتون ہوں۔ مزدوری کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ایران کا دم چھلا ساتھ باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جلد ہی چائے اور بسکٹ منگوا کر خوشامد کے طور پر اس کو اپنا مہمان بنایا۔

ایسا ہی ایک دفعہ میرے ساتھ بندر بوشہر اور بندر عباس کے درمیان ہو چکا تھا۔ جب ایک ایرانی نے مجھ سے میرے وطن کے متعلق پوچھا، تو میں نے اسے جواب دیا کہ میں ایرانی ترک آذربائیجان کا رہنے والا ہوں، وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ تمہاری چال ڈھال ہندوستانیوں کی سی ہے۔

کبھی تو میں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہوا اور کبھی اتنی جلدی پہچان لیا گیا کہ خود بھی حیرت ہوئی۔ لباس بدلنا ایک ہنر ہے جو کہ تھوڑی سی مشق سے آدمی اچھی طرح سیکھ لیتا ہے۔ کم باتیں اور اپنے آپ کو مزدور کے لباس میں رکھنا ایک ہنر ہے۔ شام سے پہلے پہلے اس مسافر خانے سے راہ فرار اختیار کر لی۔

کراچی میں مولوی بننا

دو دن کراچی میں گزارے۔ دونوں دن پشتون مزدوروں کے ساتھ گزارے۔ ایک دفعہ

پیش امام بھی بنا۔ اس لئے مولوی کے لقب سے مشہور ہوا۔ جو بھی پوچھتا اسے یہی کہتا کہ مزدوری کے لئے آیا ہوں۔ پشتون کافی تعداد میں کراچی میں مزدوری کر رہے ہیں، عزت سے وقت گزار رہے ہیں اپنی ساکھ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ بازار میں دو سندھیوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ میں ان کے قریب گیا تاکہ ان کو چھڑا سکوں۔ لیکن وہ منع نہیں ہو رہے تھے۔ اتنے میں ایک پشتون وہاں آیا۔ وہ مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا:

"دیکھیں، مولوی صاحب یہ اس کے بغیر نہیں مانیں گے۔"

دونوں کو ایک ایک تھپڑ مارا۔ ایک، ایک طرف چلا گیا اور دوسرا دوسری سمت چلا گیا۔ مزدوروں کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا لیکن سات مہینے سے وطن عزیز کے ارادے سے ماسکو سے روانہ ہوا تھا۔ کراچی میں کہاں ٹھہر سکتا تھا۔

کراچی میں افلاس

کراچی کافی بڑا شہر ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں نئی تعمیر کی گئی ہیں اور کچھ زیر تعمیر ہیں۔ کراچی بندگاہ ہے۔ افغانستان اور برصغیر کے مغربی حصے کی تجارت بیرونی ممالک سے اسی بندرگاہ کے ذریعے ہو رہی ہے۔ امیر و کبیر سوداگر جن کے کروڑوں روپے کے معاملات چل رہے ہیں یہاں رہائش پذیر ہیں۔ اس وقت کراچی میں انگریزی استعمار پنجے گاڑے ہوئے تھا جس کسی نے بھی شہر دیکھا۔ افسردہ دل واپس اپنے گھر آیا ہوگا۔ اس عالی شان شہر کے چوڑے چوڑے بازاروں کے دونوں کناروں پر بے حساب لوگ زمین پر لیٹے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا یہی گھر ہے۔ صبح سویرے بھوکے پیاسے مزدوری کے لئے نکل جاتے ہیں اور شام کو جب مزدوری سے واپس آتے ہیں تو ان کے پاس اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اس سے بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ اپنے بال بچوں سمیت ان فٹ پاتھوں پر سو سکیں۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے ان کے پاس کوئی انتظام نہیں۔ چھوٹے چھوٹے اور

شیر خوار بچے زمین پر پڑے رہتے ہیں۔ جو بھی تھوڑی سی انسانی ہمدردی دل میں رکھتا ہے کراچی میں ہرگز خوش نہیں رہ سکتا۔ ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ انسان ترقی کر رہا ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ لوگ اس تنزل کو ترقی کیوں کہتے ہیں۔ ہندوکش کے دامن میں خانہ بدوش، وسط ایشیا میں صحرا نشین اور ایران کے غریب دیہاتی بھی ایک وقت اچھا پلاؤ تو کھا سکتے ہیں لیکن کراچی اور قزوین میں بے حد افلاس ہے۔ مزدور فاقے کاٹ رہے ہیں۔ تاشقند، ماسکو، باکو اور طہران خوب صورت شہر ہیں۔ میں نے کراچی دیکھا، پسند نہیں آیا۔ زیادہ بڑا شہر بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے اور خوب صورت بھی نہیں ہے۔

کراچی سے لاہور

تیسرے دن ریلوے سٹیشن کی طرف جانکلا۔ سٹیشن سے باہر ریلوے کے ایک ملازم سے جو ترازو کے ساتھ کھڑا تھا اس سے میں نے اردو میں گاڑی جانے کا وقت معلوم کرنا چاہا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے پشتو میں مجھ سے دریافت کیا:

"تم کس گاؤں کے رہنے والے ہو؟"

"میں لوند خوڑ کا رہنے والا ہوں"۔ میں نے اسے جواب دیا۔

ملازم سیدھا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

"کیا کہا! تم اس گاؤں کے نہیں ہو۔ ہاں اگر تم سچے ہو تو گاؤں میں کسی کو پہچانتے بھی ہو۔"

"کسے نہیں پہچانتا"، میں نے غصے میں جواب دیا۔ "زیدی خان کو پہچانتا ہوں۔ ابراہیم خان کو جانتا ہوں" لیکن اس نے میری بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا:

"اگر تم سارے گاؤں والوں کو بھی جانتے ہو پھر بھی تم اس گاؤں کے نہیں ہو۔ تمہیں تو گاؤں کا نام بھی صحیح طور پر نہیں آتا۔ پھر کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہاں کے رہنے والے ہو۔ زیدی خان اور ابراہیم خان تو گاؤں کے خان ہیں، سارا عالم انہیں جانتا ہے۔ تم نے بھی وہ نام سُن لئے

ہوں گے۔ تم کسی غریب شخص کا نام لے دو۔ تب میں جانوں۔ تم نے لامدہ خوڑ (پشتو میں اسی طرح کہا جاتا ہے) کو لوند خوڑ کہا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس باتونی کے ساتھ مزید بحث نہیں کرنی چاہیئے۔ اس سے تو جتنا دور رہوں اتنا ہی اچھا ہے۔

"دیکھو کاکا (پشتو میں عزت کے طور پر اپنے سے بزرگ کو کاکا یا ماما کہا جاتا ہے) میں تم سے کچھ مانگ نہیں رہا ہوں۔ اگر گاڑی کا وقت بتا سکتے ہو تو بتا دو ورنہ میں چلتا ہوں۔"

اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں وہاں سے یہ بڑبڑاتا ہوا روانہ ہوا:

"میں سٹیشن سے کسی سے وقت معلوم کر لوں گا۔" ملازم پشیمان ہوا۔

"ناراض کیوں ہوتے ہو بھائی، ناراض مت ہو۔"

لیکن میں نے وہاں سے جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی تھی۔ میں درجہ دوئم کے ایک خالی ڈبے میں چڑھا۔ خورجین سر کے نیچے بطور تکیہ رکھی اور اپنی چادر لکڑی کی بنی ہوئی سیٹ پر پھیلا دی۔ چادر کے ایک پلو سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور لیٹ گیا۔ گاڑی روانہ ہونے سے پہلے کسی نے آکر زور سے پکارا:

"او اٹھو! تم کون ہے؟"

چہرہ باہر کیا اور آنکھیں ذرا اوپر اٹھائیں۔

"خوش آمدید۔ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"وطن جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور پھر چادر کا پلو چہرے پر ڈال دیا۔ اس آدمی نے جو وطنی معلوم ہو رہا تھا میرے ساتھ والی نشست پر قبضہ جما لیا۔ اوپر چڑھ کر اس پر بیٹھ گیا لیکن خاموش نہ رہ سکا اور مجھے آواز دی

"بھائی کیا وجہ ہے۔ معلوم ہو رہا ہے ساری رات جاگ کر گزاری ہے جو اس وقت نیند آ رہی ہے۔"

"نہیں بھائی!" اور یہ کہہ کر فوراً اٹھ بیٹھا کیونکہ مجھے بھی لیٹنے میں مزہ نہیں آرہا تھا۔ جو بھی ڈبے کے اندر داخل ہوتا تو دوسرے کونے میں جا کر بیٹھ جاتا۔ اگر کوئی ہمارے قریب بیٹھنے کی جرأت کرتا تو ہم وطن فوراً غراتا:

"مت آؤ۔"

وہ آدمی یہاں آنے سے رہ جاتا۔ یہ بات مجھے بُری لگی۔ گاڑی چل پڑی۔ چند سٹیشن چل کر ٹکٹ دیکھنے والا بابو آیا۔ بابو نے جب اس کا ٹکٹ دیکھا تو اس کو فوراً کہا کہ خان صاحب اُتر جاؤ تم غلط سمت جا رہے ہو۔ وہ فوراً اُتر پڑا اور میں اکیلا رہ گیا۔

مجھے خوشی ہوئی کہ اب لوگوں کو فراخی سے بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن اب کم اشخاص میرے قریب بیٹھنے پر آمادہ ہوتے۔ چند آدمیوں کی میں نے منت سماجت بھی کی کہ آکر میری نشست کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ وقت گزر رہا تھا۔ نئے نئے چہرے نئے سٹیشن پر چڑھتے۔ کراچی سے روانہ ہوئے ایک دن اور ایک رات گزر گئی۔ دوسرے دن کی دوپہر ہوئی۔ ڈبے میں کافی سواریاں تھیں۔ اتنے میں ایک عورت معہ چودہ سال کی بیٹی کے چڑھی۔ والدہ تو میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی جبکہ بیٹی میرے ساتھ میرے خورجین پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ ماں نے ڈرایا دھمکایا لیکن وہ نہیں مانی اور خورجین پہ ہی بیٹھی رہی۔ ماں نے اس کو سمجھایا کہ پرائے سامان پر بیٹھنا اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن لڑکی نے مجھے بُری نظروں سے گھورا۔ اسے اور بھی زیادہ غصہ آگیا۔ کہنے لگی:

"کیوں یہ کسی سے بڑا آدمی ہے کہ اس کا تو سامان بھی بنچ پر پڑا رہے۔ کیا یہ ہم سے زیادہ کرایہ دے رہا ہے؟"

"میں نے جھگڑا ختم کرنے کے لئے فوراً اس کی ماں سے کہا کہ خیر ہے لڑکی ہے چھوٹی بچی ہے ابھی اس کو وہاں بیٹھنے دو۔"

لڑکی کا رنگ کالا سیاہ تھا۔ کنواری معلوم ہوتی تھی۔ لباس اس کا پنجاب کے کسی دیہات کی طرز کا تھا۔ اس نے سیاہ دھوتی باندھ رکھی تھی اور سرخ موٹے کھدر کی قمیض پہنے ہوئے تھی۔ ان سادہ

کپڑوں میں اچھی لگ رہی تھی۔ غصّہ اس کو زیب نہیں دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کا غصّہ مصنوعی ہو۔ مزاج میں پھر بھی درشتگی چھائی رہی۔ میری طرف منہ پھیر کر کہنے لگی:

"کیا آپ کو اور لوگ کچھ دکھائی نہیں دیتے"۔

میں ہنس پڑا اور اس کی خدمت میں عرض کی:

"بہن مجھے نہیں معلوم میری کیا غلطی ہے۔ اگر کوئی میری جگہ بھی لینا چاہے تو میں راضی ہوں"۔

اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ جب کھڑا ہوا تو اردگرد کے لوگوں نے بھی ہماری گفتگو میں دلچسپی لی۔ انہوں نے لڑکی سے کہا:

"پٹھان اچھا آدمی ہے۔ یہ تو کسی کو کچھ نہیں کہہ رہا۔ تم خاموش ہو جاؤ"۔

اس واقعے کے بعد ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو گئے۔ سواریوں کا میری جانب خیال اور رویّہ بدلا۔ لاہور تک ہم بھائیوں کی طرح گپ شپ لگاتے پہنچے۔

لاہور

شام کے وقت لاہور پہنچے۔ گاڑی کے ساتھیوں نے مجھ سے اور میں نے ان سے رخصت لی۔ یہ چھوٹا سا سفر اتنا دلکش تھا کہ دل چاہ رہا تھا سفر اور بھی طویل ہو تو اچھا ہے۔

نیڈو ہوٹل

لاہور دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ راستے کی کوئی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ ایک تانگے والے کو کہا کہ کسی ہوٹل پہنچاؤ۔ وہ ایک ہوٹل لے گیا۔ وہاں پہنچتے ہی پتہ چل گیا کہ تانگے والے نے اپنی اوقات آخر دکھا ہی دی۔ ایک شخص اٹھا اور تانگے کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں جان گیا کہ یہ جگہ میرے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ ہوٹل والے نے تانگے بان سے دریافت کیا کہ کیا مسافر ہوٹل کا خرچ برداشت کر سکے گا۔ اس نے جواب میں کہا یار گرمی کا موسم ہے۔ بس ایک چھوٹی سی چارپائی

دے دو۔ غریب آدمی ہے ایک طرف پڑا رہے گا۔ دو روپے دے دے گا۔ اس وقت میری جیب میں پانچ روپے کا نوٹ موجود تھا۔ کھانا میں گاڑی ہی میں کھا چکا تھا۔ کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی! ایک لڑکے نے میری خورجین تانگے سے اٹھا کر برآمدے میں رکھ دی میں بھی اُتر کر اس طرف گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ بیرہ یہ دو روپے مالک سے چھپا کر اپنے لئے رکھ لے گا۔ ایک پھٹی پرانی چارپائی اٹھا کر باہر میدان میں ایک طرف ڈالدی۔ ایک پرانا تکیہ بھی لے آیا۔ گرمی کا موسم تھا جولائی کے آخری دن تھے لیکن ہوا چل رہی تھی اس لئے رات آرام سے گزری۔

گورے کنکر مارتے ہیں

صبح سویرے میرے مانگنے پر چائے لے آیا۔ بیرے کو جب میں نے ناشتے کا کہا تو وہ خوش ہو گیا۔ میرے لئے غسل خانے میں پانی رکھا گیا۔ صابن تو نہیں تھا لیکن پانی میں نے اپنے اوپر بہت ڈالا۔ غسل سے طبیعت بہتر ہو گئی۔ تولیہ نہیں تھا۔ میں نے وہی کافی دنوں والے میلے کپڑے گیلے بدن پر دوبارہ پہن لئے۔ گرمی کی بدولت جلد خشک ہو گئے۔ پسینے کی بدبو تو اس سے آ رہی تھی۔ جب غسل خانے سے نکلا تو چارپائی کی جگہ ایک چھوٹی میز کرسی اس جگہ موجود پائی۔ میں اس پر بیٹھ گیا اور چائے پینی شروع کر دی۔ ابھی ایک ہی ٹوسٹ کھانے پایا تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرے سر پر ایک کنکری ماری۔ بہت حیرت ہوئی لیکن ایک دم خیال آیا کہ کسی نے غلطی سے کنکری اس طرف پھینکی ہو گی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک ساتھ دو کنکریاں اور آئیں۔ ایک کمر پر لگی اور دوسری پاؤں میں گری۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو دو گوروں کو کرسیوں پر بیٹھے دیکھا۔ میرے دیکھتے ہی دونوں چائے کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں کچھ اس انداز سے لینے لگے جیسے ان کو ان کنکریوں کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ میں تو ان لوگوں کی شیطانیت سے واقف تھا۔ میرے مونڈے ہوئے سر کو دیکھ کر وہ بغیر کسی شرارت کے نہیں رہ سکے۔ یہ ان کے لئے ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ میں نے کرسی کا رُخ ان کی طرف کر لیا۔ دل ہی دل میں یہ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں میری داڑھی ان کے لئے مزید دلچسپی کا باعث نہ بن

جائے۔ لیکن بھلا ہو ان کا انہوں نے اور کنکریاں نہیں پھینکیں۔

۶۶ سی آئی ڈی کے انسپکٹر خان بہادر عبدالعزیز سے ملاقات

گورے اٹھ کر چلے گئے۔ دل کو تسلی ہوئی۔ ابھی ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں دو شرفاء آئے اور آکر ان کی جگہ بیٹھ گئے۔ میں چائے پینے میں مشغول تھا۔ ان میں سے ایک شخص اُٹھ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا:

"اے تم کو صاحب بُلاتا ہے۔"

صورت حال نازک تھی لیکن میں بھی ایسے موقعوں کے لئے تیار رہتا۔ مجھے اپنا راستہ نکالنا آتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا

"صاحب کدھر ہے"؟

دونوں اس کے پاس گئے۔ خان صاحب نے مجھ سے دریافت کیا:

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔

"ہم بمبائی سے آیا ہے۔"

خان صاحب "تم بمبئی کیا کرنے گیا تھا"۔

میں "خان کے ساتھ جائیگا"۔

خان صاحب "کون خان؟ تمہارے خان کا کیا نام ہے"؟

میں "میر گل خان"۔

خان صاحب "تمہارا گھر کدھر ہے؟"

میں "شربت خیل۔ کوہاٹ کا ضلع ہے"۔

خان صاحب "تم کون سے قبیلے سے ہو؟"

میں۔"ہم خٹک ہے۔"

میری خوش قسمتی تھی کہ خان صاحب زیادہ واقف نہیں تھا۔اس وقت تک میں نے بھی کوہاٹ نہیں دیکھا تھا۔اور میرا یہی خیال ہے کہ سارے ضلع میں شربت خیل کہیں نہیں ہے۔

خان صاحب۔"تم کبھی ایران گئے ہو؟"

میں۔"نہ صاحب۔ہم خوایران نہیں دیکھا۔"

خان صاحب۔"تم نے ایرانی جوتا کہاں سے پیدا کیا۔"

اس بات سے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایرانی چپل کراچی میں دُور رہٹا دینے چاہئیں تھے لیکن کیا کرتا پیسے جو نہیں تھے۔

"اے خو بمبائی میں بہت ہے۔"میں نے فوراً جواب دیا۔اس جواب سے اس کی تسلی ہوگئی۔

خان صاحب۔"تمہارا خان کہاں ہے؟"

میں۔"ہم کا خان دلّی میں ہے۔"

اس بات پر خان صاحب نے اس دوسرے کو میری بابت بتایا کہ کوئی جاہل،گنوار،اُجڈ آدمی ہے۔اور ساتھ ہی مجھے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔میں اپنی جگہ لوٹ آیا۔تھوڑا انتظار کیا اور پھر ہوٹل سے نکل گیا۔

حاجی معراج دین

اس وقت میرے پاس پانچ روپے تھے اور بآسانی گھر جا سکتا تھا لیکن آنکھیں بند کئے اس طرح گھر جانا مناسب نہیں تھا۔دل میں خیال آیا کہ لاہور کے مہاجرین میں سے کسی سے ملنا چاہیئے تاکہ وطن کی سیاسی فضا کا علم ہو سکے۔پھر کہیں سے اپنے گھر کی خبر لوں گا۔دو سالوں سے گھر کی کوئی خبر نہیں تھی۔اس طویل سفر اور سیاحت نے میرے دل میں شہر دیکھنے کا شوق پیدا کیا تھا۔خیال آیا کہ لاہور دیکھنے کا موقعہ حاصل ہے اس لئے اس سے فائدہ اٹھا کر سیر کر لینی چاہیئے۔

بغیر کسی واقفیت کے ایک طرف روانہ ہوگیا۔ کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف۔ اتنے میں ایک بڑے دروازے سے داخل ہوا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دلی دروازہ تھا) میں پرانے شہر میں داخل ہوا۔ بازار میں ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ ہر قسم کے لوگ پھر رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اتنے میں ایک دوکان پہ دوکاندار اور گاہک کے درمیان کسی بات پر تکرار سُنی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حاجی معراج دین (جس کی پُرجوش تقریر پر مہاجرین ناطول روانہ ہوئے تھے) گرم جوشی سے بحث میں پڑا ہوا ہے۔ بغیر رُکے وہاں سے سیدھا گزر گیا۔ اور پھر واپس پلٹا۔ اچھی طرح پہچان لیا کہ حاجی ہی ہے۔ دوکان کے آگے جا کر کھڑا ہوگیا۔ حاجی کی نظر مجھ پہ پڑی۔ خریداروں کو چھوڑ کر اپنی چُندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ایک نعرہ لگایا اور میرے ساتھ بغلگیر ہوگیا۔ خریدار حیران رہ گئے۔ حاجی نے مجھے جلدی سے چھوڑ دیا۔ تھوڑا پیچھے ہٹ کر خریداروں کو کچھ اس طرح مخاطب ہوا۔

"دیکھو بھائی! غازی اس طرح کے ہوتے ہیں۔ اچھی طرح دیکھ لو۔ اس کا دیکھنا بھی ثواب ہے۔"

"خاموش ہو جائیں حاجی صاحب!" میں نے اس کی بات کاٹ ڈالی۔

حاجی صاحب سمجھ گئے کہ کیا بات ہے۔ انہوں نے خریدار کو جلدی رخصت کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ حاجی صاحب میرا سامان ہوٹل میں پڑا ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی حاجی صاحب نے فوراً اپنی دکان بند کر دی۔

"چلو چل کر سامان گھر لے آتے ہیں۔ ہوٹل میں خرچ زیادہ ہے۔" حاجی صاحب بولے۔

دونوں ہوٹل کی سمت روانہ ہوگئے۔ جب احاطے کے پھاٹک کے قریب پہنچے تو حاجی صاحب رُک گئے

"دیکھو بھائی! وہ سامنے شیطان بیٹھے ہیں۔"

حاجی صاحب نے اپنی نگاہیں وہاں گاڑی ہوئی تھیں۔ مجھے ہاتھ کے اشارے سے بتایا وہ آگے، میں اس کے پیچھے پیچھے، جلدی سے لوٹ گئے۔

"حاجی صاحب یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ کیونکہ یہ وہی آدمی تھا جو مجھے ہوٹل میں

پہلے ہی تنگ کر چکا تھا۔ اور کچھ نازک سوالات مجھ سے پوچھے تھے۔ لیکن حاجی صاحب آگے بھاگتے ہی رہے اور میں ان کے پیچھے رہا۔ جب کافی دُور گئے تو حاجی صاحب کھڑے ہوئے اور مجھے بتانے لگے۔

"یہ خان بہادر عبدالعزیز سی آئی ڈی کا انسپکٹر ہے۔ ہم جو مہاجرین روس سے آتے ہیں اس کے ہاتھوں سخت پریشان ہیں۔"

میں نے جب سی آئی ڈی کا نام سُنا تو حاجی صاحب کے بھاگنے کی اہمیت کو جان گیا۔ کبھی کبھی حاجی صاحب سے کہتا کہ میرا بہت خوب صورت خورجین ہوٹل میں پڑا ہوا ہے چل کر خورجین کو لینا چاہیئے۔ دراصل خورجین کی خوب صورتی کی ایک بڑی وجہ اور بھی تھی۔ اس میں اسایان کی تصویر تھی۔ اور میرا تاریخی پُرانا لباس بھی اس میں پڑا ہوا تھا جس میں میں نے شیراز سے بوشہر تک سفر کیا تھا۔ ایک اور قیمتی چیز اس میں میری وہ 'پاکٹ بک' تھی جس میں میرے تمام سفر کے واقعات ایک نئی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ اس پر حکومتیں اعتراض کر سکتی تھیں۔ وہ زبان میں نے خود ایجاد کی ہوئی تھی۔ اس کے ا، ب، ج، د نئے تھے اس لئے ان کو ماہرین کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

لیکن حاجی صاحب نے مجھے ہوٹل نہیں جانے دیا۔

حاجی صاحب اور لاہور کے اور مہاجرین رنگا رنگ مصیبتوں کے شکار ہوئے تھے۔ روس میں بھی انہوں نے سخت قسم کی تکلیفیں سہی تھیں جن کا تفصیلی ذکر میری اس کتاب میں آچکا ہے۔ روس کے مصیبتوں کے مارے جب پشاور پہنچے تو سی آئی ڈی والوں نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا اور ان کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔

لاہور میں میرے اٹھارہ دن کے قیام کے دوران مختلف مہاجرین نے مجھے پشاور اور لاہور کی مصیبتیں اور تکالیف جو انہوں نے سہیں بیان کیں۔ اس نے مجھے نہایت ہی افسردہ کیا لیکن غلامی سے بھی نجات پانا آسان نہیں۔ جب ہند کی آزادی کی تاریخ تحریر کی جائے گی تو دنیا کو معلوم

ہو جائے گا کہ کتنے نوجوان اس مقدس مقصد کے لئے وطن عزیز پر قربان ہوئے ہیں۔ کتنے افراد نے خوشی سے اپنی راحت و آرام کو قربان کیا ہے اور راضی خوشی ایسی مصیبت میں پڑے جن کو سُن کر اپنے تو اپنے پرائے بھی افسردہ ہو جاتے ہیں۔ میں ان دوستوں کو یہی جواب دیتا کہ آزادی کوئی تر نوالہ نہیں جو آسانی سے نگلا جا سکے۔ مادر وطن کو تب ہی آزادی ملے گی جب نوجوان اپنے اوپر آرام کی زندگی حرام کر لیں۔ اور آزادی کی قیمت ادا کریں۔ ہم سب خاموش ہو جاتے۔ حاجی صاحب چپکے سے ایک سرد آہ بھر کے کہتے "خدا جانے ہم اس وقت تک زندہ بھی ہوں گے؟"

حاجی صاحب نے پہلے دن ہی مجھے زور دار الفاظ میں ایک بات سمجھائی

"یاد رکھو! سرحد کی سی آئی ڈی تمہیں ضرور پکڑے گی۔ سردار عبدالمجید کی زبان پر ہر وقت تمہارا ذکر رہتا ہے۔ اس نے ہر مہاجر سے تمہارا، سلطان محمد خان، گوہر رحمان خان، فیروز الدین منصور اور ایم اے مجید کا پتہ کیا"

لاہور میں سلطان محمد بابو کا انتظار

پہلے دن تو حاجی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے اور وہاں میری خوب خاطر مدارات کی لیکن میں نے پہلے دن ہی اس خطرے کا اظہار کر دیا کہ ان کے گھر میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ کسی مسجد میں رات بسر کرنا میرے لئے زیادہ محفوظ رہے گا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ہم نے آپس میں یہ مصلحت بھی کی کہ سلطان محمد بابو کو تار دینا چاہیئے کہ اس کے کہنے کے مطابق میں لاہور سے آگے جانے کا پروگرام بنا سکوں۔

سلطان محمد بابو صاحب نوشہرہ چھاؤنی کے ایک بڑے انقلابی تھے۔ انہوں نے ایک مدرسہ "تعلیم القرآن" کے نام سے بنوایا جو بعد میں اسلامیہ ہائی سکول نوشہرہ بنا۔ میں نے اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی لئے سلطان محمد بابو صاحب کے ساتھ اچھی واقفیت تھی۔

سلطان محمد بابو کی ذات نوشہرہ کی قومی تحریک کی مرکز تھی۔ اس مدرسے کے علاوہ وہ نوشہرہ ہی میں ایک یتیم خانہ بھی چلاتے تھے۔ یتیم خانہ ٹیکنیکل مڈل سکول تھا۔ اس طرح ایک وقت میں بابو صاحب

ہائی اور مڈل سکول دونوں چلا رہے تھے۔

بابو صاحب پنجاب کے رہنے والے تھے لیکن جوانی میں نوشہرہ آئے اور سانگہ یزوں کے فوجی کلب میں کلرک بھرتی ہوئے۔ اسی لئے بابو صاحب کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

بابو صاحب یہ مدرسے چندوں سے چلاتے تھے۔ ہر سال مسلم کلب میں دریا کے کنارے ایک بڑا جلسہ ہوتا۔ تحصیل کے مخیر حضرات اور چھاؤنی کے دوسرے تجارت پیشہ مسلمان اس میں بھاری چندے بصد دل و شوق دیا کرتے تھے۔ اس مدرسے میں میں نے چھٹی جماعت سے نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اور بابو صاحب مجھ پر بہت اعتماد کیا کرتے تھے۔

بابو صاحب انگریزوں کے دشمن تھے۔ کبھی کبھی جب وہ مسلمان فوجیوں کو پریڈ میں دیکھتے تو اپنے آپ سے کہتے:

"اگر صرف تمہاری توجہ راہ راست پر آجائے تو پھر کیا کمی ہے؟"

بابو صاحب جعلی نوٹوں کے مقدمے میں قید ہوئے لیکن نوشہرہ کے لوگوں کا جو ان سے اچھی طرح واقف تھے یہی خیال تھا کہ بابو صاحب نے اپنی ذات کے لئے اس نوٹ سازی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اتنے بڑے پیمانے پر تعلیمی کوششیں اسی نوٹ سازی کی برکت تھیں۔

بابو صاحب ہمیشہ زمین پر سونے کے عادی تھے۔ وہ بہت نیک اور پارسا انسان تھے۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔ نوشہرہ کی تعلیمی حالت میں انقلاب لائے۔ آج کے تعلیم یافتہ نوشہرہ کے باشندے بغیر تعریف و توصیف کے بابو صاحب کے لئے زبان پر اور کچھ نہیں لاتے۔ بابو صاحب کے اپنے بیوی بچے تو تھے نہیں اس لئے مسلمان بچوں کو اپنے بچے ہی سمجھتے رہے۔

مسجد وزیر خان

بابو صاحب سلطان محمد خان کے انتظار میں لاہور میں چند دن گزارنا لازمی ہو گئے۔ بابو صاحب پر بھی پولیس کی نظر تھی۔ میں نے اور حاجی صاحب نے آپس میں مشورہ کیا کہ رات میں مسجد وزیر خان میں ہوں

گا اور دن جہاں اور جیسے بھی ہوا کٹ جائے گا۔

جولائی کے آخری ایام تھے۔ دن کو سخت گرمی ہوتی۔ لیکن سونے کی جگہ تو تھی نہیں اس لئے دوپہر لاہور کے باہر درختوں کی چھاؤں میں گزار دیتا۔ دن کو ویسے نیند آنی مشکل تھی۔ میں نے داڑھی بڑھالی تھی۔ سر کے بال استرے سے صاف کرواتا۔ ایک بلی قمیص پہنے ہوئے رہتا۔ بالکل کسی مسجد کا طالب علم دکھائی دے رہا تھا۔ لاہور میں میں نے کُل اٹھارہ راتیں گزاریں اور وہ تمام مسجدوں اور خانقاہوں میں بسر کیں۔

وہاں میرے ایام حاجی صاحب کے پروگرام کے مطابق بسر ہو رہے تھے۔ جہاں بھی جاتا۔ کھانے کے وقت حاجی صاحب موجود ہوتے۔ روٹی کا سارا انتظام ان کے ذمے تھا۔ جب وہ میں کھا لیتا تو وہیں دوسری جگہ بتا دیتے اور پھر مجھ سے رخصت ہو جاتے۔

میری صاف اور واضح ہدایات کے باوجود کہ میری موجودگی کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ حاجی صاحب ہر دوسرے تیسرے دن چند مہاجرین کو کہیں ایک جگہ کہیں دوسری جگہ مجھ سے ملاقات کروانے لاتے رہتے۔ اس طرح لاہور کے کئی مہاجرین سے میری واقفیت پیدا ہو گئی۔

مقبرہ جہانگیر میں آموں کی دعوت

میں حاجی صاحب کو منع کرتا کہ ساتھیوں کو میرے متعلق کچھ بتانا اس لئے ٹھیک نہیں کہ ان کے پیچھے سی آئی ڈی ضرور لگی ہو گی۔ کہیں میرا پتہ نہ چل جائے۔ لیکن حاجی صاحب کا دل دوستوں کے لئے محبت سے لبریز تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ تاج الدین کو میرے پاس لے آئے۔ اُس نوجوان سے میں جلال آباد میں مل چکا تھا۔ بخارا تک یہ میرے ساتھ ہی رہا۔ پھر اس کو باکو میں دیکھا تھا۔ بہت باہمت اور دلیر انسان تھا۔ لیکن منہ پھٹ تھا اس لئے اس سے میں گھبراتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بہت محبت کا اظہار کیا اور حاجی صاحب سے جھگڑ کر بولا:

"حاجی صاحب! آپ نے تو میاں صاحب کو قتل کروا دیا ہے۔"

تاج الدین باوجود میرے اور حاجی صاحب کے منع کرنے کے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میں بھی

اُکتا چکا تھا اس لئے راضی ہو ہی گیا۔ تاج الدین کے ساتھ آرام سے رات گزاری۔

اگلے دن تاج الدین مجھے جہانگیر کے مقبرے پر لے گیا۔ آموں کی ایک بھری ہوئی ٹوکری اس نے ساتھ لی۔ ایک حاجی صاحب اور دو اور اشخاص جو میرے لئے اجنبی تھے وہ بھی ساتھ ہو لئے بارش ہوئی تھی، موسم کافی خوشگوار ہو گیا تھا۔ میں تو خاموش بیٹھا ہوا تھا لیکن تاج الدین کہاں چُپ رہنے دے رہا تھا۔ بار بار کہتا:

"مولوی جی! تُسی بھی بزرگو کچھ فرماؤ۔"

سارا دن ہنسی خوشی میں گزرا۔

شروع کی چند راتیں میں نے مسجد وزیر خان میں گزاریں۔ دن کی گرمی اور بے آرامی کی وجہ سے رات کو مجھے جلد نیند آجاتی اور سو جاتا۔ حاجی صاحب نے پہلے روز میرا تعارف مولوی صاحب سے کچھ اس انداز سے کروایا۔

"مولوی صاحب! یہ پٹھان طالب علم ہے۔ سرحد سے آیا ہوا ہے۔ یہاں چند روز کے لئے میرا مہمان ہے۔ یہاں سے دیوبند جائے گا۔"

اس تعارف سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ میں مسجد میں لیٹ جاتا۔ اگرچہ کبھی کبھی نماز رہ بھی جاتی۔ تو مولوی صاحب مجھ سے بدستور اسی عزت سے پیش آتے اور کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ میری یہی کوشش ہوتی کہ عشا اور فجر کی نمازیں تو باقاعدہ ادا کروں۔ لیکن بعض اوقات میں اتنا تھکا ماندہ ہوتا کہ عشا کی نماز سے پہلے ہی سو جاتا۔ مولوی صاحب نے ایک صبح فجر کی نماز کے بعد حاجی صاحب سے شکایت کر دی۔

"حاجی صاحب! یہ کیسا طالب علم ہے جو نماز بھی باقاعدگی سے ادا نہیں کر رہا ہے۔"

حاجی صاحب نے کچھ ادھر ادھر کی ہانکی لیکن بات نہ بنی۔ حاجی صاحب چونکہ ایک مشہور و معروف آدمی تھے۔ سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے اس لئے بچ گیا۔ ایک دن حاجی صاحب نے اس کو کہا:

"مولوی صاحب مجاہدین کے کردار کے متعلق اتنی پوچھ گچھ نہ کیا کریں"۔ اس سے مولوی صاحب شک میں پڑ گئے۔ حاجی صاحب کی غیر موجودگی میں اس نے مجھ سے تحقیقات شروع کی

"آپ کب جہاد میں شامل ہوئے ہیں"۔

میں نے جواب دیا کہ میں طالب علم ہوں۔ جہاد کے ساتھ کیا غرض۔ مولوی صاحب کے مجاہد جاننے سے اور کوئی نقصان تو نہیں تھا البتہ یہ خدشہ ضرور تھا کہ کہیں ڈر کر پولیس کے حوالے نہ کر دیں۔ اس کے بعد مسجد وزیر خان بھی مجھ سے گئی۔

پولیس میرے تعاقب میں ہے

تاج الدین بھی جلد ہی سمجھ گیا کہ اس طرح میں غیر محفوظ ہوں۔ میرے بار بار کہنے پر اس نے مجبور ہو کر مجھے شہر سے باہر دلی دروازے کے پاس بڑے چمن کی ایک زیارت کے مجاور کے حوالے کیا۔ لیکن اگلے دن وہ ہانپتا کانپتا آیا اور کہنے لگا کہ پولیس نے مسجد وزیر خان میں داخل ہو کر تمہارا اتہ پتہ معلوم کیا ہے۔ چلو جلدی شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں وہ یہاں پہنچنے ہی والی ہو گی۔

میں نے شہر کے باہر رہنا مناسب جانا۔ شام قریب تھی۔ تاج الدین مجھے شاہی قلعے کے قریب لے گیا۔ چرسیوں کے ایک اڈے کے پاس اس نے مجھے چھوڑا۔ رات دیر تک چرسیوں کا میری طرف کوئی خیال نہیں گیا لیکن جب ان کی میرے ساتھ آنکھیں چار ہوئیں تو یک دم مجھے مخبر جانا۔ میں نے اپنی صفائی شروع کر دی اور ہر چند ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف شب بسری کے لئے یہاں آیا ہوں لیکن انہوں نے میری منت سماجت کا جواب گالیوں سے دیا۔ مجھے مارنے کے لئے لپکے۔ لیکن چرس اتنی زیادہ پی لی تھی کہ بجائے آگے آنے کے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔

اس جگہ رات گزارنا مجھے پسند نہیں آیا۔ دور جانا بھی نامناسب تھا کیونکہ ساتھیوں کے بچھڑنے کا خطرہ تھا۔ لاچار چرسی خانے کے قریب ہی ایک جگہ ٹیک لگا لی۔ صبح سویرے تاج الدین پہنچا۔ میں

"مولوی صاحب مجاہدین کے کردار کے متعلق اتنی پوچھ گچھ نہ کیا کریں"۔ اس سے مولوی صاحب شک میں پڑ گئے۔ حاجی صاحب کی غیر موجودگی میں اس نے مجھ سے تحقیقات شروع کی

"آپ کب جہاد میں شامل ہوئے ہیں"۔

میں نے جواب دیا کہ میں طالب علم ہوں۔ جہاد کے ساتھ کیا غرض۔ مولوی صاحب کے مجاہد جاننے سے اور کوئی نقصان تو نہیں تھا البتہ یہ خدشہ ضرور تھا کہ کہیں ڈر کر پولیس کے حوالے نہ کر دیں۔ اس کے بعد مسجد وزیر خان بھی مجھ سے گئی۔

پولیس میرے تعاقب میں ہے

تاج الدین بھی جلد ہی سمجھ گیا کہ اس طرح میں غیر محفوظ ہوں۔ میرے بار بار کہنے پر اس نے مجبور ہو کر مجھے شہر کے باہر دلی دروازے کے پاس بڑے چمن کی ایک زیارت کے مجاور کے حوالے کیا۔ لیکن اگلے دن وہ ہانپتا کانپتا آیا اور کہنے لگا کہ پولیس نے مسجد وزیر خان میں داخل ہو کر تمہارا اتہ پتہ معلوم کیا ہے۔ چلو جلدی شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں وہ یہاں پہنچنے ہی والی ہو گی۔

میں نے شہر کے باہر رہنا مناسب جانا۔ شام قریب تھی۔ تاج الدین مجھے شاہی قلعے کے قریب لے گیا۔ چرسیوں کے ایک اڈے کے پاس اس نے مجھے چھوڑا۔ رات دیر تک چرسیوں کا میری طرف کوئی خیال نہیں گیا لیکن جب ان کی میرے ساتھ آنکھیں چار ہوئیں تو یک دم مجھے مخبر جانا۔ میں نے اپنی صفائی شروع کر دی اور ہر چند ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف شب بسری کے لئے یہاں آیا ہوں لیکن انہوں نے میری منت سماجت کا جواب گالیوں سے دیا۔ مجھے مارنے کے لئے لپکے۔ لیکن چرس اتنی زیادہ پی لی تھی کہ بجائے آگے آنے کے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔

اس جگہ رات گزارنا مجھے پسند نہیں آیا۔ دور جانا بھی نامناسب تھا کیونکہ ساتھیوں کے بچھڑنے کا خطرہ تھا۔ لاچار چرسی خانے کے قریب ہی ایک جگہ ٹیک لگا لی۔ صبح سویرے تاج الدین پہنچا۔ میں

میں نے اسے رات کا حال احوال سُنایا۔ دن کو ویسے بھی بے قراری رہتی۔ تاج الدین مجھے راوی[۶۷] کے کنارے لے گیا۔ ایک آم کے درخت کے نیچے دن گزارا۔ شام کو تاج الدین آیا اور مجھے بادشاہی مسجد لے گیا۔

رات کو جب عشا کی نماز سے فارغ ہوئے تو تاج الدین نے مسجد کے ایک ملازم سے میری سفارش کی کہ یہ مولوی صاحب رات یہاں گزارے گا لیکن اُس نے فوراً مسجد خالی کرنے کو کہا۔

بابو صاحب سے ملاقات

تاج الدین نے یہ تجویز کیا کہ اس کے گھر چل کر رات آرام سے بسر کروں۔ دن کو دیکھا جائے گا۔ لیکن میں نے یہ منظور نہیں کیا۔ مسجد کے باہر ایک بارہ دری تھی۔ اس کے پاس ہی لیٹ گیا۔ تاج الدین بھی جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ وہ کوئی بات کہہ رہا تھا۔ اتنے میں اس چمن میں چار اشخاص داخل ہوئے اور ایک طرف لیٹ گئے۔ میں نے تاج الدین کو سرگوشی میں بتایا کہ یہ لوگ بھی شاید ہماری طرح خانہ بدوش ہیں۔ لیکن اس نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں فوراً خاموش ہو گیا۔ دل میں خیال آیا کہ شاید پولیس والے ظالم پہنچ گئے ہیں۔ وگرنہ تاج الدین کیوں اتنا خوفزدہ ہوتا۔

تاج الدین آہستہ آہستہ ان کے پاس گیا۔ ایک شخص کے ساتھ مصافحہ کیا اور مجھے آواز دی میں ان کے پاس گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سلطان محمد بابو صاحب ہیں۔ جا کر ان سے بغل گیر ہوا۔ کچھ دیر تو دونوں خاموش ہی رہے۔ ہلکی روشنی تھی، ایک دوسرے کو صحیح طور سے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن دل کو تسلی ہوئی کہ میں اب محفوظ ہوں۔ کچھ دیر تک تو بابو صاحب کچھ نہ بولے۔ پھر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔ ہم تینوں رہ گئے۔ پھر بھی بابو صاحب خاموش ہی رہے۔ تھوڑی دیر بعد بابو صاحب نے تاج الدین کو ذرا دور ہٹنے کو کہا۔ اب میں اور بابو صاحب ہی رہ گئے تھے۔

"پڑھو کلمہ"۔ بابو صاحب نے حیران کن طریقے سے مجھ سے کہا:

میں نے بغیر کسی پس و پیش کے کلمہ سُنا دیا۔

"دل سے مسلمان ہو"۔ دوسری بات انہوں نے پوچھی۔

میں ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ "الحمدللہ"۔

"بس یہی کافی ہے۔ ہم اب تعاون کر سکتے ہیں۔ بابو صاحب صاف اور واضح انداز میں بولے۔

بابو صاحب نے مجھ سے سفر کے مختصر حالات دریافت کئے جو میں نے سُنا دیئے، میرے پوچھنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ محمد اکبر قریشی کو صرف تین سال کی قید ہوئی ہے۔ اور ساتھ ہی انہوں نے مشورہ دیا کہ "سیدھا اپنے گھر جاؤ۔ چھپنے کی کوشش مت کرو۔ خفیہ زندگی سے باہر رہ کر کام کرنا سیاسی زندگی کے لئے ضروری ہے"۔

لاہور سے گاؤں کو روانگی

اٹھارویں روز بابو صاحب کے مشورے سے ایک سپاہی کی وردی پہن لی۔ عبدالمجید کو میرے ساتھ کیا گیا تاکہ مجھے محفوظ گھر پہنچا سکے۔ میں نے جیب سے وہ پانچ روپے نکال کر عبدالمجید کو دینے چاہے تاکہ اس سے وہ ٹکٹ خرید سکے لیکن اس نے نہیں لئے۔ میرا کہنا اس کے لئے رائیگاں تھا۔ وہ ٹکٹ پر پیسے خرچ کرنا گناہ سمجھتا تھا۔ لالہ موسیٰ کے سٹیشن پر ہم پکڑے جانے کے قریب تھے کہ دوسرے ڈبے میں نکل بھاگے۔ عبدالمجید نے گارڈ والا سفید کوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہر جگہ ٹی ٹی کے ساتھ مصافحہ کرتا اور یہ ثابت کرتا کہ میں ٹی ٹی ہوں۔ اسی طریقے سے وہ اس کو دھوکہ دے دیتا۔ لالہ موسیٰ کے سٹیشن پر جب ٹی ٹی نے ہم سے ٹکٹ مانگا تو عبدالمجید نے اس کو بتایا کہ:

"میرا اور تمہارا تعلق ایک ہی برادری سے ہے۔ تمہیں میرا لحاظ کرنا پڑے گا اور مجھے تمہارا"۔

ٹی ٹی نے اس کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ جب ڈبے سے نیچے اُترا تو عبدالمجید بھی اس کے پیچھے اُترا۔ فوراً اندر آیا اور مجھے پکارا۔ کہنے لگا کہ جلدی باہر آؤ۔ وہاں سے دوسرے ڈبے میں لے گیا۔ دوسرے ڈبے میں میں نے اس کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہنے لگا کہ اگر تم نے بغیر ٹکٹ جانا ہے تو بے شک جاؤ لیکن مجھے شرمندہ مت کرو اور میرے لئے ٹکٹ لے لو۔ لیکن عبدالمجید نے قسم کھاتے ہوئے کہا

"میں انگریز کی مدد اپنے ہاتھ سے نہیں کرنا چاہتا۔ یہ گاڑی ہماری اپنی ہے۔ ہمارے ہی خون پسینے سے بنائی گئی ہے۔ تم چھوڑو سب ذمہ داری میری ہے۔"

عبدالمجید نوشہرہ کے اسلامیہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر عبدالرحیم کا بھتیجا تھا۔ بابو صاحب کا خاص مرید تھا۔ نوشہرہ چھاؤنی میں پلا بڑھا تھا۔ اور سکول میں ہمارے ساتھ تعلیم حاصل کرتا تھا۔

میرے بچپن کا ہم جماعت مجھے پہچانتا ہے

پنڈی اور کیمبل پور کے درمیان میرا ایک ہندو ہم جماعت جو بچپن میں میرے ساتھ پڑھا تھا قریب آیا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنے آپ کو لاتعلق بنا دیا۔ ویسے بھی میں نے فوجی وردی پہنی ہوئی تھی۔ اس لئے اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ قریب آکر کہنے لگا

"میاں صاحب تُسی ہونڑ بولدے بھی نہیں۔"

"ہم کاتم کا نہیں جانتا۔ تم کون اے۔" میں نے جواب دیا۔

لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اپنے دوسرے ساتھی کو کہنی مارتے ہوئے کہنے لگا:

"دیکھو نا یار! میاں ہونڑ سیانڑ وا ہی نہیں۔"

قریب ہو کر میرے ساتھ بیٹھ گیا اور پھر مجھ سے دریافت کیا:

"تم کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جارہے ہو؟"

"ہم فرانس کا آئے گا اور تیراہ کا جائے گا۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ وہ حیران رہ گیا۔ دوست سے کہنے لگا:

"یار کیا بتاؤں! بالکل اکبر شاہ کی طرح ہے۔"

"ہے تو پر تمہیں اس سے کیا۔" ساتھی نے اس کو جواب میں کہا۔

لیکن پشاوری (یہ اُس کا نام تھا) میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ ہم نے پرائمری مدرسے میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔

"یار بالکل اکبر شاہ ہے۔ میں اس کی آواز پہچانتا ہوں"۔

آہستہ آہستہ گاؤں کے نزدیک ہوتا گیا۔ خیر آباد اور اٹک کے درمیان ایک آدمی میرے قریب ہو کر کہنے لگا

"بھائی کدھر جا رہے ہو"۔

میں نے جواب میں کہا تیراہ جا رہا ہوں۔

"دیکھو بھائی یہ پشتونوں کا علاقہ ہے۔ اگر تمہارے پاس شلوار ہے تو اسے پہن لو"۔

میں نے جلدی سے اپنی گٹھڑی سے شلوار نکالی اور جانگیہ کے اوپر پہن لی۔ میں سمجھ گیا کہ پشتون ننگی پنڈلیوں کو دیکھ کر زیادہ خوش نہیں ہوتے۔

زیارت کاکا صاحبؒ[۶۸] میں فخرِ قوم[۶۹] کے ہاں رات گزارنا

اکوڑہ خٹک کے ریلوے سٹیشن پر گاڑی دوپہر کے رُک گئی۔ مجھ سے مشورہ لئے بغیر عبدالمجید ڈبے سے نیچے اُترا اور مجھے بھی اُترنے کا اشارہ کیا۔ اکوڑہ سے زیارت کاکا صاحبؒ دو چار میل ہی ہے پیدل روانہ ہو گئے۔ دلئی کا مولانا عبدالرؤف جو میرا بہترین دوست ہے راستے میں ملا۔ میں اس کے بالکل قریب سے گزرا۔ لیکن اس نے پہچانا نہیں۔ مغرب کے وقت زیارت کاکا صاحبؒ پہنچے، جس وقت ہم وہاں پہنچے تو فخر قوم میاں صاحب کو نماز کی تیاری میں مصروف پایا۔

فخر قوم میاں صاحب ایک مشہور شخصیت ہیں۔ قومی تحریک میں بالکل آشکارہ تھے۔ وہ عبدالمجید کو نہیں جانتے تھے لیکن عبدالمجید ان کے ساتھ بغلگیر ہوا اور اسے سرگوشی میں کہنے لگا کہ اس مولوی کا آپ کے ساتھ نماز کے بعد تعارف کراؤں گا۔ اس کو بابو صاحب نے بھیجا ہے۔ فخر قوم میاں صاحب ایک تجربہ کار شخص تھے۔ پرانے پکے انقلابیوں کی طرح صرف سر ہلا کر جواب دیا۔ اپنے آپ کو جیسے ناآشنا بنا لیا۔ ہم نے نماز پڑھی اور پھر قریبی حجرے میں گئے۔ رات گئے جب حجرہ خالی ہوا تو ہم تینوں علیحدہ بیٹھ گئے۔ بابو صاحب کے سلام کے بعد ان سے میرا

تعارف کرایا گیا اور زیارت کاکا صاحبؒ جانے کا مقصد صرف یہی بتایا گیا کہ بدرشی تک مجھے خیر و عافیت سے پہنچا سکیں۔

میں نے ان کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ گاؤں میں بڑی آسانی سے پہنچ سکتا ہوں کیونکہ صرف چھ میل یہاں سے دور ہے۔ لیکن میری خواہش ہے کہ میرے گاؤں جانے سے پہلے وہاں سے میرے رشتہ داروں کو بلوایا جائے تاکہ مجھے وہاں کے حالات سے کچھ واقفیت ہو جائے۔

میرے پہنچنے سے قبل گاؤں میں خبر پہنچ گئی

میں نے رات گئے ایک خط لکھا اور اس میں واضح کیا کہ اگلی شام کو چار بجے میرا بھائی یا میرا ماموں زیارت کاکا صاحبؒ کے قریب کہیں مجھ سے ملاقات کرے اور کوئی ساتھ نہ آئے میں نے فخر قوم میاں صاحب کو تاکید کی کہ جس کسی کو یہ خط دینا ہے اس کو سمجھا دیں کہ وہ خود بدرشی جائے اور میرے بھائی یا ماموں کے علاوہ یہ خط اور کسی کو نہ دے۔

اگلے دن سہ پہر کے چار بجے میرا ماموں مقررہ جگہ پر کھڑا تھا۔ لیکن اکیلا نہیں میری والدہ اور دوسری رشتہ دار خواتین بھی ان کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں۔

ماموں سے معلوم ہوا کہ سارے گاؤں کو پتہ چل گیا ہے کیونکہ خط پہلے چھاؤنی گیا تھا وہاں ہمارے گاؤں کے ایک آدمی کے حوالے کیا گیا۔ اس کی ہمارے ساتھ نہیں بنتی تھی اس لئے اس نے وہ خط ایک دوسرے آدمی کو دے دیا جس کا نام گڈے تھا۔ گڈے اچھا شریف آدمی تھا جو بھی اسے ملتا اسے خوشخبری سنا دیتا کہ اکبر شاہ پہنچ آیا ہے۔ ماموں کی زبانی اسے پتہ چلا کہ میرا والد اور بھائی دونوں پشاور گئے ہیں فوراً ان کے پیچھے پشاور گیا۔ ماموں نے ساتھ یہ بھی بتایا کہ ہمارے گاؤں میں ہمارے دوست احباب مبارکباد دینے بھی آئے تھے لیکن ماموں کے کہنے پر خاموشی اختیار کر کے واپس لوٹ گئے۔

مجھے افسوس ہوا میرا تجربہ اتنے لمبے سفر کے بعد اپنے ہی گھر میں ناکام رہا۔ میں اور میرا

ماموں زیارت کاکا صاحبؒ سے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اتنے میں بیت الغریب اور ہمارے گاؤں کے درمیان ایک تانگہ آتا دکھائی دیا۔ میں راستے سے ایک طرف پیشاب کے بہانے بیٹھ گیا۔ میرے پاس سے گزر کر تقریباً بیس قدم دور وہ تانگہ میرے ماموں کے پاس رُک گیا۔ میرے والد صاحب اور بھائی تانگے سے اُترے۔ ماموں نے جلدی سے ان کی توجہ میری طرف مبذول کروائی۔ مختصر ملاقات کے بعد میرے والد صاحب اور بھائی واپس اپنے گاؤں چلے گئے اور میں اور ماموں صاحب ان سے گاؤں کے مشرقی سمت میں اُتر گئے اور پوشیدہ طور سے گاؤں میں داخل ہوئے۔

رات گاؤں میں گزاری لیکن پتہ چلا کہ رات گاؤں میں گزارنا زیادہ محفوظ نہیں۔ پورا حال معلوم کرنے کے لئے بہتر ہوگا کہ چند دن گاؤں کے باہر رہ لوں۔ اس لئے صبح سویرے میں تنگی خٹک گیا۔ ایک دن وہاں گزارا۔ اس سے اگلے دن معراجی گیا اور دو دن وہاں گزارے۔

مجھے گرفتار کر لیا گیا

گاؤں پہنچنے کے چوتھے دن میں اپنے حجرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں خاکی لباس میں ملبوس ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ کہنے لگا

"میاں صاحب! ہم تو آٹھ مہینوں سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم تو بہت دیر سے آئے ہو۔"

خاکی وردی والا شخص میرے ساتھ ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھ گیا اور بات چیت شروع کر دی۔ اتنے میں اس نے اپنی پاکٹ بک نکال کر اس میں لکھنا شروع کر دیا۔ میرا تو یہی خیال تھا کہ یہ کوئی پولیس افسر ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پشاور کی سی آئی ڈی کا مشہور زمانہ تھانیدار شیخ عبدالعزیز تھا جو بعد میں خان بہادر اور ڈی ایس پی بنا۔

زبان کا اتنا شیریں تھا کہ میرے ذہن میں خیال آیا کہ ضرور میرے والد صاحب یا بھائی کا کوئی دوست ہے۔ لیکن دل اس کا بالکل اس کے برعکس تھا۔ اسی لئے میں نے مزید دو سالوں اور سترہ دن کی مسافرت کی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ اب میں بدرشی سے تقریباً پچیس میل دور پشاور جیل میں بند تھا۔

تعلیقات

(۱) اسلامیہ کالج پشاور :

سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی انتھک اور بے لوث محنت کا نتیجہ سرحد کے عوام کو ایک دارالعلوم اسلامیہ کالج کے نام سے ملا۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم ایک عرصے سے صوبہ سرحد کے مسلمانوں کے لئے ایک دارالعلوم کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے سر جارج روس کیپل کی مدد سے اپنے اس خواب کو ۱۹۱۳ء میں شرمندۂ تعبیر کیا۔ کافی غور و فکر کے بعد انہوں نے پشاور سے تین میل باہر ایک صاف اور ہوادار جگہ کا انتخاب کیا۔ اس جگہ سے خیبر کے دلکش نظاروں کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہی وہ تاریخی جگہ تھی جہاں ۱۸۳۵ء میں امیر دوست محمد خان والیٔ افغانستان کے بیٹے سردار محمد اکبر خان نے پشتونوں کی مدد سے سکھوں کی فوج کو زبردست شکست دی تھی۔ اور رنجیت سنگھ کے مایہ ناز جرنیل ہری سنگھ کو میدان جنگ میں قتل کر دیا تھا۔ اسی جگہ صدیوں پہلے کی ایک بدھ خانقاہ کے آثار بھی پائے گئے۔ کالج کی مسجد کا سنگ بنیاد ۲۱ مارچ ۱۹۱۲ء کو حاجی فضل واحد صاحب ترنگ زئی نے رکھا۔ ۵ اپریل ۱۹۱۳ء کو کالج نے باقاعدہ کام شروع کیا۔ یہی کالج اکتوبر ۱۹۵۰ء میں پشاور یونیورسٹی بنا

(۲) بابو سلطان محمدؒ

بابو سلطان محمد خوش وضع شکل و صورت کے مالک تھے۔ نوشہرہ چھاؤنی میں ایک کوارٹر میں رہائش پذیر تھے سیدھا سادہ لباس پہنتے اور کھانے پینے یا رہائش میں بھی حد درجہ سادگی اختیار کی ہوئی تھی۔ دوست احباب کی آمد و رفت ان کے ہاں سارا دن جاری رہتی۔ نوشہرہ کلاں میں انہوں نے ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی جس کا نام انہوں نے دارالعلوم اسلامیہ رکھا۔ اس میں کافی بڑی تعداد میں طلبہ تھے۔ ان طلبہ کے کھانے پینے اور کتب و اخراجات سب کے سب بابو صاحب کے ذمے تھے۔ بابو صاحب قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ بابو صاحب جعلی نوٹ

چھاپنے کے الزام میں پکڑے گئے۔ اس کے علاوہ ان پر اور مختلف الزامات بھی لگے۔ بابو صاحب کو گیارہ سال قید کی سزا دی گئی۔ رہائی ملنے پر وہ لاہور گئے۔ لاہور میں انہوں نے اپنا مطب شروع کیا اور وہیں وفات پائی۔

(۳) ہشت نگر

ہشت نگر درج ذیل قصبوں پر مشتمل علاقے کو کہا جاتا ہے۔

پڑانگ، چارسدہ، رجڑ، اتمان زئی، عمرزئی، ترنگ زئی، شیرپاؤ اور تنگے۔

(۴) بدرگہ

پشتونوں کے بعض علاقوں میں یہ رواج آج بھی پایا جاتا ہے کہ ایک آدمی چوروں یا ڈاکوؤں کے ڈر سے اپنے ہمراہ اپنے کسی دوست یا اُجرتی محافظ کو لے کر اس علاقے میں سفر کرے۔ اس حالت میں بدرگے پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ محافظ حملے کے وقت برملا کہتا ہے کہ میں فلاں شخص ہوں اور فلاں قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں اور اس وقت اس کا بدرگہ ہوں۔ اس وقت اس بدرگے وال پر حملہ کرنا اس قبیلے پر حملے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

(۵) بُرج

بُرج دراصل مینار ہوتے ہیں۔ رہائشی مکان کے اندر ایک یا دو حفاظتی مینار بنائے جاتے ہیں جس کی بالائی منزل میں بیٹھ کر چاروں طرف کا دُور دُور تک راستہ نظر آئے۔ یہ مکان کم از کم دو منزلہ اونچے ہوتے ہیں۔ بالائی حصے میں چاروں طرف مورچے کے سوراخ ہوتے ہیں جن سے فائر کیا جا سکے۔ اکثر یہ بُرج مٹی یا پتھر کے بنے ہوتے ہیں۔ آج کل لوگ اینٹیں بھی استعمال کر رہے ہیں۔

(۶) خرخوڑئی

پہاڑوں کے درمیان ایک ایسا چشمہ جو تنگ گہرائی میں واقع ہو خرخوڑئی کہلاتا ہے۔

(۷) مہمندوں کی مہمان نوازی

مہمان نوازی ساری پشتون قوم کا خاصا ہے۔ مہمندوں کی مہمان نوازی بھی اور پشتونوں کی طرح کافی مشہور ہے۔ جتنے دن مہمان کہیں گزارنا چاہے اس کی خدمت میزبان پر فرض ہوتی ہے۔ اس کی عزت و مدارات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جاتا۔ حتیٰ کہ حلیم تمباکو کے بندوبست کے علاوہ اگر ضرورت پڑے تو اس کے ساتھ بطورِ رہنما اور چوکیدار

سے بھی چلنے کو تیار ہوتا ہے۔

(۸) حاجی صاحب ترنگ زئی

حاجی فضل واحد ترنگ زئی کے رہنے والے تھے۔ آپ وہ پہلے شخص ہیں جو صرف مسلح جدوجہد سے ہٹ کر سیاسی جدوجہد کی طرف آمادہ ہوئے۔ آپ نے پشتونوں کو برطانوی استعمار کے خلاف منظم کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

حاجی صاحب چارسدہ میں ۱۸۵۰ء کے اواخر میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک معزز علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نوجوانی ہی میں آپ ہڈے مولوی صاحب (نجم الدین اخون زادہ صاحب) کے مرید بن گئے۔ ۱۸۹۷ء کی جنگ میں ہمندوں کے علاقے میں جاکر باقاعدہ طور سے انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ واپس چارسدہ آنے پر حکام نے گرفتار کر لیا۔ لیکن معززین کی سفارش پر ضمانت پر رہا ہوئے۔ آپ نے اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ اسلامیہ کالج پشاور کا سنگِ بنیاد بھی آپ ہی نے رکھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء میں حاجی صاحب اچانک روپوش ہوگئے۔ ان کے اس طرح روپوش ہوجانے پر انگریزوں کو کافی دھچکا لگا۔ کیونکہ انہوں نے حاجی صاحب کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گاؤں سے جانے کے بعد حاجی صاحب باجوڑ چلے گئے۔ وہاں مجاہدین سے رابطہ قائم کیا جو کہ تمام عمر رہا۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے ایما پر حاجی صاحب علاقہ غیر گئے تھے۔ حاجی صاحب پہلے بنیر گئے جہاں لوگوں نے آپ کی خوب آؤ بھگت کی۔ آپ ہی کے ایما پر ۱۷ اگست ۱۹۱۵ء کو رستم واقع ضلع مردان پر حملہ ہوا تھا۔ اگست ہی میں لنڈاکی پر ایک اور حملہ ہوا تھا۔ حاجی صاحب کی ساری زندگی برطانوی سامراج کے خلاف ہی گزری۔ علاقہ غیر سے انگریزوں کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ آپ نے تمام عمر جہاد کی تبلیغ کی اور اپنے مریدین کی ایک خاصی بڑی تعداد بنائی۔ حاجی صاحب ترنگ زئی نے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۷ء کو وفات پائی۔

(۹) کنڈاؤ

پہاڑوں اور پہاڑیوں کے بیچ میں گزرگاہ کنڈاؤ کہلاتا ہے۔

(۱۰) تیگہ (فائر بندی)

تیگہ وہ پتھر ہوتا ہے جو دو مخالف فریق کے درمیان عارضی مصالحت یا جھگڑے کے التوا کے معاہدے یا قول و قرار کے نشان کے طور پہ گاڑا جاتا ہے۔ اس پتھر کی اپنی جگہ موجودگی اس بات کی دلیل یا علامت مانی جاتی ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ نہ ہی ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کریں گے۔ کبھی یہ تیگہ مستقل صورت بھی اختیار کر لیتا ہے ورنہ ایک معینہ مدت کے لئے عارضی صلح کی شکل میں برقرار رہتا ہے۔ تیگہ کو توڑنا پشتونوں کی روایات میں بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے اور یہ ایک ناقابل برداشت جرم بھی جانا جاتا ہے۔ اس قبیلے پہ بڑا بھاری جرمانہ عائد ہوتا ہے جو اس کو توڑتا ہے۔

(۱۱) لوگری

فصل کی کٹائی والے آدمی کو لوگرے بولتے ہیں۔ فصل کی کٹائی کے دنوں میں مزدور پیشہ لوگ ٹولیوں کی شکل میں اپنی اپنی درانتیاں لئے مزدوری کی تلاش میں گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ لیکن آج کل وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں بھی ختم ہوتی جاتی ہیں۔ مشینوں کا دور آگیا ہے۔ آج کل اکثر جگہوں پر کٹائی اور صفائی مشینوں کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔

(۱۲)

پشتونوں کے علاقے پر سکھوں کی یورشیں ۱۸۱۸ء سے شروع ہوئیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان انہوں نے قبضہ کیا۔ پانچ سال بعد مروتوں کا میدانی علاقہ بھی ان کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۳۴ء میں نوشہرہ کے مقام پہ پشتون قبائل کو شکست دینے کے ٹھیک دو سال بعد ہری سنگھ نے پشاور کا قلعہ فتح کیا۔ ہربرٹ ایڈورڈ نے سکھوں کے لئے بنوں کا علاقہ فتح کیا اور اس طرح لاہور دربار کا رنجیت سنگھ پشتون علاقے کا بھی حاکم اعلیٰ بن گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرتے ہی اس کے جانشینوں میں تخت نشینی کی لڑائیاں شروع ہوگئیں جلد ہی اندرونی خلفشار اور کش مکش نے سکھ ریاست کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ اس کا پھل انہیں انگریزوں کے ساتھ ۱۸۴۶ء اور ۱۸۴۹ء کی اینگلو سکھ جنگوں کی شکل میں ملا۔ سکھوں کو شکست ہوئی۔ انگریز

سکھ ریاست پر قابض ہو گئے۔ انگریزوں نے جب سابقہ سکھ مقبوضات کا دورہ شروع کیا تو وہ پشتونوں کے علاقے میں چھوٹے چھوٹے قلعے دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ ان قلعوں میں سکھوں کے "لیڑے سردار" رہا کرتے تھے جن کی ذاتی افواج ارد گرد کے علاقے سے محصول وصول کرتی تھیں۔ قبائل ان کے ساتھ جنگوں میں مصروف رہتے۔ انگریزوں کے آنے پر بھی ان قبائل نے اپنی روش نہ بدلی۔ انگریزوں نے یہاں اپنی افواج بڑھائیں جنگوں کا ایسا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ تاریخ کا ہر طالبعلم ان کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ جتنا انگریزوں نے پشتونوں کے ہاتھ سے نقصان اٹھایا ہے اور جتنا ان کو پشتونوں نے پریشان کیا ہندوستان چھوڑ کر ساری دنیا میں اور کسی قوم نے نہیں کیا ہوگا۔

(۱۳) انگریز، افغانستان اور جنگِ استقلال

افغانستان کے ساتھ مملکت برطانیہ کے تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے بلحاظ ترتیب کچھ اس طرح پڑھیں گے۔

سب سے پہلے ۱۸۰۹ء میں ماونٹسٹورٹ الفنسٹن (Mountstuart Elphinstone) کو چوکنا رہنے کی پالیسی (Alarmist Policy) کے تحت ایک مشن کا سربراہ بنا کر کابل بھیجا گیا۔ اس کے بعد کا دور مفاہمت کرانے کی پالیسی (Meddling Policy) کا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۳۲ء میں الیگزینڈر برنس تجارتی مشن کے ہمراہ کابل پہنچتا ہے اور اسی پالیسی کے تحت ۱۸۳۸ء میں جنرل کین بارک زئی سردار دوست محمد خان کو تخت کابل سے اتار کر اپنے حلیف و دوست شاہ شجاع کو تخت پر بٹھانے کابل روانہ ہوتا ہے۔ ۱۸۳۹ء میں مملکت برطانیہ ایک بار پھر افغانستان کے معاملات میں مداخلت کرتی ہے۔ تاہم شاہ فارس کی نیت کو بھانپتے ہوئے ۱۸۵۵ء میں انگریزوں نے امیر دوست محمد خان شاہ افغانستان کے ساتھ ایک معاہدہ دوستی (A Treaty of Friendship) کیا۔ یہی وہ معاہدہ تھا جس کی اہمیت کا اندازہ انگریزوں کو ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی کے دوران ہوا۔ جبکہ وہ اس سمت کے محاذ سے بے فکر دیسیوں کو کچلنے میں لگے رہے۔ ۱۸۶۳ء میں سرجان لارنس نے تخت نشینی کی جنگ میں غیر جانبدار رہتے ہوئے امیر دوست محمد خان کے بیٹوں میں سے کسی ایک کی طرف داری بھی نہیں کی تاہم جب شیر علی خان اپنے بھائی افضل خان کے

خلاف کامیاب ہوا تو برٹش انڈین گورنمنٹ نے جلد ہی اس کو امیر افغانستان تسلیم کر لیا۔ اس دور کی پالیسی (Masterly Inactivity) کہلاتی ہے۔ اس کے بعد ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ جلد ہی انگریز فارورڈ پالیسی (Forward Policy) اپنا لیتے ہیں جس کا نتیجہ دوسری اینگلو افغان جنگ کی صورت میں نکلتا ہے۔ انگریزوں نے ایک چھوٹے سے واقعے کو بہانہ بنا کر افغانستان پر حملہ کر دیا۔ امیر شیر علی خان نے اپنے آپ کو مقابلے سے لاچار پا کر پایہ تخت (کابل) خالی کر دیا۔ اور دسمبر ۱۸۷۸ء میں سینٹ پیٹرز برگ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے روس کے علاقے میں پناہ لینی چاہی لیکن وہاں پناہ نہ لی اور اس کو افغانستان لوٹنے پر مجبور کیا گیا۔ واپسی کے سفر میں ۲۱ فروری ۱۸۷۹ء کو مزار شریف میں امیر شیر علی نے وفات پائی۔ انگریز کیوگنری (Cavagnari) کی قیادت میں قلعہ بالاحصار کابل میں قیام پذیر تھے۔ افغانوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ لیفٹیننٹ ہملٹن نے مقابلہ کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ افغانوں نے قلعہ میں موجود تمام انگریزوں کو قتل کیا۔ اس پر جنرل رابرٹ کو محاذ کا کمانڈر بنا کر افغانستان بھیجا گیا جس نے اپنی شکست کا بدلہ معاہدہ گنڈمک کی صورت میں امیر شیر علی کے بیٹے یعقوب خان سے لیا۔ اس کی رو سے مختلف اضلاع ژوب، لورالائی، پشین، کوئٹہ اور نوشکی افغانستان سے چھین کر برطانوی عملداری میں شامل کیے گئے۔ امیر عبدالرحمٰن کے ساتھ بھی انگریزوں کا تعلق حاکم اور محکوموں جیسا تھا۔ افغانستان کی خارجہ پالیسی کو اب انگریز ہندوستان سے ہی چلاتے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن کے ساتھ ڈیورنڈ لائن کا معاہدہ بھی ۱۸۹۳ء میں کیا گیا جس میں افغانستان کا کافی علاقہ انگریزی عملداری میں شامل کیا گیا۔ امیر عبدالرحمٰن کے مرنے پر اس کا بیٹا حبیب اللہ خان تخت نشین ہوا وہ انگریزوں کا زبردست حلیف تھا۔ اس کے وقت میں افغانستان برطانیہ کا زیادہ سے زیادہ حاشیہ بردار تھا۔ والیٔ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کو اس کے دورۂ ہندوستان کے موقع پر اتنا مرعوب کیا گیا کہ جب پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندوستان میں بہت کم فوج رہ گئی تھی۔ امیر افغانستان، انگریزوں کے دشمنوں کو افغانستان کی سمت سے راستہ دینے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے مرنے پر اس کا بیٹا امان اللہ خان تخت پر بیٹھا۔ وہ انگریز دشمنی میں مشہور تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپریل ۱۹۱۹ء میں ایک دربار منعقد کیا اور معززین افغانستان کو اس میں مدعو کیا۔ وہاں انگریزوں کے ساتھ جنگ

کی بات ہوئی۔ سب جہاد کے لئے راضی ہو گئے۔ ۳ر مئی ۱۹۱۹ء کو جنگ شروع ہوئی۔ افغانستان کی طرف سے باقاعدہ اعلان جنگ ۹ر مئی کو کیا گیا۔ ۳ر جون ۱۹۱۹ء کو جنگ بند ہوئی۔ انگریزی حکومت اور افغانستان دونوں نے اپنے اپنے فاتح ہونے کا اعلان کیا۔ کابل جاکر امیر امان اللہ خان نے اعلان کیا کہ

"افغانستان آزاد ہو گیا۔ میرے ملک کی بہادر افواج نے استقلال کی جنگ جیت لی ہے اب ہم مزید انگریزوں کے غلام نہیں رہے۔ آج کے بعد افغانستان ایک آزاد مملکت ہے جو دنیا کے اور ممالک کی طرح اپنے معاملات میں خود مختار ہو گا۔"

(۱۴) چمرکنڈ اور ہندوستانی مجاہدین

وہ مجاہدین جو ۱۸۳۱ء کی جنگ بالاکوٹ میں رہ گئے تھے اس مس واقع بنیر میں رہائش پذیر ہوئے۔ وہ برطانوی ہند اور امیر افغانستان کے ساتھ مستقل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ ۱۹ویں صدی کے اختتام تک انہوں نے برطانوی سامراج کو خوب تنگ کیا۔ لیکن ۲۰ویں صدی کے آغاز سے ہی ان کی طاقت زائل ہونا شروع ہوئی۔ ان میں مختلف گروہ بنے اور ان کی ایک بڑی تعداد وہاں سے چل کر چمرکنڈ میں رہائش پذیر ہوئی۔ چمرکنڈ باجوڑ کے علاقے میں مہمند اور باجوڑ کے اتصال پر واقع ہے اور افغانی سرحد کے بالکل قریب ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو مجاہدین عبدالکریم قنوجی کی سرکردگی میں ۱۹۱۵ء میں چمرکنڈ آئے۔ یہ جماعت مجاہدین ایک خاص مقصد کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس کے ارکان بہت مخلص اور جان نثار تھے۔ ان کو نہ تو مال و دولت کی آرزو تھی اور نہ دنیوی عزت و جاہ کی تمنا تھی۔ وہ تو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنی جانیں وقف کر چکے تھے لیکن بعد میں ان کے راہنماؤں میں کچھ لوگ دولت و دنیاوی جاہ و جلال کے لئے جماعت مجاہدین کو داؤ پہ لگا بیٹھے لیکن ان رہنماؤں کو جلد ہی کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔

(۱۵) مجاہدین کی پشتون غازیوں کے ساتھ امداد

مولانا بشیر (جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا) کی نمائندگی میں مجاہدین منظم طور پہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں مصروف تھے۔ وہ پشتون غازیوں کے ساتھ وزیرستان میں انگریزوں کے خلاف شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ ان

لوگوں کا چرکنڈ کے ساتھ باقاعدہ رابطہ تھا۔ چرکنڈ سے تازہ ٹولیاں وقتاً فوقتاً جہاد کے لئے جاتیں۔ عام طور سے مجاہدین کی ٹولیاں پندرہ سولہ دنوں میں پہنچ جاتی تھیں۔ مولانا عبدالکریم چرکنڈی کے مطابق جنگ وزیرستان میں مجاہدین کی تعداد پانچ سو سے زیادہ تھی۔ مجاہدین کا وہ لشکر مولانا البشیر کی وفات (۱۹۳۵ء) تک وہاں رہا اور ان کی وفات کے ساتھ ہی مجاہدین کا لشکر بھی وزیرستان سے اُٹھ کر منتشر ہو گیا۔

(۱۶) ہڈے مولوی صاحب

حضرت ہڈے مولوی صاحب ایک شیدائی خدا و رسول اور غازی مرد گزرے ہیں۔ ڈیورنڈ لائن کی مخالفت میں جو سیلاب پشتونوں کی سرزمین سے بڑھا چلا آرہا تھا اس کا نتیجہ ۱۸۹۷ء کی جنگوں کی صورت میں نکلا۔ ستمبر ۱۸۹۷ء میں مولوی نجم الدین اخونزادہ المعروف بہ ہڈے مولوی صاحب کی زیر قیادت ایک زبردست جنگ لڑی گئی جس میں انہوں نے انگریزوں سے شبقدر کا قلعہ اور بازار چھین لیا تھا چونکہ خود ہڈے مولوی صاحب غازی مرد اور کفر دشمن تھے اس لئے ان کے تمام اولوالعزم مرید ملا صاحب اکاخیل، سرکانی ملا، ملا صاحب چکینور اور حاجی صاحب ترنگ زئی فرنگی دشمنی میں پیش پیش تھے۔

(۱۷) سید احمد اور شاہ اسماعیل کی تحریک جہاد

سید احمد رائے بریلی کے ایک معزز سید خانوادے کے سید محمد عرفان کے گھر نومبر ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی فنون سپہ گری و حرب کی طرف مائل تھے۔ باپ کی وفات کے ساتھ ہی نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلے لیکن نوکری کرنے کے بجائے شاہ عبدالعزیز کے پاس دہلی گئے۔ ان کی بیعت کر کے ان سے دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ امیر خان والئی ٹونک کی ریاستی فوج میں ملازم ہو گئے۔ انہوں نے ٹونک میں سات سال گزارے۔ امیر خان کے انگریزوں سے معاہدہ کرنے کے بعد وہ ٹونک سے رخصت ہو گئے۔ ۳۸ سال کی عمر میں ۱۸۲۰ء میں حج کرنے مکہ معظمہ گئے اور ۱۸۲۴ء میں ہندوستان واپس لوٹے۔

واپس آکر جب انہوں نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو معاشرے کو ہزار قسم کی بُری رسموں میں ڈوبا پایا۔ ہندوستان میں اس وقت اسلام کلمہ پڑھنے، اسلامی نام رکھنے یا گائے کا گوشت کھانے تک ہی محدود ہو گیا تھا۔ سچی اسلامی روح ناپید تھی۔ ہندوؤں کے رسم و رواج نے مسلمان معاشرے کو حد درجے متاثر کیا تھا۔

سید صاحب اسلامی معاشرے کی اصلاح و ترقی کے لئے ہمہ تن کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ وہ اسلام کی اور اسلامی معاشرے کی اصلاح و ترقی کے لئے جہاد کو لازم قرار دیتے تھے۔ ان کے ساتھ اس وقت کے دو جید عالم سید اسماعیل اور مولانا عبدالحئی جو شاہ ولی اللہ کے خانوادے سے تھے اس کارِ نیک میں شریک ہو گئے۔ ۱۸۲۶ء میں سید صاحب معہ اپنے رفقاء کے ہندوستان سے شمال مغربی سرحدی صوبے کی طرف چل پڑے۔ صوبہ سرحد کو مرکز بنانے کے متعلق مولانا سید ابوالحسن ندوی صاحب فرماتے ہیں :

"سید صاحب کو ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے انتخاب میں اس بات نے بھی مدد کی ہوگی کہ افغانوں کی جواں مردی، سپہ گری، جنگی صلاحیت اور شجاعت کی ہندوستان میں بڑی دھوم تھی جو افغان ہندوستان کے مختلف حصوں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے وہ ان مردانہ اوصاف کے حامل اور سپہ گری میں ممتاز تھے"

جنوری ۱۸۲۶ء میں سید صاحب ہندوستان سے روانہ ہوئے اور براستہ گوالیار، ٹونک، اجمیر، سندھ حیدر آباد، بلوچستان، قندھار، غزنی، کابل، نومبر میں پشاور پہنچے۔ سکھوں کا پشاور پر قبضہ تھا۔ سید صاحب کی ان سکھوں کے ساتھ کافی جنگیں ہوئیں جن میں قابلِ ذکر جنگ نوشہرہ، جنگ اکوڑہ، جنگ شیدو، جنگ حضرو وغیرہ ہیں۔ جماعت مجاہدین نے علاقے کے پشتونوں کی مدد سے سکھوں کو شکستوں پر شکستیں دیں۔ سید صاحب کو علاقے کا امیر بنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ ایسے قوانین نافذ کئے جن سے مقامی لوگ مجاہدین کے خلاف ہو گئے۔ ان کے دلوں میں محبت کی جگہ مجاہدین سے نفرت نے لے لی۔ جلد ہی مجاہدین کے کئی سرکردہ رہنماؤں کو پشاور میں قتل کر دیا گیا۔ سید احمد اس پر دل برداشتہ ہو کر کشمیر کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں بالاکوٹ کے مقام پر ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو سردار شیر سنگھ کی سرکردگی میں سکھوں کے ساتھ مجاہدین کی جنگ ہوئی جس میں سید احمد اور شاہ اسمٰعیل اپنے بہت سے دوستوں اور رفقاء سمیت شہید ہو گئے۔ جماعت مجاہدین منتشر ہو گئی۔ جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو بنیر اور پھر باجوڑ میں جمع کر لیا اور اپنے پرانے مشن میں مشغول ہو گئے۔

(۱۸) سپہ سالار نادر خان

سپہ سالار نادر خان یحییٰ خیل قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو اب محمد زئی کہلاتا ہے۔ وہ ڈیرہ دون

میں پلے بڑھے تھے لہٰذا اردو اچھی طرح جانتے تھے۔ ڈیرہ دون میں ان کے والد اور خاندان کے اکثر افراد نے امیر دوست محمد خان کے زمانے میں پناہ لی تھی۔ سردار نادر خان امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے وقت ان کے محافظ تھے۔ جنگ استقلال کے موقع پر امیر امان اللہ خان نے انہیں ٹل کے محاذ کا رہنما اور کمانڈر بنا کر بھیجا تھا جہاں سے وہ کامیاب و کامران لوٹے تھے۔ محاذ سے واپسی پر ان کو افغانستان کا سپہ سالار بنایا گیا۔ لیکن جلد ہی امان اللہ خان ان سے بدظن ہو گئے۔ ان کو وزارت حربیہ سے سبکدوش کر کے فرانس میں افغانستان کا سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ امان اللہ خان کے تخت سے دستبردار ہونے پر بچہ سقاؤ تخت کابل پر بیٹھا تھا۔ اس کے زمانے میں فروری ۱۹۲۹ء میں بمبئی پہنچے تھے۔ مارچ سے اکتوبر تک بچہ سقاؤ کے خلاف مختلف مہمات میں مشغول رہا۔ اور اکتوبر میں کابل فتح کر کے بچہ سقاؤ کو پہلے تو کابل بدر کیا اور پھر قتل کرا دیا۔ خود تخت کابل سنبھال لیا لیکن تھوڑے عرصے بعد ہی ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو انہیں قتل کر دیا گیا۔

(۱۹) مولانا محمد بشیر

آپ کا اصلی نام مولانا عبدالرحیم تھا اور مولانا رحیم بخش صاحب امام جامع مسجد چینیانوالی لاہور کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اتباع سنت تو ورثے میں پایا تھا۔ اسلامی تاریخ کا بڑی حد تک مطالعہ کئے ہوئے تھے جنوری ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کو چھوڑ کر پندرہ دوسرے طلبہ کے ساتھ اسمس میں واقع آزاد علاقہ مرکز مجاہدین میں آئے۔ جلد ہی اپنی قابلیت کی بنا پر جماعت مجاہدین میں ایک اہم عہدے پر فائز ہو کر افغانستان چلے گئے۔ وہاں معین السلطنت سردار نصر اللہ خان کے رفیق بنے۔ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے دوران مولانا بشیر اور ان کی پارٹی تیراہ اور آفریدی علاقے میں بڑی اثر پذیر تھی۔ انہوں نے علاقہ تیراہ میں کوکی خیل کے علاقے میں سرکش نامی ایک چھوٹی سی مجاہدین کی ایک کالونی بھی بنائی۔ اس کالونی کو مولوی محمد حسن بی اے لاہور، ایک سابقہ طالبعلم جس کا نام محمد یعقوب لکھا گیا کے زیر نگرانی کر دیا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خیری بیگ اور احمد افندی جو کہ کابل میں حکومت ترکیہ کے نمائندے تھے کچھ عرصے تک اس کالونی میں رہے۔ کالونی والوں کی حتی الوسع کوشش یہی رہی کہ تیراہ کے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔ لیکن ان کو ناکامی ہوئی ۱۹۱۶ء کے آخری عشروں تک کالونی جو برائے نام رہ گئی تھی آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔

ترک جرمن مشن کی یہ کارروائی کہ علاقہ تیراہ کے قبائل کو حکومت کے خلاف لا کھڑا کریں ناکام ہوئی حکومت برطانیہ کے حلیف قبائلیوں نے جرمن ترک مشن کے اراکین کو علاقہ خالی کرنے پر مجبور کیا۔ ترک وہاں سے راجگال نامی ایک پہاڑی علاقے میں جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان کڑے حالات میں مولانا بشیر نے اپنے چار ساتھیوں سمیت راجگال جا کر دسمبر ۱۹۱۶ء میں انہیں چمرکنڈ چلنے کی دعوت دی۔ اس اثنا میں ترکوں کا میزبان طلعیم معہ چند ساتھیوں کے حکومت برطانیہ کے حلیف چند قبائلیوں کے ہاتھوں شہید ہوا ترکوں کے لئے اب ننگر ہار جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اس کے بعد ۱۹۱۹ء کی محسود لڑائی نے مولانا بشیر کو ایک بار پھر موقع فراہم کر دیا کہ وہ جا کر جنوبی وزیرستان میں مکین نامی جگہ میں اپنا مرکز بنا لے۔ مولوی محمد حسن تیراہ کالونی والے اس کے انچارج بنا دیئے گئے۔ حکومت برطانیہ نے خود اعتراف کیا ہے کہ وزیرستان کی مشکلات میں مجاہدین کا کافی ہاتھ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اور ۱۹۲۱ء میں بھی ان کا یہی کام چلتا رہا۔

مولانا بشیر ایک بہت بڑے منتظم بھی تھے۔ انہوں نے چمرکنڈ میں ایک سکول اور ہسپتال قائم کرنے کا منصوبہ بھی پیش کیا۔ علاوہ ازیں ان کا اپنا ارادہ تھا کہ مجاہدین کا اخبار "المجاہد" فارسی کے بجائے پشتو میں شائع کرایا جائے۔ امیر امان اللہ خان کے ساتھ مولانا کے تعلقات کافی زیادہ تھے جبکہ بچہ سقاؤ (حبیب اللہ) کے ساتھ انہوں نے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ بچہ سقاؤ کے بعد نادر خان سے بھی دوستی کا تعلق رکھا۔ مولانا بشیر نومبر ۱۹۳۴ء میں شہید کر دیئے گئے۔ تجہیز و تکفین کے بعد ان کا بستر اٹھا کر دیکھا گیا تو تکیئے کے نیچے سے ایک رقعہ برآمد ہوا جس میں تحریر تھا کہ میرے قاتل سے قصاص نہ لیا جائے کیونکہ یہ اس غریب کا اپنا فعل نہ ہوگا بلکہ وہ کسی درپردہ طاقت کا ہاتھ ہوگا۔ وہ تحریک کی جان تھے اور حقیقتاً ان کی شہادت کے بعد تحریک ایک بے جان لاشہ رہ گئی۔

(۲۰) درہ خیبر

صوبہ سرحد کے شمال مغربی پہاڑوں میں چند اہم اور مشہور درے ہیں جو صدیوں سے وسط ایشیا سے آنے والے تجارتی کاروانوں اور حملہ آوروں کے لئے راستہ کا کام دے رہے ہیں سان

راستوں سے صوبے کی اہمیت اور حیثیت اور بڑھ جاتی ہے۔ بروغیل اور دوراہ دو مشہور درے ہندوکش کے شمالی حصے میں واقع ہیں۔ اول الذکر پامیر کی طرف جاتا ہے جبکہ آخر الذکر افغانستان کی طرف جانکلتا ہے۔ ہندوکش کے جنوب میں ایک اور درہ خیبر بھی واقع ہے۔ اس کے علاوہ ٹوچی، گومل اور پیواڑ کوتل بھی واقع ہے۔

خیبر پاس افغانستان اور ہندوستان کے درمیان تجارت کا بڑا ذریعہ رہا ہے۔ خیبر پاس کے متعلق بغیر مبالغہ آرائی کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ہر ایک پتھر پر انسانی خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔ حملہ آوروں کا صدیوں سے یہی راستہ رہا ہے۔ خیبر پاس کو ابھی تک آریاؤں کی آمد یاد ہے یقیناً یہ ابھی یونانیوں اور باختریوں کو بھی نہیں بھولا ہوگا۔ سفید ہن، منگول، ساسانی، ترک اور مغل باری باری ادھر سے ہی گزر کر ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے۔ ۲۳ میل لمبا خیبر پاس جمرود سے تقریباً ۳ میل دور قدم نامی گاؤں سے شروع ہو کر بل کھاتا ہوا جا کر طورخم پر ختم ہو جاتا ہے۔ لنڈی کوتل کے قریب واقع پہاڑوں کی اونچائی ۳۳۷۳ فٹ تک جا پہنچتی ہے۔ خیبر کو جانے کے لئے تین راستے ہیں۔ ایک پکی سڑک جو کہ بہت موڑوں اور گھاٹیوں سے گزرتی ہے۔ ایک خچروں والا راستہ جو اب کاروانوں والا راستہ کہلاتا ہے اور تیسرا ریل گاڑی کی پٹڑی جو کہ ۲۶-۱۹۲۵ء میں بچھائی گئی تھی۔

(۲۱) ڈاکٹر برائڈن کا واقعہ

امیر دوست محمد خان کو تخت کابل سے اتار کر ہندوستان میں نظر بند کرنے کے بعد انگریزوں نے ۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع کو تخت پر بٹھایا۔ نہ صرف اس پر اکتفا کیا بلکہ اپنی فوج کی خاصی بڑی تعداد کابل بھیج دی۔ افغانوں کو انگریزوں کی کابل میں موجودگی نہ بھائی۔ انگریزوں سے نفرت کے اظہار کے لئے کابل میں جلد ہی جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ انگریزوں کی فوج جنرل ولیم الفنسٹن کی قیادت میں شہر پور جو کہ کابل کے نواح میں ہے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس وقت کابل میں اور قابل ذکر انگریز افسر ایلگزینڈر برنس، میکناٹن، کیمبل، ٹریور اور میکنزی تھے جبکہ افغان سرداروں میں امیر دوست محمد خان کا بڑا بیٹا اکبر خان، عبداللہ خان، موسیٰ خان اور امین اللہ خان تھے۔ ان میں سے کچھ انگریز افسروں کو تو افغانوں نے

قتل کر دیا۔ میکناتھن کی سر بریدہ لاش کو بازار میں ایک کھمبے سے لٹکایا گیا۔ باقی انگریزوں کو افغانستان چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ ۶ر جنوری ۱۸۴۲ء میں برطانوی افواج، مشنریاں، عورتیں اور ان کے حلیف کابل سے ہندوستان کی سمت روانہ ہوئے۔ موسم قدرے صاف تھا لیکن نہایت سرد تھا۔ کابل سے روانہ ہونے والوں کی کل تعداد چار پانچ ہزار تھی (صحیح تعداد چار ہزار پانچ سو تھی) ان کے تقریباً بارہ ہزار ہمراہی عقب میں تھے۔ ناقابلِ برداشت سردی کی وجہ سے قافلے کی رفتار بہت سست تھی۔ تیسرے دن تک قافلہ صرف بارہ میل دور کابل خورد تک پہنچا تھا۔ یہ ایک تنگ درّہ تھا جس کے دونوں اطراف قبائل ان کا استقبال کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ ان کا استقبال گولیوں کی بوچھاڑ اور پتھروں کی بارش کی صورت میں کیا گیا۔ اگرچہ سردار اکبر خان وغیرہ نے انہیں ایسا کرنے سے روکا۔ تاہم وہ نہ مانے اور قافلے کو نقصان پہنچاتے رہے۔ اس پر محمد اکبر خان نے قافلہ سے بچوں اور عورتوں کو معہ ان کے شوہروں کے کابل لوٹ جانے کو کہا۔ سارے راستے افغان یہی دہراتے رہے۔ قافلہ دن بدن کم ہوتا گیا۔ کچھ تو سردی کے مارے ٹھٹھر گئے۔ اور اکثریت گولیوں کا شکار ہوئی۔ جلال آباد کے نواح میں واقع فتح آباد صرف چھ آدمی پہنچنے میں کامیاب ہوئے پانچ تو وہیں ستانے کے لئے ٹھہر گئے جبکہ چھٹا آدمی ایک اسسٹنٹ سرجن برائڈن نامی جلال آباد کے قلعے میں انگریزی فوج کی تباہی کی خبر پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ برائڈن سخت زخمی تھا۔ اس کا گھوڑا مر چکا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کے محاصرے کے دوران وہ گنتی کے ان چند لوگوں میں سے تھا جو بچ گئے تھے۔

(۲۲) قاضی عبدالولی

قاضی ولی محمد خان کا اصل نام عبدالولی خان تھا۔ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو کر جب افغانستان گئے تو وہاں اپنا نام محمد ولی خان رکھا۔ آفیسر منشی کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر اسٹاف کالج کوئٹہ میں اردو اور پشتو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ بھوپال نے انہیں بھوپال بلوا کر اعلےٰ عہدوں پر تعینات کیا۔ جنگ طرابلس کے زمانے میں ترکی چلے گئے اور جنگِ بلقان میں شرکت کی جنگ کے خاتمے پر وہ وطن واپس آ گئے اور سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ آپ نے نئی قائم شدہ

مسلم لیگ پشاور میں نائب صدر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ آپ لوگوں نے انگریزوں کے خلاف بھرپور سرگرمیاں جاری رکھیں۔ آخر کار انگریزوں نے ان پر کاری وار کیا۔ قاضی عبدالولی جیل میں ڈال دیئے گئے۔ ان کے دوسرے ساتھی علی عباس بخاری افغانستان بھاگنے پر مجبور ہوئے اور تیسرے دوست میاں عبدالعزیز بمبئی چلے گئے۔ قاضی صاحب کو جیل سے کچھ عرصے بعد رہائی ملی۔ رولٹ ایکٹ (تفصیل آگے آئے گی) کے زمانے میں جب پھر گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوا تو دوستوں کے مشورے سے افغانستان چلے گئے۔ اور وہاں سے اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔ وہاں حالات کے ناسازگار ہونے پر جرمنی چلے گئے اور وہاں سے "کریسنٹ" اور "اورینٹ" کے نام سے یکے بعد دیگرے دو اخبار نکالے۔ ان اخبارات میں ہندوستان کی آزادی کے متعلق مضمون ہوتے۔ ہندوستان میں ان اخبارات کا داخلہ بند کیا گیا۔ کچھ مدت بعد یہ اخبارات بھی بند ہو گئے۔ قاضی صاحب جرمنی سے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ وہاں سے "مسلم سٹینڈرڈ" کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ کچھ عرصہ کے بعد امریکہ چلے گئے اور کافی مدت تک وہاں قیام کیا۔ قاضی صاحب کا انتقال پاکستان میں ۱۹۵۹ء میں ہوا۔

(۲۳) رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کا حادثہ

جنگ عظیم اوّل کے آخری دنوں میں ہندوستان بھر میں آزادی کی خفیہ تحریکیں شروع تھیں۔ اکثر صوبوں میں امن و امان کا فقدان تھا۔ ایسے میں ڈیفنس آف انڈیا کے تحت "تخریب کاروں" سے نمٹنے کے لئے یہ بل پاس کئے گئے۔ پہلے دو بلوں کے تحت ایسے جرائم کی سماعت ایک زبردست عدالت کرے گی جو ہائی کورٹ کے تین ججوں پر مشتمل ہو گی۔ ان میں اپیل کا حق نہیں دیا گیا۔ یہ ایسے حالات میں ہونا تھا جبکہ حکومت ہند کو یہ یقین ہو جاتا کہ انقلابی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ علاقائی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا کہ ایسے مشکوک افراد پر کڑی نظر رکھے اور انہیں اپنے علاقے میں بھی رہنے پر مجبور کیا جائے اور ان سے ضمانت بھی لی جائے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مذکورہ افراد حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہو رہے ہیں تو اُسے پھر کسی وقت بھی حکومت گرفتار کر سکتی تھی۔ ان بلوں کے دوسرے حصے میں علاقے کے عام قوانین میں مستقل قسم کی تبدیلی لائی گئی۔ کوئی بھی "تخریبی" دستاویز شائع کرنے یا موجود پانے پر ایک شخص کو قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ ایسے افراد جو کہ ریاست (ہند) کے خلاف کارروائیاں کرتے پائے گئے ہوں تو ان کو مدت سزا ختم ہونے کے دو سال بعد بھی ضمانت پر رہنا پڑتا۔

ان بلوں کی ہندوستان بھر میں سخت مخالفت ہوئی۔ وہی حکومت جو کل تک ہندوستانیوں کے سامنے امداد و اعانت کے لئے دست سوال پھیلا رہی تھی۔ اب زبان توپ و تفنگ سے باتیں کرنے لگی۔ ملک کے طول و عرض میں جبر و استبداد کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو ابھی تک لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہوا۔ رپورٹ کے متعلق خطوط اور اداریئے ہندوستان کے مختلف اخباروں میں مارچ کے مہینے میں چھپتے رہے۔ قومی رہنما اپنے کے سارے مہینے لوگوں کو بلوں کے خلاف تیار کرتے رہے۔ گاندھی جی کی ہدایت پر ملک بھر میں ہڑتالیں ہوئیں۔ اور سوگ کے دن منائے گئے۔ ۳۰ مارچ کو دہلی سے فسادات کی ابتدا ہوئی۔ ۶ اپریل کو ملک گیر ہڑتال کی اپیل کی گئی۔ سب سے عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں ہندو مسلمان دونوں متحد تھے۔ ۶ اپریل کی ہڑتال کامیاب رہی۔ ملک کے اکثر حصوں سے گڑبڑ کی خبریں آئیں۔ پنجاب میں امرتسر کے مقام پر مقامی انتظامیہ نے دو رہنماؤں ڈاکٹر کچلو اور ست پال کو گرفتار کیا۔ ناراض ہجوم نے ٹیلی فون کی تاریں کاٹ دیں۔ ایک بینک جلایا اور کچھ انگریزوں کو قتل کیا۔ پولیس نے گولی چلا دی جس سے کئی افراد زخمی ہوئے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ لاہور اور امرتسر میں مارشل لاء کا نفاذ کر دیا گیا۔ ۱۳ اپریل کا خونی دن تھا امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں نہتے لوگ جمع تھے۔ لوگ اپنے محبوب رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ایک انگریز جنرل او ڈائر نے ان پر گولی چلا دی۔ ایک ہزار چھ سو پچاس فائر کئے گئے جس نے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تین سو انا سی جانیں لیں۔ ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ فائرنگ تب تک جاری رہی جب تک کہ اسلحے کا ذخیرہ نہ ختم ہو گیا۔

(۲۴) موقتی حکومت ہند

ہندوستان کے چیدہ چیدہ انقلابی فرار ہو کر افغانستان چلے گئے۔ وہاں انہوں نے یک جا ہو کر مختلف منصوبے اور سکیمیں بنائیں جن میں سے ایک موقتی حکومت ہند کی بھی تھی۔ منصوبے میں یہ تھا کہ عالم اسلام کی تمام ریاستیں مثلاً عرب، ترک، افغان، ازبک، صوبہ سرحد کے آزاد قبائل اور مسلمان ہند یک جا ہو کر برطانوی راج کے خلاف بغاوت کریں۔ مجاہدین بھی اس سلسلے میں قبائل کو انگریزوں کے خلاف ابھاریں گے۔ یہ امید تھی کہ انقلاب پسند ہندو اور سکھ بھی مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے اور یہ متحدہ قوتیں انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر بحیرہ ہند میں جا پھینکیں گی۔ اس سلسلے میں وفود دنیا کے مختلف حصوں مثلاً مکہ، ترکی، روس، جاپان اور چین وغیرہ بھیجے گئے اور ساتھ ہی

حکومت موقتہ ہند کا اعلان کیا گیا۔ ساتھ ہی جنود اللہ کے قیام کا بھی اعلان کیا گیا۔ مولانا محمود الحسن صاحب کو کمانڈر انچیف بنایا گیا۔ راجہ مہندر اپرتاب صدر بنا، مولانا برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم چنے گئے جبکہ مولانا عبید اللہ سندھی کو وزیر خارجہ چنا گیا۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اگر امیر افغانستان اس منصوبے کے ساتھ رضا مندی کا اظہار کرے تو پھر اس کو ہندوستان کا بادشاہ مانا جائے گا۔ اور اگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو ترک افواج کے افغانستان پہنچتے ہی اس کو قتل کر کے سردار نصر اللہ خان جو کہ اس منصوبے کا روح رواں تھا کو امیر بنا دیا جائے گا۔ لیکن افسوس کہ تمام منصوبے غداری کی وجہ سے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ شیخ عبدالحق نامی ایک شخص نے جس کو ریشمی رومالوں پر کچھ تحریریں لکھ کر ہندوستان بھیجا گیا نے راز افشا کر کے اوڈائر کو موقع دیا کہ وہ تمام انقلابیوں کو جو کہ ہندوستان میں مختلف جگہوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ گرفتار کر کے تحریک کو بے اندازہ نقصان پہنچا دے۔ انہوں نے (انگریزوں نے) صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شیخ الہند کو بھی معہ ان کے رفقاء کے حجاز میں گرفتار کر کے مالٹا بھیجا گیا۔

(۲۵) ترکی کے لئے ہلال احمر کا طبی مشن

اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی عیسائی ریاستوں نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ ہندوستان میں اس خبر سے سخت ہیجان پیدا ہوا۔ حالات نے جوں ہی خطرناک صورت اختیار کی اور اس کی خبریں ہندوستان پہنچنی شروع ہوئیں تو مسلمانوں کی بے چینی میں اور اضافہ ہو گیا۔ ترکوں کی امداد کی مختلف طریقوں اور صورتوں پر غور و فکر کیا جانے لگا۔ اس وقت جن تجاویز پر عمل کیا گیا ان میں سے ایک ترکی کو طبی وفد بھیجنے کی بھی تھی۔ طبی وفد کی سربراہی ایک قوم پرست رہنما اور ملک کے نامور طبیب ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام نکلی۔ ان کے ہمراہ ہندوستان سے جانے والے حضرات کی تعداد ۲۴ تھی۔ ان میں پانچ ڈاکٹر تھے اور بقیہ انیس میدان جنگ سے زخمیوں کو لانے اور مرہم پٹی میں امداد دینے والے تھے۔ بعد میں کچھ لوگ انگلستان سے بھی آ کر شامل ہو گئے تھے۔ طبی وفد کے اراکین کے نام درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر ایم احمد انصاری، ڈاکٹر محمد نعیم انصاری، ڈاکٹر فیضی، ڈاکٹر باری اور ڈاکٹر محمود اللہ۔

ممبران: عبدالرحمٰن صدیقی، عبدالعزیز انصاری، منظور محمود، محمد یوسف، عبدالرحمٰن پشاوری، توکل حسین

تفضل حسین، قاضی بشیر الدین، وحید الدین، نور الحسن، چراغ علی، غلام احمد، شعیب قریشی، خلیق الزمان، رضا حسین، اسمٰعیل شیرازی، تونگر حسین، حامد رسول اور غلام جیلانی۔

ہندوستان کا یہ طبی وفد اواخر دسمبر ۱۹۱۲ء میں ترکی پہنچا۔ ۸ فروری ۱۹۱۳ء کو میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا۔ ترکی میں نہایت گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا گیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے اس ایثار اور کارنامے کو نہایت قدر اور محبت کی نظروں سے دیکھا گیا۔ طبی وفد نے جس دلسوزی اور جانکاہی کے ساتھ زخمیوں کی تیمارداری کی۔ ترکوں کے دل پر اس کا کافی اثر ہوا۔ وفد کی خدمات کا اعتراف ایک عام آدمی سے لے کر حکمران تک سب نے ہی کیا۔

(۲۶) جرمن ترک وفد کی افغانستان آمد

اس کے پس منظر میں انور پاشا کا ذہن کام کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں وہ جہاد جو قسطنطنیہ سے شروع ہوا تھا ایران کو عبور کر کے افغانستان پہنچ جائے گا وہاں سے افغانستان کا مسلمان امیر اپنی افواج کے ہمراہ برطانوی ہندوستان پر بھرپور حملہ کر دے گا۔ اس نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہندوستانی انقلابیوں کو دنیا بھر سے برلن میں جمع کیا۔ ہردیال کو کیلی فورنیا سے بلوایا گیا اور مولانا برکت اللہ کو جاپان سے بلوا کر برلن میں ان کو منظم کیا گیا۔ مشن نائیدہ میئر کی کمان میں تھا۔ فونھنیک ڈبلیو اووان معہ چند ترک اور ہندوستانی انقلابیوں کے تھا۔ وفد میں زیادہ جرمن تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایرانی بھی تھے۔ ممبران کی کل تعداد اسّی تھی۔

اگست ۱۹۱۵ء میں مشن کابل کے لئے روانہ ہوا۔ ۲۴ اگست ۱۹۱۵ء کو مشن ہرات کے راستے افغانستان میں داخل ہوا۔ انگریزوں کو فکر لاحق ہوئی لیکن امیر حبیب اللہ خان نے ان کو تسلی دی کہ ان کے آنے سے افغانستان اور انگریزوں کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم وہ مشن کے اراکین سے ملے گا تاکہ پتہ چلا سکے کہ ان کے ذہنوں میں کیا ہے۔ مشن کا کابل پہنچنے پر شاندار استقبال کیا گیا۔ کابل میں مشن کے اراکین کچھ اور یورپین افراد سے بھی ملے۔ جن میں کچھ وہ آسٹرین جنگی قیدی شامل تھے جو روسی ترکستان سے فرار ہو کر آئے تھے۔ افغانوں کو بھی مشن کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا گیا۔ سب

سے زیادہ سرگرمی امان اللہ خان نے دکھائی۔ امیر حبیب اللہ خان کے علاوہ تمام لوگ برطانیہ کے خلاف تھے۔ اس لئے انہوں نے مشن کے اراکین کی خوب آؤ بھگت کی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو امیر نے جرمن مشن کے سربراہ کو شرف باریابی بخشا۔ اگرچہ حبیب اللہ برطانیہ سے دوستی ختم کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لاسکتا تھا تاہم عوامی دباؤ کے تحت اس نے مشن کے اراکین سے مجبوراً ایک معاہدہ کیا۔ معاہدے کی رو سے اس نے دس ملین پاؤنڈ سٹرلنگ کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں اسلحہ مانگا۔ اس کے علاوہ اس نے مشن کے سربراہ کو صاف اور واضح الفاظ میں بتایا کہ جنگ میں تب ہی شروع کروں گا جبکہ ۲۰ ہزار سے ایک لاکھ ترکی افواج افغانستان پہنچ آئیں۔ اس معاہدے پر ۲۴ جنوری ۱۹۱۶ء کو دستخط ہوئے۔ ۲۲ مئی ۱۹۱۶ء کو مشن کابل سے واپس ہوا۔ نائیڈر میئر ہمدان واپس پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ مولانا برکت اللہ، راجہ مہندر اپرتاب اور کاظم بے کابل میں ہی رہ گئے۔

(۲۷) مولانا برکت اللہ، راجہ مہندر اپرتاب اور ہردیال

مولانا برکت اللہ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اوائل عمر ہی میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ دینی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ ۱۸۹۰ء میں آپ تبلیغ اسلام کے لئے انگلستان روانہ ہوئے۔ وہاں آپ نے بے شمار مضامین لکھے اور لیکچر دیئے۔ مشہور مؤرخ سٹین لے لین پول کے ساتھ "Medieval India" میں مدد کی۔ وہاں سے ۱۹۰۶ء میں امریکہ گئے اور آہستہ آہستہ سیاست میں آگئے۔ ۱۹۰۸ء میں جاپان گئے اور وہاں ٹوکیو سکول آف فارن لینگویجز میں اردو کے معلم چنے گئے۔ یہاں آپ کو وقت ملا اور آپ نے ایک رسالہ "Islamic Fraternity" کے نام سے نکالا۔ رسالہ ہر جگہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ روس، مصر اور ترکی کے مطالعاتی دورے پر گئے۔ اس کے بعد سان فرانسسکو گئے جہاں ہردیال کے ساتھ اس کی غدر پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ترک جرمن وفد کے ہمراہ افغانستان آئے۔ ہندوستان کی موقتی حکومت میں ان کو نائب صدر بنایا گیا۔ ترک جرمن مشن کی ناکامی پر کابل ہی میں ٹھہر گئے۔ مولانا صاحب روس بھی گئے لیکن جلد ہی برلن لوٹ آئے۔

جرمنی سے وہ پیرس گئے لیکن اپنی سرگرمیوں کی بنا پر فرانس بدر کئے گئے۔ پھر مختصر سی مدت کے لئے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی بھی گئے۔ آخر کار کیلی فورنیا گئے اور وہاں ۱۹۲۷ء میں گمنامی کی حالت میں سان فرانسسکو میں وفات پا گئے۔

راجہ مہندر اپرتاب بنارس کے رہنے والے ایک انقلابی تھے۔ ہندوؤں کے ایک معزز گھرانے سے آپ کا تعلق تھا۔ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان سے باہر اٹلی، فرانس اور سوئٹزرلینڈ جانے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک نہایت قابل آدمی تھے اور کئی زبانیں ماہرانہ انداز سے بول لیتے تھے۔ جینوا میں ہردیال سے ملے جس نے ان کو جرمن کونسل سے متعارف کروایا۔ اس کے بعد برلن گئے اور وہاں سے خصوصی مشن پر افغانستان بھیجے گئے۔ افغانستان ہی میں راجہ صاحب حکومت ہند موقتہ کے صدر بن گئے۔

ہردیال دہلی کا رہنے والا ایک برہمن تھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد جو انہوں نے لاہور کے ایک امریکن کالج میں حاصل کی اپنی قابلیت کی بنا پر ہردیال کو ۱۹۰۵ء میں سرکاری خرچ پر اعلےٰ تعلیم کے لئے کیمبرج بھیجا گیا۔ اپنے تعلیم کے آخری سال اس نے انگریزوں سے نفرت کی بنا پر اپنا وظیفہ اس لئے چھوڑ دیا کہ انگریزوں کے رائج کردہ نظام تعلیم کے بُرے اثرات نوجوان ہندوستانیوں پر پڑ رہے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں ہردیال وطن لوٹا اور انگریزوں کے خلاف سرگرم تحریک میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں ہردیال سان فرانسسکو میں اور ہندوستانی تارکین وطن کے ساتھ رہنے امریکہ چلا گیا۔ وہاں اس نے غدر پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد کی اس کی زندگی انقلابیوں کے لئے ایک نمونہ بن کے رہ گئی۔ لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکنے کی ذمہ داری غدر پارٹی نے قبول کی۔ جرمنوں کی امداد سے اس نے ایک رسالہ "غدر" تین زبانوں انگریزی، اردو اور گورمکھی میں نکالا۔ پارٹی کا اپنا ایک آشرم بھی تھا جہاں انقلابیوں کو تربیت دی جاتی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں امریکی حکومت نے اسے گرفتار کیا۔ وہ ہردیال کو کسی نہ کسی طرح ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک بدر کرنا چاہتی تھی کہ وہ خود کسی طریقے سے فرار ہو کر یورپ پہنچا۔ برلن آ کر وہ ہندوستانی انقلابیوں کا رہنما بن گیا۔ وہاں سے اس نے جرمن حکومت اور اس کے حلیفوں کے ساتھ مل کر ہر وہ طور طریقے اپنانا شروع کئے جس سے وہ اتحادیوں کو پریشان کر سکتا۔

لیکن جرمن اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ وہ جلد ہی ان کی نظروں سے گر گیا۔ اس پر اس نے "جرمنی میں چوالیس مہینے" نامی ایک پمفلٹ نکالا جس میں اس نے جرمنوں کی خوب خبر لی۔ پھر تا پھراتا پھر امریکہ واپس چلا گیا۔ جہاں ۱۹۳۹ء میں اس کی موت واقع ہوئی۔

(۲۸)

یہ سب ہندی مہینوں کے نام ہیں۔ انگریزی مہینوں کے ساتھ کچھ اس طرح آتے ہیں۔

۱۔ ماگھ ۔ ۱۴ر جنوری ۲۔ پھاگن ۔ ۱۳ر فروری ۳۔ چیت ۔ ۱۴ر مارچ
۴۔ بیساکھ ۔ ۱۳ر اپریل ۵۔ جیٹھ ۔ ۱۴ر مئی ۶۔ اساڑھ ۔ ۱۴ر جون
۷۔ ساون ۔ ۱۶ر جولائی ۸۔ بھادوں ۔ ۱۶ر اگست ۹۔ اسو ۔ ۱۶ر ستمبر
۱۰۔ کتک ۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۱۔ مگھر ۔ ۱۶ر نومبر ۱۲۔ پوہ ۔ ۱۵ر دسمبر

(۲۹) انگریزوں اور حکومت افغانستان کے درمیان صلح

۳ر مئی ۱۹۱۹ء کو شروع ہونے والی جنگ ۳ر جون ۱۹۱۹ء کو بند ہوئی۔ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے فاتح ہونے کا اعلان کیا۔ افغانستان کی طرف سے پہلی دفعہ آزاد افغانستان کا ایک وفد علی احمد جان جو کہ امان اللہ خان کا برادرِ نسبتی تھا کی رہنمائی میں ہندوستان روانہ ہوا۔ علی احمد جان ایک تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ اور امیر حبیب اللہ خان کے ساتھ ہندوستان پہلے بھی جا چکے تھے۔ وہ امان اللہ خان کی والدہ عُلیا حضرت کا قریبی رشتہ دار تھا۔ وفد کے دوسرے اراکین میں سے ایک ہندو نرنجن داس، امان اللہ کا استاد ڈاکٹر عبدالغنی اور کرنل غلام محمد شامل تھے ۲۴ر جولائی ۱۹۱۹ء میں افغانی وفد ہندوستان کے حدود میں داخل ہوا۔ پشاور سے اراکین کو ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے راولپنڈی لے جایا گیا۔ برطانوی وفد کے اراکین بھی راولپنڈی آئے۔ ان کا سربراہ سر ہملٹن گرانٹ تھا اور ساتھ میں سر شمس شاہ سر گور بخش سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ ۲۷ر جولائی سے گفتگو کی ابتداء ہوئی جو ۸ر اگست تک جاری رہی۔ ۸ر اگست کو علی احمد خان اور سر ہملٹن گرانٹ نے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کی رو سے تو افغانستان کی آزادی تسلیم کی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ ڈیورنڈ لائن کو افغانستان

اور مملکت برطانیہ کی سرحد تسلیم کی گئی۔ انگریزوں کی طرف سے امیر افغانستان کو اپنے احسن تعلقات و اچھی نیت کا ثبوت دینے کے لئے کہا گیا کہ عبیداللہ سندھی، مولانا برکت اللہ، مہندر اپرتاپ اور دوسرے ہندوستانی "تخریب کاروں" کو معطل کیا جائے۔

سردار احمد علی خان نوجوان افغانوں کے نقطۂ نظر سے بالکل ناکام رہا۔ کیونکہ مذاکرات کے دوران اس نے ڈیورنڈ لائن کو افغانی اور ہندوستانی سرحد تسلیم کر لیا تھا۔ پُرجوش سردار جو سردار محمود طرزی کی رہنمائی میں کام کر رہے تھے اس امر کے جاننے پر سخت مشتعل ہوئے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کی نقلی سرحد کے سوا اور کسی حد فاصل کو ان کے ملک اور ہندوستانی حدود کے درمیان تسلیم کیا جائے۔

یہی وہ خبر تھی جو انگریز اور افغانستان کے درمیان صلح کی جو جبل السراج میں مہاجرین پہ بجلی بن کر گری۔

(۳۰) کوہ ہندوکش

روایات کے مطابق اس کو ہندوکش اس لئے کہا جاتا ہے کہ صدیوں پہلے ہندوستان سے لائے گئے ہزاروں غلام اس کے برف سے اٹے ہوئے راستوں میں ہلاک ہو گئے تھے۔ یونانیوں کے لئے ہندوکش "پیروپامیس" تھا یہ پہاڑوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ ہے جو کہ تقریباً چھ سو میل طویل ہے۔ اس کی چوٹیاں کہیں تو ۱۵ ہزار فٹ بلند ہے اور کہیں کہیں اونچائی ۲۰ ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس کی مشہور گزرگاہیں خاواک پاس (گیارہ ہزار چھ سو چالیس فٹ) اک روباٹ پاس (بارہ ہزار پانچ سو ساٹھ فٹ) اور کپ چاک پاس (تیرہ ہزار نو سو فٹ) ہیں مشہور حملہ آوروں میں سکندر اعظم نے خاواک پاس استعمال کیا۔ جبکہ تقریباً ایک ہزار سال بعد تیمور لنگ نے بھی ہندوستان آنے کے لئے یہی راستہ اختیار کیا۔ بابر مغل نے کپ چاک پاس استعمال کیا۔ کوہ ہندوکش کو ہندوستان کا کوہ قاف بھی کہا جاتا ہے۔

(۳۱)

دریائے کابل دریائے سندھ کے بعد دوسرا بڑا دریا ہے جو کہ صوبہ سرحد کے ایک بڑے علاقے کو سیراب کرتا ہے۔ دریائے کابل یہاں سے کافی اوپر ہندوکش کے پہاڑی سلسلے میں اُنے پاس جو کہ کابل شہر سے ۴۵ میل مغرب میں واقع ہے سے شروع ہو کر مشرق کی جانب چل پڑتا ہے۔ راستے میں بہت چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کو

ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے۔ راستے میں اس کے ساتھ دریائے لوگر، دریائے پنج شیر، علینگار، علی شنگ اور سرخ آب کے دریا بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ مچنی کے قریب پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا وادی پشاور میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے دریائے سندھ کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ راستے میں دریائے باڑہ کو بھی ساتھ ملا لیتا ہے۔ آگے چل کر بسنتہ کے مقام پر دریائے سوات، دریائے چترال، دریائے کنڑ، دریائے یارخون اور دریائے پنج کوڑہ بھی اس کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ یہاں سے دریائے لنڈہ کا نام لے کر ۳۶ میل کا فاصلہ طے کر کے نوشہرہ سے خیر آباد نامی جگہ کے پاس اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کے ساتھ جا ملتا ہے۔ اس طرح اس کا سارا سفر تقریباً تین سو سولہ میل کا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی چیز دریائے کابل میں گر جاتی ہے تو وہ اکبر شاہ میاں کے گاؤں بدرشی کے پاس سے ہو کر گزرتی ہے۔ انہوں نے اسی لئے ذکر کیا ہے کہ اگر وہاں وہ لوگ اس پانی میں گر جاتے تو پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ آ کر نوشہرہ سے گزر کر دریائے سندھ میں جا پڑتے۔

(۳۲) مزار شریف

کابل سے ۱۹ میل دور جنوب مغرب میں واقع ہے۔ بڑا تجارتی مرکز ہے۔ قالینوں اور قراقلی کے لئے کافی مشہور ہے اس کے شہرت کی اصل وجہ وہ مزار شریف ہے جو کہ روایات کے مطابق حضرت علیؓ کا ہے۔ اس بات کا سب سے پہلے بقول خوندامیر ۱۴۸۰ء میں مرزا بے قرا کو سلطان سنجر سلجوق کے وقت کی لکھی ہوئی ایک تاریخی کتاب کے سبب پتہ چلا۔ کتاب میں حضرت علیؓ کے مدفن کو خواجہ خیران نامی گاؤں بتایا جو کہ بلخ کے قریب ہی تھا۔ وہاں جا کر تحقیق کے بعد ایک کتبہ نکلا جس پر عربی میں لکھا ہوا تھا "یہ مزار اسد اللہ کا ہے جو کہ چچا زاد بھائی ہے اللہ کے رسولؐ کا"۔ اس پر اس جگہ ایک بہت بڑی زیارت گاہ بن گئی۔

(۳۳) بلخ

۹ ویں صدی عیسوی میں یعقوبی بلخ کو خراسان کا سب سے بڑا شہر قرار دیتا ہے جس کے تین اطراف دیواریں بنی ہوئی تھیں اور جس کے تیرہ دروازے تھے۔ اینٹوں سے بنی ہوئی آبادی تھی اور فصیل کی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ دیوار کے باہر ایک گہری خندق کھدی ہوئی تھی۔ شہر کے وسط میں جامع مسجد

اور مارکیٹ تھی۔ بلخ کے چاروں طرف خوب صورت اور بڑے بڑے باغات لگے ہوئے تھے جن میں مالٹے نیلوفر کے پھول اور بہت سی دوسری قسم کے پھل پیدا ہوتے تھے۔ چاروں طرف دور دور تک گنے کے کھیت نظر آتے تھے۔ بازاروں میں سوداگروں کی وجہ سے ہر وقت بھیڑ رہتی تھی۔ ۱۲ ویں صدی عیسوی تک بلخ پھلتا پھولتا رہا۔ لیکن ۱۲ ویں صدی عیسوی کے درمیان میں غز ترکوں کے ہاتھوں اس کی بربادی ہوئی۔ ان کے جانے کے بعد لوگ پھر آنے شروع ہوئے اور بلخ آباد ہو گیا۔ دوبارہ منگولوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔

بلخ کے نواح میں نوبہار نامی جگہ میں آتش پرستوں کا ایک بڑا معبد خانہ تھا۔ جہاں کا پروہت برمک تھا جو کہ مشہور زمانہ خاندان برامکہ کا جد اعلےٰ تھا۔ نوبہار کے ارد گرد کا کافی علاقہ اس معبد کی جاگیر تھی۔ ہندوستان چین اور کابل سے عقیدت مند جاتے وہاں بتوں کے آگے جھکتے اور پروہت کے ہاتھ چومتے۔ نوبہار کا یہ معبد خانہ احنف بن قیس نے فتح خراسان کے موقع پر تباہ کیا۔

(۳۴) رگ وید

یہ ہندوستان کی تاریخ کی سب سے قدیم کتاب جانی جاتی ہے۔ اس کو کتاب حکمت (Book of Knowledge) بھی کہا جاتا ہے۔ دس ہزار سے زیادہ دلکش اور خوب صورت پیرایوں میں تقسیم ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ رگ وید کے اشلوک ۱۵۰۰ قبل مسیح اور ۱۰۰۰ قبل مسیح کے درمیان کے وقفے میں اکٹھے کئے گئے ہیں۔ ویدا کے علماء کے مطابق یہ ہندوکش کے آس پاس کے علاقوں میں بنائی گئی۔ یہ بات اس چیز سے بھی صاف ظاہر ہو جاتی ہے جب انسان اس میں ذکر کئے ہوئے دریاؤں یا پہاڑوں کے نام سنتا ہے اس میں کوبا (دریائے کابل) کرومو (دریائے کرم) گومتی (دریائے گومل) سرودواستی (دریائے سوات) اور سندھو (دریائے سندھ یا ایاسین) کے نام آئے ہیں۔ اسی طرح وہ ایک بڑے قبیلے گنداری کا ذکر کرتے ہیں اور ان کو بھیڑیں پالنے والے کہا جاتا ہے۔ ان کا علاقہ موجودہ جلال آباد سے لے کر ٹیکسلا تک کا ہے اور جو گندھارا تہذیب کے نام سے بعد میں مشہور ہوا۔

(۳۵) ترمذ

بلخ سے آگے دریائے آمو کے کنارے واقع ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں شہر کا والی رہتا تھا۔ اردگرد ایک مضبوط حصار بنایا گیا تھا۔ شہر کے وسط میں اینٹوں کا بنا ہوا ایک جامع مسجد بھی تھا۔ شمالی خراسان سے آنے والی تجارت کا مرکز ترمذ ہی تھا۔ ۱۲۲۰ء میں منگولوں نے شہر کو تباہ و برباد کیا۔ اس کے بعد ایک نیا شہر پرانے شہر کے کھنڈرات سے دو میل اوپر تعمیر کیا گیا۔ شہر کے چاروں طرف انگوروں کے باغات پائے جاتے ہیں۔

(۳۶) بخارا

تاشقند سے ۲۸۰ میل دور واقع ہے۔ مشہور تجارتی مرکز ہے۔ ریشم اور اونی صنعت کے لئے کافی مشہور ہے۔ ایک زمانے میں قالین سازی کی صنعت میں بہت مشہور تھا۔ یہ بھی ایک قدیم شہر ہے جو چاروں طرف سے دیواروں میں گھرا ہوا ہے۔ سارے شہر میں مسجدوں اور بازاروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بخارا نے مسلمانوں کا عروج و زوال اپنی آنکھوں سے کئی بار دیکھا۔ بعد کے وقتوں میں یہ ریاست بخارا کہلائی۔ ریاست کے مشہور شہر کرکی، گذر، چارجوئی، کراگین، ڈینیو، حصار اور دوواز وغیرہ ہیں۔ آگے بخارا کی مزید تفصیلات آئیں گی۔

(۳۷) کیف

آج کل سوویت یونین کے بڑے شہروں میں کیف کا شمار ہوتا ہے۔ دریائے دنیپر کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ دریائی بندرگاہ بھی ہے۔ اہم ریلوے اور روڈ جنکشن ہے۔ یہ ایک بڑا صنعتی مرکز ہے۔ قابل دید تاریخی مقامات میں سینٹ صوفیہ کا باز نطینی گرجا اور پیچرسکی کی خانقاہ زیادہ مشہور ہے۔ یہ شہر ۹ ویں صدی سے قبل تعمیر کیا گیا۔ ۹۸۸ء میں اس کے حکمران شہزادہ ولادیمیر نے عیسائیت قبول کی اور یہاں سے سارے ملک میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کی۔ تاتاریوں کے حملے سے یہ شہر اُجڑا۔ اس کے بعد بھی کئی بار اُجڑا اور آباد ہوا۔ آخر کار ۱۹ ویں صدی عیسوی سے اس کا دوبارہ عروج شروع ہوا۔ انقلاب روس اور دوسری جنگ عظیم سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن اب پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

(۳۸) انگریز اور امیر بخارا

بخارا کا آخری امیر عالم جان تھا۔ وہ جناب عالی کہلاتا تھا۔ امیروں کی حکومت مطلق العنان تھی۔ عام لوگ اس سے سخت نالاں اور پریشان تھے۔ تعلیم اور نظم و نسق میں اصلاحات کے خواہشمند معاشی استحصال سے لوگ بے حد تنگ تھے اور اس سے نجات کے خواہاں تھے۔ امیروں نے اپنا خزانہ بھرنے کے لئے گونا گوں ٹیکس لگائے تھے جن کے بار تلے عوام پسے جا رہے تھے۔ امیر بخارا کا شمار دنیا کے متمول ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔ سٹیٹ بینک تاشقند میں اس کے چار کروڑ روبل جمع تھے۔ ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ کے بینکوں میں بھی اس کی بہت بڑی رقم محفوظ تھی۔ بخارا کے خزانے میں سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے صندوق تھے۔

بخارا میں جدیدیت، آزاد خیال اور سیاسی شعور کی رو ۱۹۰۵ء سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ترکستان میں جگہ جگہ خفیہ مدارس کام کر رہے تھے اور اُن کے اثرات تیزی سے پھیل رہے تھے۔ بخارا میں امیر نے سختی کی تو وہ لوگ زیر زمین چلے گئے۔ لیکن اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔ امیر نے جلد ہی جدیدیوں کی پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ لیکن کارکن اور رہنما روپوش ہو گئے یا تاشقند چلے گئے۔ روس میں انقلاب برپا ہونے کے بعد امیر بخارا نے کرنسکی کی حکومت کے ساتھ تعلقات استوار کئے۔ بخارا کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ دوسری طرف جدیدیوں نے خواجہ فیض اللہ (خوجہ سوف) اور میرزا محی الدین منصور کی قیادت میں امیر کے خلاف کام جاری رکھا۔ امیر نے ان کو دبانے کی کوشش کی اور ان کے ایک رہنما میرزا نصر اللہ کو قتل کروا دیا۔ میرزا نصر اللہ کے قتل سے ہر طرف مظاہرے ہونے لگے۔ کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے اور عناصر نے ۱۹۱۸ء میں اپنی ایک الگ پارٹی نوجوانان بخارا (Young Bukharans) کی بنیاد رکھی۔ اگست ۱۹۲۰ء کو بخارا کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی گئی۔ زبردست خونریز جنگ کے بعد امیر عالم جان کو شکست ہوئی۔ سرخ فوج نے ۲ ستمبر ۱۹۲۰ء کو بخارا پر قبضہ کر لیا۔ امیر بخارا جان بچا کر کوہ پامیر میں دوشنبے کی طرف جا نکلا اور وہاں سے ۵ مارچ ۱۹۲۱ء کو افغانستان چلا گیا۔ اس سارے عرصے میں انگریزوں نے بالشویکوں کے خلاف ہر طرح سے امیر بخارا کی مدد کی۔ انہوں نے کمیونسٹوں کے خلاف

مولوی حضرات سے فتوے بھی دلوائے۔ کیونکہ مذہب کے نام کو استعمال کرنا ان کے لئے ہر جگہ مفید ثابت ہوا۔ ویسے تو ۱۹۱۸ء کے اوائل سے ہی انگریزوں کا امیر بخارا کے ساتھ باقاعدہ رابطہ شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے امیر کو ترکستان پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا۔ جنرل میلسن نے تو باقاعدہ طور پر اسلحہ اور فوجی وردیاں بھی بھیجی تھیں۔

(۳۹) جدیدی

بالشویکوں کو وسط ایشیا اور افغانستان میں عام طور سے "جدیدی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان لوگوں سے میل ملاپ کو مولویوں نے ایک عظیم گناہ گردانا تھا۔

(۴۰) تاشقند

تاشقند کے متعلق زیادہ معلومات تو میاں صاحب اکبر شاہ خود ہی مہیا کر رہے ہیں۔ ان میں تھوڑے اضافے کے لئے یہ عرض ہے کہ غالباً ۷ ویں صدی عیسوی میں یہ شہر آباد کیا گیا تھا۔ پہلے تو ترکستان کا دارالخلافہ تھا اور اب ۱۹۳۰ء سے سوویت ازبکستان کا دارالخلافہ ہے۔ سوویت وسطی ایشیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ایک مشہور قدیمی گذرگاہ بھی ہے۔ اب ایک بڑا صنعتی شہر بنا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشہور تعلیمی مرکز بھی ہے۔ ۱۹۲۰ء سے یہاں ایک یونیورسٹی قائم ہے۔ اس کے علاوہ ازبک اکیڈمی آف سائنسز بھی نئے روسی مرکز میں موجود ہے۔ پرانے شہر میں مسلمانوں کے مدرسوں کے کھنڈرات بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں کوئلہ، چمڑے کی صنعت، کپڑا اور کاغذ زیادہ مشہور ہیں۔

(۴۱) عبدالاکبر خان اکبر

عبدالاکبر خان اکبر ۱۹ ویں صدی کے آخری عشرے میں عمرزئی چارسدہ میں پیدا ہوئے۔ علاقے کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جوانی میں شعروشاعری کا شوق بھی پیدا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ہندوستان کے بہت سے اور مہاجرین کی طرح ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے اور وہاں سے پھر آگے سوویت روس بھی گئے۔ لیکن وہاں ان کا مدت قیام تھوڑے عرصے ہی رہا۔ روس سے واپسی پر افغانستان میں کچھ عرصہ گزارا اور پھر وطن واپس لوٹے۔ واپس

آکر اپنا سفرنامہ "سفرنامہ روسی ترکستان" کے نام سے چھپوایا۔ انہوں نے تفصیل سے اپنے آنے جانے کے ذکر کے علاوہ روس کی اس وقت کی حالت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ واپس وطن آکر عبدالغفار خان کے ساتھ تحریک خدائی خدمت گار بنائی اور پشتون معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ خان صاحب نے بارہ کتابیں لکھی ہیں جو سب کی سب ان کی مادری زبان پشتو میں لکھی گئی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہوا۔

(۴۲) مولانا فضل حق

ان صاحب کا تفصیلی ذکر عبدالاکبر خان اکبر کی کتاب میں ہوا ہے لیکن ان کا نام فضل حق کی جگہ عبدالحق بیان کیا گیا ہے۔ شیخ صاحب ہندوستان کے رہنے والے تھے اور باتیں بہت اچھی کر لیتے تھے۔ کابل آکر انہوں نے اپنی چرب زبانی سے شاہی دربار میں اپنے لئے جگہ بنا لی۔ انہوں نے روس کا سفر بھی اور مہاجرین کے ساتھ کیا لیکن جلد ہی واپس آگئے۔ واپس آکر شاہ افغانستان امیر امان اللہ خان سے مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے نام سفارشی خطوط بھی لئے اور بڑی آن بان کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے۔ کیونکہ اس نے امیر امان اللہ کو واضح طور پر بتا دیا تھا کہ ہندوستان جا کر بہتر کام کر سکتا ہوں۔ لیکن اصل میں انگریزوں کا جاسوس تھا۔ افغانستان کی سرحد پر اس کے وہ خطوط پکڑے گئے جو اس نے اپنے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے بھیجے تھے۔ اس کو گرفتار کر لیا گیا اور کہا جاتا ہے کہ گولی مار دی گئی۔

(۴۳) آذربائیجان

آذربائیجان دو حصوں میں تقسیم ہے۔ آدھا سوویت رُوس کے پاس ہے جبکہ آدھا ایران کے قبضے میں ہے۔ روسی آذربائیجان کا کل رقبہ ۳۳٫۴۳۰ مربع میل ہے۔ اس کا دارالحکومت باکو ہے۔ شمال میں اس کے کوہ قاف کا سلسلہ واقع ہے جس کی اونچائی ۱۴٫۰۰۰ فٹ سے زیادہ تک جا پہنچتی ہے۔ علاقہ تیل کی پیداوار میں زیادہ مشہور ہے۔ تیل کے علاوہ کپاس، گندم، جوار، آلو وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پھل اور چائے کی پیداوار میں بھی شہرت رکھتا ہے۔ دھاتوں میں تانبہ، لوہا، المونیم گندھک وغیرہ پیدا ہوتی ہے۔ ایرانی آذربائیجان ایران کا جنوب مغربی حصہ ہے۔ انتظامی طور سے ایرانی آذربائیجان دو حصوں میں تقسیم ہے۔ مشرقی آذربائیجان جس کا صدر مقام تبریز ہے اور مغربی آذربائیجان

جس کا صدر مقام رضائیہ ہے۔ اکثر پہاڑی علاقے پر مشتمل ہے۔

(۴۴) ڈی لکس ہوٹل

انقلاب کے بعد اور جنگ کے دنوں میں ماسکو میں رہائشی مکانوں کے لئے قلت تھی۔ یہ کام حکومت نے اپنے ذمے لیا تھا۔ یہ ماسکو کا ایک بڑا ہوٹل تھا جس میں پردیسی کمیونسٹ اور بعض غیر ملکی جو روسی حکومت کے مہمان ہوتے تھے ان کو اس میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ روسی کمیونسٹ پارٹی کے بارسوخ لیڈروں میں سے بعض یہاں مقیم تھے۔ روسی صوبوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کے نمائندے جب ضروری کام سے ماسکو آتے تو اکثر اسی ہوٹل میں ٹھہرتے۔ اس ہوٹل میں رہنے والوں کو ایک کاغذ دیا جاتا جو شناختی کاغذ کہلاتا۔ کاغذ پر اس کا نام اور فوٹو ہوتے۔ ساتھ ہی ہوٹل میں آنے کی تاریخ لکھی ہوتی اور ہوٹل کی مہر لگی ہوتی۔ ہندوستانی انقلابی اکثر اسی ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔

(۴۵) تیسری انٹرنیشنل

جنوری ۱۹۱۸ء میں پیٹرگراڈ جو کہ اب لینن گراڈ کہلاتا ہے میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کے قیام کے لئے ایک استقبالیہ کمیٹی قائم کرنے کی ابتدا کی گئی۔ اس استقبالیہ کمیٹی کا کام عالمی کمیونسٹ اور انقلاب پسند پارٹیوں کو بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت دینا تھا۔ اس استقبالیہ کمیٹی میں امریکہ برطانیہ فرانس، جرمنی، ناروے، سویڈن، چیکوسلاویکیہ، رومانیہ اور بلغاریہ کے نمائندے شامل تھے۔ اس وقت تک تمام ممالک میں انقلابی اور مارکسی پارٹیوں کے نام بالعموم سوشل ڈیموکریٹک یا لیبر پارٹی وغیرہ تھے لیکن انقلاب روس کے بعد اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کے قیام کے موقع پر اکثر و بیشتر ممالک کی پارٹیوں نے اپنا نام کمیونسٹ پارٹیوں میں تبدیل کر لیا۔

۲ مارچ ۱۹۱۹ء کو ماسکو کے شاہی محل کریملن میں اس تیسری انٹرنیشنل کمیونسٹ کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ اس کانفرنس کی مجلس صدارت کے لئے سوویت روس سے لینن (V.I. Lenin) جرمنی سے ایبرلین (Eberlein) اور سوئٹزرلینڈ سے پلیٹن (Platten) کو منتخب کیا گیا اس کانفرنس میں یورپ، امریکہ اور ایشیا کے اکیس ممالک کی ۳۵ کمیونسٹ تنظیموں کے ۵۲ نمائندوں نے

شرکت کی۔ یاد رہے کہ پہلی کمیونسٹ انٹرنیشنل ۱۸۴۸ء میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے قائم کی تھی اور یہ ۱۸۵۲ء تک قائم رہی تھی۔ دوسری انٹرنیشنل انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوئی اور پہلی جنگِ عظیم تک قائم رہی تھی۔

(۴۶) موپلا اور جنگِ آزادی

موپلا ایک محنت کش اور راسخ العقیدہ مسلم قوم ہے۔ کالی کٹ کے نواح میں مالابار کے ساحل پر عرب ملاحوں کی یہ اولاد پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے ہیں موپلا بھی ہندوستان کے اور مسلمانوں کی طرح تحریک خلافت میں شامل ہوئے۔ پولیس کے تشدد نے ہی انہیں بغاوت پر آمادہ کیا۔ پولیس نے ان پر ظلم کی انتہا کر دی۔ انہیں ننگا کر کے پیٹا گیا۔ ان کی بے عزتیاں کی گئیں۔ ان کے مکانات لوٹے گئے اور اس پر بھی بس نہیں کیا بلکہ کئی دفعہ ان پر گولی بھی چلا دی گئی۔ موپلا ایک جنگ جو قوم تھی انہوں نے مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پولیس اور انتظامیہ کو علاقہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ بہت سا سرکاری اسلحہ دبا رہ دان کے ہاتھ آیا۔ انہوں نے ریلوے اور مواصلات کا نظام درہم برہم کر دیا۔ اس ساری تحریک کے دوران انہوں نے اور خلافتیوں کی طرح ہندوؤں کے ساتھ بھائی چارے کی فضا قائم رکھی۔

لیکن دو ہفتوں کے بعد فوج اور پولیس معہ ساز و سامان کے دوبارہ لوٹی۔ انہوں نے علاقے کا کنٹرول حاصل کیا۔ انہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا جس سے موپلوں کا غصہ ان ہندوؤں پر نکلا۔ مہینوں تک موپلاؤں کے علاقے پر مارشل لاء کا نفاذ رہا۔ ہزاروں موپلاؤں کو بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کیا گیا۔ اور دو سو سے زیادہ کو قتل کر دیا گیا۔ سنٹرل خلافت کمیٹی نے سارے فسادات کی ذمہ داری مقامی انتظامیہ اور حکومت پر ڈالی۔ کیونکہ حکومت کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کو سازش کے ذریعے ہندو مسلم فسادات میں بدلا گیا۔

(۴۷)

باکو میں اس وقت مختلف النسل لوگ رہتے تھے ۱۹۲۳ء میں باکو کی آبادی نسلی تناسب سے درج ذیل تھی۔ آذربائیجانی ترک ۳۱٫۳ فیصد، فارسی بولنے والے جن میں اکثریت ترک النسل ایرانی آذربائیجان کے

لوگ تھے ۷، ۴ فی صد کرد، روسی ۳، ۲۸ فی صد، آرمینی ۲، ۱۵ فی صد، یہودی ۷، ۵ فی صد اور قومیتیں جن میں جارجین، جرمن یونانی وغیرہ شامل تھے ۸، ۴ فی صد، آذربائیجانی ترک معہ ایرانی آذریوں کے تمام آبادی کا تقریباً نصف تھے۔

(۴۸) انور پاشا

انور پاشا ۱۸۸۲ء میں قسطنطنیہ کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہیں کی فوجی اکیڈمی میں داخل ہوئے۔ آہستہ آہستہ اپنی قابلیت کی بنا پر ۱۹۱۳ء میں پاشا بنے۔ اور وزیر جنگ بنائے گئے۔ نوجوان ترکوں کے ہر دلعزیز رہنما تھے۔ اس کے علاوہ تنظیم اتحاد و ترقی کے ایک اہم ستون بھی تھے۔ وہ ترکی میں سیاسی تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ اور جدید ٹیکنالوجی کی بنا پر ترکی کی تعمیر کے خواہشمند بھی تھے۔ انہوں نے سلطان عبدالحمید کے تخت بردار ہونے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ انور پاشا نے طرابلس کی جنگوں میں اپنا نام پیدا کیا۔ عالم اسلام سے لگاؤ کو لوگوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ تاہم حالات کے بدلنے پر وہ جمال پاشا۔ طلعت پاشا اور ناظم پاشا کے ہمراہ ترکی چھوڑ کر چلے گئے۔ انور پاشا نے اپنے لئے ماسکو کو منتخب کیا۔ ماسکو میں ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ وہاں لینن سے بھی ملے۔ بالشویکوں نے انور پاشا کو بسماچیوں (وہ مسلمان جو انقلاب روس کی مخالفت کر رہے تھے بسماچی کے نام سے مشہور ہوئے۔ باسمچ ترکی زبان میں دبانے یا خلاف ورزی کرنے والا کہا جاتا ہے جبکہ ازبک زبان میں ڈاکو اور لٹیرے کو باسمچ کہا جاتا ہے) کے خلاف استعمال کرنا چاہا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں انور پاشا کو گئے جہاں انہوں نے مشرقی کمیونسٹ کانگرس میں بھی شرکت کی جو کہ باکو کانفرنس کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن بسماچیوں کے خلاف اسے بھیج کر بالشویکوں کے لئے بساط ہی الٹ گئی۔ ان کے پاس جا کر اس نے بخارا کی افواج کو بھی نئے سرے سے منظم کیا۔ بخارا کی کئی اہم شخصیات انور پاشا کے ساتھ مل گئیں جن میں وزیر جنگ عبدالحمید آفندی، وزیر داخلہ علی رضا بیگ اور جمہوریہ کا صدر عثمان خواجہ اوغلی شامل تھے۔ ابراہیم بیگ ایک مشہور رہنما بھی ان کے ساتھ کام کرنے پر راضی ہوا۔ اس کے علاوہ اور قابل ذکر افراد جمہوریہ ترکستان کا صدر جان زاکوف (یعقوب جان) اور عوامی عدالت کا ایک بااثر رکن ملا صدرالدین بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ انور پاشا پان اسلام ازم (Pan-Islamism) کا داعی تھا۔ اس نے "دنیا بھر کے مسلمانو! ایک ہو جاؤ" کا نعرہ لوگوں کو دیا۔ وہ وسط ایشیا میں ایک عظیم اسلامی سلطنت کے قیام کی باتیں کیا کرتا تھا۔ سوویت روس نے اس کے خلاف

بروقت اقدامات کیے۔ اس کے خلاف فوجی مہمیں بھیجی گئیں۔ ۲۰ جون ۱۹۲۲ء کو انور پاشا کو شکست دی گئی۔ سرخ فوج کا دباؤ بڑھتا ہی گیا۔ انور پاشا کے زیر کنٹرول علاقے یکے بعد دیگرے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت افغانستان کی سرحدوں کی طرف ہٹنے پر مجبور ہوئے۔ آخر کار ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو بالجوان اور خوانگ کی پہاڑیوں میں ایک معرکے میں انور پاشا شہید ہوئے۔

(۴۹) طہران

موجودہ ایران کا دارالخلافہ ہے۔ کوہ البرز کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے اونچائی تقریباً چار ہزار فٹ ہے۔ ایران کا ایک بڑا صنعتی مرکز ہے۔ علاوہ ازیں اسی مشہور شاہراہ پر واقع ہے جو مشہد سے تبریز کو جاتی ہے۔ اگرچہ شہر روایتی طور پر مشرقی علاقہ میں ہے تاہم رضا شاہ نے کافی اصلاحات کر کے طہران کو مغربی طرز پر بنا لیا ہے۔ شہر میں کشادہ سڑکیں، چوڑی گلیاں اور بڑے بڑے چمن واقع ہیں شہر کے وسط میں بڑا چوک میدانِ سپاہ کے نام سے مشہور ہے۔ طہران ۱۷۸۸ء میں ملک کا دارالخلافہ بنا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عربوں کے اثر کی وجہ سے مصنف کے دمیاں اکبر شاہ کے) سفر ایران کے دنوں میں طہران لکھا جاتا تھا لیکن پہلوی دور کے بعد سے اب یہ تہران لکھا جانے لگا ہے۔

(۵۰) بندر انزلی

یہ بندرگاہ گیلان میں واقع ہے۔ پھر اس کا نام بندر پہلوی پڑا اور اب غالباً بندر خمینی کہلاتی ہے رشت کے جنوب میں چودہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چاول، کھالیں اور مچھلیاں برآمد کرتا ہے۔

(۵۱) رشت

صوبہ گیلان کا دارالخلافہ ہے۔ تہران سے ۱۵۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چاول یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ قالین بافی کی صنعت کے لئے بھی مشہور ہے۔

(۵۲) مرزا کوچک خان جنگلی

سردار جنگلی کے لقب سے مشہور ہونے والی شخصیت کا اصلی نام یونس تھا۔ رشت کے ایک اہم اور معروف شخصیت جناب مرزا بزرگ کے فرزند تھے۔ لہٰذا میرزا کوچک کے نام سے یاد کیے جانے لگے۔

آپ ۱۲۹۸ھ (بمطابق ۱۸۸۱ء) میں اسادسرا کے علاقے میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی علوم دینی کی بہترین تعلیم پائی۔

جوانی میں ملک کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس کیا کہ عوام کو غیروں کے تسلط سے نجات دلانے کی ضرورت ہے۔ آپ نے اس راہ میں عملی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرزا کوچک نے یہ جان لیا کہ پہلی جنگِ عظیم کے آغاز کے بعد سے جن غیر ملکی تجاوزات نے ایران کو چاروں اطراف سے اپنا ہدف قرار دے رکھا ہے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک انقلابی جماعت اور ایک انقلابی مرکز کی ضرورت ہے اس فیصلے کے بعد میرزا کوچک نے اس انقلابی تحریک کے قیام کے لئے ایران کے شمال میں واقع جنگلات کا رُخ کیا۔ جہاں سے تھوڑے ہی عرصے میں عوام کے بھرپور تعاون و حمایت کے ساتھ سامراجیت کے خلاف ایک زبردست تحریک کا آغاز کیا جس کا نام تحریک جنگل تھا۔ یہی وہ تحریک تھی جس کے لئے میرزا کوچک نے ایران کے شمالی جنگلات میں رہ کر ایسی چھاپہ مار فوج تیار کی جس نے انگریزی افواج اور ایران کی مرکزی حکومت کی افواج کے ساتھ زبردست جنگ کے بعد کافی علاقہ آزاد کرایا تھا لیکن جلد ہی سازشوں کا شکار ہو کر میرزا کوچک کو انقلاب میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کوہ البرز کی چوٹیوں میں میرزا کوچک کو شکست دی گئی۔ اس کو قتل کر کے اس کا سر کاٹ کر رضا خان سپہ سالار کو پیش کیا گیا۔

(۵۳) رضا خان

رضا خان ۱۸۷۸ء میں ماژندران کے ایک روایتی سپاہیانہ قبیلے میں پیدا ہوئے۔ یہ لوگ بالائی ماژندران کے رہنے والے تھے۔ اس کا والد عباس علی خان کرنل تھا۔ اس کا دادا میجر مراد علی خان ۱۸۵۶ء کے ہرات کے محاصرے کے دوران ہلاک ہوا تھا۔ عباس علی خان کے مرنے پر خاندانی وراثت کے جھگڑے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے رضا خان کی ماں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور اپنے بیٹے کے ہمراہ تہران چلی آئی۔ رضا خان ۱۴ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوا۔ اور اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر جلد ہی افسری کے رتبے تک پہنچ گیا۔ اپنی محنت کے باعث بریگیڈیئر بنا اور پھر ایرانی افواج کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی وزارت جنگ کے منصب پر بھی فائز ہوا۔ یہ منصب سنبھالنے کے بعد رضا خان کی حیثیت

ایک فوجی آمر کی سی ہو گئی۔ وہ ایک آہنی ارادے والا مضبوط آدمی تھا۔ عوام میں اس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ وہ ایران کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے وزیر مقرر کرتا اور برطرف کرتا۔ مسلح اور منظم فوج کی تعداد اڑھائی ہزار سے چالیس ہزار تک بڑھالی۔ آخر کار خود ملک کی قیادت سنبھالنے کا فیصلہ کیا اور ۱۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کو رضا شاہ کے نام سے تخت نشین ہو کر خاندان پہلوی کی بنیاد رکھی جس نے ایران پر انقلاب ایران ۱۹۷۹ء تک حکومت کی۔

(۵۴) ایران میں انگریز، ہندوستانی افواج اور ساؤتھ پرشین رائفلز

جرمنوں نے ۲۰ ویں صدی عیسوی کے آغاز پر افغانستان کو ایک مشن بھیجنے کے ساتھ ہی فیصلہ کیا کہ ایران میں بھی اسلحہ اور دولت بھیجی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آدمی بھی بھیجے جائیں۔ تاکہ وہ مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر ایران سے روسی اور انگریزی اثرات ختم کریں اور ساتھ ہی روسیوں اور انگریزوں کو ایران سے باہر نکال دے کیونکہ بعد میں جرمنوں کی امداد سے ایرانی ہندوستان پر حملہ کر سکیں گے۔ جرمن پراپیگنڈے کو مذہبی رہنماؤں سے کافی مدد ملی۔ ۱۹۱۵ء کے اواخر تک جرمن مشنوں کے افراد نے کافی حد تک انگریزوں اور روسیوں کو جنوبی اور وسطی ایران سے باہر نکال دیا تھا۔ ۱۹۱۶ء تک موسم بہار میں سر پرسی سائکس (Sir Percy Sykes) بندر عباس پہنچا۔ وہ وہاں ایرانیوں کو جرمنوں کے خلاف منظم کرنے پہنچا تھا۔ سر پرسی سائکس نے وہاں ایک نئی فوج بنائی جس کو ساؤتھ پرشین رائفلز کا نام دیا گیا۔ ساؤتھ پرشین رائفلز میں اکثریت ہندوستانی فوجیوں کی تھی۔ مئی میں یہ لوگ کرمان گئے۔ وہاں سے باآسانی انہوں نے جرمنوں کو نکالا۔ ان میں سے کچھ جرمن اور کچھ ایسے پشتون سپاہی جو کہ انگریزی فوج سے بھاگ گئے تھے شیراز میں نومبر ۱۹۱۶ء میں انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔

(۵۵) روسی افواج بمقابلہ انگریز افواج، ایران میں

مارچ ۱۹۲۰ء میں روسی افواج کا ایک سمندری دستہ انزلی (بندر پہلوی) کے راستے نمودار ہوا۔ انہوں نے بریگیڈیر جنرل چیمپئن (Champion) سے بالشویکوں کے مخالف سفید دستوں (White Forces) کا مطالبہ کیا۔ اس وقت انزلی پر انگریز قابض تھے۔ انہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر بالشویکوں نے ان کی سپلائی لائن کاٹ دی۔ ساتھ ہی انگریزوں کو الٹی میٹم دیا کہ انزلی

فوراً خالی کردو ورنہ ان پر ساحل کی جانب سے گولہ باری اور زمین کی طرف سے حملہ کر دیا جائے گا۔ اس پر دو بٹالین سمیت چیمپئن انگریز دستوں کو روسی افواج کے درمیان سے گزار کر لے گیا۔ جو کہ بے عزتی کی آخری حد جانی گئی۔ روسی افواج نے مزید پیش قدمی کی اور رشت جا کر مرزا کوچک خان کی فوج سے مل گئی۔

(۵۶) قزوین

صوبہ گیلان کا ایک بڑا قصبہ ہے تہران سے تقریباً ۹۰ میل دور کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے یہ قصبہ شاہ پور دوئم نے چوتھی صدی عیسوی میں بسایا تھا۔ سولہویں صدی میں شاہ طہماسپ اوّل نے اسے ملک کا دارالحکومت بنایا۔ زلزلوں کی کثرت نے اسے تباہ و برباد کیا۔ زلزلوں کے علاوہ ۱۳ویں صدی عیسوی میں منگولوں کے حملوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ مصنوعات میں قالین اور سوتی کپڑوں کے علاوہ چمڑا بھی خاصا مشہور ہے۔

(۵۷) جلات محبوبہ کی داستان

ہر زبان اور ملک میں کچھ نہ کچھ روایتی داستانیں ہوتی ہیں۔ جلات محبوبہ پشتونوں کی ان روایتی قومی داستانوں میں سے ایک ہے جو آج تک ہر دلعزیز ہیں اور آج بھی حجروں میں بڑے شوق سے سُنی اور کہی جاتی ہیں۔ کہانی پشاور کے علاقے کے ایک بادشاہ نامسلم کی ہے جو اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس کی سب سے چھوٹی بیوی کی ایک لڑکی کو اس کی بیویوں نے اس کی نظر سے چھپا کر رکھا تاہم نو سال بعد کسی نہ کسی طرح بادشاہ کی نظر اس پر پڑی۔ اس کو غصہ تو بہت آیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، اس نے محبوبہ (جو کہ شہزادی کا نام تھا) کے لئے ایک تہہ خانہ اور قلعہ ایسا تعمیر کروایا کہ اس تک کسی کی رسائی نہ ہو سکے۔ پھر عام داستانوں کی طرح اس کے حسن کا چرچا ہرات کے خونکار نامی بادشاہ کے سات بیٹوں تک پہنچا۔ باری باری چھ شہزادوں نے قسمت آزمائی کی لیکن محبوبہ کو پانے میں ناکام رہے۔ آخر کار ساتواں شہزادہ جلات نامی قسمت آزمانے چل پڑا۔ اس کو اپنے بھائیوں کا انتقام بھی لینا تھا۔ جلات ہوشیاری اور چالاکی کے باعث شہزادی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا۔ وہاں سے وہ شہزادی کو نکال کر لے گیا۔ نامسلم بادشاہ کی فوجوں نے جلات کا پیچھا کیا۔ لیکن جلات کے باپ خونکار بادشاہ کی فوجوں نے نامسلم کی فوجوں کو شکست دی اور اس طرح جلات نے اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے ساتھ ساتھ محبوبہ بھی حاصل کر لی۔

(۵۸) ٹپہ

اسے لنڈئی یا مصرعہ بھی کہتے ہیں۔ یہ پشتو ادب کی بڑی قدیم صنف ہے۔ ٹپہ پشتونوں کی اپنی چیز ہے۔ کسی دوسری زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ پشتو ادب کی تاریخ میں ٹپہ کہنے والے کا نام مقام اور وید وقت معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن سنسکرت زبان کے ماہرین اس کی نسبت وید کی گاتوں سے کرتے ہیں یہ تقریباً ڈیڑھ مصرعے کا ایک شعر ہوتا ہے۔ مگر اس میں جذبات، احساسات، خواہشات، آرزؤں اور تمناؤں کے مختلف کوائف اور تاثرات کی ایک وسیع دنیا بسی ہوتی ہے کیونکہ ٹپہ میں حسن و عشق، وصل و فراق، رزم و بزم، مدح و ذم، طنز و مزاح، پند و نصائح، شکوے شکایات اور مختلف قسم کے سوال و جواب سب کچھ کہا جاتا ہے۔ کوئی شاعر ٹپہ کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کی ایجاد ہے۔

(۵۹) خٹک بھنگڑہ۔ اتنڑ۔

یہ بھنگڑہ وغیرہ کی قسم کا ایک مخصوص ملی ناچ ہے۔ بہت سے افراد مل کر ایک بڑے دائرے کی شکل میں چاروں طرف پھر پھر کر ناچتے ہیں۔ نوجوان ہاتھ میں تلوار لئے ناچتے ہیں۔ اس میں ہاتھ، پاؤں، سر اور گردن کی تیز تیز حرکات، آگے جھکنا یا دائیں بائیں مڑنا اور ایسے میں موقع بہ موقع اِدھر اُدھر اور آگے پیچھے کی جُنبش، تیزی سے آگے بڑھنا اور پھر اسی تیزی سے پچھلے قدم لوٹنا، جھپٹنا، لپکنا، بیٹھنا، پینترا بدلنا اور تیزی سے اُٹھ کر کھڑے ہونا شامل ہے۔ ساتھ ہی ہاتھوں کو مختلف اطراف میں حرکت دینا جو کہیں حملہ آور ہونا لیکن بچاؤ کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ پھر ساتھ ہی ساتھ مختلف اوقات میں مختلف قسم کی زوردار اور گرج دار آوازیں بھی ایک ساتھ منہ سے نکالنا جو عموماً دشمن پر حملہ کے وقت اپنی قوت کے اظہار اور دشمن کو مرعوب و خوفزدہ کرنے کے لئے نکالتے ہیں۔

(۶۰) بوشہر

خلیج فارس پر واقع ایک بندرگاہ ہے جو کہ شیراز سے ۱۱۰ میل دور ہے۔ ۱۷۳۶ء میں اسے دریافت کیا گیا۔

(۶۱) تبریز

ایرانی آذربائیجان کا دارالحکومت ہے۔ ایران کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ ۹ ویں صدی عیسوی میں اس کو محض ایک چھوٹا سا گاؤں بیان کیا گیا ہے۔ کچھ تاریخ دانوں کے بقول تبریز کی بنیاد ہارون الرشید عباسی خلیفہ کی بیوی زبیدہ نے رکھی تھی۔ مشہور جغرافیہ دان مقدسی دسویں صدی عیسوی میں اس کو ایک خوب صورت بڑے قصبے سے تشبیہہ دیتا ہے۔ منگولوں کی فتوحات سے اگرچہ تبریز کچھ متاثر ہوا تاہم ان کی تباہی و بربادی سے بچا۔ دو دفعہ زلزلوں سے شہر بُری طرح متاثر ہوا۔ ال خانوں کے وقت میں تبریز علاقے کا سب سے بڑا شہر بنا۔ مشہور زرعی شہر ہے اور پیداوار میں کپڑا، قالین اور چمڑے کی مصنوعات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ خشک میوے کی بہت بڑی منڈی ہے۔

(۶۲) اصفہان

ایران کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ زمانہ قدیم سے ایک بڑا تجارتی مرکز رہا ہے۔ ۱۰۵۲ء میں سیاحوں نے اس کو فارسی بولنے والے میں سب سے بڑا شہر بیان کیا ہے۔ اس میں سینکڑوں کارواں سرائے موجود تھے۔ ۱۶ ویں صدی عیسوی کے اواخر میں شاہ عباس صفوی نے اس کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ ۱۷۲۲ء میں افغانوں کے ہاتھوں اس طرح تباہ و برباد ہوا کہ ابھی تک اپنی اصلی حالت میں دوبارہ نہیں آیا۔ کپڑے کی صنعت میں بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ قالین بافی کا بھی مرکز ہے۔ اپنی کشیدہ کاری کے لئے مشہور ہے۔ شہر کے قابل دید مقامات میں میدان شاہ، مسجد شاہ، مسجد لطف اللہ معہ مقبرہ، شاہ عباس کا چہل ستون، چہار باغ، مدرسہ مادر شاہ اور پُل علی وردی خان مشہور ہیں۔

(۶۳) قُم

اہلِ تشیع کے لئے قُم بہت متبرک جگہ ہے۔ ان کے مطابق یہاں فاطمہ جو کہ چھٹے امام علی رضا کی بہن تھی کا روضۂ اقدس ہے۔ فاطمہ خراسان کی طرف اپنے بھائی کی امداد کے لئے جا رہی تھیں کہ انہیں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔

(۶۴) یزد

صوبہ اصفہان کا تقریباً ۴ ہزار فٹ اونچا شہر ہے۔ اصفہان سے ۱۰۰ میل دور واقع ہے۔ ایک سڑک

کے ذریعے اصفہان سے ملا ہوا ہے۔ ابن حوقل نے دسویں صدی عیسوی میں اس کو ایک اچھا تعمیر شدہ شہر جس کے اردگرد مضبوط فصیل بنی ہوئی تھی بیان کیا۔ زمانہ قدیم کی چند دیواریں اور مسجدیں شہر کے وسط میں آج کل بھی پائی جاتی ہیں۔ پانی بکثرت موجود ہے جو کہ اردگرد کے پہاڑوں سے نہروں اور چشموں کے ذریعے لایا جاتا ہے۔

(۶۵) بمبئی

ہندوستان کے صوبے مہاراشٹر کا دارالخلافہ ہے اور ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ بحیرہ عرب کے کنارے واقع ہے۔ ملک کی ایک اہم بندرگاہ ہے۔ ۱۵۳۴ء میں پرتگالیوں نے گجرات کے سلطان سے یہ جگہ خریدی تھی اور کھیترین برگنزا کے جہیز کی حیثیت سے انگلستان کے چارلس II کو ۱۶۶۱ء میں عطا کی گئی جس سے یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملی۔ برطانوی راج کے دوران یہ بمبئی پریذیڈنسی کا دارالحکومت تھی اور ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے ساتھ ہی ریاست بمبئی کا دارالحکومت بنا۔ آخر کار ۱۹۶۰ء میں مہاراشٹر کا دارالحکومت بنا۔ آبادی کی اکثریت ہندوؤں کی ہے لیکن پارسی شہر میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ مزدور کار لوگوں کے لئے ایک بڑا صنعتی مرکز بھی ہے جو ان کو روزگار فراہم کرتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے صوبہ سرحد کے اکثر باشندے وہاں کام کرتے تھے۔

(۶۶) خان بہادر عبدالعزیز

خان بہادر عبدالعزیز صوبہ سرحد کے سی آئی ڈی کا انچارج تھا۔ عہدہ اس کا ایس پی کا تھا اور بذات خود قادیانی تھا۔ عبدالعزیز انگریز پرستی اور برطانوی استعمار کی خدمت گزاری میں ان سے بھی آگے بڑھ چکا تھا بلکہ غیر ملکی سامراجی حکمرانوں سے بھی بڑھ کر قومی کارکنوں پر ظلم و ستم کیا کرتا تھا۔ اسی لئے تو شیخ عبدالعزیز نے اپنی غدارانہ ملت فروشی کے عوض خان بہادر کا خطاب انگریز سرکار سے پایا تھا۔

جب بھی کوئی اس خبیث نفس کے زیر عتاب آتا تو اس کا بچ نکلنا ناممکنات میں شامل ہوتا۔ اگر وہ بدقسمت قانونی تقاضوں کے پورا نہ ہونے سے عدالتی فیصلوں سے بچ نہ پاسکتا تو عدالتی کارروائی سے قبل اتنے اذیت ناک مرحلوں سے اسے گزرنا پڑتا کہ ان کی تفصیل بیان کرنے سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

عبدالعزیز پنجاب کے کسی غیر معروف علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ معمولی کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا اپنی ملازمت اور عمر کا سارا زمانہ صوبہ سرحد کے سی آئی ڈی کے محکمہ سے وابستہ رہ کر گزارا۔ پستہ قد اور نحیف جسم کا مالک

تھا۔ نہایت غلیظ کپڑے پہنتا۔ بہت ہی عیار اور سازشی ذہن کا آدمی تھا۔ اس نے درجنوں افراد کو مجاہدین چرکنڈ سے رابطہ رکھنے کے الزام میں نہ صرف قید و بند میں ڈالا بلکہ کئی کو تو زندگیوں سے بھی محروم کر دیا۔ وہ مجاہدین جو ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے تھے ان پر تو شیخ عبدالعزیز کی کڑی نگاہ تھی۔ اس نے بہت سے قومی کارکنوں کو حکومت کے حوالے کر کے اپنے لئے ڈی ایس پی اور پھر ایس پی کا عہدہ اور خان بہادری کا اعزاز پیدا کیا۔ لیکن قدرت کا انتقام بھی عجیب ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ہی میں اس کے دو جوان بیٹے ٹی بی (تپ دق) میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ ملازمت کے دوران ہی اس کے بائیں بازو میں ناسور کا زخم پیدا ہو گیا جس کے عذاب میں وہ برس ہا برس تک مبتلا رہا۔ آخر اسی زخم نے اس حال میں کہ وہ اطمینان سے اپنی چھٹی پوری نہ کر پایا تھا اسے بڑے کرب و ستم میں ہلاک کر دیا۔ اس طرح انگریزی استعمار کے لئے اپنا دین و ایمان قربان کرنے والے کا انجام بڑا حسرت ناک ہوا۔ نہ تو اس کا کوئی نام لیوا جہاں میں رہا اور نہ ہی قیامت تک وہ اچھے الفاظ سے یاد کیا جائے گا۔

(۶۷) دریائے راوی

اس دریا کی کل لمبائی تقریباً ۴۵۰ میل ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں سے گزرتا ہے۔ پنجاب کے مشہور پانچ دریاؤں میں سے ہے۔ اس کا منبع کوہ پیر پنجال کوہ ہمالیہ ہے۔ لاہور کو عبور کر کے یہ دریا چناب کے ساتھ مل جاتا ہے مشہور اپر باری دوآب نہر کو یہی دریا پانی مہیا کرتا ہے۔

(۶۸) زیارت کاکا صاحبؒ

ایک مشہور گاؤں ہے جو نوشہرہ ریلوے سٹیشن سے بجانب جنوب تقریباً چھ میل کے فاصلے پر پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ گاؤں کا نام مشہور ولی اللہ اور بزرگ حضرت سید کستیر گل الملقب بہ شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کے نام کی مناسبت سے زیارت کاکا صاحب پڑا۔ حضرت سید کستیر گل کاکا صاحبؒ کا مزار شریف گاؤں ہی میں واقع ہے۔ حضرت قدس سرہٗ کی اولاد میں روحانیت کا سلسلہ چار پانچ پشتوں تک جاری رہا۔ ان میں بڑے متقی، پرہیزگار، عابد و زاہد و پابند شریعت افراد کثرت سے موجود تھے عموماً پشتون قبائل کے تنازعات کا فیصلہ کاکا صاحبؒ کی اولاد کے ذریعے ہی طے کیا جاتا تھا۔ حضرت کاکا صاحبؒ کی اولاد

کے ذریعے ہی طے کیا جاتا تھا۔ حضرت کاکا صاحبؒ کی اولاد جو کہ کاکا خیل کہلاتی ہے نے آزادیٔ وطن کی خاطر قومی تحریکوں میں اپنی آبادی کے تناسب سے قابلِ قدر حصہ لیا۔ ان میں مولوی میر اجان، میاں حمید گل، میاں جعفر شاہ، میاں عطاء الدین عرف جرنیل میاں صاحب اور مولانا عزیز گل (اسیر مالٹا) کی قربانیاں قابلِ ذکر ہیں۔ کاکا خیلوں نے حتی الوسع اپنی مادری زبان پشتو کی بھی خدمت کی ہے۔ ان کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کاکا خیلوں کے ذکر کے بغیر پشتو ادب کی تاریخ ادھوری ہے۔ قابلِ ذکر ادبی شخصیات میں میاں شمس الدین، میاں محمد مبین، میاں حبیب گل، میاں عنوان الدین، میاں جناب کاکا خیل، میاں آزاد گل، میاں مسرور گل، محترمہ سیدہ بشریٰ بیگم، تقویم الحق اور مشہور تاریخ دان بہادر شاہ ظفر شامل ہیں۔

(۶۹) میاں حمید گل المعروف بہ فخرِ قوم میاں صاحب

آپ کا اصل نام حمید گل تھا اور کاکا خیلوں کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ محکمہ مروے میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ حکومت سے بہت انعامی سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں حاصل کر چکے تھے لیکن قومی تحریک کے فروغ کے ساتھ ہی ان کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ انہوں نے انگریزوں کا دیا ہوا سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ملازمت سے استعفےٰ دیا اور خلافت کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ انگریز سرکار نے پہلے تو ہر طرح سے لالچ دے کر انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کیا لیکن وہ نہ مانے اس پر انگریزوں نے انہیں کہا کہ اگر وہ اپنے استعفےٰ کے الفاظ بدل دیں اور یہ لکھ کر دے دیں کہ خرابیٔ صحت کی بنا پر استعفےٰ دے رہا ہوں تو ان کو ان کی پنشن بھی مل جائے گی اور مراعات بھی حاصل ہوں گی۔ لیکن وہ نہ مانے۔ اپنے ارادے پر ڈٹے رہے اور جلد ہی قوم سے "فخرِ قوم" کا خطاب پا گئے۔

ان کی کوششوں سے زیارت کاکا صاحب اور اردگرد کے لوگوں نے انگریزوں کے خلاف کام شروع کر دیا۔ تحریک منظم طور پر چلائی۔ ایک ہلچل پیدا ہوئی۔ ہر طرف جلسے ہونے لگے۔ جلد ہی میاں صاحب فخرِ قوم کی گرفتاری کا حکم آ گیا۔ انہیں گرفتار کر کے پشاور لے جانے کا حکم دیا گیا۔ اردگرد کے علاقوں سے رضا کار زیارت کاکا صاحب جمع ہوئے۔ وہ بہت جوش و خروش کی حالت میں تھے۔ انہوں نے میاں صاحب کے ساتھ ہی پشاور چلنے کا ارادہ کیا۔ فخرِ قوم میاں صاحب کو پشاور شہر کے قلعہ بالا حصار میں

قید کر دیا گیا۔ سارا دن پشاور شہر میں جلسے جلوس ہوتے رہے۔ پشاور شہر کے آفریدیوں، مہمندوں اور علاقے کے اربابوں کا ایک وفد لاٹ صاحب (چیف کمشنر صاحب) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہیں سمجھایا گیا کہ اگر فخر قوم میاں صاحب رہا نہ کئے گئے تو گڑبڑ اور فساد پھیلنے کا خطرہ ہے۔ انہوں نے لاٹ صاحب پر یہ بھی واضح کر دیا کہ کاکا خیل ہمارے پیر خانہ ہیں اور ہمیں بھی میاں صاحب کی گرفتاری سے سخت افسوس ہوا ہے۔ تین دن تک متواتر جلوس نکلتے رہے اور چوتھے دن مجبور ہو کر حکومت نے انہیں رہا کر دیا۔ فخر قوم میاں صاحب نے باقی عمر آزادی کے لئے جدوجہد میں گزاری۔ مولوی عبدالکریم چمرکنڈی کے "روزنامچہ" سے پتہ چلتا ہے کہ میاں صاحب کے مجاہدین چمرکنڈ کے ساتھ گہرے روابط تھے۔ میاں صاحب نے اپنی آخری عمر نہایت غربت و افلاس میں گزاری۔ وہ اگر چاہتے تو وقت کے بہت بڑے خان خوانین کی طرح انگریز کی چاپلوسی کر کے ان سے مالی فائدے کے علاوہ خان بہادری کا اعزاز بھی پاتے لیکن ان کی عزت نفس نے اس غربت و افلاس کو انگریز کی دی ہوئی عزت اور دولت مندی پر ترجیح دی۔ ۱۹۳۰ء تک میاں صاحب خدائی خدمت گار تحریک کے ساتھ وابستہ رہے اور اسی سال یعنی ۱۹۳۰ء میں دق سل کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا گئے۔ کانگریس کو دیہاتوں میں متعارف کرانے کا سہرا بھی میاں صاحب فخر قوم کے سر ہی ہے۔

اشاریہ

ابن ہیکل : ۴۲۵

ابوالحسن ندوی، سید: ۳۹۷

آپ بیتی (کتاب) :۱

اپر باری دوآب (نہر) : ۴۲۶

آتش، عبدالغفور : ۱۹

اتمان زئی: ۳۹۰- ۵۱- ۵۰- ۱۷- ۱۶- ۱۱

اٹک : ۴۱۰ - ۳۸۵ - ۳۳ - ۲۳-

اٹلی: ۴۰۷ - ۷

اجمیر : ۳۹۷

اچاریہ : ۷۶

اچھوت : ۲۹

احمد : ۲۱۸ - ۲۱۷ - ۲۱۳ - ۲۰۵

احمد سعید : ۲۳

احمد سید : ۳۹۷ - ۳۹۶ - ۶۱

احمد شاہ، میاں : ۲۰ - ۱۶

احمد، غلام : ۴۰۵ - ۱۳۴

احمد، نور : ۹۸

احنف بن قیس : ۴۱۱

آذربائیجان : ۲۶۹ - ۲۶۸ - ۲۱۸ - ۲۱۶ - ۱۷۱

۳۶۶ - ۳۰۵ - ۲۹۹ - ۲۹۱ - ۲۸۷ - ۲۷۴

۴۲۴ - ۴۱۸ - ۴۱۷ - ۴۱۵

آذری : ۴۱۸

اردو : ۳۶۸ - ۲۹۳ - ۲۴۰ - ۱۳۸ - ۸۰

۴۰۷ - ۴۰۶ - ۴۰۱ - ۳۹۸

آرکینجل : ۲۴۰

آرمنستان : ۲۶۹ - ۲۶۷ - ۲۶۶ - ۲۳۶ - ۲۱۸

۲۷۶ - ۲۷۵ - ۲۷۱ - ۲۷۰

آرمنی : ۲۹۰ - ۲۷۳ - ۲۷۲ - ۲۷۱ - ۲۴۰

۴۱۸ - ۳۲۵ - ۳۱۷ - ۳۰۶ - ۳۰۵

اردن، لارڈ: ۲۴

اروان: ۲۷۲ - ۲۷۱ - ۲۷۰ - ۲۶۹

آریا: ۴۰۰ - ۱۳۱

اڑلیہ: ۳۴۲ - ۳۰

آزاد سکول: ۱۸ - ۱۷ - ۱۶

آزاد گل، میاں: ۴۲۷ -

آزاد، مولانا ابوالکلام: ۴۱۵ - ۴۰ - ۳۰ - ۶

آزاد ہند فوج: ۴۲ -

آزادی کی تلاش (کتاب): ۴۷ - ۴۶ - ۱

ازبک: ۲۳۲ - ۱۳۴ - ۱۳۰ - ۱۲۳ - ۱۰۷

۴۱۸ - ۴۰۳

ازبک اکیڈمی آف سائنسز: ۴۱۴

آسام: ۳۱ - ۳۰ -

اسایان، آنیا: ۲۳۹ - ۲۳۸ - ۲۳۷ - ۲۳۶

۲۴۸ - ۲۴۳ - ۲۴۲ - ۲۴۱ - ۲۴۰

۲۵۵ - ۲۵۲ - ۲۵۱ - ۲۵۰ - ۲۴۹

۳۷۶ - ۳۵۷ - ۳۵۶ - ۲۸۱ - ۲۵۷

استاد سرا: ۴۲۰ -

آسٹریلیا: ۲۲۰ -

اسداللہ: ۴۱۰ -

اسلام: ۹۰ - ۸۹ - ۸۶ - ۳۹ - ۳۸ - ۲۱

۱۱۹ - ۱۸۰ - ۳۹۶ - ۳۹۷ - ۴۱۸ -

اسلام آباد: ۴۴ - ۲ -

اسلامک فریٹرنٹی (رسالہ): ۴۰۶ -

اسلامی: ۳۹۶ - ۳۲۲ - ۹۴ - ۷۴ - ۶۵ - ۵۹

۳۹۸ - ۳۹۷ -

اسلامیہ کالج پشاور: ۴۸ - ۴۵ - ۳۴ - ۳۳ - ۶

۳۹۱ - ۳۸۹ - ۳۰۱ - ۲۰۰ - ۶۶ -

اسلامیہ کلب ہال: ۸ -

اسلامیہ ہائی سکول: ۳۸۴ - ۳۷۷

اسلامیہ ہوٹل: ۴۸۷ -

اسمس: ۳۹۸ - ۳۹۵ -

اسمٰعیل شاہ: ۳۹۷ - ۳۹۶ - ۷۱ -

اصفہان: ۳۲۴ - ۳۲۳ - ۳۲۲ - ۳۱۴ - ۳۰۴

۳۲۵ - ۳۲۶ - ۳۲۷ - ۴۲۴ - ۴۲۵ -

آفریدی: ۳۹۸ - ۹۵ - ۸۰ - ۵۳ - ۲۳ - ۲۲

۴۲۸ -

افریقہ: ۱۰۴ -

افغان: ۱۰۶ - ۹۶ - ۸۴ - ۷۰ - ۶۹ - ۴۹

۲۹۲ - ۲۸۵ - ۲۸۲ - ۱۴۷ - ۱۲۶ - ۱۲۳

۳۹۵ - ۳۹۴ - ۳۶۶ - ۳۰۱ - ۲۹۶ - ۲۹۳

۴۰۹ - ۴۰۸ - ۴۰۵ - ۴۰۳ - ۴۰۱ - ۴۰۰ - ۳۹۷

۴۲۴-

افغانستان: ۱۶-۱۵-۱۴-۱۳-۱۲-۱۱-۹-۱

۳۴-۳۵-۳۶-۴۵-۵۰۰-۵۷-۵۸

۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۶-۶۷-

۶۸-۶۹-۷۲-۷۳-۷۶-۷۸-

۷۹-۸۰-۸۱-۸۵-۸۶-۸۷-

۸۸-۹۱-۹۳-۹۴-۹۵-۹۹-

۱۰۰-۱۰۱-۱۰۴-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸

۱۰۹-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۲۰

۱۲۱-۱۲۵-۱۲۶-۱۳۰-۱۳۲-

۱۴۸-۱۵۷-۱۶۵-۱۷۵۰-۱۸۴

۱۹۲-۱۹۵-۱۹۹-۲۰۱-۲۱۱-

۲۱۵-۲۴۱-۲۴۴-۲۶۵-۲۶۶-

۲۶۷-۲۸۰-۲۹۴-۳۰۰-۳۳۲

۳۴۲-۳۶۶-۳۸۹-۳۹۳-۳۹۵

۳۹۸-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳

۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-

۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۹-۴۲۱-

افغان ترکستان: ۱۲۹-۱۲۳-۱۲۲-۱۵

افغان یوتھ لیگ: ۱۷-

آفندی، احمد: ۱۰-۳۹۸-

آفندی، سرفراز: ۱۲۸-۱۴۲-۱۳۱-۱۳۰

۱۷۹-۱۸۰

آفندی عبدالحمید: ۴۱۸

آکاش (اخبار): ۶-

اکاخیل، مُلا صاحب: ۳۹۶-

اکالی پارٹی: ۲۹-

اکبر شاہ، میاں: ۳۸-۳۷-۳۶-۳۴-۳۳-۱

۴۷-۴۴-۴۳-۴۲-۴۱-۴۰-۳۹-

۳۸۴-۳۷۹-۲۳۵-۱۸۹-۹۳-۵۱

۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۴۱۰-۴۱۴-۴۱۹-

اکبر، عبدالاکبر خان: ۱۶-۲۰۰-۲۰۱-۴۱-۱

اک روباٹ پاس: ۴۰۹-

اکوڑہ خٹک: ۳۸۵-۸۴-۷۶-۷۵-۴۶

آگرہ: ۶-۷۵-

آل انڈیا مسلم لیگ: ۳۰-۲۹-۲۸-۲۷-۲۴-۶

۳۱-۳۲-۳۳-۳۷-۴۰۲-

آل انڈیا نیشنل کانگرس: ۲۵-۲۴-۲۲-۲۰-۱۸

۲۶-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۷-۳۸

۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۳-۴۶-۴۲۸-

ال خان: ۴۲۷-

الفنسٹن، ماؤنسٹورٹ: ۳۹۳-

الفنسٹن، ولیم: ۴۰۰-

المجاهد (اخبار): ۳۹۹

الیگزنڈر، اے، وی: ۳۰-

آمو (دریا): ۱۰۷-۱۱۴-۱۲۰-۱۲۳-۱۲۷-
۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۴۴
۱۵۶-۱۶۳-۱۶۸-۱۷۳-۱۷۷-۱۸۴
۱۸۹-۱۹۲-۲۴۱-۲۸۹-۴۱۲-

امام اعظم: ۱۵۶-

امام شافعی: ۱۵۶-

امان افغان (اخبار): ۸۶-۸۹-

امرتسر: ۱۱-۳۳-۴۵-۷۱-۱۵۸-۴۰۳

مرتسری، خیرالدین: ۹۸-

امریکن: ۴۰۷-

امریکہ: ۶-۲۷-۲۹-۴۷-۱۹۸-۲۲۰-
۲۲۹-۲۳۳-۲۶۹-۸-۲۶۹-
۲۷۱-۲۷۲-۳۰۱-۴۰۲-۴۰۶-
۴۰۷-۴۰۸-

امیر جنید، پنڈت: ۶-

انجمن الاصلاح الافاغنہ: ۱۶-

انجمن ترقی واتحاد: ۷-

اندوسکی دومہ: ۷۴-۷۶

انجمن خدام کعبہ: ۸-

انڈین (دیکھیے ہندوستانی)

انزلی: ۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-
۲۸۷-۲۸۹-۲۹۱-۲۹۶-۳۰۴-
۳۰۷-۳۲۹-۳۳۱-۳۵۰-۳۵۸-۴۱۹
۴۲۱-

انصاری، ڈاکٹر محمد نعیم: ۴۰۴-

انصاری، ڈاکٹر مختار احمد: ۷-۲۳-۷۲-۴۰۴-

انصاری، عبدالعزیز: ۴۰۴

اناطولیہ: ۳۶-۸۶-۱۲۷-۱۳۰-۱۴۲-۱۸۵
۱۹۰-۱۹۱-۲۱۴-۲۱۵-۳۷۵

انقلاب روس: ۴۱۲

انگریز: ۳-۴-۵-۶-۷-۹-۱۰-۱۱-۱۲-
۱۳-۱۷-۱۸-۱۹-۲۱-۲۲-۲۳-۲۶
۲۹-۳۲-۳۴-۳۵-۳۹-۴۱-۴۵-۴۶
۴۷-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۷
۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۷-۶۸-
۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-
۷۷-۸۲-۸۳-۸۶-۸۷-۸۹-
۱۰۴-۱۰۷-۱۱۶-۱۲۰-۱۲۹-۱۳۳
۱۳۴-۱۳۵-۱۴۷-۱۵۱-۱۷۵-۱۸۳-

۱۸۵-۱۹۱-۱۹۹-۲۰۱-۲۰۴-۲۰۹
۲۱۵-۲۱۷-۲۱۹-۲۲۳-۲۲۴-
۲۲۹-۲۴۱-۲۴۵-۲۴۹-۲۵۰-
۲۵۳-۲۶۱-۲۷۲-۲۸۰-۲۸۹
۲۹۱-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۹-۳۰۲-
۳۰۴-۳۰۷-۳۰۹-۳۱۲-۳۱۳
۳۱۴-۳۱۵-۳۱۸-۳۲۰-۳۲۴-
۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-
۳۳۲-۳۴۵-۳۴۳-۳۵۰-۳۵۱
۳۵۶-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-
۳۶۴-۳۶۵-۳۷۲-۳۷۳-
۳۷۸-۳۸۴-۳۹۱-۳۹۳-۳۹۴
۳۹۵-۳۹۶-۳۹۸-۴۰۰-۴۰۱-
۴۰۲-۴۰۳-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-
۴۱۳-۴۱۴-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲
۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-
انگریزی (زبان) ۲۰۲-۱۹۰-۱۲۶-۱۲۵-۷۷
۲۶۳-۳۶۲-۳۰۱-۲۶۱-۲۰۸
۴۰۷-
انگلستان: ۲۲۹-۳۱-۲۸-۱۳-۶-۵
۲۳۳-۲۶۱-۳۰۹-۳۳۷-۴۰۶
۴۲۵-
اُنے پاس: ۴۰۹-
اودھ: ۷۵-
اوڈائر: ۴۰۴-
اورمرگ: ۲۲۷-
اورنگ زیب، سردار: ۲۷-۳۹
اورینٹ (اخبار) ۴۰۲
آئرش: ۳۶۲:
آئرلینڈ: ۳۶۱-
ایبٹ آباد: ۲۷-۳۸
ایبٹ، جیمس: ۴
ایمبرلین: ۴۱۶-
ایبک: ۱۰۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۳-
ایبک، ظفر حسن: ۱
ایڈورڈ، ہربرٹ: ۳۰۴-۳۹۲
ایران: ۱-۹-۳۶-۴۵-۶۸-۷۴-۱۹۹-
۲۱۸-۲۱۹-۲۳۰-۲۳۳-۲۶۴-۲۶۶
۲۶۷-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۷-۲۷۸-۲۸۰
۲۸۱-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۱-۲۹۵-۳۰۰
۳۰۲-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۷-۳۰۸-
۳۱۱-۳۱۲-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸

۳۲۶ - ۳۲۵ - ۳۲۳ - ۳۲۱ - ۳۱۹
۳۳۵ - ۳۳۴ - ۳۳۲ - ۳۲۹ - ۳۲۸
۳۵۰ - ۳۴۸ - ۳۴۴ - ۳۴۲ - ۳۲۶
۳۶۲ - ۳۵۹ - ۳۵۸ - ۳۵۶ - ۳۵۱
۴۱۵ - ۴۰۵ - ۳۷۴ - ۳۶۸ - ۳۶۶
۴۲۱ - ۴۲۰ - ۴۱۹
ایرانی: ۲۷۵ - ۲۶۹ - ۲۶۸ - ۲۲۹ - ۲۱۷
۲۸۴ - ۲۷۹ - ۲۷۸ - ۲۷۷ - ۲۷۶
۲۹۸ - ۲۹۵ - ۲۹۲ - ۲۸۸ - ۲۸۵
۳۱۱ - ۳۰۹ - ۳۰۳ - ۳۰۲ - ۳۰۱
۳۱۸ - ۳۱۷ - ۳۱۶ - ۳۱۵ - ۳۱۴
۳۳۰ - ۳۲۸ - ۳۲۵ - ۳۲۴ - ۳۱۹
۳۳۷ - ۳۳۶ - ۳۳۴ - ۳۳۳ - ۳۳۱
۳۵۴ - ۳۵۰ - ۳۴۶ - ۳۴۱ - ۳۳۸
۳۷۴ - ۳۶۶ - ۳۵۸ - ۳۵۶ - ۳۵۵
۴۲۴ - ۴۱۸ - ۴۱۷ - ۴۱۵
ایرانی آذربائیجان: ۲۱۹
ایس ایس بنکورہ (جہاز): ۳۶۵ - ۳۶۰ - ۳۵۹
ایسٹ انڈیا کمپنی: ۴۲۵
ایشیا: ۲۲۰ - ۲۱۷ - ۲۱۳ - ۱۹۷ - ۷۸ - ۶۷
۳۶۴ - ۲۸۰ - ۲۵۹ - ۲۲۹ - ۲۲۸ - ۲۲۷
ایشیائی: ۳۶۱ - ۳۰۳ - ۲۹۵ - ۲۶۴ - ۲۳۳
ایشیائے کوچک: ۲۱۱
امپیریل بینک آف پرشیا: ۳۲۴
اینگلز، فریڈرک: ۳۹۴ - ۸۰
اینگلو افغان جنگ: (دیکھیے ڈیورنڈ لائن)
اینگلو افغان سرحد (دیکھیے ڈیورنڈ لائن)
اینگلو سکھ جنگیں (۱۸۴۶ء ۱۸۴۹ء) ۳۹۲ - ۴

ب

بابا، عبدالرحمٰن: ۱۷۸
بابر مغل: ۴۰۹ - ۱۸۰ - ۵۹
باجوڑ: ۳۹۱ - ۶۰ - ۵۹ - ۵۸ - ۵۶ - ۳۴
۳۹۷ - ۳۹۵
باچا خان (دیکھیے خان، عبدالغفار)
باختری: ۴۰۰
بادشاہی مسجد: ۳۸۲
بارک زئی: ۳۹۳
باری، ڈاکٹر: ۴۰۴
باڑہ (دریا): ۴۱۰
بازارگی: ۱۰۷ - ۱۰۸
بازگل، میاں: ۳۷ - ۳۳
بارنیطینی: ۴۱۲

باکو: ۱۹۳-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۶-۴۵
۲۱۸-۲۱۹-۲۵۰-۲۵۷-۲۵۸
۲۵۹-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴
۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۷۱
۲۷۲-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۸-۲۸۰
۲۸۱-۲۸۹-۳۰۶-۳۱۸-۳۶۸
۴۱۵-۴۱۷-۴۱۸-
بالاحصار (قلعہ): ۴۷-۴۲۷
بالاکوٹ: ۶۱-۳۹۷
بالجوان: ۴۱۹-
بھا، دنوبا: ۲۸-
بت خاک: ۷۰-
بچہ سقاؤ (حبیب اللہ): ۳۹۸-۳۹۹
بحر بالٹک: ۲۲۸-
بحیرہ اسود: ۲۶۹-۲۸۹
بحیرہ خضر: ۱۸۹-۱۹۲-۱۹۳-۲۱۳-
۲۱۷-۲۶۲-۳۱۷-
بحیرہ عرب: ۳۶۴-۴۲۵
بحیرہ ہرمز: ۳۱۷-
بحیرہ ہند: ۴۰۳-
بخارا: ۱۳۰-۱۳۳-۱۳۷-۱۳۹-۱۴۷-
۱۵۱-۱۵۲-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۹-۱۹۳-
۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۲۱۳-۲۴۱-
۲۵۰-۲۶۴-۲۷۵-۲۸۱-۲۸۹-
۳۰۰-۳۷۹-۴۱۲-۴۱۸-
بخاری، عطاء اللہ شاہ: ۲۳-
بخاری، علی عباس: ۶-۸-۴۰۲
بخش، رحیم: ۲۰
بخش، عمر: ۱۱-
بدخشان: ۱۰۶-۱۰۹
بدرشی: ۳۳-۴۶-۴۷-۵۸-۷۱-۷۴-
۱۱۰-۳۸۶-۳۸۸-۴۱۰
بدھ: ۳۸۹-
برائڈن، ڈاکٹر: ۴۰۰-۴۰۱
برٹش (دیکھیے برطانوی)
برقی، اللہ بخش: ۱۹-۲۰-
برکت اللہ بھوپالی، مولانا: ۷۵-۹۰۴-۹۰۵-
۴۰۶-۴۰۹-
برگنزا، کھیترپن: ۴۲۵-
برلن: ۹-۴۲-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷
برمک: ۱۱۱-
برنس، الیگزینڈر: ۳۹۳-۴۰۰
بروغیل: ۴۰۰-

برہان: ۲۱۳-
برہمن: ۴۰۷-
بزرگ مرزا: ۴۱۹-
بسمجاچی: ۴۱۸-
بشریٰ بیگم، سیدہ: ۴۲۷
بشیر، مولانا: ۳۹۹-۳۹۶-۳۹۵-۷۲-۶۶
بشیرالدین، قاضی: ۴۰۵-
بصرہ: ۳۱۳
برطانیہ: ۴۰۰-۳۷-۳۳-۱۵-۸-۵
-۴۰۹-۴۰۶-۳۹۹-۳۹۳-۲۲۰
برطانوی: ۳۹۱-۲۲۹-۷۵-۳۱-۱۲-۹
۴۰۵-۴۰۳-۴۰۱-۳۹۵-۳۹۴
-۴۲۵-۴۰۸
بغداد: ۱۳-۲۶۷-۲۶۶-۱۹۹-۷۵
-۳۵۹-۳۵۶-۳۲۹-۳۱۴
۳۶۱-
بغلان: ۱۱۹-۱۱۴-۱۱۳-۱۱۲-۱۱۱-۱۰۹
-۱۲۲-۱۲۰
بگائی، رام داس: ۲۵-
بالشویک (ارکان): ۱۳۸-۳۷-۳۶-۱۷
۱۸۴-۱۸۳-۱۷۷-۱۶۱-۱۵۶-۱۴۲
۲۱۶-۲۱۲-۲۰۲-۱۹۹-۱۹۴-۱۸۵
-۴۱۴-۴۱۳-۳۲۹-۲۶۹-۲۲۸
بالشویک (روس): ۱۹۳-۱۳۵-۱۳۰-۲۴
۴۲۱-۴۱۸-۳۰۵-۲۹۷-۲۸۹-۲۳۷
بلخ: ۱۳۲-۱۳۱-۱۳۰-۱۲۹-۹۶-۶۸-۴۵
-۴۱۲-۴۱۱-۴۱۰-۲۴۱
بلغاریہ: ۷-
بلقان: ۴۰۴-۷۲
بلوچستان: ۲۷۶-۲۷۴-۲۶۶-۷۶-۷۵
-۳۹۷-۳۶۴-۳۵۶
بمبئی: ۲۶۰-۳۵۸-۳۵۷-۳۰-۲۱
۴۲۵-۴۰۲-۳۹۸-۳۷۴-۳۷۳-۳۶۵
بموال، پنڈت امیرچند: ۱۱-۱۰۰-۵
بنارس: ۴۰۷-
بندرعباس: ۳۶۶-۳۶۳-۳۶۰-۳۵۹
۴۲۱-
بنگال: ۳۱-۳۰
بنگالی: ۳۶۳-۳۶۲-۱۹۸
بنوں: ۳۹۲-۲۲۱-۲۰۵-۲۲-۱۹-۱۶-۴
بنیر: ۳۹۷-۳۹۵-۳۹۱-۶۱
بورڈین: ۲۴۵-۱۹۹

بوس، سبھاس چندر: ۴۲-۴۱-۴۰-۳۸-۲۶
بوس سمر کمار: ۴۱-
بوشہر: ۳۳۱-۳۲۹-۳۲۸-۳۰۴-۳۰۱
۳۴۱-۳۳۷-۳۳۶-۳۳۵-۳۳۲
۳۴۶-۳۴۵-۳۴۴-۳۴۳-۳۴۲
۳۵۶-۳۵۵-۳۵۱-۳۵۰-۳۴۷
۳۶۲-۳۶۲-۳۵۸-۳۵۷
۴۲۳-۳۷۶-۳۶۶-۳۶۵
بولٹن، تارمن: ۲۲-
بونیر (دیکھیے بنیر)
بہار: ۳۰-
بھوپال: ۴۰۶-۴۰۱-۷۵-۴۶
بیت الغریب: ۳۸۷-
بیگ، ابراہیم: ۴۱۸-
بیگ، جینری: ۳۹۸-۱۰
بیگ، علی رضا: ۴۱۸-
بیگم تمباکوف: ۳۰۰-۲۹۶-۲۹۵-۲۸۳
بیگم رلئے: ۴۹-۲۴۸-۲۴۴-۲۴۳
۲۵۵-۲۵۳-۲۵۲-۲۵۱-۲۵۰
بیگم صاحبہ بھوپال: ۴۰۱
بے سود: ۶۵-۶۴
بے قرا، مرزا: ۴۱۰-

- پ -

پارسی: ۴۲۵-۲۹
پاشا، انور: ۴۱۸-۴۰۵-۲۷۱-۷۲-۹
۴۱۹-
پاشا، جمال: ۴۱۸-
پاشا، طلعت: ۴۱۸-
پاشا، مصطفیٰ کمال: ۲۱۵-۲۱۴-۴۳
پاشا، ناظم: ۴۱۸-
پاشا، نوری: ۲۷۱-
پاکستان: ۴۰۲-۴۷-۴۳-۳۳-۳۲-۳۱
۴۲۶-
پاک و ہند: ۴۵-۳۲
پامیر: ۴۰۰-۲۸۱-۱۹۹-۱۹۳
پبی: ۴۶-۲۰
پٹا بھائی، ستیارامیہ: ۴۰-۲۶
پٹھان (دیکھیے پشتون)
پٹیل، سردار ولبھ بھائی: ۴۰-۳۰
پرتگالی: ۴۲۵-
پڑانگ: ۳۹۰-
پشاور: ۱۴-۱۳-۱۲-۱۱-۱۰-۶-۵-۳

۱۵-۱۸-۱۹-۲۰-۲۳-۲۷-۳۱
۳۳-۳۴-۳۵-۳۷-۳۹-۴۱-۴۲
۴۶-۴۸-۴۹-۵۰-۵۹-۶۶-۶۸
۷۰-۷۱-۷۲-۷۴-۷۵-۷۶-۷۸
۸۴-۸۵-۹۳-۹۹-۱۰۴-۱۱۸-
۱۲۴-۱۲۵-۱۲۸-۱۴۳-۱۵۴-
۱۸۲-۱۹۶-۱۹۹-۲۰۲-۲۱۹-۲۸۱
۳۳۲-۳۷۶-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸
۳۸۹-۳۹۲-۳۹۷-۴۰۲-۴۰۸-
۴۱۰-۴۲۲-۴۲۷-۴۲۸-
پشاور سازش کیس : ۳۷-
پشاوری (اشخاص) : ۶۰-۱۱۶-۱۲۱-۱۲۶-۱۵۲
۲۶۴-
پشاوری (نام) : ۳۸۴
پشتو (زبان) ۱۶-۵۳-۵۴-۵۶-۶۰-۶۴
۶۵-۸۰-۱۱۶-۱۲۴-۱۳۸-۲۶۹۰
۲۹۴-۳۰۰-۳۶۸-۳۶۹-۳۹۹
۴۰۱-۴۱۵-۴۲۳-۴۲۷
پشتون : ۳-۴-۱۴-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹
۳۲-۳۴-۳۹-۴۵-۵۹-۶۰۰
۶۵-۶۷-۷۲-۷۴-۷۵-۸۴-۸۶
۹۳-۱۱۴-۱۲۳-۱۲۵-۱۳۰-۱۵۶
۲۰۰-۲۲۳-۲۵۰۰-۲۷۰-۳۲۶-
۳۶۶-۳۷۱-۳۸۰-۳۸۵-۳۸۹-
۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۵-۳۹۶
۳۹۷-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۶-
پشتونستان : ۳۲-
پشین : ۳۹۴
پُل علی وردی خان : ۴۲۴
پلیٹن : ۴۱۶
پنجاب : ۴-۵۰-۱۷-۱۹-۳۰-۳۱-۸۳
۱۳۶-۱۹۶-۲۵۰-۳۷۰-۳۷۸-۴۰۳
۴۲۵-۴۲۶-
پنجابی (اشخاص) :- ۷۳-۹۱-۱۳۸-۱۵۸
۲۴۰-۲۶۷-۳۲۰-
پنجابی (زبان) : ۸۰-
پنج شیر (مقام) :- ۲۰۲-۱۰۴-۱۰۷-۱۰۸
۱۰۹-۱۱۴-
پنج شیر (درہ) : ۹۷-۹۹-۱۰۰
پنج شیر (دریا) : ۹۸-۴۱۰
پنج کوڑہ (دریا) : ۴۱۰-
پوشکین : ۲۲۹-

پونا: ۳۱۳-
پہلوی (بندرگاہ): ۴۱۹-
پہلوی (قبیلہ): ۴۲۱- ۲۸۸-
پہلی کمیونسٹ انٹرنیشنل یہ ۴۱۷-
پیٹرگراڈ: ۲۴۴- ۲۴۳- ۲۳۳- ۲۲۸-
۲۴۹- ۲۴۶- ۲۴۵-
پیچرسکی (خانقاہ): ۴۱۲-
پیر پیائی: ۴۱-
پیتھک لارنس، لارڈ: ۳۰-
پیرس: ۴۰۷- ۳۱۱-
پیرس ہوٹل: ۲۸۳-
پیر مانکی، ایین النخات: ۳۲-
پیرو پامیس: ۴۰۹-
پیواڈ کوتل: ۴۰۰-

: ت :

تاتار (اشخاص) ۲۰۷- ۱۷۱- ۱۳۵- ۱۳۴
۲۹۵- ۲۹۴- ۲۹۳- ۲۹۲- ۲۹۱-
۴۱۲-
تاتارستان: ۲۲۲- ۲۲۸-
تاج الدین: ۳۸۰- ۳۷۹- ۱۸۰- ۱۷۹-
۳۸۱- ۳۸۲
تاجک: ۱۰۴- ۸۰
تاج محل ہوٹل: ۴۲۰-
تاشقرغان ۱۲۹- ۱۲۷- ۱۲۳- ۱۲۲- ۱۲۱
تاشقند: ۷۷- ۷۶- ۷۵- ۷۴- ۴۵- ۳۶-
۱۹۱- ۱۹۰- ۱۸۹- ۱۸۵- ۱۸۱- ۱۸۰
۲۰۱- ۲۰۰- ۱۹۸- ۱۹۷- ۱۹۶- ۱۹۳
۲۰۷- ۲۰۶- ۲۰۴- ۲۰۳- ۲۰۲
۲۱۹- ۲۱۸- ۲۱۶- ۲۱۳- ۲۱۱- ۲۰۹
۲۲۷- ۲۲۶- ۲۲۴- ۲۲۳- ۲۲۲- ۲۲۱
۲۶۵- ۲۶۴- ۲۶۳- ۲۴۱- ۲۲۹
۳۴۲- ۳۴۱- ۳۳۲- ۳۲۵- ۳۲۳
۴۱۴- ۴۱۳- ۴۱۲- ۳۶۸
تبریز: ۳۳۶- ۳۰۴- ۲۸۹- ۲۶۷- ۲۶۶
۴۱۹- ۴۱۵- ۳۵۹- ۳۳۹- ۳۳۷
۴۲۴-
ترک: ۱۳۰- ۹۴- ۹۰- ۸۹- ۷۵- ۱۰- ۹
۱۸۵- ۱۸۰- ۱۷۱- ۱۴۲- ۱۳۱
۲۱۶- ۲۱۵- ۲۱۳- ۲۱۱- ۱۹۹- ۱۹۱
۲۲۹- ۲۲۴- ۲۲۳- ۲۲۱- ۲۱۹
۴۰۰- ۳۹۹- ۳۶۶- ۲۷۱- ۲۶۳
۴۱۷- ۴۱۱- ۴۰۴- ۴۰۳

ترکستان : ۱۷۱ - ۱۳۸ - ۱۳۶ - ۸۶ - ۶۸
- ۲۰۶ - ۱۹۷ - ۱۹۴ - ۱۸۵ - ۱۸۴
- ۲۲۵ - ۲۲۴ - ۲۲۱ - ۲۱۹ - ۲۱۰
۴۱۳ - ۳۰۰ - ۲۶۵ - ۲۵۸ - ۲۲۶
- ۴۱۸ - ۴۱۴

ترکستان لنین اکیڈیمی : - ۲۰۷

ترکمان : ۱۳۸ - ۱۳۷ - ۱۳۴ - ۱۳۰ - ۱۲۳ - ۳۶
- ۱۴۴ - ۱۴۳ - ۱۴۲ - ۱۴۱ - ۱۳۹
- ۱۴۹ - ۱۴۸ - ۱۴۷ - ۱۴۶ - ۱۴۵
- ۱۵۴ - ۱۵۳ - ۱۵۲ - ۱۵۱ - ۱۵۰
- ۱۵۹ - ۱۵۸ - ۱۵۷ - ۱۵۶ - ۱۵۵
۱۶۸ - ۱۶۷ - ۱۶۴ - ۱۶۳ - ۱۶۲ - ۱۶۱
۱۷۷ - ۱۷۶ - ۱۷۵ - ۱۷۴ - ۱۶۹
۱۸۶ - ۱۸۵ - ۱۸۴ - ۱۸۳ - ۱۸۱
- ۱۹۴ - ۱۹۲ - ۱۹۰ - ۱۸۹ - ۱۸۸
- ۳۰۱ - ۲۴۴ - ۲۴۱ - ۲۰۰
- ۳۴۲ - ۳۳۵ - ۳۲۰

ترکانی : - ۱۷۳

ترکی : - ۶۸ - ۳۵ - ۱۵ - ۱۰ - ۹ - ۸ - ۱۰۷
- ۱۴۷ - ۱۳۹ - ۱۳۶ - ۹۳ - ۹۲
- ۱۹۰ - ۱۸۳ - ۱۷۱ - ۱۶۰ - ۱۵۷
- ۲۱۶ - ۲۱۴ - ۲۱۱ - ۲۰۴ - ۱۹۸ - ۱۹۱
- ۲۷۷ - ۲۷۲ - ۲۷۱ - ۲۷۰ - ۲۶۵
۳۹۸ - ۳۳۷ - ۳۲۰ - ۲۹۳ - ۲۹۲
- ۴۱۸ - ۴۰۶ - ۴۰۵ - ۴۰۴ - ۴۰۳

ترمذ : ۱۳۶ - ۱۳۵ - ۱۳۴ - ۱۳۳ - ۱۳۲
۱۷۳ - ۱۴۲ - ۱۴۱ - ۱۳۹ - ۱۳۸ - ۱۳۷
۴۱۲ - ۳۰۱ - ۱۹۲ - ۱۸۵ - ۱۸۴

ترنگ زئی (گکوں) : - ۳۹۰

تفلس = ۲۶۸ - ۲۶۷ - ۲۶۶ - ۲۶۵ - ۲۵۹
۲۷۸ - ۲۷۷ - ۲۷۰ - ۲۶۹

تقویم الحق : - ۴۲۷

تلوار، بھگت رام : - ۴۲ - ۲۳ - ۲۲

تلوارز آف دی پٹھان لینڈ اینڈ سبھاس چندر راز

گریٹ سیکیپ (کتاب) : - ۴۲

تمباکوف : ۳۰۳ - ۳۰۱ - ۳۰۰ - ۲۹۷ - ۲۹۶
- ۳۲۵ - ۳۲۳ - ۳۲۲ - ۳۲۱ - ۳۲۰
- ۳۳۱ - ۳۲۹ - ۳۲۸ - ۳۲۷ - ۳۲۶
۳۳۲

تنظیم اتحاد و ترقی : - ۴۱۸

تنگی خشک : ۳۸۷ - ۳۹۰

توپخانہ میدان : ۳۵۸ - ۳۳۰ - ۳۲۰ - ۳۰۶ - ۳۰۵

تورخم (دیکھیے طورخم) -

تہران (دیکھیے طہران) -

تھرڈ انٹرنیشنل : -۲۴۳

تہکال : -۱۹۰-۹۳-۶۶

تیراہ : ۲۹۹-۳۹۸-۳۸۵-۳۸۴-۱۰-۷۱-

تیمرگرہ : -۵۹

تیمور لنگ : -۴۰۹

تیمور سکایا ایستہ : ۲۲۹

تیونس : -۷

: ٹ :

ٹریور : -۴۰۰

ٹکر : -۲۲

ٹل : -۳۹۸-۱۲

ٹوپچی : -۴۰۰

ٹوکیو سکول آف فارن لینگویجز : -۴۰۶

ٹونک : ۳۹۶-۳۹۷

ٹیکسلا : ۴۱۱-۶۰

: ج :

جاپان - ۴۰۵ - ۴۰۳ - ۲۳۳ - ۲۷ - ۹-

-۴۰۶

جارجین : ۴۱۸

جانسن، کرنل : -۲۷

جان، علی احمد : -۴۰۹ -۴۰۸ - ۱۲

جان محمد، حاجی : -۱۴

جان، مقصود : -۱۷

جان، یعقوب (جان زاکوف) : -۴۱۸

جبل الارادات : -۲۱۳

جبل السراج : ۷۹-۷۸-۷۲-۳۵-۳۴-۱۵

۸۹-۸۶-۸۴-۸۳-۸۲-۸۱-۸۰

۱۲۸-۱۱۴-۱۱۲-۱۱۱-۹۹-۹۶-۹۵-۹۰

-۴۰۹-۱۴۳-۱۳۸-۱۳۴

جبئی : -۱۲۸

جدیدی : -۴۱۴-۴۱۳-۱۹۶-۱۹۴

جرمن : -۴۰۷-۴۰۶-۷۳-۲۷-۱۰-۸

-۴۲۱-۴۱۸-۴۰۸

جرمن ترک مشن : -۴۰۶-۴۰۵-۳۹۹-۹

جرمنی : -۲۱۹-۱۹۹-۱۹۸-۷۶-۷۴

-۴۰۷-۴۰۲

جرمنی میں چوالیس مہینے (رسالہ) : -۴۰۸

: چ :

چارجوئے : -۱۸۵-۱۸۳-۱۷۱-۱۶۹-۱۶۸-۱۶۱

۱۹۳-۱۹۲-۱۸۹-۱۸۸-۱۸۷-۱۸۶

۲۱۴-۲۷۵-۴۱۲-

چارسدہ: ۱۶-۲۰-۳۹-۴۹-۵۰-۲۰۰-

۳۹۰-۳۹۱-۴۱۴-

چارلس II: ۴۲۵-

چاریکار: ۷۹-

چترال: ۱۱۰-۲۸۱

چترال (دریا): ۶۲-۴۱۰

چترال (وادی): ۶۲-

چترالی: ۱۲۴-۱۲۵-۱۲۷-۱۲۸-۲۲۰

چٹو پادیہ: ۱۹۸-۱۹۹

چرچل، ونسٹن: ۲۷-

چکنور، ملا صاحب: ۳۹۶

چمرقند (دیکھیے چمرکنڈ)

چمرکنڈ-۳۵-۶۰-۶۱-۶۲-۶۵-۷۳-

۹۲-۹۳-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۹

۴۲۶-

چناب (دریا): ۴۲۶-

چنگیز: ۱۲۲-۱۲۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶

چہار باغ: ۴۲۶-

چہل دختر: ۳۳۵-

چیکوسلاویہ: ۴۱۶-

چیمپین، بریگیڈیر جنرل: ۴۲۱

چیمسفورڈ ہاسٹل: ۴۸-

چین: ۲۷-۶۸-۱۹۹-۲۱۶-۲۲۹-

۴۰۳-۴۱۱-

: ح :

حاجی محمد ماسٹر: ۴۶-

حافظ: ۳۱۸-۳۳۱-

حبشی: ۱۰۴-

حبیب، سید: ۴۶-

حجاز: ۴۰۴-

حسن: ۲۸۴-

حسن، محمد: ۳۹۹-۳۹۸

حسین: ۳۴۸-۲۸۴

حسین، رضا: ۴۰۵-

حسین، تفضل: ۴۰۵-

حسین، توکل: ۴۰۴-

حسین، تونگر: ۴۰۵-

حسین، صنوبر: ۱۸-

حصار: ۴۱۲-

حقیقت (اخبار): ۳۰۸-

حلیم، مُلا: ۳۹۹-

حمیدگل، فخر قوم میاں صاحب: ۳۸۵-۲۲-۴۲۸-۴۲۷-۳۸۶

حیدرآباد: ۳۹۷-

حیدر رضا، سید: ۶-

حیدر زمان، راجہ: ۲۵-

: خ :

خان، ابراہیم: ۳۶۸-

خان، اجون: ۳۸-

خان، ارباب عبدالغفور: ۲۸-

خان، افضل: ۳۹۳-

خان، امیر: ۳۹۶-

خان، امیر امان اللہ: ۳۵-۱۶-۱۳-۱۲-۹-۱۹۹-۱۹۴-۱۳۸-۱۲۸-۹۴-۶۶-۴۰۶-۳۹۹-۳۹۸-۳۹۵-۳۹۴-۴۱۵-۴۰۸

خان، امیر حبیب اللہ: ۱۹۹-۸۱-۷۳-۱۲-۹-۴۵۸-۴۵۷-۴۵۵-۳۹۸-۳۹۴

خان، امیر دوست محمد: ۴۰۰-۳۹۳-۳۸۹

خان، امیر مختار: ۱۶

خان، امین اللہ: ۴۰۰-۹۴-۸۰

خان، بہرام: ۱۶-

خان، تاج محمد: ۴۳-۱۶-

خان، تقی: ۲۸۸-

خان، تمین جان: ۲۹-

خان، جار: ۵۸-

خان، حاجی شاہنواز: ۲۰-

خان، حکیم اجمل: ۷۴-

خان، راجہ عبدالرحمٰن: ۲۹-

خان، رضا - ۳۰۲-۲۸۹-۲۸۸-۲۸۷

۳۱۵-۳۱۳-۳۱۲-۳۵۵-۳۰۴-۳۰۳

۴۲۰-۳۲۷-۳۲۶-۳۱۶

خان، ریدی: ۳۶۸-

خان، سردار اورنگزیب: ۴۳-۲۹-

خان، سردار محمد اکبر: ۳۸۹-

خان، سر سعد اللہ: ۲۷-۲۵-

خان، سرفراز: ۹۲-۶۲-۶۱-۴۹-۲۰

۱۲۸-۱۱۵-۱۰۸

خان، سرور: ۸۱-

خان، سعید: ۸۴-

خان، سلطان محمد: ۱۹۶-۶۲-۶۰-۴۹-۴۶

۲۲۸-۲۴۶-۲۴۵-۲۴۳-۲۴۲

۳۷۷-۲۶۶-۲۵۵-۲۵۲

خان، سلطان محمد علی: ۳۱۵-۳۱۴-۳۱۳

خان، شیر علی: ۳۹۴-۳۹۳

خان صاحب، ڈاکٹر ۲۵-۲۷-۲۹-۳۱-۳۹-۴۶-
خان، طاؤس : ۵۲-۵۳-۵۴-۵۵
خان، عباد : ۴۱-۴۲
خان، عباس علی : ۱۶-۲۶-۴۲۰
خان، عبدالرحیم : ۹۳-
خان، عبدالروف : ۳۸-
خان، عبدالغفار : ۱۱-۱۶-۱۷-۱۸-۲۰-
۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۸-۳۰-۳۲
۳۴-۳۸-۳۹-۴۹-۵۰-۵۷-۴۱۵
خان، عبدالکریم : ۷۶-
خان، عبداللہ : ۴۰۰-
خان، عبدالہادی : ۱۹۶-۲۰۱
خان، عبیداللہ : ۳۹-
خان، علی گل : ۱۴-۲۰
خان، غلام محمد بوندخوڑ : ۳۸-
خان، غلام نبی (بریگیڈیر) : ۶۶-۶۷
خان، فقیر محمد : ۷۶-
خان، فیض محمد : ۱-
خان، قیوم : ۴۳
خان، گوہر رحمان : ۴۶-۴۹-۵۳-۶۱-۶۲
۹۲-۹۳-۱۳۴-۱۷۷-۱۹۶-۲۵۰-
۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱
۲۷۳-۲۷۸-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-
۲۸۳-۲۸۵-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵
۲۹۶-۲۹۹-۳۰۱-۳۰۵-۳۰۶-۳۱۲
۳۲۰-۳۲۱-۳۲۳-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳
۳۴۲-۳۷۷-
خان، لالہ پیٹرا : ۲۰-
خان، محمد اکبر : ۴۸-۴۹-۵۰-۵۵-۶۰-۶۱
۶۲-۶۵-۸۷-۹۶-۱۰۲-۱۲۳-۱۲۸
۱۳۲-۱۳۶-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۸-۱۷۴-
۱۷۷-۱۸۱-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۶-۲۱۰-
۲۱۲-۳۴۲-۴۰۰-۴۰۱-
خان، محمد علی : ۲۸۸-
خان، محمد یوسف زئی : ۹۳-
خان، مراد علی : ۴۲۰-
خان، موسیٰ : ۴۰۰-
خان، مولانا ظفر علی : ۲۱-۲۳
خان، میر گل : ۳۷۳-
خان، نادر ۱۲-۶۵-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹
خان، نصر اللہ : ۳۹۸-۴۰۲

خان، نواب اسمٰعیل : ۳۰۰-

خان، نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم : ۴-۲۴-۱۵
۲۵-۲۷-۳۸۹-

خان، وارث : ۴۰-

خان، ولی محمد طوفان : ۲۸-

خان، یعقوب : ۳۹۴-

خادم، محمد اکبر : ۱۶

خارکوف : ۲۵۷-

خاک جبار : ۷۰-

خالصہ دربار : ۳-

خاندان عباسیہ : ۳۲۳-

خانم، رشیدہ : ۲۱۸-۲۱۷

خانہ آباد : ۱۲۸-۱۲۳-۱۲۲-۱۱۰-۱۰۹
۱۲۹-۲۱۶

خاکروب پاس : ۴۰۹-

خٹک : ۲۹۵-۱۲۶-۱۲۵-۵۸-۵۳
۴۲۳-۴-۳۷

خدائی خدمتگار تحریک : ۲۵-۲۳-۲۲-۱۷
۴۱۵-۴۳-۳۳-۳۲-۲۸
۴۲۸-

خراسان : ۴۲۴-۴۱۱-۴۱۰-۳۰۵

خلافت عثمانیہ : ۷-

خلیج فارس : ۳۵۶-۳۴۵-۳۴۰-۳۱۷
۴۲۳-۳۶۲

خلیق الزمان : ۴۰۵-

خمینی (بندرگاہ) : ۴۱۹-

خواجہ اوغلی، عثمان : ۴۱۸-

خواجہ خیران : ۴۱۰-

خوالنگ : ۴۱۹-

خوش باش، عبدالعزیز : ۱۸-

خوندامیر : ۴۱۰-

خونکار : ۴۲۲-

خیابان خان خانان : ۳۳۰-

خیابان لالہ زار : ۳۱۹-۳۱۷-۳۰۹-۳۰۶
۳۵۸-۳۳۰

خیبر : ۳۸۹-۲۶۴-۸۰-۶۶

خیبر آباد : ۴۱۰-۳۸۵-۵

: د :

دارالعلوم اسلامیہ : ۳۸۹-

داس، بنرجن : ۴۰۸-

داغستان : ۲۱۷-

دت : ۱۹-

درویش (گاؤں): ۲۹۴-۴۰۶

درّہ خیبر: ۴۰۰-۳۹۹-۶۸

زرداب: ۲۶۶-

دوراہ (درّہ) و ۴۰۰-

دوسری انٹرنیشنل: ۴۱۷-

دوشنبہ: ۴۱۳-

دولت رام، جے رام داس: ۴۰-

دوواز = ۴۱۲

دہلی: ۳۸۱-۳۷۴-۱۵۴-۶۹-۶
۴۰۷-۳۹۶

دیپنیر: ۴۱۲-

دیوبند: ۳۸۰-۱۶

دیو، شنکر داؤ: ۴۰-

دیولی کیمپ: ۴۳-۴۲-

: ڈ :

ڈانڈی: ۱۹-

ڈائر، جنرل: ۴۰۳-۴۵-۳۳-۱۱

ڈنگر زئی: ۸۴-

ڈیرہ اسمٰعیل خان: ۳۹۲-۳

ڈیرہ دون: ۳۹۸-۳۹۷

ڈیرہ غازی خان: ۷۳-

ڈیسائی، بھولا بھائی: ۴۰-

ڈیفنس آف انڈیا رولز: ۴۷-

ڈیلکس ہوٹل: ۲۴۳-۲۳۴-۲۲۹-۲۲۸
۲۶۱-

ڈیلی نیوز (اخبار): ۱۰-

ڈینیز ہوٹل: ۴۲-

ڈینیو: ۴۱۲-

ڈیورنڈ لائن: ۴۰۸-۳۹۶-۳۹۴-۱۲-۱۱
۴۰۹-

: ذ :

ذکریا، سلیمان: ۲۸۰-۲۶۷-۲۶۶

: ر :

رابرٹ، جنرل: ۳۹۴-

راجپوتانہ: ۴۲-

راجگال: ۳۹۹-۱۰

راجندرا، پرشاد بابو ۴۰-

رالف گرفتھ، سر: ۲۵-

رام، آیا: ۱۱-

رام، بھگت: ۴۱-۴۰

رام چند، پنڈت: ۶-۵

رام، سنت: ۲۳-

رام، کیشو: ۱۰-

راولپنڈی : ۴۰۸ - ۳۸۴ - ۸۶ - ۱۱
راوی (دریا) : ۴۲۶ - ۳۸۲ - ۱۸
رائے، ایم این : ۱۹۷ - ۱۹۰ - ۷۶ - ۷۴
۲۱۳ - ۲۰۱ - ۲۰۰ - ۱۹۹ - ۱۹۸
۲۳۴ - ۲۳۲ - ۲۲۹ - ۲۲۱ - ۲۲۰
۲۴۴ - ۲۴۳ - ۲۳۹ - ۲۳۵
۲۸۰ - ۲۶۶ - ۲۵۰ - ۲۴۵
رائے بریلی : ۳۹۶
رجڑ : ۳۹۰
رحیم بخش، مولانا : ۳۹۸
رستم : ۳۹۱
رسول، حامد : ۴۰۵
دشت : ۳۰۵ - ۲۹۰ - ۲۸۷ - ۲۸۶
۴۲۲ - ۴۱۹ - ۳۰۷
رضا، محمد : ۲۷۸ - ۲۷۶ - ۲۷۵
رضائیہ : ۴۱۶
رفیق : ۴۶
رگ وید : ۴۲۳ - ۴۱۱ - ۱۳۱
رنگون : ۲۷
روزنامچہ (کتاب) : ۴۲۸
روزنبرگ : ۲۱۳
روزویلٹ : ۲۷
روس (دیکھیے سوویت روس)
روس کیپل، سرجارج : ۳۸۹ - ۱۱
روسی (اشخاص) : ۱۲۹ - ۷۷ - ۷۶ - ۴۷
۱۴۶ - ۱۴۳ - ۱۴۱ - ۱۳۸ - ۱۳۷ - ۱۳۵
۱۹۹ - ۱۹۱ - ۱۸۳ - ۱۷۴ - ۱۷۰ - ۱۴۹
۲۲۳ - ۲۲۱ - ۲۱۱ - ۲۰۵ - ۲۰۴ - ۲۰۲
۲۶۰ - ۲۴۸ - ۲۳۰ - ۲۲۹ - ۲۲۶
۳۰۴ - ۳۰۳ - ۲۹۱ - ۲۸۲ - ۲۸۰
۳۵۹ - ۳۵۷ - ۳۲۸ - ۳۲۷ - ۳۲۳
۴۲۲ - ۴۲۱ - ۴۱۸ - ۴۱۴
رولٹ، جسٹس : ۱۰
رولٹ ایکٹ : ۴۰۳ - ۴۰۲ - ۳۳ - ۱۶ - ۱۱
روم : ۲۷۱ - ۲۱۵ - ۹۴
رومانیہ : ۴۱۶
ریا، عبدالرحمٰن : ۲۰ - ۱۸
ریحانہ : ۴۶
ریڈسکوائر : ۲۳۲
ریفکم : ۲۰۰ - ۱۹۸ - ۷۴

: ز :

زار روس : ۲۰۴ - ۱۹۳ - ۱۸۱ - ۱۳۷ - ۱۳۰

۳۲۹-۳۵۵-

زبیدہ : ۴۲۴-

زلیخا : ۲۸۰-

زیارت کاکا صاحب (گاؤں) : ۲۲-۳۳-۳۷

۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۴۲۶-۴۲۷

زینوی لیف : ۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵

: ژ :

ژوب : ۳۹۴-

: س :

ساسانی : ۴۰۰-

سالونیکا : ۷-

سانڈرس : ۱۹-

سان فرانسسکو : ۴۰۶-۴۰۷-

ساؤتھ پرشین رائفلز : ۳۰۴-۳۲۸-۳۲۹

۴۲۱-

سائبریا : ۱۳۰-۲۲۷

سائمس، سر پیرسی : ۴۲۱-

ستارہ ایران (اخبار) : ۳۰۸-

ست پال : ۴۰۳-

سٹاف کالج کوئٹہ : ۴۰۱-

سٹرینگلنگ آف پرشیا (کتاب) : ۳۰۲-

سخی سرور : ۱۰۰-۱۱۳-۱۲۹-۱۳۰-

سرائے عبدالرشید : ۱۹۶-

سرائے نظام بیگ : ۱۱۴-۱۴۷-۱۵۳-۱۵۹

۲۴۱-

سرحدی گاندھی (دیکھیے خان عبدالغفار)

سرخ آب (دریا) : ۴۱۰-

سرخ پل : ۷۰-

سرخ پوش (دیکھیے خدائی خدمتگار)

سرخ فوج : ۴۱۳-

سرکانئی : ۶۲-۱۰۴

سرکانئی ملک : ۳۹۶-

سرور شاہ، سید : ۴۸-

سرو داستی (دریائے سوات) : ۴۱۱-

سرویا : ۷-

سعدی : ۳۵۸-

سفرنامہ روسی ترکستان (کتاب) : ۱-۴۱۵

سفید پوش : ۲۶۹-

سفید دستے ۴۲۱

سفید سن : ۴۰۰-

سکندر اعظم : ۵۹-۴۰۹

سکھ : ۳-۴-۶-۲۹-۶۰-۶۱-۷۳-۲۵۰

۳۸۹-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۷-۴۰۳

سکھدیو : ۱۹-

سلجوق، سلطان سنجر : ۴۱۰-

سلطان : ۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱

سلطان محمد، بابو : ۳۶-۴۹-۵۰-۳۷۸-۳۸۲

۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۹-۳۹۰

سلیم : ۲۳۵-۲۳۷-۲۳۸-۲۴۰-۲۴۲

۲۴۶-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۵-۲۹۶

سمتے : ۶۱-

سمرقند : ۴۵-۱۹۷-۲۱۳

سندھ دریائے سندھ : ۵۹-۴۰۹-۴۱۰

۴۱۱-

سندھ : ۳۰-۳۱-۳۵-۳۹۷

سنسکرت : ۱۳۱-۱۳۲-۴۲۳

سنگھ، بھگت : ۱۹-

سنگھ، رنجیت : ۴-۳۸۹-۳۹۲

سنگھ، سرگوبند بخش : ۴۰۸

سنگھ، شیر : ۳۹۷-

سنگھ، ہری : ۳-۳۸۹-۳۹۲

سوات (دریا) : ۴۱۰-۴۱۱

سوویت ازبکستان : ۴۱۴-

سوویت ایشیا : ۲۱۶

سوویت ترکستان : ۱۰-۱۹۲-۲۱۳-۴۵۳-

۴۰۵-

سوویت روس : ۱-۱۵-۱۷-۲۴-۳۶-

۳۷-۴۱-۷۳-۷۶-۸۶-۱۳۰

۱۳۲-۱۳۳-۱۳۷-۱۴۱-۱۴۷-۱۵۸

۱۷۳-۱۷۵-۱۸۵-۱۹۰-۱۹۸-۱۹۹-

۲۰۰-۲۰۲-۲۰۷-۲۰۹-۲۱۴-۲۱۶

۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۲-۲۲۵-۲۲۶

۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۲-

۲۳۳-۲۴۲-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۳

۲۵۴-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۱-

۲۶۲-۲۶۴-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۵

۲۷۶-۲۷۷-۲۸۴-۲۸۷-۲۹۵-

۳۰۰-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۲۵-

۳۴۳-۳۴۴-۳۴۷-۳۵۵-۳۵۷-

۳۷۶-۳۹۴-۴۰۳-۴۰۶-۴۱۲-۴۱۴

۴۱۵-۴۱۸-

سوویت وسطی ایشیا : ۴۱۴

سوئزرلینڈ : ۴۰۲-۴۰۷-

سوئم جنگ افغانستان : ۱۱-

سویڈن : ۴۱۶-

سیالکوٹ: ۲۰۰-۷۳

سیاہ گرد: ۱۳۲-۱۳۱

سیٹھی، غلام ربانی ۲۰۰-

سیستان: ۲۶۶-۲۳۲-۷۴

سینٹ پیٹرزبرگ ← ۳۱۳-۳۹۷

سینٹ صوفیہ: ۴۱۲-

سی پی : ۳۰-

: ش :

شامران : ۳۰۲-

شاہ، احمد : ۳۱۲-۳۰۹

شاہ، آغا سکندر: ۱۱۶-۱۱۳-۱۰۱-۹۹
۱۳۱-۱۲۸-۱۲۶-۱۱۷

شاہ پور: ۴۶-

شاہ، پور، دوئم : ۴۲۲-

شاہ، جعفر: ۴۳-

شاہ جہان پور : ۲۱۳-

شاہ، رضا : ۴۲۱-۴۱۹

شاہ، سرشمس : ۴۰۸-

شاہ، طہماسپ (اول): ۴۲۲-

شاہ عباس کا چہل ستون : ۴۲۴-

شاہ، عبدالعظیم : ۳۲۱-

شاہ، فارس: ۳۹۳-

شاہ، ولایت: ۱۵۹-۱۵۷-۱۵۵-۱۵۴
۱۶۵-۱۶۹-۱۷۰-

شربت خیل: ۳۷۴-۳۷۳

شبقدر: ۳۹۶-۲۳

شجاع، شاہ : ۴۰۰-۳۹۳

شسٹر: ۳۰۴-

شفیق، محمد: ۳۳۲-۷۶-۷۵-۷۴

شمال مغربی سرحدی صوبہ: ۹-۸-۶-۵-۴
۲۸-۲۷-۲۶-۲۵-۲۲-۱۱-۱۰
۳۸-۳۷-۳۴-۳۲-۳۱-۳۰
۳۸۰-۳۷۷-۶۵-۴۶-۴۳
۴۲۵-۴۰۳-۳۹۹-۳۹۷-۳۸۹

شمالی ایران: ۳۱۳-۳۱۰-۳۰۴-۲۸۷

شمالی خراسان : ۴۱۲-

شمران : ۳۲۱-

شمس الدین، میاں : ۴۲۷-

شملہ : ۳۰-۲۹

شوکت علی، مولانا : ۸-

شولبین : ۲۰۹-

شہاب الدین، حاجی : ۴۴-۱۳۸-۱۳۶-۸۳
۱۸۹-۱۴۸

شہباز گڑھی : ۵۹-

شہر پور : ۴۰۰-

شاہراہ ریشم : ۶۸-

شاہراہ قراقرم (دیکھیے شاہراہ ریشم)

شیدائی، اقبال : ۲۰۱-۲۰۰

شیخ محمد : ۳۴۷-۳۴۵-۳۴۴-۳۴۳
۳۵۴-۳۵۵-

شیخ محمدی (گاؤں) : ۳۴۳-۳۴۲

شیخوپورہ : ۱۳۶-۴۶

شیراز : ۳۲۸-۳۲۱-۳۲۰-۳۱۴-۳۰۱
۳۲۳-۳۲۲-۳۲۱-۳۳۰-۳۲۹
۳۴۹-۳۴۲-۳۳۶-۳۳۵-۳۳۴
۴۲۳-۴۲۱-۳۷۶-۳۵۸-۳۵۰

شیرازی، اسمٰعیل : ۴۰۵-

شیر پاؤ : ۳۹۰-

شیعہ : ۳۴۸-۲۱۹-۱۴۳

شینواری : ۱۱۶-۱۱۵-۱۱۴-۱۱۳-۶۷
۳۳۵-۲۴۱-۱۱۹-۱۱۸-۱۱۷

: ص :

صادق، محمد : ۱۰۳-۱۰۱-۹۵-۹۲-۹۱
۱۰۶-۱۰۵-۱۰۴

صدر الدین، ملا : ۴۱۸-

صدر گڑھی : ۵۱-

صدیقی، عبدالرحمان : ۴۰۴-

صغیر، مصطفیٰ : ۲۱۵-

صفوی، شاہ عباس : ۴۲۴-

صوابی : ۹۳-۵

صوبہ جات متحدہ : ۷۵-

صوفی صاحب : ۳۴۴-۳۳۲-۳۱۴

: ط :

طرابلس : ۴۱۸-۷

طورخم : ۴۰۰-۶۸

طورو : ۴۰-۲۶

طہران : ۲۸۲-۲۸۰-۲۷۴-۲۶۰
۲۸۹-۲۸۸-۲۸۷-۲۸۵-۲۸۳
۳۰۱-۳۰۰-۲۹۷-۲۹۶-۲۹۱-۲۹۰
۳۰۷-۳۰۶-۳۰۵-۳۰۴-۳۰۳-۳۰۲
۳۱۴-۳۱۳-۳۱۲-۳۱۱-۳۰۹-۳۰۸
۳۲۱-۳۲۰-۳۱۹-۳۱۸-۳۱۶-۳۱۵
۳۲۹-۳۲۸-۳۲۵-۳۲۴-۳۲۲-

۳۲۹-۳۴۳-۳۳۲-۳۳۱-۳۳۰
۴۲۲-۴۲۰-۴۱۹-۳۶۸-۳۵۸

ظ

ظفر، بہادر شاہ : ۴۲۷-

ع

عالم جان، امیر: ۴۱۴-۴۱۳
عبدالباری فرنگی محل، مولانا: ۸-
عبدالجلیل، حکیم : ۱۱-
عبدالحمید، سردار: ۳۷۷-
عبدالحمید، سلطان : ۴۱۸-۷
عبدالحق : ۴۱۵-۴۰۴
عبدالحکیم، قاضی : ۲۷-
عبدالحئی، مولانا : ۳۹۷-
عبدالرب، مولانا : ۱۹۷-۷۷-۷۶-۷۵
۲۲۱-۲۰۲-۱۹۹-۱۹۸
عبدالرحمان : ۱۸۲-۱۷۴-۱۵۹-۱۵۸
عبدالرحمٰن، امیر: ۳۹۴-۱۲-۱۱
عبدالرحمٰن، پشاوری: ۴۰۴-
عبدالرحیم پوپلزئی، مولانا: ۲۸-۱۸
عبدالرحیم، مولانا :- ۸۴-۸۳-۴۸-۲۰
۳۹۸-۳۸۴-۲۰۵-۱۹۰
عبدالرشید : ۱۹۶-
عبدالرؤوف، مولانا: ۳۸۵-
عبدالعزیز، خان بہادر: ۳۷۶-۳۷۴-۳۷۳
۴۲۵-
عبدالعزیز، شاہ : ۳۹۶-
عبدالعزیز، شیخ : ۴۲۶-۳۸۷-۴۶
عبدالعزیز، میاں : ۴۰۲-۶
عبدالغفار، حاجی : ۱۶-
عبدالغنی، ڈاکٹر: ۴۰۸-
عبدالقیوم : ۲۴۰-۲۳۹
عبدالکریم : ۲۲۳-۲۲۲-۲۱۹-۶۲
۳۲۵-۳۲۱-۳۲۰-۳۱۲-۳۰۱
۳۳۲-۳۳۱-۳۳۰-۳۲۹-۳۲۶
۳۵۹-۳۳۳
عبدالمجید : ۳۸۵-۳۸۴-۳۸۳
عبداللہ : ۹۳-
عبداللہ شاہ، میاں : ۲۴-۱۶-۱۱
عبدالولی، قاضی : ۷۳-۷۲-۷۱-۶۶-۱۱-۶
۴۰۲-۴۰۱-۷۸
عبیداللہ سندھی، مولانا: ۴۰۴-۷۴-۷۳-۷۲
۴۰۹-

عثمانی، شوکت : ۳۴۱ - ۳۴۲ - ۳۴۵

عثمانیہ : ۱۳ -

عرب : ۱۰۴ - ۲۱۶ - ۲۶۴ - ۳۵۹ -
۳۶۱ - ۴۰۳ - ۴۱۷ - ۴۱۹ -

عربی (زبان) : ۲۲۳ - ۳۶۴

عزیز گل، مولانا : ۴۲۷ -

عزیز : ۳۳۱ -

عشق آباد : ۱۹۲ - ۲۱۳ - ۲۶۶ - ۲۷۹

عطاء اللہ، قاضی : ۱۶ - ۲۶

عطاء الدین، میاں : ۴۲۷ -

علی : ۱۲۹ - ۳۱۰ - ۳۴۰ - ۳۴۸ -
۴۱۰ -

علیا حضرت : ۴۰۸ -

علی چراغ : ۴۰۵ -

علی رضا امام : ۴۲۴

علی شنگ (دریا) : ۴۱۰ -

علی، فداء ۱۴۳ - ۱۴۶ - ۲۰۲

علی، مقصود : ۲۱۳ -

علینگار (دریا) : ۴۱۰ -

عمر : ۳۴۰ -

عمرزئی : ۵۰ - ۲۰۰ - ۳۹۰ - ۴۱۴ -

عنوان الدین، میاں : ۴۲۷ -

عیسائی : ۱۳۳ - ۲۰۲ - ۲۳۲ - ۲۶۳ - ۳۲۵ -
۳۶۱ - ۴۰۴ -

: غ :

غازی ایکٹ : ۵ -

غدر (۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی) : ۶۳ -

غدر (اخبار) : ۶ - ۴۰۷

غدر (پارٹی) : ۶ - ۴۰۶ - ۴۰۷

غُز : ۴۱۱ -

غزنی : ۲۶۶ - ۳۹۷ -

غلہ ڈھیر : ۱۹ - ۲۶ - ۳۹ - ۴۰ - ۴۶

غور : ۱۲۰ -

غوری، محمد شہاب الدین : ۱۲۰ -

: ف :

فارسی : ۸۰ - ۱۰۴ - ۱۱۲ - ۱۱۳ - ۱۳۱ - ۱۳۴
۱۳۵ - ۱۳۸ - ۱۴۷ - ۱۵۱ - ۱۵۷ - ۱۶۲
۱۷۱ - ۱۷۲ - ۱۷۷ - ۲۲۳ - ۲۶۵ - ۲۹۲
۳۲۷ - ۳۲۸ - ۳۳۹ - ۳۴۷ - ۳۵۵ -
۳۶۰ - ۳۶۲ - ۳۶۴ - ۳۹۹ - ۴۱۷ - ۴۲۴ -

فارورڈ بلاک (انڈین نیشنل کانگرس) : ۲۶ - ۳۸

فاطمہ : ۴۲۴ -

فتح : ۳۱۰-

فتح آباد : ۴۰۱- ۷۰- ۶۹-

فخر عالم، مولوی: ۱۲۶-۱۱۶-۱۱۴-۱۱۳-۱۱۲
۱۶۹-۱۶۵-۱۵۹-۱۵۴-۱۲۷

فرانس: ۲۸۸-۲۳۳-۲۲۳-۲۲۰-۷
۴۰۷-۳۹۸-۳۸۴-۳۰۷

فرنگی (دیکھئے انگریز)

فریزر: ۴۶-

فضل الٰہی : ۱۸-

فضل الٰہی لاہوری، ملک: ۹۸-

فضل حق، مولانا: ۴۱۵-۲۰۰-۱۹۸

فضل واحد، حاجی صاحب ترنگ زئی: ۳۴-۱۶
۵۹-۵۸-۵۷-۵۶-۵۴-۵۰
۶۰-۶۲-۳۸۹-۳۹۱-۳۹۶

فقیر چند، بخشی: ۱۹-

فونٹینک، ڈبلیو اوون: ۴۰۵-۱۹۹-۷۳

فیروز: ۲۴۶-۲۴۵-۲۴۳-۱۳۶
۲۶۶-۲۵۵-۲۵۲-۲۴۹-۲۴۸
۲۸۱-۲۸۰-۲۷۹-۲۷۸

فیض اللہ، خواجہ (خوجہ سوف): ۴۱۳

فیضی، ڈاکٹر: ۴۰۲-

: ق :

قاجار، محمد علی: ۲۸۸-

قادیانی: ۴۲۵-

قدم: ۴۰۰-

قرغز: ۲۳۲:

قریشی، شعیب: ۴۰۵-

قریشی، محمد اکبر: ۳۸۳-۹۲-۸۲

قزاق: ۳۳۲

قزوین: ۳۰۰-۲۹۹-۲۹۸-۲۹۷-۲۸۹
۴۲۲-۳۶۸-۳۱۴-۳۰۷

قسطنطنیہ: ۴۱۸-۴۰۵-۹

قصہ خوانی بازار: ۲۱-

قطب عالم، حکیم: ۱۴-

قفقاز: ۲۱۸-۲۱۷-۲۱۵-۹۲-۸۶-۴۵
۲۶۲-۲۵۹-۲۳۲-۲۳۰-۲۲۲
۳۰۰-۲۷۵-۲۶۹-۲۶۸-۲۶۷
۳۵۶-۳۰۱

قلعہ بالاحصار: ۳۹۴-۲۰-

قلعہ سرور خان: ۸۰-۷۹

قلعہ گوش: ۱۲-

قم:

قندہار : ۲۰۱-۲۶۶-۳۹۷
قنوجی، عبدالکریم : ۳۹۵-
قوانین جرائم سرحد : ۵ -
قیوم : ۲۴۱-۲۴۶-

ک :

کابل : ۹-۱۴-۱۵-۱۶-۴۱-۴۲-۴۵
۴۸-۵۱-۶۵-۶۶-۶۸-۶۹-
۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-
۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۳
۸۶-۹۶-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۹-
۱۲۰-۱۹۵-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱
۲۰۲-۲۱۶-۲۶۴-۲۶۶-۲۸۲
۳۳۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-
۳۹۷-۳۹۸-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۵
۴۰۶-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۵
کابل (دعیا) : ۵۶-۴۰۹-۴۱۱
کابلی تھانہ : ۲۰-
کازان : ۱۷۷-۲۲۸
کازرون : ۳۳۴-۳۳۶-۳۳۷
کاظم بے : ۹-۴۰۶-
کاکاخیل (قبیلہ) : ۴۲۷-
کاکوری سازش کیس : ۱۹-
کالوخان : ۵۴-
کالی کٹ : ۴۱۷-
کانگرس (دیکھیے آل انڈیا نیشنل کانگرس)
کائی شیک، چیانگ : ۲۷-۱۹۹-
کپ چاک پاس : ۴۰۹-
کتوزئی : ۵۱-
کچھوری : ۴۲-
کچلو، ڈاکٹر : ۴۰۳-
کراتگین : ۴۱۲-
کراچی : ۳۶-۳۳۷-۳۶۰-۳۶۵-
۳۶۶-۳۶۸-۳۷۰-۳۷۴-
کراسناوسک : ۲۱۳-
کربلائے معلیٰ : ۲۸۸-
کرپس، سرسٹیفورڈ : ۲۷-۲۸-۳۰
کرپلانی، اچاریہ : ۴۰-
کرزن، لارڈ : ۴-
کرسنکی : ۴۱۳-
کرکی : ۱۴۲-۱۴۳-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۸
۱۶۸-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۶

۱۷۷-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۳-۱۸۴-
۱۸۵-۱۸۷-۱۹۰-۱۹۲-۳۰۱-
۴۱۲-
کرمان : ۴۲۱-
کرومو (کرّم) : ۴۱۱-
کریسنٹ (اخبار) : ۴۰۲-
کریملین : ۲۲۸-۲۳۰-
کتیسر گل، سید (شیخ رحمکار کا صاحب) ۴۲۷-۴۲۶
کشک : ۲۶۶-
کشمیر : ۳۹۷-۱۰۰
کشن، ہری : ۱۹-
کفایت اللہ، مفتی : ۲۳-
کلکتہ : ۳۶۱-۴۱
کننگھم پارک : ۳۲۰-
کننگھم، سر چارلز : ۲۵-۲۷۰
کوچہ چہار باغ : ۳۲۵-
کوچی : ۲۹۴-
کوریا : ۲۱۶-۲۲۹
کوکی خیل : ۳۹۸-
کونڑ : ۶۲-۶۴-۶۸-۱۰۴
کونڑ (دریا) : ۶۳-۴۱۰
کونڑ (وادی) : ۶۳-
کوہاٹ : ۶۴-۷۶-۱۴۹-۲۲۱-۲۲۲-
۳۷۳-۳۷۴-
کوہ البرز : ۲۸۰-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۷-
۴۲۲-
کوہ پامیر : ۴۱۳-
کوہ پیر پنجال : ۴۲۶-
کوہ دامان : ۷۱-۷۸-۷۹-۸۰-۸۲
۱۰۷-
کوہ سفید : ۶۸-
کوہ قاف : ۹۱-۲۶۱-۲۶۸-۴۰۹-۴۱۵
کوہ ہمالیہ : ۴۲۶-
کوئٹہ : ۷۵-۲۰۱-۲۵۶-۲۶۶-۲۷۴
۲۷۶-۳۱۳-۳۳۲-۳۵۶-۳۹۴-
کھنہ، رائے بہادر مہر چند : ۲۵-
کیف : ۴۱۲-
کیلی فورنیا : ۹-۴۰۵-۴۰۷
کیمبرج : ۴۰۷-
کیمبل : ۴۰۰-
کیمبل پور : ۳۸۲-
کین، جنرل : ۳۹۳-

کین، ڈپٹی کمشنر: ۱۱-
کینٹن: ۱۹۹-
کینیڈا: ۲۰۲-
کیوگزی: ۳۹۴-

: گ :

گاندھی بھنبھور رام: ۲۶
گاندھی (موہن داس کرم چند): ۲۴-۲۳-۱۹
۴۲-۴۱-۴۰-۳۸-۲۸-۲۶
۴۱۵-۴۰۳
گجرات: ۴۲۵-۴۴-۲۳-۲۱
گڈے: ۳۸۶-
گدر: ۴۱۲-
گرانٹ، سر ہملٹن: ۴۰۸-۱۲
گرانڈ ہوٹل: ۳۱۹-
گرگاں: ۱۹۳-
گرو، راج: ۱۹۰
گریٹ سکیپ، دی (کتاب): ۴۱-
گڑھی حبیب اللہ: ۴۱۳-
گل بہار: ۱۱۴-۱۰۰-۹۷-۹۴-۷۹
گل، حمید: ۳۷-
گنداری: ۴۱۱-
گندھارا: ۴۱۱-
گوالیار: ۳۹۷-
گوپال، جے: ۵-
گورستان: ۲۶۹-۲۶۸-۲۱۸-۲۱۷
گورداسپور: ۹۱-
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵: ۳۲-
گورنمنٹ کالج لاہور: ۳۹۸-
گورمکھی: ۴۰۷-
گورے (دیکھیے انگریز)
گومتی (دریائے گومل): ۴۱۱-
گومل: ۴۰۰-
گھڑ والی فوج: ۲۱-
گھنڈی، اچرج رام: ۲۰-
گھوش، ڈاکٹر سی سی: ۱۱-
گیلان: ۲۸۸-۲۸۷-۲۸۶-۲۷۷
۴۲۲-۴۱۹

: ل :

لارنس، جارج: ۴-
لارنس، سرجان: ۳۹۳-
لال چند، بخشی: ۱۰-
لال، شنکر: ۲۳-

لالہ موسیٰ : ۳۸۳-
لاہور : ۳-۱۸-۳۶-۴۶-۶۶-۸۳
۱۷۹-۱۹۷-۲۳۶-۲۶۷-۲۸۰
۳۶۸-۳۷۱-۳۷۴-۳۷۶-۳۷۷
۳۷۸-۳۷۹-۳۸۳-۳۹۰-
۳۹۲-۳۹۸-۴۰۷-۴۲۶-
لاہور سازش کیس : ۱۹-
لتویا : ۳۲۱-
لطیف : - ۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰
۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-
لعل بادشاہ، سید : ۲۰-
لغمانی (باشندہ) : ۱۰۰-۱۱۰-۱۱۴-۱۲۰
لکڑئی : ۵۷-۵۹-۶۰
لکھنؤ : ۸-۱۳-۴۰۱
لندن : ۲۴-۲۹
لنڈہ (دریا) : ۴۱۰-
لنڈی کوتل : ۴۰۰-
لورالائی : ۳۹۴-
لوگر (دریا) : ۴۱۰-
لوندخوڑ : ۳۶۸-۳۶۹
لیاقت علی، ۳۰-

: م :

مارکس، کارل : ۴۱۷-
ماسکو : ۳۶-۴۵-۷۴-۷۶-۱۹۸-۲۱۸
۲۲۰-۲۲۱-۲۲۵-۲۲۷-۲۲۸-
۲۳۰-۲۳۱-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-
۲۳۸-۲۴۱-۲۴۴-۲۴۷-۲۴۸-
۲۵۲-۲۵۶-۲۵۷-۲۶۱-۲۶۴-
۲۶۶-۲۶۷-۲۶۹-۲۸۰-۲۸۷-
۳۰۱-۳۲۳-۴۱۸-
مازون صاحب : ۶۰-۸۵-
مارگریٹ : ۲۳۶-۲۴۲-۲۴۵-۲۴۸
۲۴۹-۲۵۷
مالاکنڈ : ۵۹-۳۳۵
مالابار : ۴۱۷-
مالٹا : ۴۰۴-
لیبر پارٹی : ۳۰-
لیتش : ۳۲۱-
لین پول، سٹین لے : ۴۰۶-
لینن : ۷۶-۲۴۳-۲۷۷-۴۱۸
لینن اکیڈیمی : ۲۰۸-۲۱۱-۲۲۲-
لینن گراڈ : ۴۱۶-

مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات : ۲۵-۴

مانٹیگرو : ۷-

مانشویکی (منشویکی) : ۱۹۳-۲۶۹-۲۸۹

ماؤنٹ بیٹن، لارڈ : ۳۱-

مٹکاف چارلس : ۱۱-

مجید، ایم اے : ۲۳۶-۹۸-۷۲-۴۶
۲۴۵-۲۴۳-۲۴۲-۲۳۹
۲۵۲-۲۵۱-۲۴۹-۲۴۸-۲۴۶
۲۷۹-۲۷۸-۲۶۶-۲۵۵
۲۸۰-۲۸۱-۳۷۷-

مجنی : ۴۱۰-

محبوبہ : ۲۲۲-۲۹۲

محمود : ۳۹۹-

محمد : ۷۱-

محمد اسلم سنجری، حکیم : ۱۱-

محمد امین، حکیم : ۸-۶

محمد بشیر، مولانا : ۳۹۸-

محمد رضا، ناظم : ۲۷۴-

محمد زئی : ۳۹۷

محمد، سلطان : ۶۱-

محمد شاہ، میاں : ۴۶-۴۱-۴۰

محمد شعیب، مولانا : ۲۷-

محمد عرفان، سید : ۳۹۶-

محمد علی، مولانا : ۶-

محمد، غلام : ۱۷۷-۱۷۸-۴۰۸-

محمود اللہ، ڈاکٹر : ۴۰۴-

محمود الحسن، مولانا : ۷۴-۳۹۱-۴۰۴

محمود طرزی، سردار : ۴۰۹-

محمود، منظور : ۴۰۴-

محنت کش (رسالہ) : ۷۲-۹۸

مدراس : ۳۰-۷۶

مدرسہ تعلیم القرآن : ۳۷۷-

مدرسہ مادورشاہ : ۴۲۴-

مدینہ : ۳۵۶-

مردان : ۱۹-۲۲-۳۹-۴۰-۵۰-۵۸
۳۹۱-

مرو : ۱۸۹-۱۹۲-۱۹۳-۲۱۳-۲۶۶

مروتوں : ۳-۳۹۲

مرہٹہ : ۳۱۳-

مزار شریف : ۹۵-۹۶-۱۰۶-۱۲۱-۱۲۳-
۱۲۴-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱
۱۳۷-۱۹۱-۲۰۰-۲۱۶-۳۹۴-۴۱۰-

ماڑ ندران : ۴۲۰ -

مسجد جنیانوالہ: ۳۹۸ -

مسجد شاہ : ۴۲۲ -

مسجد قاسم علی خان: ۸ -

مسجد لطف اللہ: ۴۲۴ -

مسجد مہابت خان د ۸ -

مسجد وزیر خان : ۳۸۱ - ۳۸۰ - ۳۷۸

سرور گل، میاں : ۴۲۷ -

مسقط : ۳۶۴ - ۳۶۳ - ۳۵۹

مسلمان : ۲۹ - ۱۸ - ۱۴ - ۱۳ - ۱۲ - ۹ - ۶
۷۴ - ۷۳ - ۶۵ - ۵۰ - ۴۲ - ۳۰
۱۴۳ - ۱۴۲ - ۱۳۹ - ۱۲۷ - ۸۸
۱۷۶ - ۱۷۵ - ۱۶۳ - ۱۵۵ - ۱۴۶
۲۰۵ - ۲۰۱ - ۱۹۷ - ۱۹۱ - ۱۷۹ - ۱۷۸
۳۱۳ - ۲۶۳ - ۲۳۲ - ۲۲۸ - ۲۱۶
۳۹۶ - ۳۸۲ - ۳۷۸ - ۳۶۵ - ۳۲۵
۴۱۴ - ۴۱۲ - ۴۰۵ - ۴۰۴ - ۴۰۳
۴۱۷ -

مسلم سٹینڈرڈ (اخبار) ۴۰۲ -

مسلم لیگ (دیکھئے آل انڈیا مسلم لیگ)

مسلم نیشنلسٹ پارٹی : ۲۵ -

مسلم ہائی سکول : ۵۰ -

مشہد : ۴۱۹ - ۳۰۵ - ۳۰۴ - ۲۶۹ - ۲۶۶

مصر : ۴۰۶ - ۲۱۶ - ۷

مظفر گڑھ : ۷۴ -

معاہدہ سیورے : ۱۳ -

معاہدہ گندمک : ۳۹۴ -

معراج الدین: ۹۱ - ۹۰ - ۸۹ - ۸۸ - ۸۷ - ۸۳
۲۱۵ - ۲۱۴ - ۱۸۹ - ۱۴۱ - ۱۳۸ - ۹۲
۳۷۹ - ۳۷۷ - ۳۷۶ - ۳۷۵ - ۳۷۴
۳۸۱ - ۳۸۰

معراجی : ۳۸۷ -

مغل : ۴۰۰ - ۱۴۲ - ۲۳

مفتی آباد : ۳۹ -

مقبرہ جہانگیر : ۳۸۰ - ۳۷۹

مقدسی : ۴۲۴ -

مقصود : ۲۱۷ -

ملکرجی : ۲۳۹ - ۲۳۸ - ۲۳۵ - ۲۲۹ - ۱۹۸

ملکین : ۳۹۹ -

مکہ : ۴۰۳ - ۳۹۶ - ۳۵۸

ملاپ سنگھ، سردار : ۱۱ -

ممتاز، امیر : ۱۷ -

منٹو مارلے سکیم : ۴-

منرلنی وادی : ۲۶۹-۲۵-۲۵۸

منصور، فیروزالدین : ۳۷۷-۴۶

منصور، مرزامحی الدین : ۴۱۳-

منگول : ۴۲۲-۴۱۲-۴۱۱-۴۰۰-۲۳

۴۲۴-

موپلا : ۴۱۷-۲۵۰

موچی گیٹ، لاہور : ۷۲-

موقتی حکومت ہند : ۴۰۴-۴۰۳-۷۳-۷۲

۴۰۷-

مہاراشٹر : ۴۲۵-

مہمند : ۵۹-۵۵-۵۳-۵۱-۴۰-۲۳

۳۹۵-۳۹۱-۳۹۰-۶۷-۶۰

۴۲۸-

مہندرا پرتاب، راجہ : ۴۰۴-۷۵-۹

۴۰۹-۴۰۷

میڈیول انڈیا (کتاب) : ۴۰۶-

میراجان، مولوی : ۴۲۷

میراحمد، قاضی : ۶-

میدان شاہ : ۴۲۴-

میرٹھ سازش کیس : ۱۹-

میئر نائیدر : ۴۰۶-۴۰۵-۹

میکناٹھن : ۴۰۱-۴۰۰

میکنزی : ۴۰۰-

میلسن، جنرل : ۴۱۴-

میمنہ : ۲۰۰-

: ن :

ناتھ، بشیشر : ۵-

ناروے : ۴۱۶-

نارین : ۱۲۸-۱۲۳-۱۲۲-۱۱۱-۱۰۹-۱۰۸

ناگمان : ۴۹-

نامسلم (بادشاہ) : ۴۲۲-

ناوگئی : ۶۰-۵۹-۵۶

نبی بخش : ۲۲۱-۲۰۵

نپولین : ۳۱۹-۲۳۰

نجم الدین، اخون زادہ (ہڈے مولوی صاحب) : ۱۶۰

۳۹۶-۳۹-۶۱-۶۰

نحقئی ۲۰-

نرے : ۵۱-

نستہ : ۴۱۰-

نستر، سردار عبدالرب : ۳۰-۲۹

نصراللہ، مرزا : ۴۱۳-

نظام آباد : ۱۵۹-

نظیر، فقیر شاہ : ۲۲۱-

نقشبند : ۳۲۵ - ۲۷۵ - ۲۷۴ - ۲۷۲

نکلسن، جان : ۴-

نگینہ، رام سرن : ۲۸-۱۸

ننگرہار : ۳۹۹ - ۱۰

نوبہار : ۴۱۱-

نوجوانان بخارا : ۴۱۳-

نوجواناں سرحد : ۱۹-

نوجوان بھارت سبھا : ۱۹-۱۸

نوجوان ترک : ۷-

نورالحسن : ۴۰۵-

نوشکی : ۳۹۵-

نوشہرہ : ۵۰-۴۹-۴۶-۴۳-۳۳-۳

۳۸۴-۳۷۸-۳۷۷-۱۹۶-۱۲۸

۴۲۶-۴۱۰-۳۹۲-۳۸۹

نیڈو ہوٹل : ۳۷۱-

نہرو، پنڈت جواہر لعل : ۳۱-۳۰-۱۸

نیملا : ۱۱۲-۷۰-۶۹

: و :

واخر، محمد : ۲۷۷-۲۷۶-۲۷۵

وحید الدین : ۴۰۵

وزارتی مشن : ۳۰-

وزیر باغ : ۲۳-

وزیرستان : ۳۹۶-۳۹۵-۶۷

وزیراں (دیکھئے جونز)

وسط ایشیا : ۳۹۹-۳۶۸-۳۳۴-۷۸

۴۱۸-۴۱۴

وسطی ایران : ۳۰۴-

وسوندھی رام، لالہ : ۲۰-

وقار علی شاہ (کاکاخیل)، سید : ۴۴-۲

ولادیمیر : ۴۱۲-

ولنگڈن، لارڈ : ۲۵-

ولی : ۳۸۵-

ویول، لارڈ : ۳۱-۲۹

" ہ "

ہاتھی خیل : ۲۲-

ہارڈنگ، لارڈ : ۴۰۷-

ہارون الرشید : ۴۲۴-

ہرات : ۲۶۶-۲۰۱-۹۵-۷۴

۴۲۲-۴۲۰-۴۰۵-۳۳۲

ہردیال : ۴۰۷-۴۰۶-۴۰۵-۹

ہری پور: ۲۹۴-۴۶

ہزارہ: ۱۳۵-۶۵-۶۱-۴۶-۱۹

ہزارہ (باشندہ): ۳۶۶-

ہشت نگر: ۳۹۰-۵۰

ہلالی، خان میر: ۲۰-

ہمدان: ۴۰۶-۳۲۹

ہملٹن، لیفٹیننٹ: ۳۹۴-

ہندکو: ۲۴۰-

ہندو: ۳۱۴-۳۱۳-۱۳۱-۳۰-۲۹-۶
۴۰۸-۴۰۷-۴۰۳-۳۹۶-۳۸۴
۴۲۵-۴۱۷

ہندوستان: ۸-۷-۶-۵-۴-۳-۱
۱۹-۱۸-۱۷-۱۵-۱۳-۱۲-۱۰-۹
۲۹-۲۸-۲۷-۲۶-۲۵-۲۴-۲۲
۳۵-۳۴-۳۳-۳۲-۳۱-۳۰
۴۱-۴۰-۳۹-۳۸-۳۷-۳۶
۶۵-۶۳-۶۱-۶۰-۵۹-۴۲
۷۶-۷۵-۷۴-۷۰-۶۸-۶۷
۸۹-۸۷-۸۶-۸۲-۸۰-۷۷
۱۹۰-۱۵۴-۱۳۸-۱۳۷-۱۲۰-۹۳
۲۱۰-۲۰۱-۱۹۹-۱۹۸-۱۹۷-۱۹۱
۲۱۳-۲۲۹-۲۳۳-۲۳۵-۲۴۱-
۲۵۷-۲۵۰-۲۴۹-۲۴۴-۲۴۳-۲۴۲
۳۰۴-۳۰۱-۳۰۰-۲۹۴-۲۶۷-۲۶۶
۳۱۴-۳۳۷-۳۴۲-۳۴۷-۳۵۵-
۳۵۷-۳۵۹-۳۶۰-۳۹۳-۳۹۴-
۴۰۲-۴۰۱-۴۰۰-۳۹۷-۳۹۶-۳۹۵
۴۱۴-۴۱۱-۴۰۸-۴۰۵-۴۰۴-۴۰۳
۴۱۵-۴۱۷-۴۲۱-۴۲۵-۴۲۶-
۹-۱۸-۶۰-۷۲-۷۳-۷۵ :ہندوستانی
۸۴-۹۰-۹۵-۱۷۰-۱۷۲-۱۷۳
۱۷۵-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۳-۱۸۵-۱۸۹
۱۹۰-۲۰۰-۲۰۴-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۲
۲۱۵-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-
۲۲۴-۲۲۵-۲۳۰-۲۴۴-۲۵۳
۲۸۲-۲۸۹-۲۹۹-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴
۳۱۵-۳۱۸-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۳-
۳۳۲-۳۵۰-۳۵۶-۳۵۹-۳۶۰
۳۶۱-۳۶۲-۳۶۶-۳۹۴-۳۹۵
۴۰۷-۴۰۸-۴۲۱-

ہندوستان چھوڑدو (تحریک): ۲۹-

ہندوکش: ۴۰۰-۳۶۸-۲۴۱-۱۰۴-۹۹

ہندو مہاسبھا: ۲۵-

ہنڈ: ۵۹-

ہوڈسن: ۴-

: ی :

یارحسین: ۵-

یارخون (دریا): ۴۱۰-

یاغستان: ۸۷-۶۶-۶۷-۶۰

یحییٰ خیل: ۳۹۷-

یحییٰ، غلام: ۱۲۸-۱۱۰-۸۵

یزد و جرد: ۴۲۴-۳۲۹-۳۲۸-۳۲۷

یعقوب محمد: ۳۹۸-

یعقوبی: ۴۱۰-

یوپی: ۳۰-

یورپ: ۸۵-۷۸-۶۸-۴۰-۲۹-۲۶-۶

۲۵۹-۲۵۴-۲۲۹-۲۲۷-۱۹۸-۱۳۳

۳۲۶-۳۲۱-۲۹۲-۲۸۰-۲۶۹

۴۰۷-

یورپی: ۲۳۳-۲۳۲-۲۲۸-۲۱۷-۷

۴۰۵-۳۶۲-۳۰۷-۳۰۳

یوسف: ۳۵۰-۳۳۹-۳۳۶--۲۸

۴۰۴-۳۵۳

یوسف زئی: ۹۳-۵۹

یوسفی، اللہ بخش: ۸-

یونانی: ۴۱۸-۴۰۹-۴۰۰-۲۱۱-۱۹۱-۹۴-۹۰-۷

یونس: ۴۱۹-

یہودی: ۴۱۸-۲۱۳-۲۱۲-۱۴۶

ہماری دیگر مطبوعات

مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل

غلام مصطفیٰ خان (مرتب)

جمعیت العلماء ہند، دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ۱۹۱۹ء۔ ۱۹۴۵ء دو جلدیں

پروین روزینہ (مرتب)

کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد، ۱۹۳۱ء۔ ۱۹۳۹ء منتخب دستاویزات

مرزا شفیق حسین (مرتب)

برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار

ایچ۔ بی۔ خان

خاکسار تحریک اور آزادیٔ ہند

اے۔ ڈی۔ مضطر

جنگِ آزادی کے اُردو شعراء

محمود الرحمان